

خوبصورت کسانوں کا مجموعہ

سینسٹ

ماہنامہ

ستمبر 2010

نگران اعلیٰ

معراج محمد



انشائیہ

جون ایلیا

سیلاب کی تباہ کاریوں
پر ایک حساس دل کا نوحہ

11

طاقِ نیاسات

آپ کے خط

مدیر اعلیٰ

20

ماضی کا آئینہ، اختیار اور اختیار انسانوں
کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

12

سپنس کی شہرت، قارئین کی تحریروں
پر ناقدانہ نظر اور مشورے

آگہی

سہارا

کاشفِ زیر

65

”علم کی جاگیر اور کی میراث“
نہیں، بلکہ ایک پراثر تفسیر

47

ایک زیرک اور مفاد
پرست انسان کی چالاکی

درستی

واپسی

محی الدین نواب

111

انہوں کا وقت گنوا کر رکھ کے
چند پل پانے والے کا قصہ

70

عکس نگار، حیرتوں کا سلسلہ
ایک صحرائی زندگی طویل داستان

مہنگی ہمدردی

کدوؤں کی چوہی

نجمہ مودی

132

تکین حالات، تنگ بین واقعات
اور بیک صاحب کی ٹھیکیں باتیں

121

مختلف پینتے بدلتے
ہوئے گئے کا دلچسپ حال

گمشدہ

عمیر شاہ

165

گم ہوئے رستوں اور
چرواہے کے پانے کا عجیب انداز

محفلِ شعریں

قارئین

میں نہانوں

منظور امام

174

آپ کی باتوں کی ایک نئی نئی روشنی
آپ کی زندگی کے ایک نئے ہم آہنگ

169

بے حس اور مفاد پرست
معاشرے کی ایک نئی جھلک

انارٹی

احمد اقبال

ورانداز

مریم رحمان

192

حالات کی تبدیلی اور دنیاؤں کی روانی
کھلاڑیوں کی ساری ایک بازی کی کٹھن

177

دنوں میں تھیلے بوندے والی مخلوق کے
شہد کر دینے والے واقعات

حضرتِ ادریسؑ

رضوانہ مساجد

تحفہ

تلویر ریاض

237

ایک نئی کہانیاں کی خوبصورت
یادیں اور رہنمائی کا انجیل

229

چھپتا ہونے کی آگ میں جلنے
والے ایک جوان کا دلچسپ واقعہ

روشنی

ڈاکٹر مساجد امجد

260

تیر کی جانب سے روشنی کی
چوہا کا نئے والی تحریک اور دعا

مغالطہ

رضوانہ مساجد

249

سنسنی خیز لمحات پر
مشتمل دلچسپ واقعات

سیلاب

جون ایلیا

فطرت کے سیلابی غیظ و غضب نے وہ کچھ کیا جو کہا۔ ہم نے دریاؤں کا کیا بگاڑا تھا، ہم نے موجوں کو کب لٹاڑا تھا اور ہم نے گردابوں کی کب برائی کی تھی۔ سیلاب ہماری بستیوں، ہمارے گھروں اور ان میں رہنے والوں کو بے نام و نشان کر گیا۔

میں آواز دیتا ہوں کہ اے بستیو! کیا تم کبھی تھیں، میں صدا دیتا ہوں کہ اے گھر و! کیا تم کبھی آباد تھے۔ میں پکارتا ہوں کہ اے تباہ شدہ بستیوں اور آباد گھروں میں رہنے والو! کیا تم کبھی کھو گئے ہو اور لوٹ آؤ گے مگر ستائوں کی بے بسی نہ ہوئی ہے، نہ سستی ہے اور نہ سستہ دیتی ہے۔ ان کے بچوں نے کتنے گھر وندے بنائے ہوں گے، ان کے نوجوانوں نے نہ جانے کتنی آرزوئیں کی ہوں گی اور ان کے بوڑھے مردوں اور عورتوں نے اپنے بچوں کی جوانی سے کتنی امیدیں پاندھی ہوں گی۔ سب گھر وندے سیلاب کی بھیشت چڑھ گئے، سب آرزوئیں گرداب میں گم ہو گئیں، سب امیدوں کو موجوں نے روند ڈالا۔

ہم تم پر روتے ہیں مگر ہماری آنکھیں بھر ہیں اور وہ یوں کہ جن کا پیری پانی ہوا ان کی آنکھوں کا آنسو سے کیا رشتہ۔ سوہم روتے ہیں اور ہمارا رون آنسوؤں کو ترستا ہے۔ وہ قوم عادی نہیں تھے جنہیں ہواؤں کے طوفان نے گرد بنا کر اڑا دیا تھا۔ وہ قوم شہود نہیں تھے جنہیں ان کی نافرمانی کی سزا دی گئی۔ وہ حضرت لوط کی امت نہیں تھے جن پر ان کی نافرمانیوں کے باعث عذاب نازل کیا گیا۔ وہ شہروں کے شہر بائل کے شہری نہیں تھے جو اپنی عیاشی کی بھیشت چڑھ گئے۔

ہم انسانی تاریخ کے بارے میں کچھ شہد بد رکھتے ہیں لیکن ہم فطرت کی تاریخ کے بارے میں کم سے کم کچھ نہیں جانتے۔ فطرت اور انسان کے درمیان شاید پینتیس لاکھ برس سے ایک پُر خاش اور پکار جاری ہے۔ اگر اس پُر خاش و پکار کے انجام کا مرثیہ لکھا جائے تو قرن باقرن کے صفحے درکار ہوں گی، وہ مرثیہ اگر زمین کی مدور سطح پر رقم کیا جائے تو سطح کی مچبائش ختم ہو جائے گی اور مرثیہ باقی رہے گا۔

غم بہت زیادہ ہیں اور خوشی بہت کم ہے۔ تاریخ کے حساس انسانوں نے اپنی زندگی کا زیادہ حصہ اداس رہ کر گزرا ہے۔ زندگی میں خوش رہنے کے لیے بہت زیادہ ہمت بلکہ بہت زیادہ بے بسی چاہیے۔ دانشمندوں کے ایک گروہ نے یہ کہا ہے کہ انسان مختار ہے وہ اپنے اعمال کا جواب دہ ہے۔ دانش مندوں کے دوسرے گروہ نے یہ کہا ہے کہ انسان مجبور ہے۔ اس کے ہاتھ اور اس کے پیروں خود جنس نہیں کرتے بلکہ انہیں کوئی اور جنس دیتا ہے۔ وہ کون ہے جو انہیں جنس دیتا ہے؟ وہ کون ہے جس نے تاریخ کے عہد اور تاریخ سے پہلے کے عہد کے تمام انسانوں کو اپنے آئندہ کار کے طور پر استعمال کیا ہے؟ یہ بات معراج رسول نہم جانتے ہو اور نہ میں جانتا ہوں۔ ذکر عذاب ناک سیلاب کا ہو رہا ہے اور اس موقع پر میری تکی میر کا یہ شعر برحق ہے۔

کن نیندوں اب تو سوتی ہے اسے چشم گرہ ناک
مڑھوں تو کھول شہر کو سیلاب لے گیا

یہاں تک تو میں نے اپنا دکھ بیان کیا۔ اب معراج رسول اپنا دکھ بیان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔ ”یہ سیلاب تو ہمارے باہر کا سیلاب تھا، اس سے زیادہ مہیب سیلاب تو وہ ہیں جو ہمارے اندر تباہی مچا رہے ہیں، ہمارے اندر کا جموج کھین زیادہ تباہ کن ہے، ہمارے اندر کے گرداب کھین زیادہ سفاک ہیں۔ نفرت کے سیلاب، تعصب کی طغیانی اور انتقام درانتقام کے گرداب۔ ہمارے اندر کے ان سیلابوں نے سارے ہندوؤں کو دے دیں اور اب ہم ہر لمحے ان سیلابوں کے رحم و کرم پر ہیں اور ہم ایک کشتی نوح کی آس لگائے امید کے سانس لے رہے ہیں۔ نہ جانے وہ کشتی نوح کب آئے گی اور ہمیں بچائے گی۔“

یہ تو میں نے معراج رسول کی بات سنائی اب میں اپنی بات کہتا ہوں۔ میں بھی معراج رسول کی طرح ایک کشتی نوح کے انتظار میں ہوں اور اس کے انتظار میں میری چٹان جی جی پڑ گئی ہے۔ میں اپنے اندر طوفان برپا کرنے والے تباہ کن پانتوں کے اقیانوس میں اپنی امید کو ڈھونڈ رہا ہوں مگر وہ مجھے دکھائی نہیں دے رہی۔ پانی زمینوں کو شاداب اور پودوں اور پتیلوں کو سرسبز کرتا ہے، کیا کبھی وہ دن بھی آئے گا جب ہم سب کے اندر کے وجود کا پانی ہماری ہر نفرت زمینوں کو شاداب اور ہمارے اور تمہارے پودوں اور پتیلوں کو سرسبز کرے گا۔ اس سے قطع نظر کہ کیا ہمارا ہے اور کیا تمہارا ہے۔

1987ء سے خدمت میں مصروف

LEUCODERMA-VITILIGO

سفید داغ قابل علاج مرض ہے

پہلی

STERIODS FREE MOST PROGRESSIVE TREATMENT

ایوارڈز ہولڈر اجمل زیدی



ASIAN EXCELLENCE PERFORMANCE AWARD



AWARD PILLAR OF LEUCODERMA

اسلام آباد

9- اپریل 30 مئی
9- اگست 30 ستمبر
9- دسمبر 30 جنوری

AWARD OF BEST ACHIEVEMENT

لاہور

پیشہ کار

14- فروری 27 فروری
14- جون 27 جون
14- اکتوبر 27 اکتوبر

تیم

فون: 7115015-19 (042)
موبائل: 0300-8566188

بشاور

پیشہ کار

14- فروری 27 فروری
14- جون 27 جون
14- اکتوبر 27 اکتوبر

تیم

فون: 2218215-9 (091)
موبائل: 0300-8566188

ملتان

پیشہ کار

28- مارچ 6- اپریل
28- جولائی 6- اگست
28- نومبر 27 دسمبر

تیم

فون: 4518061-62 (081)
4582803 (0300-8566188)

کراچی

پیشہ کار

13- مارچ 27 مارچ
13- جولائی 27 جولائی
13- نومبر 27 نومبر

تیم

فون: 706-708 (فوری مشاورت)
021-7012068-9
موبائل: 0300-8566188

www.leucodermatologist.com

E-mail: syedajmalzaidi@hotmail.com - syedajmalzaidi@yahoo.co.uk

عزیز قارئین
السلام علیکم



ستمبر 2010ء کا شمار آپ کے سامنے جلوہ افروز ہے۔ ماہ رمضان اپنی تمام تر رموز اور برکتوں کی وسعت لیے جاری ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی فضیلتوں سے مستفیض ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین..... ماہِ شریف یومِ وقار اور یومِ انصاف کے خوالے سے بہت اہم ہے۔ مگر انہیں بچھلے دنوں ایک فضا کی حادثہ میں 152 افراد لقمۃ اجل بن گئے..... لہذا اب عوامِ وقار کے فقدان کا بھی شکار ہو گئے ہیں اور بد قسمتی سے ہم اب تک اہلِ حق سے بے خبر ہیں۔ ملکی حالات پر جب ایک نظر ڈالی تو دل میں مزید پریشان ہو گیا۔ حالیہ بارشوں کے دوران سیلاب اپنی تمام تر تباہ کاریوں کے ساتھ آیا اور بے شمار مہلتوں کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا۔ آگے بڑھتا جا رہا ہے..... یہ سیلابی ریل گاڑی نہ صرف بہت سی قیمتی جانوں اور مال و سوغات کے زلیاں کا سبب بنا اور سترائیں کھلے آسمان کے زلزلہ کی زلزلہ پر مجبور ہیں بلکہ ان کے گھر بار اور کمزری تفصیلات تک تباہ ہو گئیں۔ ساری دنیا چیخ رہی ہے کہ سیلاب کی یہ صورت سوانی اور یمنی سے بڑی تباہی کی شکل ہے مگر..... امداد اب تک اندرون کوئی پڑا ہوا نہیں، اپنی مدد آپ کے تحت زندگی اور موت کی جنگ جاری ہے مگر ہمارے سیاست کے بازی کروں کو اب بھی اپنی دکان چکانے کے علاوہ اور کوئی مشغلہ نہیں ہے۔ آخری ہولناکیوں کے باوجود ہم ہیں کہ عبرت نہیں چکرتے..... فکر کرنے کے بجائے چند لحظات اظہارِ انفوس کے بعد پھر اپنی مصروفیات میں گم ہو جاتے ہیں۔ سونابست کی بساط پر چائیں چلے والو! اگر اب بھی تمہارا چین نہ سدھر تو یاد رکھو، نہ وقت نہیں معاف کرے گا اور نہ ہی تاریخ اپنے دامن میں کوئی نمایاں جگہ دے سکے گی..... البتہ اس دور کو بدترین سیاہ روایت کے طور پر ضرور یاد رکھا جائے گا..... اور ان بچوں پر صرف ایک صدمہ کو بھیجی۔

جدمہ دیکھو اوجھ پانی، نہ گھر باقی نہ در باقی
یہاں پر ہم رہا کرتے تھے یہ ہستی ہماری ہے

اور جناب ان بوجھ پاؤں کے بعد چلے ہیں اپنی رنگ و رنگ محفل کی جانب.....
24 جولائی کو رسی سے بے حال باہنچا ہوا ہے۔ شہر اور جب تک اسٹال پر پہنچا تو ایک لمحہ کے لیے بیک اسٹال والا بھائی بھی ہلکا سا سہرا کیا اور چل دی سے سبیل کے کنارے ایسے عظیم کے ملے جلے کلاس کو بھر کر بیٹھ بٹھایا۔ سناٹے بیک وقت دونوں یعنی اہلِ حق خداوندی اور بیک اسٹال والے بھائی کو شکر آمیز نظروں سے دیکھا اور پانی کا گلاس ختم کر ڈالا۔ لیکن ساری وقت اس وقت کا نور ہو گئی جب سٹینس کا پرچہ میرے ہاتھ میں تھا۔ پرچہ کو سینے سے لگا کر شہید کر دی جس کے باعث وہاں سے نودو کیا روہنے میں ہی عافیت جانی۔ جسٹس آزادی کے خوالے سے سچا سادہ بہت بھلا لکھ رہا تھا۔ ایک معصوم و مہیوڑ کی سبیل چھٹی گہرائی لیے آگئیں ایک چھب کے دراز ہاتھ کو سینے میں خوشیں..... مہذب کا ہاتھ تو فی جھنڈے کے رنگوں سے حزن پر ہم کے قومی نشان کو سر بلند کیے ہوئے تھا۔ اتنا شاندار اور خوبصورت سرورق بخش کرنے پر شکر یہ! فہرست پر سرسری نظر ڈال کر جون صاحب کے انتائے میں پہنچا۔ ”بے معنی“ میں بہت سے معنی سمجھنے میں کافی دیر غلطیاں رہا اور پھر موجودہ حالات پر کتب انفوس ملتے ہوئے محفل کی راہ چلی۔ مدیرہ آگئی نے تازہ ترین خوشی و اقدار تادور بار لاہور کا ذکر کیا۔ اس واقعے پر سب کا دل افسردہ ہے۔ سٹینس کی نیم اور محفل کے دوستوں کو میری طرف سے جشن آزادی کا دن اور برکتوں والے صیغہ رمضان المبارک کی مبارک ہو۔ حیراندارہ بچوں کی کہانیاں اور کاغذوں پر پناہ حاصل کرنے سے پریشانی کا خاتمہ نہیں ہوگا بلکہ اگر ہم سب مسلمان خالقِ حقیقی کی یاد میں لوگائیں، مشکل وقت میں اللہ ہی سے مدد مانگیں اور اسی رب العالمین کے آگے سرجھو بہو کر گزر جائیں تو کیا پابست سستی ہے۔ کہانیوں پر بہت اچھا تبصرہ تھا آپ کا! رضوان تولی! اے ملک خدا کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں پر میں گھر سے دیکھ کے ساتھ یہ کہنے میں عذر محسوس نہیں کرتا کہ ہم غیر اللہ کے آگے ہاتھ پھیلا رہے ہیں اور یہی ہمارا خون چس چس کر اپنا نیک نہیں بھرا ہے۔ ہیں اور انہی کے مظالم کا شکار ہیں۔ کیوں؟ کیا اللہ تعالیٰ کی بے نیاز ذات سے ہمارا یقین اٹھ گیا ہے (اللہ ہم سب کو معاف کرے)۔ ڈشیں بلیج! آپ کی دروہری یاد بھی خوب رہی لیکن آپ سے کسی نہ کسی تہرے میں حرافت سرزد ہو جاتی ہے۔ ٹی بی! ”ٹی بی“ ٹیوٹ کر جانے والی بات تو آپ نے کب لکھی ہے۔ نقل جانے اپنی ذرا تفصیل سے آؤ شک مجھے گزرا ہے کہ آپ ان بٹی حضرت سے تعلق نہیں جو.....! پرس تو میرا اٹھایا ہے ہمارے بس کی بات نہیں کہ کہاں خیر خیر رکھی جائے۔ جعفر حسین آپ بھر پور تبصرہ کرتے ہیں۔ سنے سامنے کچھ یاد ہے میں شکیلہ کو مفید مشوروں سے نوازا، اب اس شکیلہ کو خدا تو دینی چاہے۔ کہانیوں میں ماضی کے با اختیار اور بے اختیار انسانوں کی چالاکیوں عیاں یوں پر مبنی تاریخی داستان ”سچی راگن“ کا اختتام تھا۔ مصنف نے اقتدار حاصل کرنے کے نشے میں باپ کا ظلم کر دیا اور خود مصنف بن چکا۔ غافلانوں کے لیے یہ دنیا بیش چھوٹی ہوتی ہے۔ ”مرگ“ میں جے بی جاسن کو اس کے مرنے کی ترتیب سے آگاہ کر دیا گیا لیکن اس کا دل مقرر تھا۔ اے لے وہاں جے بی جاسن یعنی اپنے باپ کو اپنے ہاتھوں سے قتل ہونے سے نہ روک سکا۔ ”واپسی“ کی قسط مافوق الفطرت واقعات سے کئی عرصہ بن غازی لاوہ اسٹون گلوگی اور باہانہ کے عصا کی کرامت سے اپنی ظالم اولاد کے خلاف پانپا ملنے میں کامیاب رہا۔ شہر اور بیک کی

تحریر ”اسب“ بظاہر تو بورنگی مگر آخری طور کے لفظوں کی حقیقت ترپا گئی۔ جیسے جیسے اہلِ حق پر روشنی ڈالتی گئی ”فیصلہ“ موجودہ حالات کو سامنے رکھ کر لکھی گئی تھی۔ یہ اہلِ حق ایک طرف تو کسی کو اسودہ کرتی ہے اور دوسری جانب کسی کو حق کی طرح چاٹ کر ختم کر دیتی ہے۔ ملک صفر حیات نے اس بار صفر و انداز میں کہانی کی ابتدا کی۔ بچانے کا مسئلہ بتاتے ہوئے کچھ کچھ زندگی سے نجات دے دی۔ سانس فکشن کہانی ”اصل منافع“ شرمسار خوب لائے۔ بیٹے نے باپ کے فکشن لکھ کر پڑھنے سے خوش منافع کیا مگر الگ انداز کے ساتھ ڈیزلٹ کی کہانیوں کی جگہ ”مگر یہ“ واقعی ایسی اسٹوری تھی جس میں فکری ضرورت ہے۔ غربت کے بدہم جیروں میں پھنسا انسان حرام کو بھی خود پر حلال سمجھ لگتا ہے اور دھرم سے بھی وہی کیا۔ اشعار کی محفل میں چند ایک اشعار کے علاوہ سب انتخابات اچھے تھے۔ جب مریم کے خان کی ”سائیدان“ شروع کی تو بھائی بے جہاں آنے لگی۔ ولی کی شاپت کے قصص کا احوال جس نے سیاست کے اختیارات میں سے بھائی کی محبت کو بھایا۔ کہانی کا موضوع اچھا تھا مگر مگر پڑا ہوا تھا۔ ”انازی“ میں لیکے نواب کو پچھرا ہوا دولت کی اور دشمنوں نے سر اٹھا دیا۔ اب کی قسط میں بھی وہی روایت برقرار رکھی کہانی کا تسلسل ٹوٹا جا رہا ہے۔ فہرست سے مستثنیٰ کہانی ”نشانہ“ میں سبیل کا نشانہ نہ اس کی چھپر بھائی کو جاڑ گیا۔ ماں جیسی بھی ہو ماں، ماں ہی ہوتی ہے۔ ”نہیں کانی“ محبت کے جذبے سے گندمی خیر لہذا زوال تھی۔ مختصر جیروں میں حردے گئی۔ اللہ اعجاز عظیم عطا کرے۔ ڈاکٹر ساجد احمد کو جو ”بیس انہیں“ کے کرام کے ایمانی قصوں سے روشناس کر رہے ہیں۔ حضرت یونس کا دوسرا حصہ بڑے ذوق و شوق اور مہوشی کے ساتھ پڑھا جس کی نواب! کی ”آٹھ کھوٹی“ بے شک اسٹوری آف دی ملٹی ٹی۔ جس میں محبت کے پروانے آخر کار شمع کو کھوج ہی لیا۔ ظاہر اکل ”شہر محبت“ کا جلد ہی اختتام کر دیا۔ کیا ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ آپ کی آگے خیر ہمارے ہاتھوں میں کب تک پہنچے گی۔“ (تہرے کا شکر یہ)

اسگر بلوچ، تربت بلوچستان سے فرما رہے ہیں۔ ”میں پہلی دفعہ کچھ کہنے کی جسارت کر رہا ہوں، دوسروں کی طرح بات سے بات بنانا نہیں آتا، اس لیے اب تک خاموش قاری بیٹھا تھا لیکن پچھلے رسالوں میں ظاہر جا یہ محفل کی سپر ڈپرٹ بلکہ پاک بلا سٹر کہانی ”شہر محبت“ نے قلم اٹھانے پر مجبور کیا۔ کہانی کی تعریف نہ کرنا انصافی ہے۔ اگلے کی اس جگہ کو سلام بخش ہے ہم کو لاہور کا ماضی کی یاد دلا کر حالانکہ کوئی نامت نہیں تھی لیکن دیکھ دو سب کے ایک جیسے ہوتے ہیں۔ ظاہر اکل کی یہ تحریر محبت کرنے والوں کے لیے ایک یادگار ہے جیسے کہ تاج محل، کہانی کا انداز ایسا تھا کہ پڑھنے والا اس میں ڈوب جاتا ہے ہم ابھی تک اپنے آپ کو بچوں میں محسوس کر رہے ہیں۔ ہم تمنا کرتے ہیں کہ اگلے جلد ہی کوئی نئی دھڑ دینے والی خبر پڑے پڑے والوں کو دے گئے۔ آخر میں ایک خواہش، ہم کہانی کے کرداروں کو دیکھنا چاہتے ہیں ظاہر ہے یہ ناممکن ہے لیکن ان کے خالق ظاہر جا یہ محفل صاحب کی ایک تصویر اگلے شمارے میں لگ جائے تو شکر ہے میں جا رہا تھا نگ جائیں گے۔“

عاشق شاہین، گھمراہ اور پڑی کہتے ہیں۔ ”اس بار سٹینس لاہور آئیں گے خیر اور اگر جی چھٹے کہ اس کا تیا پنا کر دیا۔ ناٹلس جیٹن آزادی کے گھانٹے سے تھک چکی تھی۔ جون اٹھائے کے اٹھائے تک پہنچے جہاں وہ کھینچا نگلیں اور دواش مندانہ معقولوں کی طلب و رسد کے بارے میں گفتگو کرتے نظر آئے۔ پر ہم جی نہیں مانتا چاہے وہی کچھ ہے۔ اپنی نقل غلطوں میں پہنچے جہاں اس بار صفر نازک حیراندارہ راجان ہیں تبصرہ بھی اچھا تھا مگر میرا ہی پرکشی زیادہ ڈانٹا ہوا ہے والی نہیں مانگے مینے کیا پاس ہے آخر میں ہوں۔ رضوان تولی اور جعفر بھوان کا تبصرہ بھی لا جواب تھا۔ مگر جا یہ آخری خط کیوں ہی رہا ہوا آتے رہے اور دل جیت گئے۔ ہاتھوں بلگرامی کی تاریخی کہانی ”سچی راگن“ پڑھی اس میں جی کہ احباب محفل کی زندگی میں ہیں، لیکن وہ اپنی سچی راگن گئی۔ جی الدین نواب کی ”واپسی“ ہم پہلی سبلی کہہ چکے، یہ عجیب ہے، اچھا ضرور لگتا ہے پر اچھا نہیں، لیکن، ہم تو اسے قطعاً مناسب نہیں سمجھتے، تبصرہ اور پکی اور طریقے سے بھی تو آسکتی ہے۔ مگر کے کچھ عام کہانیوں سے ذرا ہٹ کر موضوع پر بھی لکھ کر رہی۔ خاص کہانی انازی پر پہنچے جہاں اس بار گزشتہ اقتدا کا خلاصہ بھی دیا گیا ہے۔ اچھی لگی ہے جیڑ۔ رضوان و حید کے مسئلے تو حل ہوئے، نواب صاحب اب تک لندن کے سامنے سمجھانے میں لگے ہیں اور لگتا ہے اس بار دھماکا کچھ شدید اور دیرپا ہے۔ نواب صاحب کیسے جی پائیں اور مکہ تھلاؤں کو نہ۔ مختصر کہانیوں میں ”نہیں کانی“ نے کافی متاثر کیا اور حضرت یونس کے تاریخی واقعات نے بھی کافی معلومات میں اضافہ کیا۔ سب سے آخر میں پرل عزیز ”شہر محبت“ کی جانب آتے ہیں سب کچھ ٹھیک ہوا انتظام بھی، براہین سے ذرا پہلے وقت کا جی کا علاج کے لیے اگر شہر کو دشت یاد دلائی کہ کھانا جاتا تو کہانی اور بھی پیاری ہو جاتی۔ محفل شہر چین میں نواب راجیل، ایڈیٹ خان اور شعیب کول کا انتخاب لا جواب تھا۔“ (آتے رہا کریں)

عبدالرؤف مزاروی، کابل میں کراچی سے لکھتے ہیں۔ ”سرور قی حیدر پر ایک اپنی سی نظر ڈالتے ہوئے جب پائیں طرف سہری حروف میں لکھے گئے جشن آزادی مبارک پر نظر پڑی تو بے اختیار سیم قاز کی نظم بر صغیر پاک و ہند کے تناظر میں لکھی گئی ”خاک اور خون“ لکھ ہوں کے سامنے محسوس ہوئی۔ ایک ایسی آزادی خوشحال جس کے لیے میں لاکھوں قیمتی جانوں کا نذرانہ پیش کرنا پڑا لیکن حصول آزادی کے بعد ہم اور ہمارے صاحب اقتداروں نے اس کا وہ ستیا سن کیا جس کی نظیر نہیں ملتی۔ بہر حال تمام دوستوں کو آزادی کا دن مبارک ہو۔ فہرست و اشتہارات سے صرف یہ فکر کرتے ہوئے اہلیا صاحب کے دربار میں پہنچے تو وہ انسانیت کا درس دینے میں مصروف تھے۔ ان سے سبق لیتے ہوئے غلطی کی محفل میں پہنچے حلف قافل سے حیراندارہ صدمہ کو صدمہ پر دیکھ کر اپنے اندر کچھ جتا ہوا محسوس کیا۔ رضوان تولی صاحب آپ نے بہت اچھا لکھا تھا لیکن حیراندارہ نے پائیں کوئی خوب و داویر قبرستان میں گاڑا تھا یا کوئی اور عملیات کیے ہیں کہ سبقت لے گئیں۔ ڈشیں صاحب! امیر افسورہ مائیں تو کسی قابل ذاکر کی کمدلی میں رہیں لیکن ہے پھر بھی بیک سٹ ہوئیں تو اس جہاں خالی سے کوٹا نہ کر جائیں۔ عبدالرؤف عدم صاحب اپنے قدم مضبوط رکھیں اور

جھنڈے کو سرخ ہی رہنے دیں کیونکہ تمام تر ہتھیاروں سے لیس میدانِ عمل میں آپ کے ساتھ اتر چکے ہیں۔ پرس خور احمد ہمیشہ ایک سوئیں کی رفتار میں رہتے ہوئیں، ہمیشہ پیچھے ہی رہتے ہو، جاوید علی پٹیل سرتیب آئے خوب آئے، آتے رہا کرو، اچھا لگا۔ سنی راگناں میں موٹری کی موت اور مختصر کی چھ ماہ کی مختصر خلافت اس محاورے پر ہم تقدیر کے ہے کہ ”دوسروں کے لیے گڑھا کھودنے والا خود اس میں گرے گا۔“ ”واہسی“ کی اگلی قسط کا شہید انتظار ہے۔ ”شہرِ محبت“ پھر پورا انجام پر اختتام پزیر ہوئی۔ بلا شہزادہ اپنے بیٹی کو نجی کے روپ میں پایا۔ لیکن شہزاد کی عمر کے حساب سے لگاتار بیٹی کو بھی شہزاد کے روپ میں ہی اور گڑھوں کا پڑنے کے لیے انور صاحب کی ”نیکین کانی“ ”واقعی نیکین کانی“ ”آسیب“ کی حقیقت ایک پروردگار پر مبنی ہے۔ یہ وہ ”آسیب“ ہیں جو لوگوں میں موت تقسیم کرتے ہیں اور ہم میں گوشت کا شہابی، کیونکہ ہماری اپنی سانسیں گودی ہیں۔ اپنی تمام تر بہترین اور کچھ پر مطلقہ ہیں۔

لاہور بیب خان..... فیصل آباد سے حاضر ہیں۔ ”اس دفعہ کا شمارہ 25 جولائی کو نئی نئی کتابیں میں بڑی بے تابی سے کھولا لیکن کیا؟ میرا خط پھر نہیں جی کدو کی نوکری میں بھی نہیں، میں نے مایوسی سے رسالہ بند کیا تو سانس ہی غافل گر لیا نظر کی پہلے تو مجھے حیرت ہوئی کہ غفلت گر ل آزاد کی ماہ میں بھی اتنی اداس کیوں نظر آ رہی ہے۔ پھر بھی کیا چھاپا یہ میرا خط دوسری دفعہ بھی شائع نہ ہونے پر اداس ہے۔ خیر اسے کئی دسے کہ غفلت محاس میں آگئی تیرا رخا کا تیرہ پڑھا۔ اسے کہاں جا رہی ہیں؟ یہ تو جی چاہے اسے اسے یہ لیں مبارکباد۔ حیرانہ ایک بات تو بتائیں آپ ہمیں اپنی کیوں لگتی ہیں، مٹھی مٹھی سی دلنشین بلوچ اللہ شمس میری طرح مضبوطی عطا فرمائے۔ دیکھو وہ خط نہ جیسے پر بھی میری کیسے تیش لگی ہوئی ہے۔ (شلاش.....) عبدالرؤف عدم آپ کا بے مصالحتانہ انداز کچھ ہضم نہیں ہو رہا۔ ایسا کیوں ہے؟ اشتقاق شاہن مجھ کو آپ لگے ہی ہوں گے کہ ناگ کی حیدر آپ کے سپنے کیوں نہیں دیکھ رہی تھی۔ پرس خور احمد کا تیر تیر تیرہ پڑھا جانتا میں آپ نے تیرہ ایک ناگ پر کھڑا ہو کر تو نہیں لکھا تھا۔ جعفر حسین آپ کے تیرہ کن پوائنٹ پر لکھا تھا کیا، بہت سیریل تھا کڑا کڑا اور اچھا جاوید یہ آپ کا آخری تیرہ کیوں ہے؟ کیا آپ کو اپنا تیرہ اس قابل نہیں لگتا کہ غفلت محاس میں دوبارہ شامل کیا جاسکے۔ عبدالرؤف آپ سب کس کا منا کا کیا کیسے ہوئے ویسے تمہارا تھا منہ تیرہ اور چھاپا تھا اور ہاں مجھے اپنی کہتا ہے میں تم سے پورے ایک سال بڑی ہوں۔ اب آتی ہوں کہانیوں کی طرف، سب سے پہلے تو انڈی پڑھی اور حیران رہ گئی کہ یہ اچانک لیلیچا کو کیا ہو گیا اور انڈی، یاد یہ کیا سب کس ہے؟ احمد صاحب پلیز رقی کی یادداشت نہ کیجئے گا۔ شہرِ محبت کا اختتام بہت خوش کن تھا۔ واہسی..... یاد کیا غیر حقیقی کی کہانی ہے دوبارہ جوانی کی طرف واپسی مانگن۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتی۔ سنی راگناں کا انجام دہی کر گیا۔ یاد یہ بھی محبت ایسے ہی کیوں رلائی ہے۔ میں نے تار بجی کہانیوں میں ہمیشہ جی محبت کا ایسا ہی دہی انجام پڑھا ہے۔ کاشف زہیر کی مرگ ہمیشہ کی طرح ایک سپر کہانی تھی اور سبب واقعی ہمارا پاکستان آج بھی گمراہ بن کر رہ گیا ہے۔ اللہ اسے شر پھیلدوں سے پاک کرے۔ آئین۔ سیاستدان میں مور نے واقعی بہت بڑا ایم لکھا۔ لیکن کانی ایک جی محبت کی کہانی تھی۔ واقعی بیرون بہت خوش قسمت تھی اور کچھ پچو پورے سب کس کی کہانیوں پر چھائی ہوئی انشوری تھی جی الدین نواب صاحب آپ نے کمال کر دیا۔“

جعفر حسین، مجاہد، چینیٹ سے چنے آ رہے ہیں۔ ”ذاکر اعلیٰ نے جشن آزادی کی مناسبت سے سرورق کے ذریعے بہت اچھا پیغام دیا۔ بہتر بہتادو میں بلوچ ناٹوان شخص ناٹیا پوری قوم کی نمائندگی کر رہا تھا۔ اس کا انتہائی اچھا جوہر ہم کے چاند کو بڑی مشکل سے پکڑے ہوئے تھا۔ ظاہر کر رہا تھا کہ باوجود اپنے تمام تر گروہی اختلافات کے ہم آئین ہیں۔“ ”جون صاحب کا انٹرا“ ”نہ جی“ اپنے اندر اس درسا کا سچائی سمونے ہوئے تھا۔ صوبائی جمعیت، لسانیت، فرقہ واریت اور تعصب پسندی نے اس ملک کی جڑوں کو کھوکھلا کر کے رکھ دیا ہے۔ اعتدال، میانہ روی، مہربان اور برداشت کا مادہ ختم ہو کر رہ گیا ہے۔ جس پر ہم نے اس وقت اور دانش ور طبقے سے معاشرے کی اصلاح کی امید تھی وہی مفادات کا سب سے بڑا امیر ہے۔ ہمارے ملک میں جون صاحب جیسے قوم دوست اور مفکر لوگوں کا کال پڑنا جا رہا ہے۔ محفل میں حیرانہ صاحب کو خوبصورت تیرہ سے کسٹھ کر صدارت پر فائز دیکھا، میری طرف سے دلی مبارکباد۔ عبدالرؤف صاحب اچھے مزاج کے لیے اچھی جمالیاتی حس کا ہونا بھی ضروری ہے۔ جس سے آپ فطری طور پر محروم ہیں۔ دلنشین بلوچ صاحب ہماری کون سی پاک بھارت جنگ بھی کہ جس کے ختم ہونے کی خوشی میں آپ باجیں پھیلا رہی ہیں۔ اچھے تیرہ سے میری کمزوری ہیں اور بد قسمتی سے آپ کا شمار بھی اچھا تیرہ لکھے والیوں میں ہوتا ہے۔ سزا دہ کے تھکے تیرہ نے خاصا شکر کیا۔ تمام دوستوں کا شکریہ جنہوں نے تیرہ کے گویہ پر اپنی تیشی شائستگی اسٹور پر میں سب سے پہلے ”مرگ“ پڑھی۔ کاشف صاحب کا انتخاب ہمیشہ کی طرح عمدہ رہا۔ ”مرگ“ اس حقیقت کی عمدہ عکاسی کرتا تو قدرت سے مفر کسی کو بھی نہیں۔ ”شصتیر ادیب کے“ ”آسیب“ کو پڑھنا شروع کیا تو ابتدا میں ایسا لگا کہ جیسے مرحوم مصنف کی مغربی فیشن سے متاثر ہو کر لکھی گئی عام گزرو ہوئی مگر جس طرح رائٹر نے انسانی جانوں کو بے پایاں سمجھنے والوں کی زندگیوں کی خون آشتی کو اگیا کر دیا وہ صرف انہی کا خاصہ ہے۔ ”فیصلہ“ کو دیکھنا انہی مسائل کے گروہی تجربے تھے، جن سے اندازہ پاک کے لوگ تیرہ آ رہے ہیں۔ ”اصل منافع“ میں مصنف نے بار بار غلطی سنو کے بارے میں غیر ضروری طور پر بتا کر ہمیں بھی الجھا دیا۔ موضوع کانی دلچسپ تھا مگر اختتام کانی بورنگ اور توقع سے بہت کم تھا۔ جس کہانی نے سچ معنوں میں متاثر کیا وہ ”مٹھکرے“ تھی۔ زندگی کے خاردار رستے پر محرومیوں اور تنہاؤ کے بچوں سچ سچ کرتے ہیں یہی نہیں چنا کہ کب ہم حرام حلال کی تیز کر جیسے ہیں۔ ”سیاستدان“ میں کانی سب کس تھا اور پھر راقی مر لوجا کی باطل آخری محوں میں جا کر کھڑے کھلا کہ حقیقت کیا تھی؟ یا سب لوگ چاہے جس ملک میں ہوں۔ ان کے مفادات ایک جیسے اور فن و نقصان کے پیران سے منسلک ہوتے ہیں۔ ”نیکین کانی“ کچھ خاص نہ ہونے کے باوجود اپنے اندر ایک کشش اور اخلاقی جذبے کی تمام تر شہدیں سمونے ہوئے تھی مصنف کی تمام تر کوشش کے باوجود ”نشانہ“ ایک عام ہی تجزیہ

جاہت ہوئی۔ ”آکھ پچوئی“ میں نواب صاحب نے انٹرنیٹ کے مفتی پہلو سے صرف نظر کر کے اس ایجاد کے مثبت پہلو کا درست رخ دکھایا۔ ”سعی راگناں“ کا آخری حصہ زبردست رہا۔ جمالی بصری اور کم شدہ داستانوں کو صفحہ قرطاس پر یوں بکھیرا کہ قاری حیرت زدہ رہا اور خود کو اس ماحول کا حصہ بھی محسوس کرے، کانی مشکل کام ہے مگر ہماری نواب صاحب پر کام اسن طریقے سے کر رہے ہیں، حجام، بٹ صاحب اس بار غلاف معمول ملک صاحب کی یادداشتوں کو متنوع مختلف انداز میں لکھ کر آئے۔ ”کھرے سکے“ سیت بٹ صاحب کی تجزیہ پر پڑھتے وقت بڑا عجیب احساس ہوتا ہے۔ رائٹر زبردستی اپنے خیالات اور نظریات کا پرچار کرتے ہوئے ان کو کہانی میں مٹھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ”انڈی“ میں جیسے ”انڈی“ حالات کے سنہرے میں پس کر ڈھتا ہی چلا جا رہا ہے۔ اقبال صاحب تحریک پاکستان میں موجود کرداروں کو سیر پھرنا شروع کر چکے ہیں۔ کہانی میں نواب صاحب کی یادداشت ختم ہونے کی کمی کی کمی ہو پوری ہوئی، جس شخص حقائق کی دنیا میں رہتے ہیں وہاں ”واہسی“ جیسے داستانوں کو نہ ذہن قبول کرتا ہے اور نہ دل۔ دنیا میں جھڑے بھی رونما ہوتے ہیں مگر اس طرح نہیں جس طرح نواب صاحب حقیقت اور افسانے کا باہمی تعلق جوڑ کر پیش کرتے ہیں۔ ”حضرت یونس“ اور اس کے پیچھے دوسرے سلسلے بلاشبہ سب کس کی جان ہیں۔ ”شہرِ محبت“ بالآخر اپنے اختتام کو پہنچی۔ ہر دل عزیز مصنف کی خوبصورت تجزیہ بلاشبہ مدقوں یاد رہے گی۔ ”نیکین کانی“ کی طرح ”شہرِ محبت“ کا انداز بھی خوشگوار بار معیاری ادب اور ڈائجسٹ کی بحث میں پڑنے والے اردو ادب کے نقادوں اور دانشوروں کو کم از کم ایک بار غفلت صاحب کی تجزیہ پر ضرور پڑھنا چاہیے۔ اردو ادب کا شاندار دور گزر چکا، اس وقت ایک عرصے سے اس پر غور طاری ہے۔ ایسے میں سب کس ڈائجسٹ میں شائع ہونے والے جعفر افسانے اور آخری صفحات کی لازوال تجزیہ پر بھی کس وقت ستر قریب سے کم نہیں۔ محفل شعرو میں جن اشتقاق سیال، کاشف قیوم اور جمین سکرز کا ذوق خوب رہا۔ ادارے سے پوچھنا تھا کہ کیا محفل صاحب قادی لینڈ پر لکھی راگناں کا انداز اور فرانس چاہتے ہیں یا صرف اپنے محل اور فیاضی معلومات کی بنا پر ساری تصویریں رنگ بھرتے ہیں؟“

لاہور دلنشین بلوچ، نیکلاسے شریک محفل ہیں۔ ”جان قنا سب کس ڈائجسٹ کا گمٹ کا شمارہ ہاتھ میں ہے۔ بڑا انتظار کروا رہا ہے، خوبصورت ناگن کیوم آزادی کے بین مطابق حیدر کی حسین آنکھوں میں ایک حسرت، اشتغال کی کیفیت بھر گئی ہے، اپنے ملک کی یہ حالت دیکھ کر اس اداس ناگن سے جلد اجازت لی، اپنی دل و لہر میں بیٹھی، میرا خط قبولیت کا درجہ پا چکا لیکن بھاری غدار رسول صاحب مجھے جھاڑ طاری تھیں (اے وہ ڈانٹ نہیں تھی)..... کس صدارت بھاری میرا رضا کو مبارک ہو۔ پتا نہیں ظاہر جاوید محفل شہرِ محبت میں بیٹی کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔ خیالوں میں بھی راگناں کی بجوایا جاتی جانے اس کی کوششیں کامیاب ہوتی ہے کہ نام، دولت گمٹ کی چمن آکھری دل میں آگ گئی ہے کہ انڈی میں فیک پکڑ تامل بننے سے پہلے نہیں۔ آخر میں میں پتہ کرے ہالی سے ہر اسٹیشن پر ہر کار کا انتظار کیا، کب سب کس اپنے دیا کر دوائے دل اس وقت دھڑکن بھول گیا۔ جب کہ گویا بیٹھیں پڑیں نے دل دی اور کچھ سے حسین بلوچ اور اس کی دور درمی گزارش آنکھوں کے سامنے نظر آئی۔ دل بھری بیانی کی دوہا کہ ہوگ کوئی گاڑی تیری سے روانہ ہوئی بدلے تپ نے بہت بے تابی سے سب کس کو کھلاشا آخر تقدیر کو رحم آگیا، گے پلٹے فارم سے شاد دل گیا۔ سب دوست مل گئے لیکن حسین بلوچ غائب پلٹے آتے رہا کرو۔ عبدالرؤف شکار پور یاد دہی کا شکریہ۔ سفارش کرو ادارے سے پھر میں براہ آؤں گی۔ مجھ جاوید آخری بار کیوں؟ جعفر حسین زبردست! راجا غائب نواز فکس میں دیکھو وہ دماغ جو بھی خراب ہوگا۔ پرس خور کیسے پرس ہو صرف 2 ہزار کی بھی اچھا خیر مبارک ہو، پوچھتا ہوں خرچ کہاں کرو گے؟ مسز ابدولشاہ میں پوری طرح آپ سے متعلق ہوں جو خیالات دیوتا اور واہسی کے بارے میں آپ کے ہیں وہ میرے ہیں، اشتقاق شاہن خبردار جو میری سیٹ لی میں آگئی ہوں۔ کہانیوں میں اس دفعہ ترتیب کو ملحوظ رکھا سب سے پہلے سنی راگناں پڑھی فصل کی سی راگناں گئی لیکن مجھ کی دل بند پر محبت اور بے بسی پر دل بہت اداس ہو اور ایسا لکھ کر ہے کسی پر بہت غمہ آیا۔ مجھ نے انمول جاہت کی انٹ داستان رقم کی۔ شصتیر ادیب کی آسب پڑھ کر دل پر دھشت اور دھشت طاری ہوئی۔ ”آسیب“ تو انسان کے اندر کا گھر بستان ملک جاوید ہے، میں ”سید اشتقام کی“ ”فیصلہ“ واقعی عجیب فیصلہ کیا اور نے، اس نے ماں بہنوں کو ناراض نہ کیا لیکن عمر بھر تنواریہ ہنا منظور کر لیا۔ حالات کی تسم طریقے سے اسے فکس کی اختیار ہلا کر اس فیصلے پر مجبور کیا۔ ملک سفوحیات کھرے سکے لائے جو آخر تک کھوئے ہی گئے۔ شریک اس جو ہمیشہ زبردست تجزیہ لائے اس دفعہ ”اصل منافع“ پڑھ کر میں تو دنگ رہ گئی۔ آخر تک اندازہ نہ ہوسکا کہ کار کا حاصل منافع کیا تھا۔ شرمندگی سے منکھار د گیا کہ دوسرے سارے کی جھلکات کے سامنے مجھ کو ہیں کہ ہماری خاطر وہ میرے جواہرات کے سفندوں ٹانوا دیتے ہیں۔ مریم کے خان کی ”سیاستدان“ اختیارات کی بساط پر مجھوں کی سیاست کا احوال سیاستدان واقعی ناچنا ہوتے ہیں۔ عوام انہیں کیڑے کوڑوں سے ذرا بھی بڑے نظر نہیں آتے۔ احمد اقبال انڈی کی 52 قسط لائے کھالات واقعات کا عجیب بھانڈا بنگہ تجزیہاں، مستیاں، نادانیاں، قہقہے، دہر پائیاں، شرانگیزیان سب کچھ انڈی میں ہے، دیکھتے ہیں لکھا کیا کیا نازا رہا کرتا ہے لگاتار۔ ”نی اٹال“ یادداشت اٹن چھو ہوئی ہے۔ لیلیشا دوبارہ اپنی دولت کی طرف لپک رہی ہے۔ جی الدین نواب کی ”آکھ پچوئی“ میں سب کس تھیں کانی غیر حقیقی داستان لگی۔ میں نے تمام دوستوں سے درخواست کی ہے بھی سب کس کے دوستوں سے کہ وہ اپنی اپنی کوئی عبارت بتائیں۔ پھر ہم ایک دوسرے کو تلاش کریں گے کیسا گمراہ اور مشورہ امیری نشانی یہ ہے کہ میں کچھ سمجھ لو اس اور مٹھے شوخ میں نظر آؤں گی۔ ظاہر جاوید محفل کی ”شہرِ محبت“ کا آخری حصہ کیا کہنا ہے ایک پر بات تجزیہ پوری داستان کا زبردست اینڈ محفل صاحب بہت بہت مبارکباد۔“

عبدالغفور خان خٹک، چھپ ملنگ سے کہتے ہیں۔ ”10-7-28 کی صبح جو کہ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ تم لکھ کر آئے گا کیونکہ خلافت 202 ایئر بلو جو کہ کراچی سے اسلام آباد آ رہی تھی 9:43 A.M کو مارنگہ کے پہاڑیوں سے ٹکرائی جس میں 152 جانیں ضائع ہوئیں۔“

میرا متقدم اپنے دوستوں سے کہنا ہے کہ پلیئر ایک بار محمد شریف اور 3 بار قی شریف پڑھ کر تمام قاری 152 لوگوں کو ایصال ثواب کے لیے پڑھ لیں۔ اب آتا ہوں دوست رسالے سٹینس کی طرف۔ سب سے پہلے میں نے شہر محبت کی قی پڑھی۔ بہت دلچسپ تھی، شہزاد کی محبت کی جگہ کی کہن تھی کہ سب سے زیادہ تھی جس کو اپنی محبت شہزاد مل گیا۔ سٹینس کا یہ محقق کہانی لیکن ابھی تحریر بھی کیا ایک شخص نے 40 سال تک اپنی زندگی گزار دی۔ آج کل بھی اللہ نواب کی تحریر میں اس بات کی عکاسی تھی کہ شہریت کی وجہ سے کسی وقت بھی محبت میں مل جاتی ہے۔ انڈی پڑھی فیکے پتھر اور دودھ کی جڑی ابھی تک جاری ہے لیکن ابھی تو اقبال صاحب کو چاہے کہ شادی کروادیں اور دوسرا ایلیٹا نے بھی جائیداد کا مسئلہ حل کر دیا اور وحید کو آخر فیکے پتھر نے پاکستان بھیج دیا اور دونوں نے شادی کر ڈالی۔ اشعار کی مغل میں مذکور بڑی کا شعر واقعی اچھا تھا۔ باقی میں ماہین فاطمہ، اربہ، یوسف، محمد جاوید، اسلم خان، کے اشعار اچھے تھے۔ دوسری کہانیاں آسب، فیصلہ، مرگ، آج بھی کہانیاں ہیں۔ باقی زیر مطالعہ ہیں۔ خطوط کی مغل میں حیرانہ صدارت کی کرسی سنبھالے ہوئے تھیں اور ان کا تہیہ بھی اچھا تھا۔ پرانے قاری دوشین، رمضان ٹوٹی کی بھی آدھ ہوئی ہے۔ جعفر حسین جو نانا بھائی صاحب میرا تو غریب ایس کے اسمبل کے ساتھ ایک چھان کا جو رشہ ہے وہ میرا بھائی چارے کا ہے اور کوئی بھی نہیں ہم سب ایک خاندان کی طرح ہیں اس مغل میں ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہیں۔

حسین عباس بلوچ، ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا سے لکھتے ہیں: "اس ماہ کا شمار ہمیشہ کی طرح لیٹ ہی موصول ہوا۔ مغل شاندار تھا سب سے پہلے کہانی انڈی پڑھی۔ اس ماہ کی قی تھوڑی بڑھی۔ دینی کہانی بھی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے، ہم کافی شوق سے پڑھتے ہیں۔ کچھ قیدی بھائی جو بد قسمتی سے تعلیم حاصل نہیں کر سکے ان کو پڑھ کر سنا ہے اور وہ تمام قیدی بہت ہی خوش ہوتے ہیں۔ ہماری واحد تفریح ڈانچسٹ اور ٹیلی ویژن ہے جس سے ہم اپنا نام پاس کرتے ہیں۔ نماز تلاوت کا کام پاک بھی روزانہ ادا کیا جاتی ہے۔ اپنے کردہ نہ کردہ گناہوں کی معافی مانگی جاتی ہے جماعت تو ان کا کوئی بھی نہیں مل سکتی ہے کچھ جگہ جگہ ہوتی ہے اور کچھ کہتے ہیں کہ جو تامل ہو اس کے پیچھے نماز نہیں ہوتی۔ یہاں تقریباً نصفی پر صمت ہے گناہ سزا سے صمت کا تر ہے ہیں۔ ہمارے ملک کی پوسٹ میں شہریت غور ہے شاید کسی اور ملک کی ہو۔ یہ شہریت کے لیے کسی کی بنیادی تبدیلی کر دیتے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ کچھ ملے کھانا چاہے وہ اپنی اپنی بڑی سزا کا حق ہے بھی یا نہیں۔ اس کی زندگی اندھروں میں ڈوب کر زیادہ سے زیادہ پچاس ہزار چالیس ہزار یا تیس ہزار پڑ رہے ہیں اپنے سمیر کا سودا کر دیتے ہیں اور وہ جیسے ان کے تئیں ہوتے کسی غریب کی بیماری یا اور کسی طرح نکل جاتے ہیں۔ اگر ہمارے ملک کی پوسٹ اور اندھاری کے ساتھ اسے فرائض جیسی ادا کرے تو اللہ تعالیٰ ہمارا ملک بھی تر کرے گا اور ہم بھی تر کر دیں گے۔ ہم مسلمان ہیں اور ہمارا ایمان ہے کہ اگر کبھی گناہ سے کوئی کام کیا جائے وہ کام ہو جاتا ہے تمام قارئین سٹینس سے گزارش ہے کہ اس ماہ رمضان مقدس میں اس سزا سے صمت کے قیدیوں کے لیے خصوصی دعا میں کریں۔ تمام قاری سٹینس اور اسٹاف کو ایڈوائس رمضان شریف اور علی الصبر کی مبارکبادیں کرتے ہیں۔ قیدیوں کی گزارش ہے کہ سٹینس میں قیادار کہانی جنگلات پیراؤں اور راولپنڈی کی کہانی لکھیں۔ شہزاد، مینی شاہین کا بہت پسند آیا۔ ہم تمام قیدی سزا سے صمت کے سینٹرل جیل مٹان سینٹرل جیل میانوالی، ڈسٹرکٹ جیل جھنگ کے تمام قیدیوں کی خدمت میں سلام پیش کرتے ہیں۔ نیچے مئے دوست شہزاد احمد کا کس ہائی کورٹ میں ذرا صحت سے ایک ماہ بعد فیصلہ متوقع ہے تمام قارئین سے نہایت ہی احتساب ہے کہ اس کے لیے خصوصی دعا کریں اور اس کی امیری کے دن جلدی ختم ہو جائیں۔ آمین۔ (اے سٹینس پر تبصرہ کہاں ہے)"

غلام حسین بلوچ، اللہ دوسر، جناح کالونی چوک سرور شید سے فرما رہے ہیں۔ "دوستوں کی مغل میں پہلی انگری ہے امید ہے دیکھ سکیں گے۔ جون ایلیا کی باتیں قابل غور و فکر و عمل تھیں۔ مغل میں حیرانہ صدارت سے یہ باتیں تھیں۔ تبصرہ شاندار تھا۔ رضوان خوی کر پڑی کا نام حد کا ڈانچہ کروا کر کیا۔ تبصرے نے شکایت دور کر دی۔ مس خلیہ غائب تھیں۔ سنی راگن کا اختتام اس کر گیا۔ فضل کی موت پر افسوس ہوا۔ متوکل سازش کا شکار ہو کر جہنم داخل ہوا۔ مجبور قید کر دی گئی۔ داپھی میں بھی اللہ نواب اپنے مخصوص انداز بیان میں کہانی تخلیق کر رہے ہیں اور ابتدا حیران کن واقعات سے ہوتی۔ یقیناً تحریر دیتا ہے کسی طویل ثابت ہوگی۔ ملک صندرات اس بار مختصر تحریر کے ساتھ حاضر تھے۔ انجام حتمی جلدی اور تیز رفتاری سے ہوا اس کی توقع تھی۔ اس بار کہانی پسند آئی۔ انڈی کی تعریف کیا کرتی، یہ تعریف کروا کر دوسری ہوتی جاری ہے اور مسلسل پہنچتی جارہی ہے۔ شہریت میں ظاہر جاوید مغل کا انداز محبت، کلمہ چاہت ہے لکھی گئی کہانی بالآخر اختتام کو پہنچتی۔ ظاہر ہی اول خوش کرد یا بشتی اور شہزاد کے ملاپ نے۔ مینی اللہ نواب کی تحریر آج کل جی بھائی کے حد پسند آئی۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی کے مزید واقعات پڑھ کر دل کو اطمینان نصیب ہوا۔ انبیاء کرام کا یہ سلسلہ سٹینس کی بچکان بن گیا ہے۔ مغل شہر و جن میں تمام اشعار پسند آئے۔ منفرد تحریروں میں مرگ، مسلمانان اور مٹکین کافی حد پسند آئیں۔ باقی شمارہ لا جواب تھا۔"

محمد امجد ریاض، پیچہ پٹی، ضلع سیالکوٹ سے چلے آ رہے ہیں۔ "سٹینس کا چندہ سال سے خاموش قاری ہوں اور پہلی بار آپ کی مغل میں شرکت کر رہا ہوں۔ 25 جولائی کو مجھے یہ شمارہ آج کل جلدی اپنے پسندیدہ مصنف مغل صاحب کی شہریت پڑھ کر ہذا شہر شروع کیا اور پھر پڑھتے ہی چلے گئے۔ ہمیشہ کی طرح مغل صاحب ایک بار پھر سٹینس کے آخری صفحات پر چلا گئے۔ ان کی تحریریں سیدی دل میں اثر جاتی ہیں۔ اس کے بعد یوٹرن لیا اور اپنی پسندیدہ مغل میں بیٹھے۔ کرسی صدارت پر حیرانہ اشعار کو پا کر ان کا تہیہ واقعی پڑا نہ تھا۔ سبزو دشاؤں خاندان کی بات سے بالکل اتفاق کیا کہ مینی اللہ نواب خدا جانتے ہیں کیا سٹینس کی کوشش کر رہے ہیں۔ خدا کے لیے داپھی جیسے غیر عادی سلسلہ کو ختم

کر کے کوئی اور سلسلہ شروع کریں۔ سنی راگن میں فضل اور محمد بکے انجام پر بہت دکھ ہوا۔ صغیر ادیب کی آسب پڑھ کر احساس ہوا کہ واقعی آسب تو وہ ہے جو آج کل ہمارے بارے ملک کے کئی کوچوں میں اپنا انھوں سا پہلا بے ہوئے ہے۔"

ادب اور سنی احمد خان، عالم آباد کراچی سے شریک مغل ہیں۔ "سٹینس" 24 جولائی کو لاہور، مٹری شان کے ساتھ وہ اس طرح کہ مغل ایک نیا انداز لیے ہوئے تھا۔ بہت پسند آیا۔ سب سے پہلے انشائیہ سے آغاز کیا۔ انشائیہ پڑھ کر آگے بڑھے اور خطوط کی انجمن میں پہلے سب سے پہلے نسر پر حیرانہ اشعار کا نظم آیا۔ بہت بہت مبارکباد آگے بڑھے تو اپنے خط پر نظر پڑی۔ شامل اشاعت کرنے کا بہت شکر۔ پھر سب سے پہلے "سنی راگن" پڑھی۔ انجام پڑھ کر متوکل کی قسمت پر رشک ہوا کہ لاہور دونوں کے ساتھ وقت گزارنے کے باوجود ایک تیر کی جی محبت کی۔ مجبور کبھی حسین سے سینکڑوں جوانوں مل سکتا تھا مگر اس نے صرف اور صرف متوکل کی محبت کے سہارے زندگی گزار دی۔ آخر میں اس کی محبت کرنے والیوں پر۔ چھائی سازشیں بھی مروج پر ہیں جو کہ وقت و تاج کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں۔ پھر انڈی پڑھی۔ جہاں نواب رفیق کوشت کی سازشوں سے تہہ و دار ماہونا پڑ رہا ہے۔ نور جہاں جیسی خوبصورت اور وفا شعار عورت کا ساتھ میسر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رفیق بڑی سے بڑی مصیبت سے صاف بچ کر نکل جاتا ہے۔ دار و لاش کی جاگیر گئے کی ہڈی بن گئی ہے۔ جہاں جگہ جگہ متوکل انگریزوں اور ان کی انتقامی کارروائیوں سے اپنے آپ کو بچاتا پڑ رہا ہے۔ آخر میں انگریزوں کی بھائی ہوئی ایک سازش کا شکار ہو جاتا ہے۔ آگے کی قیادار انتظار رہے گا۔ "داپھی" اچھی چل رہی ہے۔ ڈاکٹر ساجد احمد کی تاریخی کہانی حضرت یوسف کی دوسری اور آخری قیادار سے بھی ایمان کو تازہ کر دیتی۔ حضرت یوسف کی مچھلی کے پیٹ میں لٹائی دعا کے متعلق پڑھ کر معلوم میں اضافہ ہوا۔ مجموعی اعتبار سے "شہریت" ذرا دیر سے ہی جو ظاہر جاوید مغل کی بہت ہی خوبصورت تین قصوں پر مشتمل تحریر تھی۔ جس میں محبت کی چاشنی بھی ہے اور شہریت پیر کی کہانیاں بھی معلومات کے ساتھ ظاہر جاوید مغل کی سزا ہے۔ یہیں جہاں کی شام شہور ہے جہاں کی راتیں عمر انگیز ہیں۔ جہاں موت پالو کی مسکرائیں کبھی کبھی تصویر ہے۔ جہاں بھل بھل رہے جہاں نے عظیم جتنے پر صدیوں سے کھڑا ہے۔ جہاں محبت کی ازالہ داستانیں دو جوش آئیں، جہاں کی فضا میں خوشبوؤں سے مٹی ہیں۔ مینی اللہ نواب کی "آج کل جو کچھ" بلاشبہ لفظوں کے جاوید گری کی تحریر تھی۔ "مرگ" بھی اچھی اور جامع تحریر تھی۔ ہر انسان کو موت کا مزہ چکنا ہے۔ مگر انسان کو یہ انداز نہیں ہوتا کہ کب مرے گا۔ وہ زندگی میں بڑے بڑے منصوبے بناتا ہے مگر جب وقت آتا تو انھیں حشر میں دل میں لیے چلا جاتا ہے۔ جہاں کو پہلے سے اپنی موت کے متعلق تھوڑا معلوم ہو گیا تھا۔ ش صغیر ادیب کی "آسب" بھی اچھی لگی۔ سب سے بڑا آسب یا عفریت موت کا خوف ہے جس کا کوئی انداز نہیں ہوتا اور بد قسمت سے وہ جانور ہو کر کی دشت گرد کے ساتھ موت کی وادی میں پہنچ جاتا ہے۔ سید اختتام کی کاوش فیصلہ بھی ایک جہتی تحریر تھی جس میں زندگی کے خوالے سے بتایا گیا ہے کہ لوگوں کے لیے کی شادی کے وقت بہت زیادہ تو واقعات باندھ دیتے ہیں کہ مجبور میں ہمارے بچے کو اتنا جھگڑا ملے گا جبکہ اس کے برخلاف جب اپنی بیٹی کا رشتہ ہوتا ہے تو ان کی سوچ کا پانیہ بدل جاتا ہے۔ ملک صندرات کی "کمرے سکے" اچھی لگی۔ شہر عباس کی "مصل منافع" بھی ٹھیک مگر جو سٹینس لکھن پور کی آئندہ قوموں کو پیش آنے والی زندگی کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ سریم کے خان کی سیاستدان بھی اچھی لگی۔ جس سے کام لے کر سامنے کے بھائی نے اس کو نوٹ نہ لے لیا۔ "نشانہ" میں پڑھ کر احساس ہوا کہ انسان میں خواہشیں ہی خواہشیں چل رہی ہوتی ہیں مگر یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ ان کی ہر خواہش پوری ہو جبکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا جیسا کہ سٹینس کے ساتھ ہوا اس کے برعکس کراس کی ماں کی جان گئی۔ سٹینس کا بھی اچھی لگی جو سلیم انودی کی تحریر تھی۔ جس میں بتایا گیا کہ محبوب کے تکلیف و راحت کی خاطر سٹینس نے اپنے اوپر تکلیف و ناتوازی برداشت کر لی کہ نہیں محبوب کے سامنے شرمندگی نہ اٹھانا پڑے۔ تمام عالم اسلام کو رمضان کی مبارکباد۔ اللہ تعالیٰ تمام عالم کے لیے رمضان اپنی برکتیں لائے۔ آمین۔"

ایضاً ریاض بخاری ایڈووکیٹ، شجاع آباد سے حاضر مغل ہیں۔ "اللہ تعالیٰ ڈیزر انکل معراج رسول کو صحت کاملہ عطا فرمائے (آمین) عرصہ دراز بعد اس مغل کی مغل دیکھ رہی ہوں۔ دراصل گھروالوں کی کچھ پابندی اور کچھ خواہش کا ذکر ہوا پابندیوں کی وجہ سے عرصہ دراز سے "سٹینس ڈائجسٹ" سے رابطہ قطع کر باب جبکہ میں ایک کامیاب ویل کی حیثیت سے مٹی زندگی میں قدم رکھ چکا ہوں تو سوچا کہ چلو رانی روش کو بھی تھوڑا بہت اپنا لیا جائے۔ سوچیں سوچ کر اس وفد "سٹینس ڈائجسٹ" لے لی لیا۔ مگر یہ کیا "دو پوتا" غائب، "دو پوتا" کی ناگہانی موت سے بہت دکھ ہوا۔ لگتا ہے ہمارے شادوں کو کھانا لانی پڑے گا۔ بہر حال یہی سلسلہ و آخریوں "انڈی" اور "داپھی" سے ہمیں کوئی دیکھیں۔ اسی لیے ان دونوں پر مجبور نہ ہوا۔ (مجھے سٹینس سے اپنا نہایت کاہن کوں سامان ہے۔ یہ سلسلہ بھی پڑھ کر کہیں) سرورق پر فقط اتنا ہی تبصرہ ہو سکا ہے کہ ڈاکٹر انکل کے پیش کی بات ہی کچھ اور ہے جبکہ موجودہ سرورق پر ہرگز ان کے برعکس ہے نکلا ہوا نہیں ہے۔ تاریخی تحریر "سنی راگن" ہمایوں بگلاری کی شاید قیادار تحریر بھی اسی لیے مجھے آسکی اگر کڑی قیادار پڑھی ہوئی تو شاید۔ "مرگ" آسب، فیصلہ، آج کل جو کچھ، سٹینس کا بھی اچھی لگی۔ یہ تحریریں داپھی میں ہیں مگر چنان چکر یوں کے موضوعات مختلف اور ذرا دھڑکے اسٹینس کے تھے کہ شاید مصنفین تحریروں کو کچھ طور پر چلانے کے جن کی وجہ سے ان تحریروں کا ٹیپو نہ بن سکا البتہ "مصل منافع" سیاست دان اور کمرے کے لا جواب تحریریں ہیں۔ جن میں مصنفین نے کمال کی کچھ جھڑو کر دیا اور نگاری کو جان کر کیا۔ سب سے بڑھ کر انداز بیان کی روانی نے خوب مٹکوں کو کیا۔ (شہر سے کچھ پسند آیا) "حضرت یوسف" کے واقعات پڑھی ڈاکٹر ساجد احمد کی کاوش لائق تحسین ہے۔ ہم نے کئی بار مختلف جگہوں رسالوں میں حضرت یوسف کے واقعات پڑھے مگر کبھی اپنی اپنی جگہ جو کہ پڑھ کر دور ہو گئی۔ "شہریت" ظاہر جاوید مغل کی شاید اچھی تحریر ہی ہو مگر چونکہ دوسری قیادار اسی لیے پڑھی ہی نہیں، ظاہر ہے کہ ادویہ تحریر پڑھنے کا فائدہ؟ (تقصان بھی کوئی نہیں) مگر نونوں

میں اکثر "مشتاق احمد پٹنی" کے اقتباس دیکھ کر حیرت ہو گیا ہے۔ اور اب آتے ہیں اپنی فیورٹ محفل کی طرف، جی ہاں! "آپ کے خلیفہ" کی طرف جہاں رنگ برنگے بندوں نے جسدِ جا کر غروبِ وادو پلایا ہوا ہے۔ خدا کی پناہ! ہم محفل سے کیا گئے بادشاہت ابرو غیروں کے ہتھے چڑھ گئے دیکھیں تو کسی طرح سیدتان کر بچھٹ رہے ہیں۔ رضوانِ خولی! آپ نے اپنے نام کے ساتھ کر بڑی لکھا ہے یا کر ملی، جلدی وضاحت کیجیے کیونکہ کیونکہ کچھ باتیں ہوتا کہ ب دعا دے جائے اور ہاں جہاں ملکر کسی کے ساتھ آپ بھی باقی میں پہنچ جاتے ہیں۔ یعنی آپ کی پیدائش بھی جہاں اصل کی طرح مکمل آج..... عبدالرؤف! آپ کا کیا پیری فارم ہے جو ہر کسی کو بلا دروغی مکمل لگانے میں مصروف ہیں، لیکن کم لکھا کر میں کوئی پھسل گیا تو آپ کی خبر نہیں جی اریاض بٹ جی! ہم نے تو ساتھ ساتھ کب بٹ مکمل منہ ہوتے ہیں جبکہ آپ تو "بٹ" ہی لکھے۔ لیکن اپنی زندگی کی خدمات کے لیے "بٹ" لکھیں تو میں کوئی چھپاؤ کر بولے۔ اسی لیے آپ کچھ پھل پھل رہے ہیں۔ اخلاقِ شاہین صاحب! لوگ آپ صنفِ کثرت کی طرح "دلی" ہیں۔ نہیں ہوش کہ ہر وقت ہی رسالوں سے چمکی رہے ہیں۔ جناب کے لیے عرض ہے کہ 100 بندوں کی بھی ایک شیرینی بھی صلاحیت حاصل نہیں کر سکتے، کچھ کھجے یا..... پرس تو ہر احمد! لکھا ہے پرس سینو جیو جگ پلانٹ میں کوئی بہت بڑا نیکیلکس فالت آ رہا ہے جو آپ جیسے پرس کی اب وجود میں آنا شروع ہو گئے ہیں۔ جعفر حسین جھوانڈ! آپ کے مطابق آپ کے پورے ہجرے میں ڈھنگ کی بات کیا تھی جو آپ دوسروں کو ڈھنگ کی بات کہنے کے لیے کہہ رہے ہیں۔ راجا قاب نواز! حیرت ہے کہ آپ اس دور میں بھی پاکستانی نہیں اور وہ بھی بڑے مس کی دیکھتے ہیں کیونکہ ہم نے تو سنا ہے کہ آج کل پاکستانی فلمیں ان پر..... غلطی ہی دیکھنا پسند کرتا ہے۔ محمد جاوید صاحب! اسرارِ صاحب کو کہانی لکھنے کا مشورہ دے کہ آپ شاید اپنی کوئی پرانی دشمنی اگل رہے ہیں۔ باقی آپ کا مشورہ ٹھیک کے لیے بالکل ٹھیک ہے کہ جھلکا استعمال کریں مگر آپ کو بھی تو کچھ استعمال کرنا چاہیے مثلاً گلاس، بکری، بکرے سب کا دماغ کھانا، ظاہر ہے جو چیز جس کے پاس نہ ہو اسے استعمال ضرور کرے۔ جیہذا! احمد تھوہر لکھنے پر مبارکباد قبول کرو۔ دلشیں اور تم نے تو اس محفل میں سب کو پچھا کر کر دیا ہے۔ اب تم لوگ بے فکر ہو جاؤ جس آگئی ہوں ناں! میں سب کچھ سنیں لوں گی۔ بس فلاح کو لوگوں کی سپورٹ کی ضرورت ہے۔" (گفتن مجاز کو یوں تو جتنا جتنا ہے کہتے ہیں)

✽ عبدالسلام صدیقی بن سعید اللہ تائب، عثمان سے کہتے ہیں۔ "انسانوں پر بھی آزمائشیں کرنا چاہیے کیونکہ انسان کمزور ہوتا ہے اور اس کا آسرا بھی کمزور۔" اس لیے میں جب بھی تہرہ کرتا ہوں صاف اور کھری بات کرتا ہوں۔ میں نے بھی تہرہ شائع نہ ہونے کا شکوہ نہیں کیا ہے۔ میں لکھتا رہوں گا اور آپ رومی کے حوالے کرتے رہیں۔ اب وہ بچتا ہے کہ "کتنا بڑا شہر رومی کی نوکری کا ہے۔ محفل صاحب کی "شہریت" سمجھنے کا خاص حق نہیں ملے۔ جیسے کسی جس طرح منظر کشی کی اور میں سیر کر رہی تھی اس کے لیے ان کا شکر کرتا ہوں لیکن میرا سوال ابھی تک باقی ہے جو میں نے پہلی قسط میں کیا تھا۔ جب ہم کسی لڑکی کو پسند کرتے ہیں تو وہ محبت اور انوکھی ہمارے کہان، اپنی کو پسند کرے تو وہ آوازی کہلاتی ہے۔ اس لیے آج تک میں محبت کا منہ نہیں سمجھ سکا۔ اسروق رمضان کے چاند بھٹن آزادی کے رنگ اور حسن کی دھانیوں سے مزین تھا نورانی پیاری محفل میں پہنچے۔ جیہذا! رضا صاحب سب سے پہلے تو آپ کو صدارت کی مبارک..... آپ کی بات پر ذکر خوشی ہوئی کہ آپ پناہ (سرا) کو اپنا گھر سمجھتی ہیں اور یہ گھر بنانے والی عورت کی نشانی ہے لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ ابھی تک آپ کے نام کے ساتھ "سائنس اریبا" کیوں لکھا جاتا ہے؟ دلشیں بلوچ صاحبہ..... اتنی محنت، محبت اور جاہت سے بھی یونیورسٹی ماری جالی ہیں۔ ریاض بٹ صاحب..... انسان بھی بے معرف نہیں ہوا، مشین بنانے سے جھکر تک کہنے انسانوں کو ضرورت ہوئی ہے؟ ملک محمد انور صاحب..... جب یادیں دلوں میں ہوتی ہیں تو شکوہ کیا..... پرس تو ہر احمد صاحب..... اپریس ہو کر صرف 2000 تنہی پر اپنی خوشی..... جعفر حسین جھوانڈ صاحب! ہمیں اپنے کروت و دینے چاہئیں اپنے اباؤ اجداد کو کالی دیویں لگتا ہے آپ نے تاریخ نہیں پڑھی آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ان کا تصحیح کی مٹی سے اٹھا ہے راجا قاب نواز قاب صاحب..... اپنی گاڑی کی کتنی باریک دہانے کے لیے آپ کو مناسبت الفاظ نہ ملے، محمد جاوید صاحب.....! آخر آپ کو کون سا شکوہ ہے جو آخری بار غلط لکھ دیا عبدالرؤف صاحب، اگر آپ بارہ سال سے سسٹن سے قاری ہیں تو جتنا بارہ سال پہلے کسی صدارت کس کے ہاتھ آئی تھی۔ اب کچھ.....! اللہ ہے..... جون ایلیا صاحب نے کتنا کڑواؤچ بیان کیا، ہر حال کھانا چاہیے نہ زیادہ خطرناک ہے۔ سنی راہگاہ! غلطی محفل کی موت پر مجھے ذرا انوس میں ہوا کیونکہ عیاش لوگ اس دھڑی پر بوجھ ہوتے ہیں۔ پائیز کسی ایسے خلیفہ کا بھی تذکرہ کریں جو ہمارے لیے مشکل راہ ہو..... کھرے سکے.....! بے شک ارشد کھانا سکھ اور راشد کھانا سکھ لیکن وہ چھوڑ اسابہ دق ہوئی تھی۔ اس کو اتنی بات بھی نہ آئی کہ سدا کی چاروں جزیں زین، مزدہ، زمین، زبان (چودھراہٹ) کوئی کیسے چھوڑ سکتا ہے۔ اصل منافع یہ ایک بہترین کہانی تھی واقعی انہیں بھی عیب و غریب مخلوق (انسان) کو دیکھنے کا شوق تھا۔ آپ کراچی میں تو یہ آپ سب ٹھوک پر چوہن کے حساب سے ہیں۔ مرگ نقدیر کے سامنے تو ہر انسان بے بس ہے۔ آٹھ چوٹی کا اینڈ کافی خطرناک تھا لیکن رائٹر نے ایسا بکھینچا ہونے دیا لیکن کافی محبت بہت نازک ہوتی ہے۔ انڈی پلیز نواب کو پاکستان لائیں تاکہ کہانی کا مزہ دوبالا ہو کیونکہ لاڑ سے زیادہ نوابی میں مزہ۔ واپس اب پتا چلا کہاں سے واپس ہونا تھی یعنی بیٹا باپ کی عمر میں پہنچ گیا تھا اور باپ بیٹے کی عمر میں..... اور اب کھڑی اپنی چٹا شروع ہو گئی۔"

✽ جوہری محمد سرخراز فرام جاتی "ہو! گستاخ سسٹن دھانیوں اور جولانوں کا ایک اور نیا باب رقم کر گیا۔ ذکر انکل ایسے ایسے حسین نقوش تخلیق کرنے لگے ہیں کہ نظر پڑتے ہی آنکھیں ہیں کہ بٹے کا نام نہیں لیتیں۔ آگے بڑھے تو جون ایلیا کی گھر انگیز باتیں "بے معنی" کے

عنوان سے بڑھنے کو ملیں، ایلیا صاحب تو اپنا فرض ادا کر رہے ہیں، دیکھتے ہیں نتیجے میں کتنے دھکے ہیں۔ گزشتہ دنوں مارچ 2006ء کا سسٹن ہاتھ لگا۔ محفل خطوطاں میں ابتدا ہوئی ہے سیدہ عین فاطمہ سے اس کے لیے بعد دیگرے کا جمل کرکٹی، بلک کیٹ، نوشی، چا بلوچ، عریشہ بٹ، حفظ غزل، آغا فضل، اریضہ بخاری، درخانہ کول، قرۃ العین، مروج خان، ہزار بخاری، سحرہ بی، حاجی، ادیبہ رحمان اور بشری افضل کے تہرہ جات جبکہ مردوں کے خطوط نہ ہونے کے برابر۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے آخر کہاں کم ہو گئی ہیں سب؟ اب بات اس مادی کی محفل خطوطاں کی ہو جائے۔ جیہذا! رضا صاحب! اول آنے پر جیہذا! مبارکباد۔ پرس تو ہر احمد کچھ تو لاج رکھ لو لفظ پرس کی عبدالرؤف عدم بدراہی، خدا خدا خدا اور خدا خدا خدا کھتے کھتے ہیں۔ خصوصاً صنفِ نازک کے حوالے سے بدراہی نرم گوشتہ ہیں اور اس سب کے پیچھے نہ جانے کونسا فلسفہ کا زفرہ ہے۔ رضوان خولی آپ بلیک لسٹ کی کالی سانی اور رومی کی نوکری کی بات کر رہے ہیں، تو مجھے تو اس ماہر جیو جگ پلانٹ کے بازو جگہ ڈاک کی پھر تاں لے ڈوئیں۔ دلشیں بلوچ صاحب! مسئلہ دوام ہے مجھے بھی جاسوسی ڈائجسٹ میں اسی قسم کی صورتحال کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ لہذا آپ کا پی ٹیوٹ کر جانا سمجھ میں آتا ہے۔ ریاض بٹ صاحب! آپ تو ہمارے ہاں صفت مشورہ دینا نہیں سن گیا ہے۔ سیاستدان، صحافی، دانشور، جعز و کچھ سب مشورے دے رہے ہیں مگر جب بات عمل کی آتی ہے تو سب خاموش ہو جاتے ہیں، عبدالرؤف صاحب یہ کم عمری کا ڈھنگ صنفِ نازک کو بھی چٹا ہے۔ آپ کیوں اس ضمن جگر میں پڑ گئے؟ "واپس" میں جی الدین نواب صاحب بالکل سنے اور نہایت دلچسپ موضوع پر لکھ رہے ہیں۔ عیسین غازی کی عمر کے معاملے میں جس طرح انکی تنقید میں پڑی ہے اس نے نہایت دلچسپ صورتحال پیدا کر دی ہے۔ "انڈی" کے اختتام سے لگ رہا ہے کہ یہ تحریر کوئی نیا موڈ نہیں لے رہی ہے۔ میرے خیال میں دیباغہ میں بہت قرائے ہو چکے۔ اب رفیق کو واپس پاکستان آ جانا چاہیے۔ اب کچھ بات ہو جائے نرم و نازک جہزی۔ خصوصاً سنی کا شوق و پھل کر دار پوری تحریر کی جان تھا اور سنی کے اسٹینڈ کی وجہ سے ہی پٹی اینڈ ممکن ہوا۔ "آٹھ چوٹی" میں نواب صاحب نے نہایت حساس معاشرتی مسئلہ کو موضوع بنایا۔ سنی حملہ آوروں کے لیے اچھے دینے تلاش کرنا تو جتنے شرا لے کر گئے۔ "مرگ" میں جاسن کو جس طرح مرنے کے بعد زندگی ملی اور اس کی موت کو کسی کی موت کے ساتھ شرط کر دیا گیا یہ سب عقل سے ماور تھا لہذا یہ تحریر کچھ خاص رنگ نہ جاسی۔ سنی صغیر ادیب بہت ہی دلگذا انداز میں لکھتے ہیں، ان کی تحریریں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ "آسیب" میں بھی انہوں نے اپنے اسی مخصوص انداز میں لکھا اور اختتام پر جو پیغام دیا وہ درحقیقت تک کو کھینچ کر گیا۔ فیصلہ کو رائٹر نے نہایت سلیکھ اور پرمراغ انداز میں لکھا۔ اختتام پر اس نے بالکل درست فیصلہ کیا کہ شادی نہ کرنا ہی اس کے لیے بہتر ہے۔ "اصل منافع" میں رائٹر نے سرمایہ دارانہ سوچ کو دکھایا۔ سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد ہی ذاتی فلاح اور مفاد پر ہوتی ہے۔ "جو فکر" مختصر مگر دل پر اثر کرنے والی تحریر تھی۔ جیہذا! سنی انسان سے حلال اور حرام کا فرق نہیں کر دیتی ہیں۔ "سیاستدان" میں محبت کی نئی قسم پر ہنسنے کوئی۔ واقعی جب اقتدار ہوں تو انسان سب سے پہلے انہوں کو ہی نوازتا ہے۔ "کالی" میں بھی سب سے پہلے نواب کے ساتھ کیا مگر نتیجہ اس کی تو قہات کے بالکل برعکس نکلا۔ اس کے ساتھ ہی اجازت دیں اس امید کے ساتھ ذکر ضرور شامل اشاعت ہو گا۔

✽ ڈاکٹر سلیم بھٹکر سے کہتے ہیں۔ "گستاخ کا شمار انہوں میں آتا ہے اور جب ناسل پر گڑھ لگتی تو جانے کیوں یہ سوچ کدول دکھ سے بھر گیا کہ اس بار یوم آزادی ہم تک نہیں مراحل سے گزرتے ہوئے منارہے ہیں۔ اس بار سیلاب نے انکی تباہی پھیلانی ہے کہ ایک مدت درکار ہو گئی نہیں پھر سے اپنے بیرون پر کھڑا ہونے کے لیے۔ اس بار میں نے جتنا بھی سسٹن پڑھا ہے کیوں دلی سے پڑھا ہے اس لیے آپ سے سعادت کہ تہرہ نہیں کر سکوں گا۔ فقط اپنی یاد..... دلانے حاضر محفل ہو گیا ہوں۔ ہماری حالت پر کوئی پرمراغ حال نہیں ہے۔ ایسے میں حبیب جالب کی غزل ضرور لکھنا چاہوں گا۔

ند جاں دے دو نہ دل دے دو بس ایک مل دے دو
زیاں جو کر چکے ہو قوم کا، تم اس کا مل دے دو
بھلا ہو جائے گا طوفان زدوں کا اس عنایت سے
جہاں سے پانی آتا ہے وہاں ہونے کی، مل دے دو
تمہاری غامضی سے یہ کتنی ڈوب جائے گی
خدارا چھوڑ دو پچھلا سکارہ مستقل دے دو
بہت تزیل تو پھیر کر لیں ہماری زندگی کی
اجازت موت کی اب ہم کو بن کے جھل دے دو
غلوں دل سے اسے لوگو سٹو پیٹام جالب کا
مری براد بھڑ کھیتوں کو آپ دھک دے دو"

اب ان تارخین کے نام جو محفل میں شرکت نہ کر سکے۔
ڈاکٹر عدنان، رحیم یار خان، ملک محمد انور، واہ گینٹ، محرم، لاہور۔ شیریں احتیاز پر ایچ، ضلع منڈی بہاؤ الدین، ملک خالد، نامعلوم مقام

بار برسہ رخست ہوا تو وہ سلطنت عثمانیہ کو اپنا ایسا خطرناک جانشین دے گیا جس سے پورا یورپ مدتوں تھر تھر کانپتا رہا۔ درگوت ایک ایسا بے باک کردار جس نے اپنوں کو بھی حیرت میں ڈال دیا تھا۔ اس ایک شخص میں عروج اور خیرالدین یک جا ہو گئے تھے۔ وہ پہلوان تھا پھر بحری قزاق بن گیا اور بحری قزاقی کے بعد اسلام کی برہنہ شمشیر کا روپ اختیار کیا۔ ترک مؤرخ حاجی خلیفہ نے اس کو بیسی لقب دیا تھا اور اس نے اپنے کارناموں سے ثابت کر دیا کہ وہ اس لقب کا حق دار تھا۔ اس کو غیر یقینی کارنامے انجام دینے کا شوق تھا اور اس نے کئی بار وہ کرد کیا جو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ موت سے آنکھیں لڑا سکتا تھا۔ ناممکن کو ممکن کر دکھانے والا محیر العقول کردار، بہت سی خصوصیات اور اوصاف کا حامل یہ انسان غیروں اور اپنوں کے لیے یکساں رشک و حسد کا باعث اور سبب بنا رہا۔ وہ بلاشبہ آشنا و نا آشنا کا محسوس تھا۔ اپنی تاریخ کا یادگار کردار جسے طافی نسیاں کی نذر کر دیا گیا۔

مانی کا آئینہ با اختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر و واقعات



خیر الدین بار بردسہ کا سوگ کچھ عرصے تک منایا گیا۔ سلطان سلیمان اس ناقابلِ حلافی موت کے اثرات کا اعزاز بھی لگا رہا تھا۔

چارلس الجرائز کی شکست خوردگی کے بعد جنگ و جدل سے کنارہ کشی اختیار کر چکا تھا۔ اس نے بھی بار بردسہ کی موت کی خبر سنی تو ڈوریا سے پوچھا۔ ”اس موت کا ترکوں کی بحر یہ کیا اثر پڑے گا؟“

ڈوریا نے جواب دیا۔ ”ترکوں کی خوش قسمتی اور ہماری بد قسمتی کہ انہیں درگوت حاصل ہے اور جب تک وہ موجود ہے ترک بحریہ طاقت ور رہے گی۔“

چارلس نے ذہن پر زور دیتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ وہی درگوت ہے جسے ہم نے تین ہزار سونے کے ٹکے لے کر چھوڑ دیا تھا؟“

ڈوریا نے کہا۔ ”افسوس کہ میری مرضی نہیں تھی کہ اسے رہا کیا جائے۔“

چارلس نے صالح رئیس کے حوالے سے بات کی۔ ”یہ ناموس عرب ملاج ہمارے کام آسکتا ہے۔“

ڈوریا نے جواب دیا۔ ”مگر ازم میں کسی عرب یا ترک پر بھروسہ نہیں کر سکتا۔“

ڈوریا نے اس کے بعد صالح رئیس کو چارلس کے سامنے طلب کر لیا اور اسے ذیل کر کے پوچھا۔ ”بادشاہ سلامت دریافت فرما رہے ہیں کہ بار بردسہ کی موت کے بعد ہم ترک بحریہ کے خلاف کوئی موثر کارروائی کر سکتے ہیں؟“

صالح رئیس نے جواب دیا۔ ”کیوں نہیں کر سکتے لیکن میرے خیال میں ہمیں پوری توجہ تیونس پر دینا چاہیے کیونکہ میں درگوت کی سوچ سے واقف ہوں۔ وہ امیر البحر بننے کے بعد پہلا حملہ تیونس پر کرے گا۔ اس طرح تیونس سے الجرائز تک قبضہ کر کے آپ کو افریقا کے شمال مغربی ساحلوں سے بے دخل کر دے گا۔“

چارلس نے ڈوریا سے پوچھا۔ ”تیرا کیا خیال ہے، کیا صالح رئیس کو تیونس معلوم کہ تیونس کے قریب ہی طرابلس ہے اور وہ 1510ء سے ہمارے قبضے میں ہے؟ تقریباً تیرہ چودہ سال قبل طرابلس کو مالٹا کے سبھی مجاہدین کے قبضے میں دے دیا گیا تھا۔ جب تک طرابلس ہمارے قبضے میں ہے، بحیرہ روم میں ہماری نقل و حرکت برقدار نہیں لگتی جاسکتی۔“

صالح رئیس نے کہا۔ ”درگوت بعض معاملات میں خیر الدین سے برتر ہے۔ وہ تیونس کے بعد طرابلس کو بھی لینے کی کوشش کرے گا۔“

چارلس شراب کے نشے میں مجھوم رہا تھا۔ ”یہ عرب ملاج کیا جگہ ہے۔ اس نے تو سونے کے طرابلس کو بیدار کر دیا۔“

ڈوریا بھی طرابلس کے ذکر سے چونک گیا تھا۔ حیرت سے صالح رئیس سے پوچھا۔ ”دوست! بار بردسہ نے تو بھی طرابلس پر توجہ بھی نہیں دی مگر تم کہتے ہو کہ درگوت طرابلس پر بھی توجہ دے گا۔ کیا تمہیں یہاں درگوت نے بھیجا ہے؟“

صالح رئیس دونوں کے سوالات سے تنگ آیا ہوا تھا۔ جھنجھلا کر جواب دیا۔ ”مجھے یہاں کسی نے بھی نہیں بھیجا بلکہ میری بد قسمتی یہاں لے آئی ہے۔“

چارلس نے ڈوریا کو حکم دیا۔ ”تو اس عرب ملاج کو اپنے ساتھ رکھ۔ فی الحال اس کے مشوروں پر عمل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

اب صالح رئیس کی حیثیت ایک قیدی جیسی رہ گئی تھی۔ اسے بار بردسہ کی موت کا غم تھا اور وہ ان سامعوں کو برا بھلا

کہتا رہتا تھا جن میں اسے عرب بحریہ کا خیال آیا تھا۔

ڈوریا کا خیال تھا کہ چارلس بحری تیاریاں کرے گا لیکن الجرائز کی ناکامی کے بعد چارلس کو جتنی بدعنائیں سننے کو ملی تھیں اور اپنی ناکامی کا جتنا شدید اثر اس نے لیا تھا اس کے بعد وہ سمندر میں اترتے ہوئے وحشت محسوس کرتا تھا۔

یہاں تک کہ وہ وحشت اور قسطنطنیہ میں درگوت نے سلطان کو یہ مشورہ دیا تھا کہ اب وقت آگیا ہے کہ تیونس سے عیسائیوں کو نکال باہر کیا جائے اور وہاں ایک مضبوط حکومت قائم کی جائے۔

تیونس میں شاہ حمید کی حکومت بھی ختم ہو چکی تھی اور قیروانی کونسل نے اقتدار سنبھال لیا تھا۔ شاید ان کے سامنے بیٹی بال کا عہد تھا جب یہاں سوبدوں کی کونسل حکومت کیا کرتی تھی اور وہ یہ بھول گئے تھے کہ ان کے اور بیٹی بال کے درمیان اتحاد ہوسالہ زبانی فاصلہ حاصل تھا۔ ان میں وہ ابھی اتحاد بھی نہ تھا جبکہ ماضی میں جذبہ حب الوطنی انتہائی شدید ہوا کرتا تھا۔

درگوت نے ان تمام حالات کا جائزہ لیا اور کسی کو بتائے بغیر تیونس روانہ ہو گیا۔

جب درگوت کے جہاز طلق الوید میں داخل ہوئے تو قلعہ دار کو تشویش ہوئی لیکن محاصرہ چاہک ہوا تھا اور قلعے دار کو مدافعت کا موقع نہیں دیا گیا تھا۔ تیونس کی قیروانی حکمران کونسل نے قلعہ دار شہر پناہ کی فصیلوں کے دروازے بند کر دیے اور مقابلے پر کمر بستہ ہو گئے۔

درگوت بار بار پیغام بھیجتا رہا کہ شہر اس کے حوالے کر دیا جائے اور قلعے کا پھاٹک کھول دیا جائے۔

کونسل آپس میں مشورہ کرتی رہی اور طے پایا کہ درگوت کا مقابلہ کیا جائے۔

درگوت نے کونسل کو خبردار کیا۔ ”میں خیر الدین بار بردسہ نہیں ہوں جو درگوت سے کام لیتا تھا۔ اگر میرے کہنے سے بھاٹک کھل گیا تو شہر کے لوگ امن و امان کے منتظر ہوں گے لیکن اگر میں نے گولہ باری سے دیواریں گرا دیں یا پھاٹک توڑ کر اندر داخل ہوا تو ایک بھی شہری رعایت کا منتظر نہیں ہوگا۔“

حکمران کونسل نے پھاٹک کھولنے سے انکار کر دیا اور درگوت نے محاصرہ سخت کر دیا۔ گولہ باری میں شدت اختیار کی گئی اور تیونس کا تعلق ہیر دنی دینا سے منقطع کر دیا گیا۔

درگوت نے تین دن گولہ باری جاری رکھی جس سے فصیل میں ٹوٹ پھوٹ شروع ہو گئی۔

درگوت کے غصے میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ چوتھے دن وہ محاصرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ فصیل کے اوپر سے تیر اندازی ہو رہی تھی لیکن وہ فصیل سے اتنی دور تھا کہ تیر اس کے پاس پہنچنے پہنچنے پر توڑ دیتے تھے۔ وہ ایک درخت کے سائے میں کھڑا ہو کر فصیل پر قہقہات دینے کی طرف دیکھ رہا تھا کہ کسی نے درگوت کا نشانہ لیا اور تیر اس کے سامنے آ کر گرا۔

کسی بھی نتیجے پر پہنچنے والا حاضر دماغ درگوت سوچنے لگا کہ اس پر صرف ایک تیر سے حملہ کیوں ہوا، تیروں کی بوچھاڑ کیوں نہ کی۔

درگوت کے ایک سپاہی نے تیر اٹھا کر درگوت کو دیا۔ تیر کے سوار سے ایک پرچہ بھی تھا۔

سپاہی نے کاغذ کا پرچہ تیر سے الگ کر لیا تھا مگر پھر اسے بھی درگوت کے حوالے کیا اور درگوت نے بے چینی سے کھول کر پڑھا۔ یہ حکمران کونسل کے کسی گنم رکن کا مختصر خط تھا۔ اس نے لکھا تھا۔ ”ہماری کونسل کے جملہ ارکان میرے سوا مقابلے اور محاربت پر متفق ہیں لیکن میں اسے فضول سمجھتا ہوں۔ آپ آج رات اندھیرے میں صدر بھاٹک پر آجائیں۔ آپ کو پھاٹک کھلا ہوا ملے گا لیکن آپ کو شہریوں کو پناہ دینی ہوگی کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمانوں کو نقصان پہنچے۔“

دستخط کی جگہ لکھا تھا ایک منحرف رکن کونسل۔ اے حکمرانی سلطنت تیونس!

درگوت کے معاملات میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ بدستور فصیل کا جائزہ لیتا رہا۔

اس نے پرے کی عمارت کا کسی سے ذکر بھی نہیں کیا کیونکہ وہ دشمن کی سی بات پر یقین کرنے کو تیار نہ تھا۔

شام ہوئی تو اس نے اپنے خاص خاص ساتھیوں کو کنبھا کیا اور انہیں بتایا۔ ”آج رات ہم صدر دروازہ توڑ کر اندر داخل ہونے کی کوشش کریں گے اس لیے ہمارے سپاہیوں کو اندھیرا ہوئے ہی فصیل کے نیچے پہنچ جانا چاہیے۔ فصیلوں پر متعین سپاہی کسی قدر خیر سے مشتعلین جلاتے ہیں اور ہمیں اپنے سپاہیوں کو شعلوں کے روشن ہونے سے پہلے ہی فصیلوں کے نیچے پہنچا دینا ہے تاکہ مشعلوں کی روشنی میں وہ دور دور کا جائزہ لیتے رہیں اور ہمارے سپاہی فصیلوں کے ساتھ ساتھ پھاٹک تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائیں۔“

”اس کے بعد ہم پھاٹک کو گرا دینے کی کوشش کریں گے۔“

شام ہوئی پھر شام پر شب کی سپاہی غالب آگئی اور ہر شے دھندلی پڑنے پڑنے تاریکی میں گم ہو گئی۔ درگوت نے نہایت احتیاط سے اپنے سپاہیوں کو فصیلوں کے نیچے پہنچا دیا۔ اس روز فصیلوں پر مشتعلین بھی غائب تھیں اس لیے درگوت کا مسئلہ زیادہ آسان ہو گیا۔ درگوت کی فوج پھاٹک کے سامنے پہنچ گئی۔ نصف شب قریب تھی۔

پھاٹک کو دھکا دے کر کھولنے کے لیے درگوت سب سے آگے تھا۔ اس کے کئی ساتھیوں نے درگوت کی دلیری پر اعتراف کیا۔ ”جناب! آپ نے اپنے عظیم ساتھی خیر الدین سے احتیاط کا سبق نہیں لیا۔ آپ کو اپنے دشمن پر کسی صورت بھی بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔ آگے بڑھ کر پھاٹک پر حملہ آور ہونے کا کام دوسروں کے سپرد کریں اور خود صرف نگرانی یا حکم دیتے رہیں۔“

درگوت نے جواب دیا۔ ”میں نے بار بردسہ برادران کو اپنے لیے مثالی کردار سمجھا ہے۔ میں عروج اور خیر الدین دونوں کی تقلید کرتا ہوں۔“

نصف شب کے قریب پھاٹک کا ایک ذیلی دروازہ سا کھلا اور کسی نے پوچھا۔ ”درگوت کہاں ہے؟“

درگوت نے آہستہ سے جواب دیا۔ ”میں سب سے آگے، تیرے قریب موجود ہوں، پھاٹک کھول دے۔“

دوسری طرف سے کسی نے جواب میں کہا۔ ”پھاٹک تو کھل ہی جائے گا مگر پہلے میں تیری زبان سے امن و امان کے الفاظ سنا چاہتا ہوں۔ مجھے اور میرے شہریوں کو تحفظ ملنا چاہیے۔“

درگوت نے وعدہ کیا۔ "ہمارا وعدہ ہے کہ شہریوں کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچے گا۔"

پچانک مکمل گلیا اور رات کے اندھیرے میں فوج قلعے میں داخل ہوئی۔ پچانک کے اوپر ہلائی پرچم لہرایا گیا اور درگوت نے قلعے کی فوج کو ہتھیار ڈالنے کا حکم دیا۔

صبح ہوئی اور شہری بیدار ہوئے۔ زندگی کی پہلی پہل کا آغاز ہوا۔ دکانیں کھلنے لگیں اور کاروبار زندگی میں جوش و خروش پیدا ہوا تو تیونس کے لوگوں کو تیونس کی جہتی اور ہر چور اپنے پر ترکوں کا پیرا نظر آیا۔ خاص خاص عمارتوں پر سرخ سفید ہلائی پرچم لہرا رہے تھے۔ حکمران کونسل کے ارکان گرفتار کیے جاتے تھے۔

کسی بھی فوجی نے کسی شہری کو نقصان نہیں پہنچایا لیکن تیونس کے عربوں نے ترکوں کو قحطاری کی نظر سے دیکھا۔

ان ترکوں نے شہریوں نے پوچھا۔ "تمہیں یہاں کون لایا ہے؟"

ترکوں کی طرف سے جواب ملا۔ "اب تیونس سلطنت عثمانیہ کا ایک حصہ ہے اور خلافت عثمانیہ تیونس کو بھی ملت اسلامیہ کا ایک جزو سمجھی ہے۔"

دوپہر سے قبل قلعے کے اس حصے میں جہاں پیشہ کے ارکان کونسل حکومت کیا کرتے تھے، ارکان کے صدر کی جگہ درگوت براجمان تھا۔ اس کے سامنے حکمران کونسل کے ارکان بٹھا دیے گئے۔

وہ شخص جو ارکان کونسل سے الگ ہو گیا تھا، درگوت کی ذاتی طرف بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو بتایا۔ "دوستو! اس پرست حیران ہو کہ صبح غنیمت سے بیدار ہونے کے بعد تم نے اپنے چاروں طرف ترکوں کو کیوں موجود پایا۔ میں تم سب کو بوجھ سکتا ہوں کہ اللہ نے جسے توفیق اور برتری عطا کی ہے کیا تمہارے ہاتھ تو ان ہاتھ ترکوں سے اسے چھین سکتے ہیں؟ خدا کے ان احکام کے مصداق وہ جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلت، یاد رکھو جسے اللہ نے عزت دی ہے، تم اس عزت کو چھیننا چاہو گے تو ذلیل ہو جاؤ گے۔ اسی طرح جو خدا کی طرف سے ذلیل کیا جا رہا ہو اور تم اسے عزت دینے کی کوشش کرو گے تب بھی ذلیل کر دیے جاؤ گے اور آج کل اللہ نے ترکوں کو عزت دے رکھی ہے اس لیے ان کی عزت کرو ورنہ ذلیل و خوار ہو جاؤ گے۔ بس مجھے اس سے زیادہ تم سے کچھ نہیں کہنا۔"

یہ ارکان قیروان سے تعلق رکھتے تھے اور انہیں اپنے عرب نژاد ہونے پر فخر تھا۔ انہوں نے درگوت کی باتیں سنیں

مگر اس سے اتفاق نہیں کیا۔ ایک رکن نے درگوت سے پوچھا۔ "تم یہ کس طرح کہہ سکتے ہو کہ آج ترکوں کو عزت خدا نے دی ہے۔ کیا تمہارے پاس کوئی فرشتہ آیا تھا جو تمہیں یہ بشارت دے گیا؟"

درگوت نے جواب دیا۔ "بے وقوف انسان! اللہ کیا چاہتا ہے اور کیا نہیں چاہتا، یہ جاننے اور سمجھنے کے لیے عقل تسلیم چاہیے۔ فرشتوں کی آمد کا سلسلہ بند ہوا۔ آج پوری مغربی دنیا سلطنت عثمانیہ کے سامنے بے دست و پا ہے۔ کیا یہ بات سمجھنے کے لیے کافی نہیں کہ آج اللہ ترکوں پر مہربان ہے اور یہ عزت اللہ کی عطا کردہ ہے۔"

درگوت نے قیروانی بزرگوں کو مشورہ دیا کہ وہ اس سے تعاون کریں، اخوت اسلامی پیدا کریں اور ترکوں کو بھی اپنا بھائی سمجھیں۔

وہ کئی دن تک شہری قلعہ و قست میں مشغول رہا۔ اس کے بعد اپنے پیچھے حصار رکھیں کوفوں سے الگ کیا اور لوگوں کو پہلی بار بتایا۔ "لوگو! یہ میرا بیٹھیا ہے۔ میں نے آج تک کسی کو نہیں بتایا تھا کہ یہ نوجوان رشتے میں میرا کیا لگتا ہے مگر آج بتا کر رہا ہے کہ یہ میرے بھائی کا بیٹا حصار ہے۔ اس کے نام کا لاحقہ رکھیں یہ بتانا ہے کہ اسے..... میں اس کا خطاب ترکی کر رہا ہوں۔ عطا کیا ہے جو اس کی خدا دادی اہلیت کی وجہ سے عطا ہوا ہے۔"

"میں تیونس میں مستقل نہیں رہ سکتا کیونکہ میرے ذمے دوسرے بہت سے کام ہیں اس لیے یہ تیونس میں میری نیابت کرے گا۔"

ترک فوج کو درگوت کے اس فیصلے پر کوئی اعتراض نہ تھا، اس لیے انہوں نے کوئی اختلاف نہ کیا اور حصار رکھیں کو بطور حاکم شہر تسلیم کر لیا لیکن قیروانی بزرگ، درگوت کے اس فیصلے سے متفق نہیں تھے۔ انہیں اعتراض تھا کہ یہ نوجوان قیروانی بزرگوں پر حکم نہیں چلا سکتا۔ انہوں نے اپنے اس اختلاف کا کسی سے ذکر نہیں کیا مگر انہیں کے نمائندوں سے گفت و شنید شروع کر دی۔

درگوت اپنے جبری جبر سے کے ساتھ اٹلی چلا گیا جبکہ حصار رکھیں نے تیونس کا حکم و قسٹ سنبھال لیا۔

اسی دوران میں چارلس نے اقوام یورپ کی طرف سے سلطان سلیمان سے ایک معاہدہ کر لیا۔ اس معاہدے کی رو سے جنگ یا کسی کے علاقے پر جبری تسلط یا حملے کو ناجائز قرار دیا گیا۔ گویا اب سلطان سلیمان یا اس کا کوئی جرنیل کسی بھی یورپی ملک یا شہر پر حملہ نہیں کر سکتا تھا۔ اسی طرح چارلس،

سلطان کے کسی علاقے پر یا کسی مسلم ملک پر حملہ آور نہیں ہو سکتا تھا۔ شاید یہی اطمینان ڈوریا کو تیونس سے اٹلی لے گیا تھا کہ اس کے پیچھے تیونس پر کسی کے حملے کا خطرہ باقی نہیں رہ گیا تھا۔ تیونس کے مقامی اور غیر مقامی لوگ کسی بھی طرح ترکوں کی بالادستی ماننے کو تیار نہ تھے۔

☆☆☆

چارلس کو جب یہ خبر ملی کہ تیونس اس کے ہاتھ سے نکل گیا تو اسے بہت قلق ہوا مگر وہ اندر سے معاذ مذکورہ تیونس کو مستحکم دنیا کا حصہ نہ خود کچھ سکتا تھا اور نہ کسی اور کو سمجھا سکتا تھا۔ یورپ اور اس خبر سے بے چین تھا لیکن وہ سب کچھ نہ کر سکتے کی حیثیت میں تھے۔ چارلس کو مختلف ملکوں سے اطلاعات ملیں کہ ترکوں کے خلاف ایک اتحاد قائم ہو رہا ہے اور اس کی سربراہی کا مسئلہ درپیش ہے۔ چارلس سے درخواست کی گئی کہ وہ اس متحدہ فوج کی کمان سنبھالے۔

اسی دوران میں طیلط کا نواب ڈان گارشا اچانک سیاسی اقتدار پر نمودار ہوا اور چارلس سے درخواست کی گئی کہ یورپ کی متحدہ فوج کی کمان ڈان گارشا کے سپرد کی جائے۔ چارلس کو اس پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ جب اس مقصد کے لیے ڈان گارشا نے چارلس سے ملاقات کی تو اس وقت ڈوریا بھی بولا گیا۔ ڈوریا نے صاحب رکھیں کو اسے سمجھانے لیا کیونکہ اس کے اپنے خیال میں صاحب رکھیں کو آگے بڑھانے کا یہ بہترین موقع تھا۔

یہ چند بڑوں کی مجلس مشاورت تھی اور صدر نشین خود چارلس تھا۔ اس نے ڈوریا کے ساتھ صاحب رکھیں کو کچھ کرکچھ ناگواری سے منہ بنایا، پوچھا۔ "اس محفل خاص..... میں اس عرب ملاح کو لانے کی کیا ضرورت تھی؟"

ڈوریا نے جواب دیا۔ "جناب والا! میں کس طرح آپ کو یقین دلاؤں کہ ہمیں قدرت نے تیونس میں مداخلت کا ایک بہترین موقع اس طرح دیا ہے کہ اندر سے معاہدہ اس عیسائی فوج میں ہماری سرکردگی میں تیونس نہیں جاسکتی مگر صاحب رکھیں کے ذریعے ہم یہ کام لے سکتے ہیں۔"

چارلس کو جبری امور سے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی تھی لیکن تیونس کے نکل جانے کا اسے قلق ضرور تھا۔ اس نے ڈان گارشا سے پوچھا۔ "نیکو تو نے اپنی حیثیت کا اندازہ لگا لیا ہے اور تجھ کو تیونس میں ہونے والی جنگ کے سیاہ و سفید سے عہدہ برآ ہونے کا کچھ اندازہ ہے؟"

ڈان گارشا نے چارلس کو سمجھایا۔ "میں ایک صلیبی عہدہ کی حیثیت سے نہ موری کا خواہش مند ہوں اور خداوند پرست نے

مجھے یہ موقع فراہم کر دیا ہے تو میں اس سے کیوں نہ فائدہ اٹھاؤں۔"

چارلس نے ڈوریا کی طرف دیکھا اور کہا۔ "ڈوریا تیرا ساتھ دے گا۔ میں تو صرف مشورے اور بات چیت کی حد تک اس مہم میں حصہ لے سکتا ہوں۔"

ڈوریا نے صاحب رکھیں سے کہا۔ "دوست! تم کمر بستہ ہو جاؤ۔ شاید قدرت نے تمہیں اسی دن کے لیے میرے پاس بھیجا تھا۔"

ابھی تک صاحب رکھیں کو یہ معلوم نہ تھا کہ یہ مجلس مشاورت کس سلسلے میں منعقد ہوئی ہے۔ چارلس نے کہا۔ "تیرے سامنے درگوت نے تیونس پر قبضہ کر لیا ہے اور ہم اس کی واپسی کے لیے اندر سے معاہدہ کوئی کارروائی نہیں کر سکتے۔ اب تو ہم سے درخواست کرے گا کہ تیرے ملک پر ترکوں نے قبضہ کر لیا ہے اس لیے تیری مدد کی جائے۔ میں تیرے معاون اور مددگار کی حیثیت سے تو کچھ کر سکتا ہوں مگر اپنے طور پر کچھ نہیں کر سکتا۔"

صاحب رکھیں خرمندہ تھا کہ اسے چالاک مسیحی اس کی مرضی کے خلاف استعمال کر رہے تھے اور اس میں اتنی ہمت و جرأت بھی نہیں تھی کہ وہ استعمال ہونے سے انکار کر دیتا۔ ڈوریا نے پوچھا۔ "کیا سوچ رہے ہو؟"

صاحب رکھیں نے جواب دیا۔ "میں سوچ رہا ہوں کہ میں نہ تو کسی ملک کا حکمران ہوں نہ کسی شہر کا حاکم پھر میں کس حیثیت سے تم لوگوں سے مدد طلب کروں گا؟"

چارلس نے جواب دیا۔ "عرب اتحاد کے ایک علمبردار کی حیثیت سے اور یہ حیثیت کسی حکمران سے کہیں زیادہ ہے۔ جس طرح آٹھ مسیحی سلطنتوں کا میں تھا تمہارا مددگار ہوں اسی طرح عرب اتحاد کے علمبردار کی حیثیت سے تو عرب دنیا کا تمہارا مددگار ہو جائے گا۔"

صاحب رکھیں نے پوچھا۔ "جب مسیحی دنیا میری مدد کو تیونس پہنچے گی تو اس وقت میں کہاں رہوں گا؟"

ڈان گارشا نے کہا۔ "تو ہمارے ساتھ رہے گا۔"

ڈوریا نے کہا۔ "اور اس کا بھی امکان ہے کہ درگوت کو تیونس سے بے دخل کرنے کے بعد وہاں کی حکومت تیرے حوالے کر دی جائے۔"

صاحب رکھیں نے ہتھ پتے کہا۔ "صاحبان! آپ مجھے استعمال کریں مگر اس بات کو یاد رکھیں کہ آپ نے تیونس کی فتح کے بعد وہاں کی حکومت مجھے دینے کا وعدہ کیا ہے۔"

ڈوریا نے کہا۔ "بے شک ہم اپنا یہ وعدہ یاد رکھیں گے۔"

لیکن تمہیں بھی یہ عہد کرنا ہوگا کہ بحیثیت تیونس کے حکمران تم کبھی عرب بحریہ کے قیام اور تعمیر وترقی میں کوئی حصہ نہیں لو گے۔

صالح رئیس نے پوچھا۔ ”یہ پابندی کیوں؟ اگر میں عرب بحریہ وجود میں لاتا ہوں تو بحیثیت حلیف مجھ سے تم لوگوں کو بھی فائدہ پہنچے گا۔“

چارلس نے کہا۔ ”ترکوں کی بحریہ نے ہمیں بہت نقصان پہنچایا ہے اور اب ہم یہ نہیں چاہتے کہ ہمارے مقابل ایک عرب بحریہ بھی آجائے۔“

ڈان گارشیا نے کہا۔ ”مجھے تو اس معاملے میں مجبوراً شامل کیا گیا ہے، ورنہ تو ہمارے لیے بالکل بے مصرف ہے۔“

دریغ اسی طرح نرم گرم باتیں ہوتی رہیں اور آخر میں صالح رئیس سے ایک تحریری درخواست کی گئی کہ اس کے ایک عرب شہر پر ترکوں نے قبضہ کر لیا ہے اس لیے تیونس کی آزادی کے لیے اس کی مدد کی جائے۔

چارلس نے اس سے اختلاف کیا۔ ”تیونس کسی عرب ملک کا حصہ نہیں ہے بلکہ وہ شمال مشرقی افریقا کا ایک حصہ ہے۔ تم یہ لکھ سکتے ہو کہ اس حصے پر سیکڑوں سال سے تم عرب لوگ حکومت کر رہے ہو اور یہ شہر عرب اتحاد میں شامل ہے، اسی لیے تم نے ہم سے مدد کی درخواست کی ہے۔“

صالح رئیس نے وہ سب کچھ لکھا جو چارلس اور ڈان گارشیا چاہتے تھے۔

میں سے چارلس نے خفیہ طور پر عیسائی ملکوں سے درخواست کی کہ وہ تیونس کے معاملے میں ڈان گارشیا کی مدد کریں۔

اس بار یورپ کی فوجیں غلطی کے مقابل مشرق میں بلدیہ کے ساحل پر جمع ہونے لگیں۔ کیونکہ ڈان گارشیا غلطی کا نواب تھا اور یہ نواب مسلمانوں سے جہاد کے خداوند متعال کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتا تھا۔

صالح رئیس کے دل پر بڑا بوجھ تھا کہ وہ یہ کیا کر رہا ہے۔ اسے بھی خدا کے سامنے جواب دینا ہے۔ اسے یہ سوچ

باتیں ہوئیں۔
صالح رئیس نے ڈوریا سے کہا۔ ”دوست ڈوریا! تم لوگ میرے ساتھ بہت برا سلوک کر رہے ہو۔ مجھے ایسی امید نہیں تھی۔“
ڈوریا نے پوچھا۔ ”تم مجھ سے کیا توقعات رکھتے تھے؟“

صالح رئیس نے جواب دیا۔ ”میں تمہاری بحریہ میں ترکوں کے خلاف معاون و مددگار بننا چاہتا تھا مگر تم لوگ عربوں اور ترکوں کو مقابل لاکر ایک نیا فتنہ کھڑا کرنا چاہتے ہو۔“

ڈوریا نے جواب دیا۔ ”دوست! تم یہی سمجھ لینا کہ میں تمہیں بحیثیت معاون و مددگار سمندر کی سطح پر لیے جا رہا ہوں۔ تم شاید چارلس سے واقف نہیں ہو۔ وہ بہت ہی سخت مذہبی اور انتہا پسند حکمران ہے اور اسے ترکوں سے نفرت ہے۔ اس نے ہمیں گوارا کر لیا، اب تم اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرو اور وہ تم سے فائدہ اٹھائے گا۔“

رات کو صالح رئیس سے ڈان گارشیا نے بلدیہ چلنے کو کہا۔ صالح رئیس تو یہاں حکم کا بندہ تھا، انکار نہیں کر سکتا تھا اور اس صورت میں کہ ڈوریا بھی بلدیہ جا رہا تھا۔ یہ تینوں بلدیہ روانہ ہو گئے۔

بلدیہ کے ساحل پر روز اٹلی، سسلی، جنیوا، ہالینڈ، انگلستان، جرمنی کے جہاز متحجب رہے تھے۔ غرض بہت سے ملکوں نے اپنے اپنے بحری بیڑے ساحل پر پہنچانا شروع کر دیے اور یہاں ڈوریا اور ڈان گارشیا کا زیادہ وقت مشغور ہوا اور معائنے میں گزر رہا تھا۔ ان میں صالح رئیس کو بہت کم شریک کیا جاتا تھا۔

کئی کئی جہاز پر صالح رئیس کو بھی لے جایا گیا اور سپاہیوں سے ملاقاتیں کروائی گئیں۔ اس طرح عیسائیوں نے مسلمانوں کے ایک بہت بڑے امیر البحر کو قریب سے دیکھا۔ انہوں نے ترک بحریہ کے بڑے بڑے لوگوں کے نام تو سنے تھے مگر کسی کو اس طرح قریب سے دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔

اس بار موسم کا بھی خاص خیال رکھا گیا اور ڈوریا کے مشورہ پر خاص دھیان دیا گیا لیکن اس بار ڈان گارشیا چارلس کا مقام حاصل کرنے کی فکر میں تھا۔

ذہنیت کا عادی بنانا شروع کر دیا تھا۔ اس نے اپنے پیچھے جو اس کو آگے بڑھایا۔ کیونکہ اس میں ڈوریا کو اپنی جوانی دکھائی دے رہی تھی اور پیچھا جو ابھی ڈوریا کی خواہش کو سمجھتا جا رہا تھا۔ لہذا اب وہ اپنے چچا جیسا مقام حاصل کرنے کی فکر میں تھا۔

صالح رئیس نے اس سے کہا کہ وہ کوئی ایسا لگا جیسے خدا نے اس کے لیے ایک صحیح معاون و مددگار بھیج دیا ہے۔ وہ کبھی بھی جو اس سے ملے بھی لگا۔

ڈوریا نے جب یہ دیکھا کہ صالح رئیس نے اس کے پیچھے کو دوست بنالیا ہے تو اس نے جو اس کو سمجھایا۔ ”اس عرب ملازم پر کسی قسم کا بھروسہ نہ کرنا۔“

جوا نے کہا۔ ”میں تو صالح رئیس سے گر کی باتیں معلوم کرتا رہتا ہوں اور ایمان داری کی بات تو یہ ہے کہ صالح رئیس بہت بڑا امیر البحر ہے۔ یہ اسے سوچھی کیا جو ہم میں آ گیا۔“

ڈوریا نے پیچھے کو سمجھایا۔ ”صالح رئیس کی تعریف اس کے منہ پر مت کر دینا ورنہ وہ خود کو ہم سب کے مقابل بہت بڑا آدمی سمجھنے لگے گا۔“

ڈان گارشیا بھی صالح رئیس سے کئی بار ملا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ صالح رئیس کسی کام آئے یا نہ آئے مگر اس کو سامنے رکھ کر تیونس کے عربوں کو اپنا حامی بنایا جاسکتا ہے۔ صالح رئیس کا یہ فہم کہ عربی بولنے والوں ایک بوجہ، عالم اسلام میں تفریق پیدا کرنے کے لیے بہترین نعرہ ہے۔ مسلمان خود بخود زبانوں اور جغرافیائی حدود میں سیم ہوتے جائیں گے۔

تیونس پر ڈان گارشیا کی سرپرستی میں مغربی ممالک جو متحدہ یلغار کرنے والے تھے، چارلس نے خود کو ان سے علیحدہ رکھا۔ وہ درپردہ ان اتحادیوں کو مشورے بھی دے رہا تھا اور عملی مدد بھی کر رہا تھا مگر یہ ظاہر ان سب سے لائق نہ رہا۔

درگوت نے تیونس کو اپنے پیچھے حصار رئیس کی تحویل میں دے دیا اور خود اٹلی روانہ ہو گیا۔ مطہر خیر الدین کی طرح درگوت کا یہ غلط نظر تھا کہ سلطنت عثمانیہ سے اپنی مہمات کے سلسلے میں جو کچھ لیا جائے اس سے زیادہ سلطنت عثمانیہ کو واپس کیا جائے۔

جب وہ اٹلی جا رہا تھا تو اس نے کئی جہازوں کو اسی سمت میں جاتے دیکھا۔ ان جہازوں کو دیکھنے سے اندازہ ہوا کہ کئی جہاز صرف ایک جہاز کی حفاظت اور نگرانی کے لیے سفر کر رہے ہیں۔

چالاک درگوت نے اندازہ لگالیا کہ یہ مخصوص جہاز جس کی دوسرے کئی جہاز حفاظت کر رہے ہیں، ضرور کوئی قیمتی چیز لے کر جا رہا ہے۔

درگوت نے اس پر حملہ کر دیا۔ محافظ جہازوں نے درگوت کا مقابلہ کیا لیکن یہ مقابلہ زیادہ دیر تک جاری نہیں رہا۔ درگوت کے جہازوں نے ان سب جہازوں کو نرغے میں لے لیا اور حکم دیا کہ وہ درگوت کے ساتھ چلیں۔

ان جہازوں کے ساتھ مجبوری یہ تھی کہ اگر وہ مقابلہ کرتے تو درگوت انہیں برباد کر دیتا۔ سب ہی کو سمندر کی تہ میں بٹھا دیا جاتا لیکن درگوت کا حکم ماننے میں یہ فائدہ تھا کہ وہ زندہ بچ جاتے اور کسی نہ کسی طرح کبھی رہائی بھی ممکن ہو جاتی۔

درگوت ان جہازوں کو اپنے درمیان لے ہوئے شاخ زریں میں داخل ہوا۔ جہاز کا عملہ گرفتار کر لیا گیا۔ جہازوں کے محافظین کو قلام بنالیا گیا اور جس جہاز کی حفاظت کی جارہی تھی اس سے اٹلی کا خزانہ برآمد ہوا۔

یہ ظاہر درگوت کا یہ معمولی کارنامہ تھا جو سمندری سفر کے دوران میں اس نے اچانک انجام دیا تھا مگر اس سے سلطنت عثمانیہ کو بہت فائدہ پہنچا۔

سلطان سلیمان کو جب یہ معلوم ہوا کہ درگوت نے تیونس بھی واپس لے لیا ہے تو اسے اور زیادہ خوشی حاصل ہوئی اور اسے اعتراف کرنا پڑا کہ درگوت خیر الدین باربروسہ کا بہترین شاہین ہے۔

سلطان سلیمان کو تیونس کی طرف سے یہ اطمینان تھا کہ چارلس معاہدہ امن کی وجہ سے تیونس پر حملہ نہیں کرے گا اور درگوت نے بھی اسی معاہدہ امن کی وجہ سے اپنے پیچھے حصار رئیس کو تیونس میں چھوڑ دیا تھا۔

حصار رئیس قیروانی بزرگوں کا تعاون حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن وہ قیروانی بزرگ جس کی کوششوں سے حمید بن حسن کو تیونس کی حکومت کی تھی پھر اسی قیروانی بزرگ کی کوششوں سے حمید بن حسن کو بھی معزول کر دیا گیا اور حکومت کی باگ ڈور کئی قیروانی بزرگوں کی کوسل نے سنبھال لی تھی، حصار رئیس کے قابو میں نہیں آ رہا تھا۔

یہ یہ ظاہر حصار رئیس سے تعاون کر رہا تھا لیکن وہ دل سے عرب اتحاد کا حامی تھا اور سلطنت ترکیہ اور حصار رئیس کو غاصب سمجھتا تھا۔

قیروانی بزرگ کو صالح رئیس کا انتظار تھا جو متحدہ عرب کے منصوبے پر کام کر رہا تھا۔ یہ معلوم ہو چکا تھا کہ وہ ترکوں کو

تیونس سے بے دخل کرنے کے لیے مغرب سے متحدہ فوج لے کر آ رہا ہے۔

اس قیروانی بزرگ نے روپوش ہو جانے کی کوشش کی مگر حصار رئیس نے اس کو بروقت گرفتار کر لیا اور اس سے پوچھا۔ ”تو مسلمان ہونے کے باوجود عیسائیوں سے مدد کیوں حاصل کر رہا ہے؟“

قیروانی بزرگ نے اس کی تردید کی۔ ”صاحب زادے! میں نے کسی سے بھی تمہارے خلاف مدد نہیں مانگی۔ وہ تو صالح رئیس ہے جو عرب اتحاد کے لیے کام کر رہا ہے اور میرا اس پر کوئی اختیار نہیں ہے۔“

حصار رئیس نے کہا۔ ”لیکن میں نے سنا ہے کہ تم صالح رئیس کے ہم خیال ہو۔ جو وہ چاہتا ہے، وہ تمی چاہتے ہو۔“

قیروانی بزرگ نے جواب دیا۔ ”جناب! یہ کسی طرح ممکن ہے کہ میں اپنے مسلمان بھائیوں کے خلاف عیسائیوں سے مدد چاہوں۔ ہاں میں صالح رئیس پر اختیار نہیں رکھتا۔“

حصار رئیس محسوس کر رہا تھا کہ یہ چالاک قیروانی بوڑھا چاہیچاہے کے باتیں جو کر رہا ہے اس میں اس کے دل و دماغ متحد نہیں ہیں۔

پھر اچانک حصار رئیس کے سمندری خبروں نے یہ خبر دی کہ مغرب سے جہازوں اور کشتیوں کا ایک طوفان تیونس کی طرف بڑھتا چلا آ رہا ہے۔

حصار رئیس کو معاہدہ امن کے پیش نظر ابھی تک یہ یقین تھا کہ اب عیسائی تیونس کی مدد نہیں کریں گے مگر عیسائی فوجیں اس کی طرف بڑھی چلی آ رہی تھیں۔ خبروں نے اپنے طور پر مشورہ بھی دیا تھا کہ صالح رئیس چونکہ سب سے آگے جہاز پر موجود ہے، اس لیے تیونس کے لوگ بھی صالح رئیس کا ساتھ دیں گے۔ ان حالات میں اپنی جیت کا امکان بہت کم ہے۔

عیسائیوں کے بحری جہاز حلق الیہ میں داخل ہو گئے۔ اس سے پہلے ہی حصار رئیس نے اپنا بحری بیڑا جمیل بزرگ کے ساحل پر پہنچا دیا اور معمولی سے مقابلے کے بعد حصار رئیس تیونس سے نکل گیا اور ڈان گارشیافا اتحاد نشان سے تیونس میں داخل ہو گیا۔

چونکہ صالح رئیس کو آگے رکھا گیا تھا اس لیے تیونس عربوں نے ڈان گارشیافا کا ساتھ دیا۔

حصار رئیس کے آدمی درگوت کو تلاش کر رہے تھے۔ درگوت کو چیسے ہی یہ خبر ملی کہ مغربی عیسائیوں کا متحدہ لشکر ڈان گارشیافا کی قیادت میں تیونس پر قابض ہو چکا ہے تو وہ فوراً مہدیہ کی طرف روانہ ہوا کیونکہ اسے اندیشہ تھا کہ ڈان گارشیافا

کے ساتھ چونکہ ڈور یا بھی ہے اس لیے اس بار عیسائیوں کی یہ مہم تیونس پر قبضے کے ساتھ ہی ختم نہیں ہوگی بلکہ اس طرابلس سے تیونس تک پورے علاقے پر عیسائی قبضہ کر لیں گے۔ مہدیہ اور جربہ ان دونوں کے درمیان علاقے تھے۔ درگوت نہایت آسانی سے جربہ پہنچا اور یہاں جنگی حکمت عملی ترتیب دی جانے لگی لیکن یہاں سے اس کو کسی وجہ سے الٹی جانا پڑا۔

سلطنت عثمانیہ کو خبر ہو چکی تھی کہ تیونس پر حملے اور قبضے نے معاہدہ امن کو داغ دار کر دیا ہے۔ سلطان سلیمان نے چارلس کو انتہائی سخت خط لکھا اور اس نے جواب طلب کیا کہ معاہدہ امن کی خلاف ورزی کیوں کی گئی؟

چارلس نے جواب میں سلطان سلیمان کو لکھ دیا کہ اس مہم سے اس کو کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ طلیطلہ کے نواب ڈان گارشیافا کی کارروائی ہے اور اسے زیادہ سے زیادہ بحری قزاقی کہا جاسکتا ہے۔

سلطان سلیمان نے چارلس کے خط پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”بے شک یہ ڈان گارشیافا کی قزاقی ہے اور چارلس ان قزاقوں کا سرپرست ہے۔“

تیونس پر قابض ہونے کے بعد ڈان گارشیافا نے طرابلس سے رابطہ قائم کیا۔ طرابلس بڑی افریقہ کا پہلا ساحلی شہر تھا۔ ان دونوں کے درمیان جربہ اور مہدیہ واقع تھے۔ مہدیہ تیونس سے قریب تھا اور جربہ طرابلس سے۔ گویا طرابلس یا تیونس کے بعد یہی دو مقام تھے جن پر عیسائیوں کے قابض ہونے کے بعد مسلمانوں کی بربری افریقہ سے متعلق اہم بندرگاہیں عیسائیوں کے قبضے میں جا گئیں۔

ڈان گارشیافا کا پاپائیہز کا حکم تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کی تیونس میں کامیابی کے بعد خط لکھا کہ وہ مہدیہ اور جربہ پر بھی قبضہ کر لے تاکہ طرابلس سے تیونس تک پوری ساحلی پٹی پر عیسائی قابض ہو جائیں۔

چنانچہ ڈان گارشیافا نے مہدیہ پر اچانک حملہ کیا اور اسے بھی فتح کر لیا۔

ان دونوں درگوت اٹلی کے ساحلی علاقوں میں الجھا ہوا تھا اور اس کو چیسے ہی یہ خبر ملی کہ مہدیہ بھی مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا تو وہ نہایت تیز رفتاری سے، صحیح صورت حال جاننے کے لیے جربہ آیا اور جربہ کو بچانے کے لیے جنگی منصوبے بنانے لگا۔

جربہ کا محل وقوع کچھ ایسا تھا کہ ایک تنگ آبی راستے سے جربہ میں داخل ہوا جاسکتا تھا لیکن اگر اس تنگ دہانے کو

گھیرے میں لے لیا جاتا تو محصور حکومت ہتھیار ڈال دینے پر مجبور ہو جاتی۔

جربہ کے اندر جنوبی حصے میں دلدلی جھیل واقع تھی اور اس دلدلی جھیل کو آبی شاہراہ کے طور پر استعمال نہیں کیا جاسکتا تھا۔

درگوت نے جربہ میں اپنا ڈیرا ڈال دیا۔ ڈان گارشیافا کے ساتھ ڈور یا بھی آیا ہوا تھا۔ اس نے اس خطرناک اور نازک محل وقوع کا فائدہ اٹھایا اور جربہ کے دہانے کے سامنے اپنا بحری بیڑا اکھڑا کر دیا۔ گویا اب درگوت محصور ہو چکا تھا۔

ڈور یا کو شاید ہی کبھی اتنی خوشی حاصل ہوئی ہو جتنی درگوت کو محاصرے میں لے لینے کے بعد حاصل ہوئی تھی۔ ڈور یا نے فوراً چارلس کو لکھا۔ ”جناب والا! جس درگوت کو ہم نے تین ہزار سونے کے سکوں کے عوض چھوڑ دیا تھا اور بعد کے تقریباً آٹھ نو سال درگوت کی تباہ کاریوں میں بسر کیے تھے، خداوند سبح کا شکر ہے اب وہ درگوت ہمارے قبضے میں ہے۔ اب ہم اسے مقدمہ چلا کر قرار واقعی سزا دے سکیں گے۔“

جربہ میں محصور ہونے کے بعد درگوت نے اندازہ لگایا کہ مقامی لوگ عربوں کے مقابلے میں ترکوں کو کتنے پسند نہیں۔ ان کے دل اندلی عیسائیوں پر مائل تھے۔ یہاں یہ خبر بھی کرم ہوئی کہ صالح رئیس اندلی لشکر میں موجود ہے اور اب یہاں صالح رئیس حکومت کرے گا۔ گویا اب اندر اور باہر دونوں جگہ درگوت کے دشمن موجود تھے۔

کئی اطراف سے گھرا ہوا درگوت جربہ سے نکلنے کے راستے تلاش کر رہا تھا۔ سر دست اس نے جربہ کے آبی دہانے پر توپیں نصب کر دیں اور وقت و وقت سے گولہ باری شروع کر دوائی۔

ڈور یا نے مقابلہ بے سود جانا۔ اس نے اپنے جہاز پیچھے ہٹا لے تاکہ درگوت کا گولہ بارود ضائع ہوتا رہے کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اگر درگوت نے پیچھے ہٹ کر براہ فکلی نکل جانے کی کوشش کی تو شمال میں مہدیہ اور تیونس اس کا راستہ روکے ہوئے تھے۔ جنوب میں طرابلس تھا، مانا کے مجاہدین تھے۔ اگر وہ جنوب میں طرابلس سے سمندر میں پہنچنا چاہتا تو ایک بہت بڑی دلدلی جھیل تھی جس سے جہازوں کو سمندر تک لے جانا ناممکن تھا۔

درگوت نے اسی دلدلی جھیل کو کام میں لینے کا فیصلہ کیا اور ہزاروں مزدوروں نے خشکی کو کھود کے سمندر تک آبی

شاہراہ بنانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ وہ اس جھیل کو آبی شاہراہ میں بدل دینا چاہتے تھے۔

ایک طرف کھدائی ہوئی رہی تاکہ سمندری پانی جھیل میں داخل ہو سکے اس کی دلدلی حیثیت کو ختم کر دے۔ دوسری طرف گولہ باری ہوئی رہی تاکہ ڈور یا اس گمان میں رہے کہ درگوت اس کا مقابلہ کر رہا ہے۔

جب گولہ باری میں کچھ وقت پیدا ہونے لگا تو ڈور یا کو بڑی خوشی ہوئی کہ آخر کار گولہ بارود کا ذخیرہ ختم ہو رہا ہے۔ ڈور یا کو اطمینان حاصل تھا کہ درگوت اس کی چال میں پھنس چکا ہے اور اب وہ کسی بھی طرح گرفتاری سے نہیں بچ سکتا گا۔

گولہ باری میں وقت پیدا ہوا تو ڈور یا کے ہاتھوں نے اجازت چاہی کہ انہیں آگے بڑھ کے درگوت کی گرفتاری کا موقع دیا جائے لیکن ڈور یا کو شبہ تھا کہ درگوت اتنی آسانی سے قابو ہوئے آئے والا نہیں ہے اور اس بات کا امکان موجود ہے کہ وہ گولے بارود کا اتنا ذخیرہ محفوظ رکھے گا کہ جیسے ہی ڈور یا پیش قدمی کرے، درگوت اس پر اچانک حملہ آور ہو جائے۔ ڈور یا نے آخری کارروائی کے لیے اپنے عمل کو چاق و

دوبہ بند رکھا۔ جب گولہ باری بالکل بند ہو گئی تو ڈور یا نے اپنے بحری بیڑے کو آہستہ آہستہ اندر بڑھانا شروع کر دیا اور یہ حکم دے دیا کہ جس طرف سے بھی ان پر حملہ ہو، وہ اس طرف شدید گولہ باری شروع کر دیں۔

لیکن ان پر کسی طرف سے بھی گولہ باری نہیں ہوئی۔ وہ نہایت خاموشی سے اندر بڑھتے چلے گئے اور خشکی پر پہنچنے کے دم لیا۔ اب وہ یہاں سے اس مورچے کا جائزہ لے رہے تھے۔ مقامی لوگوں نے کچھ بتایا اس لیے پسند نہیں کیا کہ درگوت کو مدد دینے کے جرم میں انہیں کوئی سزا دی جائے۔

ڈور یا حیران تھا کہ درگوت کی فوج اسٹے اور جہازوں سمیت کہاں غائب ہو گئی۔ دلدلی جھیل اب بھی موجود تھی مگر کھدایا ہوا حصہ زیر آب ہونے کی وجہ سے سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ ڈور یا نے ان حصوں کا جائزہ لیا جہاں درگوت نے محاذ بنایا تھا اور توپیں نصب کر کے مسلسل گولہ باری کی تھی۔ جب گولہ باری کا سلسلہ موقوف ہوا تو ڈور یا کو گمان ہوا کہ اب درگوت کی طرف سے مسلح اور شرابی کی درخواست آنے والی ہے یا پھر درگوت کی یہ بھی کوئی جنگی حکمت عملی ہوگی اور وہ ڈور یا کے آگے بڑھنے کا انتظار کر رہا ہوگا۔

اسی اندیشے کے پیش نظر اس نے آگے بڑھنے میں

خاصا وقت لگایا اور جب پیش قدمی کی تو بہت آہستہ آہستہ رک رک کے، اپنے دائیں بائیں اور اپنے آگے پیچھے کا جائزہ لیتے ہوئے۔ وہ پھونک پھونک کر قدم بڑھا رہا تھا اور دائیں بائیں اور آگے توپ خانے کا سراغ لگا رہا تھا لیکن آبی سطح پر کسی نشانی یا جہاز کا وجود نظر نہ آیا اور جب ڈوریا کشتی کے قریب گیا تو وہاں بھی کسی کوئی توپ خانہ نظر نہ آیا۔

جربرہ کی حیثیت ایک جربرے جیسی تھی اور جربرے میں اگر آدمیوں اور توپ خانوں کو چھپایا جاتا تو بالآخر وہ پکڑے ضرور جاتے۔

اس نے درگوت کی تلاش میں خاصا وقت ضائع کیا مگر کچھ ہاتھ نہ آیا اور یہاں سے اسے درگوت کی فوج کا ایک تنفس بھی نہ ملا۔

ڈوریا اگر یہ فرض کر لیتا کہ درگوت اپنی فوج کو پانی کے اس پار تینوں کے علاقے میں نکال لے گیا ہے تو اس کے جہازوں کو تو نہیں کہیں موجود ہونا چاہیے تھا۔ کیونکہ یہاں کے دلدلی علاقوں سے جہاز کو نکال کر لے جانے کا یہ مطلب تھا کہ وہ اپنے پورے بحری بیڑے کو دلدلوں میں پھنسا کے تباہ و برباد کروا دیتا۔

اس کے آدمی جربرے کے ساحل پر اتر گئے اور پورے جربرے کا کئی دن تک جائزہ لیتے رہے۔ اس کے آدمی بہت پریشان تھے کہ درگوت نے اپنے بحری بیڑے اور آدمیوں کو کہاں چھپا دیا ہے؟

دلدلوں کے متوازی جن حصوں کی کھدائی ہوئی تھی وہ زیر آب ہونے کی وجہ سے سمجھ نہیں آ رہے تھے۔ ان کی مٹی کہیں دور پھینکوا دی گئی تھی۔

اس نے جربرے کے لوگوں کو پکڑا اور ان سے پوچھ چھچھ شروع کر دی لیکن یہاں کے مسلمانوں نے لاعلمی ظاہر کی اور بتایا کہ جب درگوت یہاں آیا تھا تو وہ اپنے گھروں میں مقید ہو گئے تھے اور جب تک ان کے کانوں میں توپوں کی آوازیں پہنچتی رہیں وہ اپنے گھروں سے باہر نہیں نکلے۔ گولہ باری بند ہو گئی تھی کسی میں باہر نکلنے کی ہمت نہ تھی پھر لوگوں نے اعلان کیا..... کہ اب عیسائی فوجیں جربرے میں داخل ہو چکی ہیں تو شہری باہر نکلے۔ اب ان کے سامنے عیسائیوں کا بحری بیڑا ہے۔ جس طرح وہ لوگ درگوت کے بارے میں حیران ہو رہے ہیں، اسی طرح انہیں بھی حیرت تھی۔ کیا درگوت یا اس کے ساتھی اجنبی سے تعلق رکھتے ہیں جو اپنا بحری بیڑا ہواؤں میں نکال لے گئے ہیں۔

ڈوریا کئی دن تک درگوت کے بیڑے کو تلاش کرتا رہا

اور جب مایوس ہو گیا تو جربرے کے پڑوسیوں سے پوچھ چھچھ شروع کر دی۔

آخر کار جن مزدوروں نے دلدلوں سے ملحقہ حصوں کی کھدائی کی تھی ان میں سے ایک مزدور ڈوریا کے ہاتھ لگ گیا اور ڈوریا نے اس سے پوچھا۔ ”تج بتا کہ درگوت کا بحری بیڑا کہاں غائب ہو گیا؟“

مزدور نے جواب دیا۔ ”جناب! یہاں کے دلدلی راستوں سے نکل گیا۔“

ڈوریا نے دلدلی علاقے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کہیں تو نشے میں تو نہیں ہے۔ دلدلوں سے تو جہازوں کو بچایا جاتا ہے اور تو نے درگوت کو دلدلوں میں اتار دیا۔ یہ کیسے طرح ممکن ہے؟“

مزدور نے چنوکھدے ہوئے ہاتھ دکھائے اور ڈوریا کو بتایا۔ ”جناب! ان کھدے ہوئے حصوں کو ملا جلا فرمایا اور پھر ان دلدلوں پر غور کریں تب بات سمجھ میں آجائے گی۔“

ڈوریا مذکورہ حصوں کا جائزہ لیتا رہا تو زمین کے کھودے جانے کے آثار ملے۔

اس نے مزدور سے پوچھا۔ ”جب یہاں کھدائی ہوئی ہوگی تو یہاں کی مٹی کہاں پھینکی گئی؟“

مزدور نے بتایا۔ ”مٹی کو پھینکنے کے لیے بے شمار گدھوں کا انتظام کیا گیا تھا اور ان کے ذریعے یہ مٹی پہاڑی کھنڈوں میں پھینکوا دی گئی۔“

ڈوریا نے دیکھا یہاں کھنڈوں میں مٹی کے کئی توڑے کھڑے ہوئے تھے۔ تازہ کھدی ہوئی مٹی کے توڑے۔

ڈوریا نے اپنے پیچھے کو بلوایا اور دلدلی حصے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا تو ان دلدلوں کے راستے سمندر تک پہنچ سکتا ہے؟“

سمجھنے نے جواب دیا۔ ”سوال ہی یہ نہیں ہوتا۔“

ڈوریا نے اس کو حکم دیا۔ ”لیکن میں تجھ کو حکم دیتا ہوں کہ تو اپنا ایک جہاز اس دلدلی حصے سے سمندر تک لے جا اور واپس آکر مجھے خبر دے۔“

سمجھنے نے پہلے تو دلدلی حصے کا مشاہدہ کیا پھر اپنے جہاز کو دیکھا اور پچھا۔ ”کیا آپ مجھے یہ عزم یقینی سے دے رہے ہیں؟“

ڈوریا نے جواب دیا۔ ”ہم اس وقت ایک خطرناک محاذ پر موجود ہیں۔ یہاں مذاق کی محالائش نہیں ہے۔ تجھ کو یہ بحری سفر آج ہی کرنا ہے۔“

سمجھنے نے پوچھا۔ ”چچا! آپ مجھے میرے کسی نامعلوم

جرم کی یہ سزا تو نہیں دے رہے ہیں؟“

ڈوریا نے جواب دیا۔ ”نہیں سمجھتے! یہ بات نہیں بلکہ مجھے اس طرح ایک تجربہ کرنا ہے۔“

سمجھنے نے کہا۔ ”تو چچا یہ خطرناک تجربہ کسی اور سے کروائیں۔ مجھے ابھی اپنی زندگی کے کئی کارنامے انجام دینا ہیں۔“

ڈوریا نے کہا۔ ”سمجھتے! اتنا یہ سفر بھی تیرے کارناموں میں شامل کر دیا جائے گا۔ میں تجھے مجبور نہیں کروں گا۔ اگر تجھ کو یہ کارنامہ انجام دینے میں ہنگامہٹ محسوس ہو رہی ہے تو تو یہاں میری جگہ بیٹھ، میں یہ کارنامہ انجام دے کر واپس آتا ہوں۔“

سمجھنے نے چچا کو اٹھنے نہیں دیا اور کہا۔ ”آپ یہیں بیٹھے رہیں، میں جاتا ہوں۔ اگر میرا جہاز دلدلی میں پھنس جائے تو آپ اس کو نکالنے کی تربیب ضرور کیجیے گا۔“

ڈوریا نے کہا۔ ”اس کی نوبت ہی نہیں آئے گی، کیا تو موت سے ڈرتا ہے؟“

سمجھنے نے کہا۔ ”موت سے ڈرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن جس مہم میں مسلمانوں کا مقابلہ شامل نہ ہو اور اس میں موت واقع ہو جائے، میں اس فضول موت سے ڈرتا ہوں۔“

ڈوریا نے کہا۔ ”تو بالکل خوف نہ کر۔ میں تجھ کو ہلاکت میں نہیں ڈال سکا اور امید ہے کہ جب تو اس دلدلی کو عبور کر کے سمندر میں پہنچے گا تو تجھے بڑی خوشی حاصل ہوگی اور پھر جب اسی راستے سے واپس آئے گا تو اور زیادہ خوش ہوگا۔“

سمجھنے نے کہا۔ ”خداوند مسیح آپ کی زبان مبارک کرے۔“

سمجھنے نے ایک جہاز پر چوہہ بردار بٹھائے اور انہیں بتایا۔ ”اپنا یہ جہاز دلدلی علاقے سے سمندر تک لے جائے گا۔ تم سب کو چھ چلانے میں بہت مہارت دکھانا ہوگی کیونکہ اگر ہم نے اس دلدلی راستے کو پیچھے چھوڑ دیا اور اسی راستے سے بغیر ت واپس آئے تو یہ ہم سب کا عظیم کارنامہ ہوگا۔ تمہیں یہ ستر جان کی بازی لگانا پڑے گی۔“

پھر جہاز دلدلی حصے کی طرف بڑھا۔ مسلمان خلاصیوں نے نہایت تیزی سے ہاتھ چلانا شروع کر دیے۔ جیسے جیسے دلدلی حصہ قریب آ رہا تھا ڈوریا کا ہتھیار غیر معمولی بار خاطر محسوس کر رہا تھا۔ جب یہ جہاز دلدلی علاقے میں داخل ہو گیا تو سب ہی کی عجیب حالت ہو گئی۔ وہ کسی ناگہانی خطرے کے لیے بالکل تیار تھے۔

چھو چلانے والوں کو حیرت تھی کہ انہیں معمول کی محنت نہ پڑ رہی تھی اور یوں لگتا تھا جیسے جہاز کھلے سمندر میں رواں دواں تھا۔ ڈوریا کا ہتھیار بھی چھو چلانے والوں کے پاس اور بھی جہاز کے بالکل پیچھے حصے میں چلا جاتا۔ وہ بادبان پر بھی چڑھا کیونکہ اسے سمندری سطح اور دلدلی سطح کا موازنہ نہ کرنا تھا۔ وہ یہ سمجھتا جاتا تھا کہ جہاز کے دلدلی میں داخل ہونے کے بعد بھی جہاز کی چال میں کوئی فرق کیوں نہیں آیا۔

ساحل سے ڈوریا جہاز کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا اور اسے حیرت تھی کہ دلدلی حصے کو عبور کرتے ہوئے جہاز کی رفتار میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ کئی گھنٹے بعد جہاز دلدلی حصے کو عبور کر گیا۔ ڈوریا بے حد خوش تھا اور ڈوریا کا ہتھیار بھی۔

جب جہاز بحیرہ روم میں داخل ہو گیا تو کئی چمھروں نے ہاتھ کے اشارے سے ڈوریا کے پیچھے کو کچھ بتایا جو اس کی سمجھ میں بالکل نہ آیا۔ یہ ایک چھوٹی سی کشتی کے ذریعے چمھروں کے پاس گیا اور ایک چمھرے کو اپنی کشتی میں بلایا۔ اس سے پوچھا۔ ”کیا بات ہے، تم کیا پوچھ رہے ہو؟“

چمھرے نے پوچھا۔ ”جناب! آپ جس راستے سے آئے ہیں وہ تو ایک نہایت پرخطر دلدلی حصہ ہے پھر آپ نے اسے عبور کس طرح کیا؟ تمام سمندری چمھلیاں اسی حصے میں جاتی ہیں اور ہم دلدلی کی وجہ سے ادھر نہیں جاتے۔“

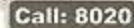
جودانے چمھرے کو بتایا۔ ”وہ حصہ صدیوں سے ممنوعہ کہلاتا ہے اور ادھر کوئی نہیں جاتا جبکہ اب سفر کرنے کے بعد اندازہ ہوا کہ یہ آبی شاہراہ بھی محفوظ نہیں ہے۔“

چمھرے نے پوچھا۔ ”کیا درگوت بھی اپنے بیڑے کو اسی راستے سے نکال لے گیا؟“

چمھرے نے جواب دیا۔ ”بالکل جناب! اس میں شک و شبہ کی کوئی بات نہیں۔ یہ اپنا آنکھوں دیکھا معاملہ ہے، ہنی سناں بات نہیں ہے۔ وہ اتنی شان سے کھلے سمندر میں داخل ہوا تھا کہ میں کیا عرض کروں۔“

چمھرے نے ڈوریا کے پیچھے کی چمھلیوں سے توضیع کی۔ ڈوریا کے پیچھے نے اس کے ساتھ ایک گھنٹا گزارا اور پھر اسی راستے سے اپنے چچا کی طرف روانہ ہو گیا۔

ڈوریا اپنے پیچھے کے انتظار میں پریشان تھا۔ آخر جب جہاز کا پرچم سرگرم ہو گیا تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔



اب سب آجاؤ لا تن پید

تو آج ہی اپنے ہم خیال لوگوں کی اس حیرت انگیز کوشش سے connect ہو جائے۔ 8020 سروں کے ذریعے کچھ شمل اور کچھ سنائیے، کچھ سیکیں اور کچھ سکھائیں۔



اپنے موبائل سے 8020 ڈائل کریں

ایک عرب غلامی نے جہاز کے مسلح سپاہیوں کو اپنے ہتھیار رکھتے دیکھا تو اسے کچھ کچھ یقین..... آیا کہ شاید ان کا دور غلامی واقعی ختم ہوا پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس جہاز پر بہت سے ترک پہنچ گئے اور اپنے قبضے میں لے لیا۔
اب عرب مسلح ملاح ترکوں کے اختیار میں چلے گئے

ایک ترک نے سب سے پہلے خلاصیوں کو بتایا۔
”تمہیں آزادی مبارک ہو۔ تمہیں عیسائیوں کی قید سے

تھے اور ترکوں کا بیڑا مالٹا کے مشرق میں جانب شمال قسطنطنیہ کی طرف جارہا تھا۔

اس جہاز کے عیسائیوں کو قبرص کے سامنے سے گزرتے ہوئے بھی یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ انہیں گرفتار کرنے والا درگوت ہے۔ قبرص کے آگے ٹرائے کی بندرگاہ پر یہ بیڑا چند دنوں کے لیے رکا تو ملاح اور اس کے عملے کو درگوت کے سامنے پیش کر دیا گیا۔

یہ ملاح درگوت کو پہچانتا تھا کیونکہ جب وہ کاریکا میں گرفتار کیا گیا تو اس کے قید کے زمانے میں اس ملاح نے درگوت سے کئی علاقائیں کی تھیں۔

جب یہاں اس نے اچانک درگوت کو اپنے سامنے دیکھا تو اس نے بار بار چلیں بھڑکائیں اور اسے یقین نہ آیا کہ اس وقت وہ درگوت کے سامنے کھڑا ہے۔ کیونکہ یہ کسی طرح ممکن نہیں تھا کہ جس درگوت کو اس کے بحری بیڑے سمیت ڈوربانے گرفتار کر لیا ہو، وہ یہاں بھی موجود ہوگا اور اس نے بارسلونا کے قاصد جہاز کو گرفتار کر لیا ہو۔ وہ یہ سوچنے لگا کہ کیا درگوت وہ ہیں یا اس وقت وہ درگوت کی روح کے سامنے کھڑا ہے۔

درگوت نے ملاح سے پوچھا: ”کیا اب تیرا بارسلونا کے امدادی جہاز جریہ پہنچ چکے ہوں گے؟“ ملاح نے جواب دیا: ”بالکل پہنچ چکے ہوں گے۔ انہوں نے وہاں اقتدار سنبھال لیا ہوگا اور وہاں سے گرفتار کیے جانے والے ترکی بیڑے کو اپنی بحریہ میں شامل کر لیا ہوگا۔“

درگوت نے ڈوریا کی مذمت کی۔ ”وہ بوڑھا ہو گیا ہے اور کچھ نہیں کیا ہے۔“

عیسائی ملاح نے پوچھا: ”جناب! درگوت اور اس کی فوج کو تو ڈوریا کے قبضے میں ہونا چاہیے مگر کچھ نہیں کہ اس وقت میں کس کو اپنے سامنے دیکھ رہا ہوں؟“

درگوت نے کہا: ”بہت خوب۔ میں جو ڈوریا کو بوڑھا اور ٹھیکھا ہوا کبیرا ہوں تو اس کی وجہ یہی ہے کہ اس نے مجھے گرفتار کر لیا اور میرا بحری بیڑا اس کے قبضے میں چلا گیا ہے۔ اس نے یہ ساری خبریں بارسلونا پہنچ دی ہیں جبکہ میں جیتا جاگتا تیرے سامنے موجود ہوں۔“

ملاح نے کہا: ”جناب! مجھے خود بھی حیرت ہے کہ میرے کانوں نے جو کچھ سنا اور میری آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی ہیں، میں ان دونوں میں سے کس پر اعتبار کروں۔“

درگوت نے جواب دیا: ”تو ان دونوں میں سے کسی

پر اعتبار نہ کر، بلکہ صرف اس پر اعتبار کر کہ تجھ کو تیرے جہاز سمیت درگوت نے گرفتار کر لیا ہے اور اب تم لوگ ہمارے جہازوں پر خلاصی کرو گے۔“

درگوت ڈوریا اور مالٹا کے صلیبی جہادین کو برا بھلا کہتا رہا جو بد مہدیوں میں شاملین قائم کر رہے تھے۔ وہ کبیرا تھا۔ ”ڈان گارشیائوس کوچ کر لیتا ہے اور ڈوریا نے معاہدہ امن کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مہدیہ اور جریہ پر قبضہ کر لیا۔ مالٹا طرابلس پر قابض ہے۔ یہ سب کیا ہے؟ اگر چارلس سے جواب طلب کرو کہ یہ معاہدہ امن کی خلاف ورزیاں کیوں ہو رہی ہیں تو وہ کہتا ہے کہ ان واقعات کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ قزاقوں کی کارروائیاں ہیں جن کے لیے وہ جواب دہ نہیں۔“

ملاح خاموشی سے یہ سب سنتا رہا۔ درگوت نے اچانک اس سے پوچھا: ”وہ خط کہاں ہے، چارلس کا وہ خط جو ڈوریا کو لکھا گیا اور جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ جریہ کا نظم و نسق سنبھالنے کے لیے فوج اور حکومت کے آدمی پہنچ رہے ہیں۔“ ملاح نے جواب دیا: ”وہ خط تو آپ کے آدمی مجھ سے پہلے ہی چھین چکے ہیں۔“

درگوت کے ایک آدمی نے وہ خط درگوت کے سامنے پیش کر دیا اور کہا: ”جناب! اسے تو اس ملاح سے پہلے ہی لے لیا گیا تھا کہ انہیں یہاں سے نکل کر دے۔“

درگوت نے یہ خط لے لیا اور خط پڑھنے کے بعد اسے مایوسی ہوئی۔ کیونکہ یہ چارلس کے بے وفائی کی طرف سے لکھا گیا تھا۔ درگوت نے کہا: ”تم کتنے شاطر لوگ ہو کہ معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہو مگر باپ کی جگہ بیٹے کا نام داخل کر دیتے ہو اور یہ بھول جاتے ہو کہ معاہدے حکومتوں کے درمیان ہوتے ہیں جن کی پابندی اقتدار میں آنے والا ہر بادشاہ کرتا ہے۔“

درگوت شاخ زریں میں داخل ہوا اور قسطنطنیہ میں یہ خبر آنا غانا بھیل گئی کہ درگوت نے ایک ایجنسی جہاز کو گرفتار کر لیا ہے۔

سلطان سلیمان نے جب درگوت کو ایک ایجنسی جہاز کے ساتھ اترے دیکھا اور اس کو جریہ سے متعلق جو یہ معلوم ہوا کہ وہ کس طرح ڈوریا کو جھوکا دے کر جریہ سے نکل کر آیا ہے تو اسے اپنا یہ امیر البحر کچھ عجیب سا لگا جو ناقابل یقین کارنامے انجام دے رہا تھا۔

سلطان کو جریہ اور مہدیہ کے نکل جانے کا بے حد افسوس ہوا۔ اس نے درگوت سے پوچھا: ”یہ بحری اور

بندرگاہی معاملات میں تم سب کی مدد سے سمجھنا چاہتا ہوں۔ کبھی تم نے تینوں فتح کر لیا اور دوبارہ عیسائی پھر قابض ہو گئے۔ آخر کیا کیوں ہے اور اب انہوں نے مہدیہ اور جریہ بھی لے لیا ہے؟“

درگوت نے سلطان کو سمجھایا: ”جناب والا! خرابی کی جڑ مالٹا اور طرابلس ہیں۔ جب افریقہ کی باطل سلطنت پر ہم کوئی ایسی چال چلتے ہیں جس سے ان کو مات ہوئے لگتی ہے تو وہ مالٹا اور طرابلس کے ذریعے شد دے دیتے ہیں اور بازی الٹ جاتی ہے۔“

سلطان نے پوچھا: ”اس کا کوئی حل؟“ درگوت نے جواب دیا: ”سب سے پہلے طرابلس کی تعمیر اس کے بعد جریہ پھر مہدیہ اور مہدیہ کے بعد تینوں۔ اسی طرح ہماری طوفانی فیلادریا اگر الجزائر تک فتح کرنی چلی جائیں تو آئینہ بالکل مایوس ہو جائے گا۔“

سلطان سلیمان نے درگوت سے جواب طلب کیا۔ ”جب تجھ کو یہ معلوم تھا کہ مہدیہ نکل گیا اور طرابلس پر مالٹا قابض ہے تو جریہ میں داخل ہونے کی غلطی تو نے کیوں کی؟“ درگوت نے جواب دیا: ”اگر میں جریہ پر قابض رہتا تو مہدیہ کو ابس لے سکتا تھا۔“

سلطان نے حکم دیا: ”اب تجھے اپنی پوری توانائیاں طرابلس کی تعمیر پر لگ دینا چاہئیں تاکہ اس کے بعد اس پاس کی ریاستوں پر بھی ہم قابض ہو جائیں۔ طرابلس پر قبضے کے بعد گویا شمال میں تینوں تک ہم اس پورے مسلم علاقے پر قابض ہو جائیں گے۔“

یہ بحث جو حکم کی صورت میں ختم کر دی گئی تھی، درگوت کے مزاج کے مطابق تھی۔

سلطان نے اس بار پیالی پاشا، صنعان یہودی اور بحریہ کے ایک نئے امیر کو بھی درگوت کے حوالے کیا اور درگوت سے کہا: ”تو اب بھی امیر البحر ہے اور یہ جملہ صاحبان تیرے مشیر و معاون اور مددگار ہیں کیونکہ تیری سوچ ان سب سے مختلف اور حیرت انگیز ہوتی ہے مگر بحری جنگی معاملات کی یہ لوگ بھی نمایاں خصوصیات اور اہلیت رکھتے ہیں اس لیے ایک سے کئی بہتر ہیں گے۔“

درگوت نے کہا: ”جناب والا! انہیں ہدایات کی جائیں کہ یہ میرے معاملات میں دخل نہ دیں کیونکہ اگر میرے تابع نہیں رہیں تو میرے معاملات میں مداخلت ضرور کریں گے۔ ہاں یہ اپنی اپنی حد تک اور اپنے اپنے معاملات میں میرے پابند نہیں ہوں گے۔“

سلطان نے درگوت کی بات مان لی لیکن سلطان کے داماد اور وزیر رستم نے درگوت سے کہا: ”یہ کس طرح ممکن ہے کہ درگوت کا حکم تو یہ سب مانیں اور درگوت کسی کے مشورے اور رائے کا پابند نہ ہو۔ اسے تو میرے احکامات کی بھی پابندی کرنا ہوگی کیونکہ سلطان کے سارے احکامات میرے ذریعے سے درگوت تک پہنچتے ہیں۔“

درگوت کو رستم کی مداخلت ناگوار گزری کیونکہ وہ خیر الدین باربروس کی طرح اپنے معاملات اور تعلقات براہ راست سلطان سے رکھنا چاہتا تھا۔ رستم کو جواب دیا: ”میں سلطان سے براہ راست احکامات حاصل کر لیا کروں گا کیونکہ جنگی بحری معاملات بہت نازک اور حساس ہوتے ہیں اور ان میں وقت کی خاص اہمیت ہوتی ہے۔“

سلطان محسوس کر رہا تھا کہ رستم اور درگوت میں اختیارات کی کشمکش شروع ہوئی ہے۔ اس نے یہ کہہ کر دونوں کو خاموش کر دیا: ”تو درگوت سے میرے براہ راست تعلقات رہیں گے مگر کبھی بھی رستم بھی وسیلہ بن جائے گا۔“ اس طرح دونوں ہی خاموش ہو گئے لیکن دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت پیدا ہو گئی۔

درگوت نے طرابلس پر حملے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ پیالی پاشا اور صنعان یہودی اس کے معاون و مددگار بنے ہوئے تھے۔ قسطنطنیہ سے عیسائیوں کے خبروں نے بارسلونا خبریں بجھوائیں کہ شاخ زریں میں بحری بیڑا تیار کیا جا رہا ہے اور کچھ پتا نہیں کہ یہ بیڑا کس کے خلاف کارروائی کرے گا مگر تینوں کا امکان زیادہ ہے، اس لیے تینوں کو مستحکم کیا جائے۔

تینوں میں کچھ اور فوج بھیج دی گئی جبکہ ڈان گارشیائوس کے دہاں موجود تھا۔

درگوت نے کسی کو کچھ بتائے بغیر طرابلس کا رخ کیا۔ مالٹا یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ درگوت کی کارروائی ان کے اپنے مقبوضہ طرابلس کے خلاف ہونے والی ہے۔ وہ یہی سمجھتے رہے کہ ترکی بیڑا اگر تینوں پر حملہ آور نہ ہو تو مہدیہ اور جریہ پر حملہ آور ہوگا اور انہیں واپس لے لے گا۔

یہ بیڑا براہ راست طرابلس پہنچا اور طرابلس کی بندرگاہ کے سامنے لنگر انداز ہو گیا۔

طرابلس میں مالٹا کے حکام آنکھیں میاڑ میاڑ کر دیکھ رہے تھے کہ درگوت کے جہاز پچھاننا شروع ہو گئے۔ سب سے پہلے درگوت نے طرابلس کے عیسائی حکمران کو یہ معمولی سا حکم دیا: ”تم طرابلس کو خالی کر دو۔ شہر میرے حوالے کیا جائے۔“

ہم جہیں طرابلس سے نکل جانے کی اجازت دے دیں گے۔

اس کو شہری حاکم کی طرف سے سخت جواب ملا۔ ”درگوت کو معلوم ہونا چاہیے کہ طرابلس پر مقابلے کے بغیر قبضہ نہیں کیا گیا تھا جو میں اسے تیرے ہاتھ سے تیرے شکوک گدائی میں ڈال دوں۔ طرابلس تجھ کو نہیں دیا جاسکتا۔“

درگوت کو غصہ تو بہت آیا، جواب میں لکھا۔ ”میں باتوں میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا حالانکہ تم لوگوں نے تو طرابلس شکوک گدائی سے حاصل کیا تھا۔ اس بڑے تفریق نے چھوٹے بھکاریوں کو یونہی دے دیا تھا۔ میں بھکاریوں سے جنگ نہیں کرنا چاہتا۔ اس لیے میری امانت مجھے واپس ملنی چاہیے۔“

طرابلس میں عیسائیوں کے آنکھ فرنے 1510ء سے اس سمجھوتے پر عمل عیرا تھے کہ ہر فریق کا سردار ایک سال حکومت کرتا تھا اور دوسرے سال دوسرے فریق کا سردار اس سے اقتدار لے لیتا تھا۔ جب درگوت نے محاصرہ کیا تو ایورین کا کسپارڈی ویلر نامی مجاہد طرابلس کا گورنر تھا اور اسی سے درگوت کی بات چیت ہو رہی تھی۔

مابوی کے بعد درگوت نے صناعان یہودی کو حکم دیا۔ ”دو مہینوں تک قیوں سے حملے کی تیاریاں شروع کر دیں جائیں۔“

صناعان یہودی نے کارروائی شروع کر دی اور جہازوں نے سمندر سے قلعہ کو نشانہ بنایا۔ کسپارڈی ویلر نے حالات متعین دیکھے اور اسے اندازہ ہو گیا کہ گولہ باری سے قلعہ کی دیواریں ٹوٹ جائیں گی اس لیے اسے کہیں سے ملک ضرور ملنی چاہیے۔ چنانچہ مالٹا اور تیوس کا صدر دانہ کر دیے گئے۔

درگوت کو یقین تھا کہ کسپارڈی ویلر جس نے ابتدا میں سخت لہجہ اختیار کیا تھا اور اب وہ نرمی پر اتر آیا ہے اور صلح اور مفاہمت کی روش اختیار کی ہے تو اس طرح یہ شخص مہلت حاصل کر رہا ہے۔ یقیناً اس کی کہیں گفتگو چل رہی ہوگی، یہ ملک حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہوگا۔ یہ ملک کہاں سے حاصل کی جاسکتی ہے، اس میں اس سوال کا پہلا جواب مالٹا تھا، دوسرا تیوس۔

اس نے کئی کشتیاں دور دور روانہ کر دیں کہ وہ کسی بھی کسی کو طرابلس آنے دیں یہ جانے دیں۔ ایک کشتی پکڑی گئی جو ملک کے لیے مالٹا جا رہی تھی۔ اپنے خط میں کسپارڈی ویلر

نے لکھا تھا کہ درگوت کے مقابلے میں اس کی فوراً مدد کی جائے اور اس صورت حال سے بارسلونا کو بھی مطلع کر دیا جائے۔

اس کشتی کو درگوت نے اپنے بیڑے کے عقب میں پہنچا دیا اور کسپارڈی ویلر کو سوچنے اور شہر حوالے کرنے کے لیے دو دن دیے۔

کسپارڈی ویلر نے غدر پیش کیا کہ وہ اپنے مشیروں کی جس کونسل کے ذریعے طرابلس پر حکومت کرتا ہے اس کے چند ارکان موجود نہیں ہیں اور امید ہے کہ وہ ایک ہفتے کے اندر آجائیں گے اور پھر ان سب کے دستخطوں سے یہ شہر آپ کے حوالے کر دیا جائے گا۔ کیونکہ اتنا بڑا قدم وہ تنہا نہیں اٹھا سکتا۔ درگوت نے جواب میں لکھا۔ ”میں بھی نہیں چاہتا کہ تو طرابلس کو تنہا میرے حوالے کر دے اسی لیے میں تیرے مشیروں کو بھی اس نازک ذمہ داری سے دور رکھنا چاہتا ہوں۔ تجھ کو جو دن دیے گئے ہیں، وہ کافی ہیں۔ تیرے دن میری بجائے اپنا کام شروع کر دے گی اور اس کا جو انجام ہوگا اس سے ہم دونوں واقف ہیں۔“

کسپارڈی کی ساری راہیں بند کر دی گئی تھیں۔ اس کی سوچ پر بھی پھرے لگ گئے تھے۔ مگر جوں کے سمجھتے ہی گئے، انہوں اور انہوں نے گریہ و زاری شروع کر دی۔ شہری فرار کی راہیں تلاش کر رہے تھے لیکن صلیبی مجاہد جان دینے اور جان لینے کے لیے آمادہ تھے۔

صناعان یہودی وقت کے گزرنے اور میعاد کے ختم ہونے کا انتظار کر رہا تھا اور یہ انتظار کی کھڑی چمڑ کی اذان اور نماز کے بعد ختم ہوئی۔

فیصل پر گولہ باری شروع ہو گئی۔ عیسائیوں نے بھی توپوں کا جواب توپوں سے دیا مگر دیواروں میں شکاف پڑ گئے یا دیواریں ٹوٹ گئیں تو ان کے توپ خانے بھی ان دیواروں کے ساتھ نہیں بوس ہو گئے۔ عیسائیوں کے حوصلے بہت جلد جواب دینے لگے۔

دست بدست بڑی لڑائی کی نوبت اس لیے نہیں آئی کہ شہریوں کی ہنگامہ دہی نے مجاہدین کے حوصلے پست کر دیے تھے۔ اس کے علاوہ کئی دن سے گرجوں کے بچے والے سمجھتے، نعوں اور بادریوں کی گریہ و زاری بھی لڑنے والوں کے حوصلوں پر اثر انداز ہو رہی تھی۔

درگوت کے جہاز آگے بڑھتے بڑھتے ساحل کے قریب پہنچ گئے اور شہر کے بعد ترین جنوبی شہری حصے میں داخل

ہو گئے۔ اسی طرح کچھ فوج شمال سے داخل ہوئی۔

اب طرابلس دو طرف سے گھیر چکا تھا اور جنگجو عیسائیوں نے ان دونوں حصوں میں مسلمانوں کو روکنا شروع کر دیا جس سے قلب کمزور پڑ گیا اور مسلمانوں کو درمیان سے شہر میں داخل ہونے کا موقع مل گیا۔ یہاں بھی معمولی سا مقابلہ ہوا۔ کسپارڈی ویلر نے شہر کی چابیاں درگوت کے حوالے کر دیں اور شکایت آمیز لکھے میں لکھا۔ ”آپ نے بے صبری کا مظاہرہ کیا اور خوارخواہ اتنا گولہ بارود ضائع ہوا۔ میں تو اپنے مشیروں کا انتظار کر رہا تھا۔“

درگوت نے چابیاں لے لیں اور پوچھا۔ ”اب تم کیا چاہتے ہو؟“

کسپارڈی نے جواب دیا۔ ”جناب! جب 1522ء میں سلطان سلیمان نے رہوڈز کو فتح کیا تھا تو ہمارے ساتھ نہایت شفقانہ سلوک کیا گیا تھا اور اجازت دی گئی تھی کہ اپنے جملہ سامان سمیت ہم جہاں چاہیں، چلے جائیں۔ اس وقت ہم نے اپنے لیے مالٹا کو پسند کر لیا تھا اور سلطان نے ہمیں یہاں آباد ہو جانے کی اجازت دے دی تھی۔“

درگوت نے کہا۔ ”جس کا تم نے یہ جاننا فائدہ اٹھایا کہ طرابلس پر بھی قبضہ کر لیا اور جب تم سے سلطان کا تہانہ نہ طرابلس کی واپسی کا ذکر کرتے ہو تو تم بھاری کی طرح نفرت و تشدد کرتے ہو۔ اب کم از کم میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ تمہیں کوئی رعایت کس طرح دی جائے؟“

کسپارڈی نے کہا۔ ”ہمیں مالٹا جانے کی اجازت دی جائے۔“

درگوت نے کہا۔ ”تم اپنے اعلیٰ ترین عہدیداروں کو بھیجا کرو اس کے بعد کوئی بات ہوگی۔ میں ان سے پوچھوں گا کہ کیا تم میری دی ہوئی زندگی کی بھیک پر زبردہ رہنا پسند کرو گے؟“

کسپارڈی نے درخواست کی۔ ”براہ کرم آپ ہمارے لیے ذلت آمیز الفاظ نہ استعمال کریں۔ آخر ہم نے خود ہی مفاہمت کی بات شروع کی ہے تو ہمیں اس کا جواب بھی ایسا ہی ملنا چاہیے۔“

درگوت نے پھر وہی اعلیٰ منصب داروں کے بارے میں بات کی۔ ”براہ کرم وہ فہرست تو پیش کی جائے کہ ایسے کتنے لوگ ہیں تیرے ساتھ جو با عزت آزادی چاہتے ہیں؟“

درگوت فاتحانہ طرابلس میں داخل ہو گیا اور کسپارڈی نے نہ صرف اپنے معزز افراد کی فہرست پیش کر دی بلکہ ان سب کو بھی درگوت کے سامنے پیش کر دیا گیا۔

درگوت نے ان سب کو گرفتار کر لیا اور کسی بھی قسم کے معاہدے سے انکار کر دیا۔ اس نے کسپارڈی کو بتایا کہ اس نے یہ اس لیے کیا کہ کسپارڈی نے بھی اس کے ساتھ دھوکا کیا تھا کہ ایک طرف تو وہ درگوت سے صلح کی بات کر رہا تھا اور دوسری طرف اس نے مالٹا سے ملک طلب کر لی تھی۔ گویا وہ حکمت عملی سے جنگ کے وقفے کو طول دے رہا تھا اور صلح یا مفاہمت کا دل سے قائل نہ تھا۔ اس لیے اب وہ اس کے ساتھی کسی عہدہ دہی کے مستحق نہیں تھے۔

کسپارڈی نے اسے الزام قرار دیا اور سختی سے اس کی تردید کی تو درگوت نے اس سختی کے عمل کو کسپارڈی کے سامنے پیش کر دیا جو مالٹا ملک لینے جا رہا تھا۔ اس عمل میں کسپارڈی کا قصدمی موجود تھا۔

کسپارڈی نے ہمت نہیں ہاری اور دوسری دلیل دی۔ ”لیکن ہم دونوں میں مفاہمت ہوئی تھی۔ آپ کو اس کا تو پاس کرنا چاہیے تھا۔“

درگوت نے تند و تیز لہجے میں جواب دیا۔ ”جب تم لوگ مسلمانوں کے کسی شہر پر غلبہ حاصل کرتے ہو تو وہاں کے مقامی مسلمانوں سے رواداری کا سلوک نہیں کرتے، ان سے بھگانے پیش آتے ہو اور ہم سے رواداری اور انسانیت سے پیش آنے کی امید رکھتے ہو۔“

کسپارڈی نے بڑی دلیلیں دیں اور درگوت کو ہر طرح سے قائل کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا اور ان سب کو قید کر کے قسطنطنیہ روانہ کر لیا اور سلطان سے درخواست کی کہ ان قیدیوں کو قسطنطنیہ کے کوچہ و بازار سے باہر جولانہ گزرا جائے تاکہ انہیں معلوم ہو کہ جب وہ مغلوب مسلمانوں کے ساتھ ایسا سلوک کرتے ہیں تو ان مسلمانوں کے دلوں پر کیا گزرتی ہے۔

قسطنطنیہ میں کسپارڈی اور اس کے ساتھیوں سے وہی سلوک کیا گیا جس کی درگوت نے خواہش کی تھی۔ اب درگوت طرابلس کے استحکام میں مشغول ہو گیا، کیونکہ اسے معلوم تھا کہ مغربی دنیا طرابلس کے معاملے میں خاموش نہیں رہے گی کیونکہ یورپ کی مسیحی اقوام نے مالٹا کے عمارت گروں کے ذریعے طرابلس کو افریقہ کے مسلم ملکوں میں آؤٹ پوسٹ (بیرونی چوکی) کی حیثیت دے رکھی تھی اور مالٹا کی حکومت عیسائیوں کا مقصد انکیش یا عرف عام میں ہراولی دستہ تھی۔ طرابلس سے مطمئن ہونے کے بعد جرہہ کے خلاف کارروائی کی گئی اور درگوت نے اسے بھی چھین لیا پھر مہدیہ کا رخ کیا اور اس پر بھی قابض ہو گیا۔

یہ ساری خبریں یورپ پہنچ رہی تھیں۔ چارلس نے الجزائر کی بریت اور پسپائی کے بعد معاملات حکومت اور مذہبی جہاد سے لے کر تعلقی اختیار کر لی تھی اور اپنا تاج الجزائر سے واپس آتے ہوئے حمارت سے سمندر میں پھینک دیا تھا۔ وہ کاروبار مملکت بتدریج اپنے بٹے قلب کو منتقل کرتا رہا اور خود خانقاہ بن ہو گیا۔ وہاں بااثر اہل خانہ تیار کیا خداوند متعال کی یاد تھی۔ شراب نوشی یہاں بھی جاری رہی۔

نوجوان حکمران قلب نے اقتدار سنبھالنے ہی باپ کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی۔ وہ درگوت کے قصے کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دینا چاہتا تھا تا کہ تاریخ میں وہ باپ سے ایک قدم آگے نکل جائے۔

چارلس آٹھ حکومتوں کا واحد حکمران تھا اور اب اس کے بعد یہ حیثیت قلب کو حاصل ہونا چاہیے تھی لیکن چارلس کے چھوٹے بھائی فردی نڈ نے پاپائے اعظم سے ساز باز کر کے چارلس کا مقام خود حاصل کر لیا۔

قلب کو اس سے دکھ تو پہنچا مگر اس نے عملاً یہ ثابت... کہنے کی کوشش کی کہ وہ اپنے باپ چارلس کا صحیح جانشین ہے اور اس کے جس منصب اور مقام کو چھین کر غاصب فردی نڈ کو دیا گیا ہے وہ اسے واپس ملنا چاہیے۔ اس نے بھی طرابلس کے نکل جانے کی خبریں سنیں اور اس کی واپسی کے لیے بے چین ہو گیا۔ وہ درگوت کو معذور ہستی سے مناد بنا چاہتا تھا۔

بوڑھے ڈوریا نے نوجوان بادشاہ کو درگوت کے بارے میں بتایا کہ اسے قلب کے باپ نے ایک معمولی اور حقیر امیر البحر سمجھ کر تین ہزار سونے کے سکے لے کر چھوڑ دیا تھا۔ آج وہی درگوت پوری سبکی دنیا کے لیے وبال جان بنا ہوا تھا۔ ڈوریا نے ہی قلب کو یہ سمجھایا تھا کہ اگر قلب پورے یورپ کو متحد کر کے طرابلس پر یلغار کرے اور طرابلس سے تیونس تک کے علاقے پر دوبارہ قابض ہو جائے تو سبکی تاریخ میں اس کو چارلس سے بڑی حیثیت حاصل ہو جائے گی۔

یہ کام اتنا آسان نہیں تھا اس لیے طرابلس پر فوج کشی سے پہلے اعلیٰ درجے کی حکمت عملی درکار تھی۔

ماضی میں عالم اسلام کے خلاف جب بھی عیسائیت نے عملی قدم اٹھایا، اس میں پادریوں نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ کوئی پر جوش پادری یا رابب پورے یورپ کو مسلمانوں کے خلاف متحد کر سکتا تھا۔

اب قلب کے ایما پر یہ خدمت پاپائے روم میں چارم نے انجام دی۔ اس نے مسلمانوں کے خلاف پر جوش خطبے دیے۔ جینوا، فلورنس، سکسی، نیپلز اور اٹلی میں اپنے خطبوں سے

آگ لگا دی۔ وہ جنوبی یورپ کے لوگوں کو جتنا پھر رہا تھا کہ مالٹا کے مقدس سیلپی مجاہدین کے ساتھ طرابلس میں کیماذلت آمیز سلوک کیا گیا۔

ان خطبات نے ایک آگ سی لگا دی اور عیسائیوں میں درگوت کے خلاف ایک ایسا پیمانہ اور جوش پیدا ہو گیا، جسے دیکھ کر کوئی بھی یہ رائے قائم کر سکتا تھا کہ جنوبی یورپ کا یہ مسکنی سیلاب درگوت اور طرابلس کو بہا لے جائے گا۔

قلب اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ ایتھین میں مسکنی مجاہد پہلے سے ہی تیار تھے۔

اس دوران میں درگوت، پیالی پاشا اور صغان یہودی اٹلی اور اس کے نواح میں حملے کرتے پھر رہے تھے اور ویش کو بھی ان کے حملوں سے نقصان پہنچا تھا۔ سلطان سلیمان کا داماد وزیر ویش کی طرف داری کرتا تھا اور اس نے کئی بار درگوت کو متنبہ بھی کیا تھا کہ نہ صرف ویش کے خلاف کارروائی نہ کی جائے بلکہ ان آبی شاہراہوں کو بھی محفوظ رکھا جائے جو ویش کی گزرگاہیں ہیں۔

درگوت سمندری سطح پر اپنے سوا کسی کی بلا دیتی قبول کرنے کو تیار نہ تھا۔ وہ اٹلی کے مضامعات سے مال و زر لے کر قسطنطنیہ پہنچا تو اس کے ساتھ غلاموں کی بھی ایک بڑی تعداد تھی۔ سلطان سلیمان قسطنطنیہ میں موجود نہیں تھا۔ سلطان کی علم موجودگی کا رستم نے فائدہ اٹھایا۔

درگوت کو ایوان وزارت میں طلب کیا گیا۔

درگوت ایک سر پھرا، خود سر اور من چلا امیر البحر تھا۔ وہ نہایت متکبرانہ انداز میں اندر داخل ہوا۔ ایوان وزارت کے کسی پیریدار یا محافظ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ درگوت کو اندر جانے سے روک دیتا۔

درگوت نے رستم کے بارے میں سن رکھا تھا کہ یہ سلطان سلیمان کی چہیتی جی مہر ماہ کا شوہر ہے اور سلطنت عثمانیہ کی پوری تاریخ کا یہ واحد وزیر اعظم ہے جسے محلات کی بیگمات کی سفارش پر وزیر اعظم مقرر کیا گیا اور رستم وہ شخص ہے جو بہت کم باتیں کرتا ہے اور جب کرتا ہے تو صرف حکم دیتا ہے۔ اس کو کبھی کسی نے ہنسنے یا مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا۔

درگوت کو اس عجیب و غریب شخص کا سامنا کرنا تھا۔ چنانچہ جب وہ متکبرانہ شان سے رستم کے سامنے پہنچا تو رستم اس کی اس روش سے خوش نہیں ہوا اور ایک پیریدار کو طلب کر کے پوچھا۔ ”تم کچھ دیر پہلے کہاں تھے؟“

پیریدار نے جواب دیا۔ ”میں کئی گھنٹے سے دروازے پر موجود تھا اور اب بھی ہوں۔“

رستم نے اپنے سامنے کھڑے ہوئے درگوت کو دیکھا اور پیریدار سے کہا۔ ”تم نااہل ہو، تم پر خاست کیے گئے۔“

پیریدار میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ عذر داری کرتا۔

چپ چاپ باہر نکل گیا۔

درگوت نے کہا۔ ”میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ جو بات کرنی ہے فوراً کی جائے۔“

درگوت سے ابھی تک بیٹھنے کے لیے بھی نہیں کہا گیا تھا۔ وہ خود بیٹھ گیا۔

رستم نے دوسری نشست کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہاں نہیں ادھر بیٹھو۔“

درگوت نے رستم کے حکم کی کوئی پروا نہ کی اور کہا۔ ”میرے پاس زیادہ وقت نہیں، بات کرو ورنہ میں چلا جاؤں گا۔“

رستم نے نہایت رعوت سے حکم مان لے جس میں کہا۔ ”ویش ہمارا حلیف ہے۔ آئندہ اس سے چھین چھاڑ نہ کی جائے اور اس کی آبی شاہراہوں کو برائیں رکھا جائے۔“

درگوت نے جواب دیا۔ ”امیر البحر میں ہوں اور سمندر تمہارے اختیارات وزارت میں نہیں آتا اور نہ تم مجھ سے سمندری معاملات میں بات کر سکتے ہو۔“

رستم نے پھر اپنی بات دہرائی۔ ”ویش ہمارا حلیف ہے۔ اس سے چھین چھاڑ نہ کی جائے اور اس کی آبی شاہراہیں برائیں نہ کی جائیں۔“

درگوت نے سختی سے تردید کی۔ ”ویش ہمارا دوست نہیں ہے کیونکہ اس کی دوستی جنگ پری ویزا کے ساتھ ہی ختم ہو گئی تھی۔“

رستم نے سہ بارہ سختی سے کہا۔ ”یہ میرا حکم ہے۔ میں نے جو کہہ دیا اس کی تعمیل ہونی چاہیے۔ بس اس کے سوا کچھ نہیں۔“

درگوت نے اکھڑ لہجے میں جواب دیا۔ ”بحری معاملات میں تیری کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اس لیے آئندہ کسی بھی آبی شاہراہ یا بحری معاملے کا مجھ سے ذکر نہ کیا جائے۔“

اب رستم نے جیتھر ابدلا۔ ”طرابلس کو جس نے فتح کیا تھا وہ اسے بخش دیا گیا۔ یعنی اب طرابلس صغان یہودی کے حوالے کیا گیا۔ اس سے تیرا کوئی تعلق نہیں رہا۔“

درگوت نے سختی سے کہا۔ ”طرابلس کی ہم کا امیر البحر میں تھا، اسے میں نے فتح کیا تھا۔ جب کسپارڈی اور اس کے ساتھی میرے حکم پر گرفتار کیے گئے تھے تو انہیں قسطنطنیہ کے کوچہ بازار میں پابھی جولاں میری فرمائش اور میری خواہش پر

پھرایا گیا تھا۔ کسپارڈی نے طرابلس شہر کی کتھیاں میرے حوالے کی تھیں۔ صغان یہودی تو میرا شریک کار بلکہ تا بعد ار تھا۔“

رستم نے کہا۔ ”اب صغان یہودی نہیں، صغان پاشا ہے۔ طرابلس کا حکمران صغان پاشا۔“

درگوت نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ”مگر یہ سب کچھ تیرے حکم سے ہو رہا ہے تو میں تیرا یہ حکم نہیں مانوں گا اور اگر یہ سلطان کے حکم سے ہے تو مجھے مرنے کا حق ملنا چاہیے۔“

رستم نے کہا۔ ”تو خود کہہ چکا ہے کہ میرے اختیارات سلطنت عثمانیہ کی زمینوں تک ہیں اور شہر طرابلس زمین پر واقع ہے۔ تو شوق سے سمندر پر حکمرانی کرتا رہ۔“

درگوت نے ایوان وزارت سے نکلے ہوئے کہا۔ ”میں طرابلس سے دستبردار نہیں ہو سکتا اور اگر تو یہ چاہتا ہے کہ میں تیری کا سہیلیسی کروں تو یہ ناممکن ہے۔ اگر تو میری جرات، دلیری اور بہادری کا نظارہ کرنا چاہتا ہے تو مجھے شاخ زریں پہنچ کر مشاہدہ کرنا ہوگا۔“

رستم نے اپنے ایک محافظ کو حکم دیا کہ وہ شاخ زریں کی بحمرانی کرے اور درگوت جیسے ہی وہاں پہنچے اسے اطلاع دی جائے۔

درگوت نے بازار کا رخ کیا اور وہاں سے سرخ کپڑے کا ایک تھان خرید اور اسے جہاز پر لے جا کر حکم دیا کہ ہلائی پرچم کے ساتھ اس کے پرچم تیار کیے جائیں۔

رستم کو خبر کر دی گئی کہ درگوت شاخ زریں میں داخل ہو چکا ہے۔

رستم فوراً اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ خیر الدین باربروسہ کے مزار کے روضہ میں داخل ہوا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ درگوت کتنا ہی غصے یا اشتعال میں کیوں نہ ہو وہ جانے سے پہلے خیر الدین باربروسہ کے مزار پر حاضری ضرور دے گا اور جہاز روانگی سے پہلے خیر الدین باربروسہ کے مزار کو توپوں سے سلامی ضرور دیں گے۔

رستم نے بھی باربروسہ کے مزار کے سرہانے کھڑے ہو کر فاتحہ پڑھی۔ اچانک درگوت بھی دو ساتھیوں کو لیے ہوئے اندر داخل ہوا اور رستم کو فاتحہ پڑھتے ہوئے دیکھ کر خود بھی فاتحہ پڑھنے لگا۔

فاتحہ پڑھ چکے کے بعد اس نے رستم سے کہا۔ ”مجھے تیرا انتظار تھا۔ تو آگیا بڑی خوشی ہوئی۔ باہر نکل اور نیا تماشا دیکھ۔“

رستم نے باہر نکل کے درگوت کو جہازوں کی طرف

جاتے ہوئے دیکھا۔

یہ بڑا صبر آزمایہ وفد تھا۔ رستم کی نظر میں درگوت کے بحری بیڑے پر بھی ہوئی تھیں جن پر ہلائی پرچم لہرا رہے تھے۔ اس نے اچانک ایک شخص کو بادبانوں سے متصل پرچم والی لمبی پرچے سے دیکھا۔ اس کی بغل میں ایک سرخ کپڑا دبا ہوا تھا۔

پھر ہلائی پرچم غائب ہو گیا اور اس کی جگہ سرخ پرچم لہرانے لگا اور اس کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے جملہ جہازوں پر سے ہلائی پرچم غائب ہو گئے اور ان کی جگہ سرخ پرچم لہرانے لگے۔

پھر درگوت کی طرف سے اعلان ہوا۔ ”رستم! اب تو مجھے سمندری راہوں میں تلاش کرو! جہاں کوئی علامت نہیں ہوتی، کوئی عمارت نہیں، کوئی چوراہا نہیں، کوئی جنگل نہیں، کوئی درخت نہیں اور کوئی بازار اور کوئی کوچہ نہیں۔ میں سب سمندر کا بے تاج بادشاہ ہوں۔ مجھ پر تیرا حکم نہیں چلے گا۔“

رستم حیران تھا کہ وہ یہ کیا دیکھ رہا ہے اور کیا سن رہا ہے۔

ایک ایک توپوں کی آواز گونجی گویا درگوت کے جہازوں نے خیرالدین یا روبرو سکورھستی سلام کیا تھا۔

درگوت کا بحری بیڑا دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو گیا اور رستم سرکشی اور بغاوت کا شاندار اور ناقابل فراموش نظارہ کر رہا۔

اب رستم کو یقین تھا کہ درگوت نے جذبات اور جوش کے عالم میں جو عاقبت نااندیشانہ قدم اٹھایا تھا وہ اس کے خطرناک انجام کی نشاندہی کر رہا تھا۔ گویا رستم نے درگوت کو اس مقابلے میں شکست دیدی تھی۔ عثمانی پرچم کی بے حرمتی اور اس کو اتار کر اپنا پرچم لہرانے کی سرکشی۔ یہ بظاہر ایک مگر حقیقتاً دو ناقابل معافی جرم تھے۔ رستم سلطان سلیمان کے مزاج اور غیظ و غضب سے واقف تھا۔ ایک ایسا شخص جس نے اپنے ولی عہد، اپنے سب سے بڑے بیٹے کو نہ معاف کیا ہو، وہ درگوت کو کس طرح معاف کر دے گا۔

پورے قسطنطنیہ میں ہر شخص کی زبان پر درگوت کی سرکشی کے چرچے تھے۔

رستم نے صناعین بیودوی کو صناعان پاشا کر دیا تھا۔ طرابلس کی حکومت اس کے نام کر دی گئی اور اسے حکم دے دیا گیا کہ وہ فوراً طرابلس پہنچے اور طرابلس کا قلم و نقش سنبھال لے۔

ان دنوں یورپ متحد ہو رہا تھا اور مشرق اور سلطنت

عثمانیہ انتشار کی طرف مائل تھے۔ وہاں ہم خیال اور ہم ارادہ لوگ تھے، یہاں ہر شخص کے ساتھ اس کی سوچ الگ تھی، ارادے الگ تھے، نصب العین الگ تھا۔

سلطان سلیمان وسط ایشیا کے دورے سے واپس آیا اور یہاں آتے ہی رستم کی زبانی درگوت کی سرکشی اور بغاوت کی داستان سنی تو ذرا سی دیر کے لیے سلطان بھی بہک گیا اور اس نے حکم دیا کہ درگوت جہاں کہیں بھی ہو، اسے گرفتار کر لیا جائے۔

رستم کے لیے بس یہ فرمان کافی تھا۔ طرابلس صناعان پاشا کو دے دیا گیا۔ اس طرح دو دوستوں میں علیحدگی ہو گئی۔ اب رستم کے پیچھے ہوئے بحری جہاز بحیرہ روم میں رواں دواں ہو گئے لیکن رستم نے صرف اس کی تلاش براکتفا نہیں کیا بلکہ وہ ایک بحری بیڑا بھی ترتیب دینے لگا جو درگوت کو سمندر پر گرفتار کرے اور اگر وہ قابو میں نہ آئے تو اسے تباہ و برباد کر دیا جائے۔

عثمانی جہاز بحیرہ روم میں درگوت کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ ان جہازوں کو درگوت کی یہ نشانی بتائی گئی تھی کہ اس کے جہازوں پر سرخ و سفید پرچم لہرا رہے ہوں گے۔ سرخ پرچم لہراتے ہوئے تو رستم نے بھی دیکھے تھے لیکن سفید پرچموں کے بارے میں اسے ان محسوسات نے خبر دی تھی جو درگوت کے جانے والے وقت پاسفوس کو عبور کر رہی تھیں اور ایشیائے کوچک کی کسی بندرگاہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ان محسوسات کے ملاحوں نے سرخ پرچموں کے درمیان سفید پرچم بھی دیکھے تھے۔

☆☆☆

سلطان سلیمان کو قلب اور پاپائے روم چہارم کی متحدہ کوششوں کی خبریں پہنچ رہی تھیں۔ ان کی تقریروں کے نتیجے میں یورپ اور جس طرح متحد ہوا تھا اسے یہ خبر بھی بالخصوص ملی گئی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ تقریباً دو سو بحری جہاز طرابلس کو واپس لینے کے لیے تیار ہیں۔

اسی عالم میں رستم نے سلطان کو بتایا۔ درگوت نے سرکشی اختیار کی اور اس نے اپنے جہازوں پر سے سلطنت عثمانیہ کے ہلائی پرچم اتار دیے اور اپنے پرچم لہرا دیے۔

سلطان، رستم کی زبانی درگوت کی بغاوت اور سرکشی کی کہانی سنتا رہا اور اس نے پوچھا۔ ”اس نے ایسا کیوں کیا؟“ رستم نے بتایا۔ ”میں نے ویش کے سلسلے میں درگوت کو ہدایات دی تھیں کہ ویش ہمارا سالہا سال حلیف رہا ہے مگر جب اس نے ہماری دوستی کو بالائے طاق رکھ دیا اور اتحاد

ملائے گا ایک رکن بن گیا اور پری ویزا کے مقام پر بحری جنگ میں اسے شکست ہو گئی تو سلطنت عثمانیہ نے اسے دی ہوئی مراعات واپس لے لیں۔ اس طرح ویش بالکل تباہ و برباد ہو گیا حالانکہ بعد میں اس نے تاوان جنگ بھی ادا کر دیا اور معافی بھی چاہی۔ اسے معاف بھی کر دیا گیا لیکن درگوت نے ویش کو کئی بار نقصان پہنچایا اور اس کی آبی شاہراہوں کو کھدو کھدو اور خطرناک بنا دیا جس پر میں نے درگوت کو حکم دیا کہ وہ آئندہ ایسا نہیں کرے گا۔ درگوت نے میرا حکم ماننے سے انکار کر دیا اور اس نے کہا کہ سلطنت عثمانیہ کا حکم زمینوں کی حد تک قابل قبول ہو سکتا ہے، سمندروں کا مالک و مختار درگوت ہے اس لیے درگوت کو میرا حکم نہیں مانے گا۔“

سلطان سلیمان یہ کہانی نہایت دلچسپی سے سنتا رہا اور جب رستم چپ ہو گیا تو سلطان نے پوچھا۔ ”چپ مت ہو، آگے بیان کرو پھر کیا ہوا؟“

رستم نے کہا۔ ”مجھے بتایا گیا تھا کہ طرابلس کی تعمیر میں صناعان کا گرفتار حصہ تھا۔ میں نے اپنے زمینی اختیارات سے کام لیتے ہوئے طرابلس کی حکومت صناعان کو دے دی اور اس کے نام کے ساتھ پاشا کا اضافہ کر دیا۔“

سلطان نے پوچھا۔ ”پھر کیا ہوا؟“ رستم نے کہا۔ ”درگوت نے میرے اس فیصلے کی مخالفت کی اور کہا کہ صناعان تو میرا شریک کار اور ماتحت تھا۔ اسے طرابلس کا حکمران نہیں بنایا جاسکتا اور پھر وہ اتنا مشتعل ہوا کہ اس نے اپنے جہازوں پر سے ہلائی پرچم اتار دیے اور ان کی جگہ سرخ و سفید پرچم لہرا دیے اور مجھ سے کہا کہ اب تم مجھے سمندری سرخ و سفید پرچم دھوئے رہو۔“

رستم خاموش ہو گیا اور سلطان کچھ سوچنے لگا۔ کچھ دیر بعد پوچھا۔ ”تو اب وہ کہاں ہوگا؟“

رستم نے جواب دیا۔ ”وہ کہیں بھی ہو، اگر وہ ہلائی پرچم کے بغیر اپنا ذاتی پرچم لگائے سمندری سطح پر رہے گا تو کہیں کا بھی نہیں رہے گا۔“

سلطان نے پوچھا۔ ”اس کی تلاش کا بندوبست کیا گیا؟“

رستم نے جواب دیا۔ ”ہمارے کئی جہاز اس کی تلاش میں جا چکے ہیں اور میں اس کی مکمل سرکوبی کے لیے ایک بحری بیڑا ترتیب دے رہا ہوں۔“

سلطان نے گویا نیند سے بیدار ہوتے ہوئے کہا۔ ”درگوت کے بحری بیڑے میں جہاز کس کے ہیں؟“ رستم نے جواب دیا۔ ”بیشتر جہاز ہمارے ہیں اور چند

وہ جہاز ہیں جو.... درگوت نے عیسائیوں سے چھینے تھے یا خود تیار کروائے تھے۔“

سلطان نے دل ہی دل میں حساب لگاتے ہوئے کہا۔ ”تو گویا اس نے ایک جرم اور کیا یعنی اپنے ساتھ ہمارے جہاز بھی لے گیا۔“

رستم نے نہایت خوشی سے تائید کی اور کہا۔ ”بے شک اور اسی لیے میں مغربیہ درگوت کے تعاقب میں ایک بحری بیڑا روانہ کر دوں گا جو اس کو گرفتار کر کے یہاں لے آئے گا اور اگر تکلیف مقابلہ ہوا تو درگوت کو ہلاک کر دیں گے۔“

سلطان نے کہا۔ ”یہ آخری بات غلط ہے۔ درگوت کو میرے سامنے زندہ لایا جائے کیونکہ میں اس مقدمے کی پوری روداد اس سے بھی سننا چاہتا ہوں اور عدالت میں انصاف کا تقاضا بھی مکن ہے کہ عدلیہ اور مدعا علیہ دونوں کو سامنے کھڑا کر کے ان کے بیانات لے لیے جائیں۔ مستفیض سے دعویٰ سننے اور دوسرے فریق سے جواب دعویٰ سننے پھر کسی نتیجے پر پہنچا جاسکتا ہے۔ درگوت کے خلاف انتہائی کارروائی فی الحال نہیں کی جاسکتی۔“

رستم کو ایسا کچھ عجیب و غریب مقدمہ بار رہا ہے۔ اس نے کہا۔ ”درگوت ایک جونی، خود راہ من جلا امیر البحر ہے جو من مانے فیصلے کرتا ہے اور یہ سب کچھ حکومتی نظم و ضبط کے خلاف ہے۔ آئی کتنا ہی فہمے میں کیوں نہ ہو اسے قوی پرچم کا ہر حال میں احترام کرنا چاہیے مگر درگوت نے قوی پرچم کی بے حرمتی کی ہے۔“

سلطان نے کہا۔ ”سب درست لیکن اب یہ مقدمہ میری عدالت میں چلے گا۔ اگر مسئلہ مذہبی ہو تو مفتی کو شریک کر لیا جاتا۔“

رستم نے آہستہ سے کہا۔ ”تب پھر ہمیں درگوت کا انتظار کرنا پڑے گا مگر مجھے یہ بھی یقین ہے کہ اس کی تلاش میں نکلنے والے جہاز اگر اسے تلاش کرنے میں کامیاب بھی ہو گئے تو اس کو واپس لانے میں ناکام رہیں گے۔“

سلطان سلیمان کا حکم تھا کہ.... درگوت کو واپس لایا جائے، اس طرح کہ لڑائی کی نوبت نہ آئے۔

رستم نے درگوت کے خلاف بحری بیڑے کی تیاری جاری رکھی اور کئی جہاز مختلف سمتوں میں درگوت کی تلاش میں روانہ کر دیے گئے۔

حالانکہ رستم کو یقین تھا کہ کوئی بھی تھا جہاز درگوت کو واپس نہیں لاسکتا بلکہ یہ امکان تھا کہ یہ جہاز بھی درگوت کے قبضے میں چلے جائیں گے اور درگوت کے بحری بیڑے میں

درگوت نے کریت کے ساحل پر قیام کیا۔ اب اس کے سامنے کی ساحلی بندرگاہیں تھیں جہاں وہ اپنے بحری بیڑے کو ٹھہرا سکتا تھا اور ان میں موزوں ترین بندرگاہ الجزائر تھی جس کو آئے دن آجین سے خطرہ لاحق رہتا تھا۔ یہ بندرگاہ اس کی سب سے زیادہ پسندیدہ تھی۔ یہاں کے لوگ بھی اس سے نہ صرف واقف تھے بلکہ بہت مانوس تھے اور شاہی حسن آغا کو بھی یہاں ایک مضبوط امیر البحر کی ضرورت تھی۔ درگوت کو یقین تھا کہ الجزائر اسے پناہ دے سکتا تھا اور اگر کسی وجہ سے حسن آغا مجبور ہو جائے تو تینیس اور الجزائر کے درمیان کی ایسی غیر معروف بندرگاہیں موجود تھیں جو اس کی معاون اور پناہ گاہ بن سکتی تھیں۔ یہاں سے وہ آزادانہ بحری قزاقی کر سکتا تھا۔ اسے اس بات کا قطعی کوئی دکھ یا افسوس نہیں تھا کہ اس نے سلطنت عثمانیہ کے وزیر رستم سے جھگڑا کیا اور اپنے جہازوں سے بلالی پرچم اترادیا اور ان کی جگہ اپنے سرخ و سفید سادہ پرچم لہرا دیے۔

سلطنت عثمانیہ کا ایک جہاز درگوت کو تلاش کرتا ہوا کریت پہنچ گیا۔ اس نے کریت کے ساحل پر بہت سے جہاز لشکر اعزاء دیکھے تھے۔ ان جہازوں پر سرخ و سفید پرچم لہرا رہے تھے جس سے ترکی کے متلاشی جہاز کو معلوم ہو گیا کہ یہ درگوت کے جہاز ہیں۔

درگوت کے ساتھیوں نے بھی ایک جہاز کو اپنی طرف آتے دیکھا جس پر دو پرچم لہرا رہے تھے، ایک پرچم تو بلالی تھا اور دوسرا سفید۔ اس کا یہ مطلب تھا کہ یہ جہاز درگوت سے صلح کی بات چیت کرنے آیا ہے۔

اس وقت درگوت کھنکی پر بیٹھا پر لطف باتوں میں مشغول تھا۔ اسے اس کے دوستوں نے ٹھہرے میں لے رکھا تھا اور اس سے پوچھ رہے تھے کہ وہ کریت کا ساحل چھوڑنے کے بعد کہاں جائے گا؟

درگوت نے الجزائر کا نام نہیں لیا اور کہا۔ ”اب تو ہمیں دوبارہ قزاقی کا پیشا اختیار کرنا پڑے گا جس میں کسی کی خوشی یا ناخوشی کا خیال نہیں کرنا پڑتا۔ کسی بالادست کو کوئی حصہ نہیں دینا پڑتا۔ دل و دماغ سے جواب طلبی اور جواب دہی کا دھڑکا لٹل جائے گا۔“

اس کے ایک دوست نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔ ”جناب! میں آپ کی اس دھڑکے والی بات سے اتفاق نہیں کروں گا۔ اب تو آپ کوئی ستوں سے دھڑکا لٹل جائے گا۔ سلطان سلیمان کا دھڑکا اس کے جہاز ایک سرکش باغی مغرور

کی تلاش میں ہوں گے۔ آجین کا دھڑکا جو ایک لاوارث، بے آسرا، مخرب امیر البحر کو تلاش کر رہے ہوں گے جنہیں اس سے بہت زیادہ نقصانات پہنچے۔ مانا کے مصلحتی مجاہدین کا خوف جن کی یہ کوشش ہوگی کہ درگوت اور سلطان سلیمان میں کسی طرح دوبارہ مفاہمت نہ ہو جائے۔ وہ اس مفاہمت سے پہلے ہی آپ کا کام تمام کر دینے کی کوشش کریں گے۔“

درگوت..... اسے ساتھی کی کھنکی ہوئی ہونا کہ خیالی تصویر سے ذرا بھی نہ گھبرا یا اور اپنے ساتھی سے پوچھا۔ ”دوست! یہ دنیا کتنی بڑی ہے اور ابھی کتنی کام ہمیں علم ہے اور کتنی سے ہم بے خبر ہیں؟“

ساتھی نے جواب دیا۔ ”دنیا کے اور چھوڑ کر کسی کو کچھ پتا نہیں۔ تا معلوم دنیا کا ہمیں کوئی علم نہیں لیکن معلوم دینا اپنی وسیع ہے کہ دن رات چلتے رہے تو بھی یہ کبھی ختم نہیں ہوگی۔“

درگوت نے کہا۔ ”تو سن۔ میں نظر انہیں ہوں اور خدا کی زمین بہت وسیع ہے۔ میں اس زمین پر کہیں بھی جا سکتا ہوں۔“

اس دوران میں ایک شخص بھاگتا ہوا درگوت کے پاس پہنچا اور بے آواز بلند خبر دی۔ ”سلطنت ترکیہ کا ایک جہاز حکومت کا بلالی پرچم اور امن و صلح کا ایک سفید پرچم لہرا رہے ہوئے حارب قریب پہنچ چکا ہے۔“

درگوت نے بے چینی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”اپنے بیڑے کو مستعد کر دیا جائے۔ یہ امن و صلح کا جہاز اپنے پیچھے بہت سے جہازوں کو لاسکتا ہے تاکہ جب ہم مطمئن ہو گے جہاز والوں سے امن و صلح کی بات کریں تو اس غفلت سے فائدہ اٹھا کے سلطان کے دوسرے جہاز ہم پر حملہ کر دیں۔ اس لیے اس وقت ہماری یہ حیثیت نہیں ہے کہ ہم کسی پر آنکھ بند کر کے گھر و سار کر لیں۔“

دیکھتے ہی دیکھتے تمام جہازوں پر اس کا علمہ اور فوجی پہنچ گئے۔

درگوت ساحل پر ہی کھڑا رہا۔ اس کی نظریں دور سمندری سطح کا جائزہ لے رہی تھیں کہ شاید کسی طرف سے اور جہاز نمودار ہوں۔

اس دوران میں آنے والے جہاز سے چند آدمی اترے اور درگوت کے پاس پہنچے۔ ان میں سے ایک کو درگوت نے پیالی پاشا کے ساتھ دیکھا تھا۔ اس کا نام سعید تھا اور یہ باتیں بڑی پر لطف کیا کرتا تھا۔

سعید نے درگوت کو دیکھتے ہی سلام کیا اور کہا۔ ”استاد! آپ نے بہت پریشان کیا۔ کہاں کہاں کی خاک چھان کر

درگوت نے کہا۔ ”تو نے تو اب تک مجھے سمندر کی سطح پر ہی تلاش کیا ہوگا اور سمندر کی سطح پر خاک کا وجود نہیں ہوتا پھر تو نے کس طرح خاک چھانی؟“

سعید نے کہا۔ ”میں نے اپنی محنت اور پریشانی کو محاورے کی زبان میں بیان کیا ہے۔“

درگوت ہنسنے لگا۔ ”کیسے آتا ہوا؟“

سعید نے جواب دیا۔ ”جناب! آپ نے ہم سب کو چھوڑ دیا۔ آپ واپس چلیں۔“

درگوت نے کہا۔ ”تو نے کہہ دیا کہ واپس چلیں۔ یہ کیا بات ہوئی، تفصیل بیان کر۔“

سعید نے بتایا۔ ”آپ کا مقدمہ سلطان کی عدالت میں پہنچ چکا ہے۔“

درگوت نے پوچھا۔ ”تھہ کو میری تلاش میں سلطان نے بھیجا ہے یا اس البانوی بد معاش نے جس کا نام رستم ہے؟“

سعید نے جواب دیا۔ ”مجھے تو رستم نے بھیجا ہے مگر اس کو سلطان نے حکم دیا تھا۔“

درگوت نے کہا۔ ”میں واپس نہیں جاؤں گا کیونکہ اس غیبت کی کوئی بات نہیں مانوں گا جو خود کو سلطان کا دلاوا اور سب سے زیادہ اختیار روز پر سمجھتا ہے۔ یہ ازار بند کی رشتہ اس کے لیے عزت کا باعث ہو تو ہو، میری نظر میں اس کی کوئی اہمیت نہیں۔“

سعید نے بے خوشی سے اس کی اور باتیں بھی دیتا رہا کہ اسے بظاہر تو رستم نے بھیجا ہے لیکن رستم کو یہ حکم سلطان نے دیا تھا۔

درگوت نے سعید کو بھی ترغیب دی کہ وہ قسطنطنیہ واپس نہ جائے اور اس کے ساتھ شامل ہو جائے لیکن سعید نے انکار کر دیا اور کہا۔ ”آپ ذرا بھی نہ گھبراہٹیں۔ سلطان آپ کے ساتھ انصاف کرے گا۔“

درگوت نے جواب دیا۔ ”میں فی الحال واپس نہیں جاؤں گا کیونکہ میں ان لوگوں سے واقف ہوں جو اس قسم کی ملاقاتوں کے دوران میں کہیں آس پاس موجود رہتے ہیں اور پھر اچانک نمودار ہو کر اپنا کام کر کے واپس چلے جاتے ہیں اور شخص مذکور اپنی زندگی سے اچھا دھو بیٹھتا ہے۔“

سعید نے درگوت پر افسوس کیا۔ ”میں آپ کے پاس بڑی تو قہمت لے کر آیا تھا مگر آپ میری بات نہیں مانتے۔ یہ بہت برا ہوا۔“

درگوت نے پوچھا۔ ”تو واپس جا کے اس البانوی بد معاش سے کیا کہے گا جو بزم خود سلطان کے بعد سب سے زیادہ با اختیار انسان ہے۔“

سعید نے جواب دیا۔ ”جو جواب آپ نے دیا ہے اسے دہرانے کی مجھ میں ہمت ہی نہیں ہے، بس یہی کہہ دوں گا کہ آپ سے ملاقات نہیں ہوئی۔“

درگوت نے کہا۔ ”لیکن تیرے ساتھی تو یہی جواب دیں گے کہ تو نے مجھے پالیا تھا۔“

سعید پریشانی میں گھر گیا۔ اب وہ نہ تو درگوت کے پاس رکنا چاہتا تھا اور نہ ہی دل واپس جانے کا مشورہ دیتا تھا۔ سعید چند دنوں کے لیے درگوت کے پاس ہی ٹھہر گیا۔

پھر یکا یک انہیں شمال کی طرف سے بہت سے جہاز آتے دکھائی دیے۔

درگوت کے ماہر ساتھی نے بتایا۔ ”جناب! یہ جہاز ڈیوک میڈینا کی سرداری میں طرابلس جا رہے ہیں۔ اس میں دوسو سے زیادہ جہاز حصہ لے رہے ہیں اور جنوبی یورپ کی جملہ قومیں اس میں شامل ہیں۔“

درگوت نے افسوس کرتے ہوئے کہا۔ ”اب دیکھنا یہ صنعان یہودی جسے رستم نے پاشا کا خطاب دیا ہے، طرابلس کو کس طرح پہنچا ہے۔“

اس موقع پر سعید نے اس کو مشورہ دیا۔ ”جب پھر جناب، اب آپ طرابلس پہنچیں اور اس جنگ میں حصہ لیں اور جب فتح حاصل کر لیں تو سلطان کو یہاں کی پوری روداد لکھ دی جائے۔ اس وقت آپ کی جتنی جائے گی اور اس طرح آپ کو بڑی سانی معافی مل جائے گی۔“

درگوت ہنسنے لگا اور کہا۔ ”یہ ساری خیالی باتیں ہیں جو فضول اور بے معنی ہیں۔ سلطان کچھ بھی کہے سنے۔ طرابلس کی شکست ہو یا فتح، یہ دونوں چیزیں صنعان سے وابستہ کر دی جائیں گی۔“

ڈیوک میڈینا کے ساتھ پادری بھی تھے اور یہ حسب سابق دعاؤں کے لیے بیٹھے گئے تھے۔ درگوت کو یہ بات بھی بتا دی گئی۔ درگوت نے کریت چھوڑ دیا اور رہوڑ پہنچ گیا۔ یہاں بھی عیسائیوں میں بڑا جوش و خروش پایا جاتا تھا لیکن سلطان کے زیراثر ہونے کی وجہ سے رہوڑ کے عیسائی اپنے جوش و خروش کا اظہار برطانیہ کر سکتے تھے۔

رہوڑ کے چند روزہ قیام کے دوران میں ہی درگوت کو بتایا گیا کہ یہاں خفیہ طور پر عیسائیوں کی بھرتی ہو رہی ہے اور یہ لوگ بھی طرابلس کی مذہبی جنگ میں حصہ لینا چاہتے

اس خبر نے درگوت کو یہ سبق دیا کہ یہ جنگ مذہبی ہے اور اس کے اور ترکی کے اختلافات سے عیسائیوں کو فائدہ پہنچے گا۔ اس نے سعید سے پوچھا: "اچھا اب یہ بتا کہ سلطان میرے مارے میں کھارائے رکھتا ہے؟"

سعد نے کہا: ”سلطان آپ کا مداح ہے لیکن آپ کی زیادتیوں تک دوری سلطان کو آپ کی طرف سے بدظن سمجھ کر کہتی ہے اس لیے آپ کی قسطنطنیہ سے دوری خطرناک ہے۔“

ڈیوگ میڈیٹانے کریٹ کے سامنے سے گزرتے ہوئے درگوت کے بیڑے کو دیکھا تھا۔ ڈیوگ کے بیڑے میں ڈوریا بھی موجود تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ درگوت کی ترک حکومت سے ان بن ہو گئی ہے اور درگوت قسطنطنیہ سے ناراض ہو کر کریٹ کے ساحل پر پڑا ہوا ہے۔ اگر اسے یہ سن تک نہ بھی ہوتی تو وہ اپنے دوسو جہازوں کے ساتھ درگوت کا محاصرہ کر لیتا اور بیڑے میں اس کی یہ خواہش پوری ہو جاتی کہ اسے کاش! وہ درگوت کو دوبارہ گرفتار کر سکتا۔ لیکن الحال تو وہ طرابلس کو واپس لےئے جا رہا تھا۔

اسے یہ خبر نہ تھی تھا کہ اگر اس چھوٹے سے پیرے سے چھپر چھار کی مٹی تو پیس کہیں کوئی بڑا پیرا بھی موجود ہو سکتا ہے اور طریقوں سے پہلے ہی بڑی جنگ کا آغاز ہو سکتا ہے جو فی الحال کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے۔

ڈیوک میڈیٹا اور ڈوریا میں اس سلسلے میں کچھ باتیں ہوئیں اور پھر یہ لوگ طرابلس کی طرف بڑھ گئے۔

مالٹا سے آگے پہنچنے کے بعد ایک نئی جگہ چھڑ گئی۔ پتا نہیں ڈیوگ میڈیٹا کو طرابلس کی طرف سے کیوں خطرات لاحق ہو گئے تھے کیونکہ اس نے طرابلس کے بجائے جرب کو اپنی منزل مقصود قرار دیا اور طرابلس کو اپنے ذہن سے نکال دیا۔

اس اتحادی فکرمیں مالٹا کے چھمی کئی سوا افراد موجود تھے اور یہ سب ڈوریا کی طرح چاہتے تھے کہ ترکوں سے پہلے طرابلس واپس لیا جائے اس کے بعد جربہ کا محاصرہ کیا جائے۔

ڈیوگ میڈیٹانے کہا۔ ”دوستو! اطراہیں تو مسلمانوں
 کا محفوظ ترین قلعہ ہے جہاں ترکی کی فوجیں شہر کی حفاظت
 کر رہی ہیں اور شہری بھی ان کا ساتھ دیں گے، جس سے یہ
 مقابلہ کمزیر ہونا چلا جائے گا۔ پھر ہمیں کراس ممبر کا کیا انجام
 ہو لیکن جرے پر حملہ کرنے سے ہمارا مقابلہ صرف معمولی

سایہوں سے ہوگا۔ شہری آبادی بھی ان کا ساتھ نہیں دے گی کیونکہ جہرہ کے لوگ یا تو خوروزے بہت کھاتے ہیں یا پھر انیون بہت استعمال کرتے ہیں اور اس کے نفعے میں وہ اس لائق نہیں رہتے کہ جنگ و جدل میں حصہ لیں۔ اگر بدرجہ مجبوری حصہ لے بھی لیں گے تو وہ لڑنے کے لائق نہیں ہوں گے۔“

ڈیوک میڈیٹا کی دونوں شہروں کے بارے میں تجزیاتی دلیلیں اپنا کام کر گئیں اور سب ہی کا ارادہ بدل گیا۔ چنانچہ دوسو بجری جہازوں کا رخ جرمنی کی طرف کر دیا گیا۔

ہر مسکے جا بدمعاش سے چینی سے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لے رہا تھا کہ شاید یہیں کوئی آبادی نظر آجائے۔ یہاں تک کہ یہ لوگ جربہ کے ساحل پر پہنچ گئے۔ یہ وہی ساحل تھا جس کے ایک دہانے پر ڈوبیا، رگدوت کو روک ٹھکرا نماز ہو گیا تھا اور پھر رگدوت دلدلی جھیل کا سلسلہ سمندر سے ملا کے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

ان دنوں جرہ کا حاکم ایک عرب تھا۔ اس عرب نے
اچانک عسائیوں کے جہازوں کو دیکھتا ہوا پریشان ہو گیا۔ وہ
ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے ذرا سی بھی مزاحمت نہ کی
اور محاصرہ کرنے والوں سے پوچھا: ”وہ یہاں کیا لینے آئے
ہیں؟“

ڈوریا نے کہلوا یا۔ ”جرہ کو ہمارے حوالے کر دو اور تم
امن و عافیت سے نکل جاؤ۔“

عرب حاکم نے پوچھا۔ ”جائے کے بعد ہمارے مسلمان بھائیوں سے کیا سلوک کیا جائے گا؟“

ڈوریا نے جواب دیا۔ ”ہم صرف تمہارے امن و عافیت سے نگہ رکھنے کی ذمہ داری پوری کر سکیں گے۔ بقیہ لوگوں سے تمہیں کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہیے۔ کہیں تمہیں بھی بہ عافیت نگہنے سے روک دیا جائے۔“

ڈیوک میڈیٹا کا خیال تھا کہ حاکم کو بھی نہ نکلنے دیا جائے اور اسے بھی گرفتار کر لیا جائے تاکہ سمجھ آئے والے مسلمانوں کے حوصلے بڑھ جائیں لیکن ڈیوک نے کہا: ”جنگوں کے بھی کچھ اصول ہیں اور سپاہیوں کی بھی کچھ اخلاقیات ہوتی ہیں۔ جب عرب شیخ نے ہتھیار ڈال دیے اور ازروئے معاہدہ وہ یہاں سے ہر عافیت نکل جاتا چاہتا ہے تو ہم اسے روک نہیں سکتے۔“

ڈیوکر میڈیٹا نے کہا۔ ”خیر اسے نکل جانے دیں۔“
عرب شیخ نے جہ پر عیسائیوں کو قبضہ کر لینے دیا اور
خود اہل وسلاستی سے نکل گیا۔ پھر عیسائی محلہ بن نے شہری

مسلم آباد کی جو درگت بنائی وہ بڑی عبرت ناک تھی۔
 ساحل پر اترتے ہی ڈیوک میڈیٹانے سب سے پہلے
 وہ مسجد دیکھی جہاں شہر بھر کے مسلمان جتنے کی نماز پڑھنے کے
 لیے جمع ہوا کرتے تھے اور یہیں درگوت بھی نمازیں پڑھتا رہا
 تھا۔

مسجد کا جائزہ لینے کے بعد اس کو گرجا میں تبدیل کر دیا گیا۔ عربی عبارات کی جگہ چونا پھیر دیا گیا اور نماز کی صفوں کی جگہ کرسیاں بچھوا دی گئیں اور مقامی مسلمانوں پر زور دیا گیا کہ وہ چھپائی ہو جائیں۔

سین ان لی یہ تدبیریں ان قاتل پسند اور حال پسند لوگوں پر کارگر نہیں ہوئیں اور یہ مسلمان ہی رہے۔ اب وہ بجائے مسجدوں کے گھروں میں نماز کر ڈھنسنے لگے۔

ڈیوگ میڈینا کو روہڑہ کر غصہ آ رہا تھا کہ اس نے جزیہ پر قبضہ تو کر لیا تھا مگر مسلمانوں کو عیسائی بنانے میں کامیاب نہیں ہوا۔

ڈیووک میڈیٹا نے جبرہ میں ایسا قیام اختیار کیا جیسے اسے منزل مقصود مل گئی ہو اور اس کے لیے طرابلس کوئی مسئلہ ہی نہ تھا۔

ڈور یا کڑواہش تھی کہ اس مہم کا خاتمہ طرابلس میں ہونا چاہیے۔ اٹاکے صلیبی جہادین بھی یہی چاہتے تھے کیونکہ طرابلس ان سے چینا گیا تھا اور ان کے بہت سے معزز صلیبی جہاد گرفتار کر کے قسطنطنیہ بھیج دیے گئے تھے۔ اب طرابلس میں صنعان پاشا کی حکومت تھی اور اسے یہاں ترک وزیراعظم برسم نے بھیجا تھا۔ گویا اب طرابلس کا تعلق براہ راست عثمانی سلطنت سے ہو گیا تھا۔ اگر طرابلس پر حملہ کیا جاتا تو اسے ترکی پر حملہ تصور کیا جاتا اور ڈپوک میڈیکس کی صورت میں بھی ترکوں سے چھپر تھارڈ پینڈ نہیں کرتا تھا۔

جب ڈیوک میڈیٹا پر مسلسل دباؤ پڑا کہ وہ طرابلس کو طاقت سے چھین لے تو اس نے جبرہ میں ایک نئے قلعے کی تعمیر کی بنیاد ڈال دی۔

اب یہ صلیبی مجاہدین نے قلعے کی تعمیر میں مشغول ہو گئے تھے۔ پورے جرہ میں عیسائی پھیل گئے اور ان سب کی پوری توجہ قلعے کی تعمیر پر مرکوز ہو گئی۔

انہیں باورِ یوں کی رہنمائی میں مقامی مسلمان آبادی کے ساتھ علم و زبان کی بجائے محبت اور رواداری کا سلوک کرنا تھا تاکہ جو مسلمان ظلم اور تردستی سے عیسائیت پر مائل نہیں کیے جاسکے تھے انہیں محبت یا نرم رویے سے اپنی طرف مائل کر لیا جائے۔

1000

پادریوں نے مسلم آبادی کو عیسائیوں سے گریزاں اور نفور دیکھا۔ وہ ان سے آنے والوں سے دور دور اور لڑائی کرتے رہے۔ انہیں اپنے وطن میں یہ اجنبی اچھے بھی نہیں لگ رہے تھے۔ گران کی مجبوری یہ بھی کہ ان کا کوئی وارث نہیں تھا۔ عرب حکمران اپنے خاندان کو لے کر تھوکس چلا گیا تھا۔ گو یا اس کا جڑ بہ والوں سے کبھی کوئی تعلق ہی نہیں رہا تھا۔

مقامی مسلمانوں نے نہ تو یہ بھی مزاحمت کی، نہ نئے آنے والوں سے کوئی واسطہ یا رابطہ رکھا۔ ان میں پادری آتے اور وعظ و تلقین کرتے۔ مسلمان نہایت خاموشی سے ان کا وعظ سنتے رہتے اور آخر میں کچھ کہے سے بغیر چپ چاپ اسے گھر وں کی راہ لیتے۔

ڈیوگ میڈیٹا کو پاوری یہ بتاتے کہ جربے کے لوگوں پر ان کی تقریر کا گر نہیں ہو رہی ہے اور یہ بے حس لوگ تقریریں سننے کے بعد منتشر ہو جاتے ہیں اور پلٹ کر پاوری کو دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے۔

ڈیوک میڈیٹا نے اپنے ساتھ آئے ہوئے عام عیسائیوں سے کہا کہ وہ مقامی لوگوں سے مکمل جائیں۔ انہی کی طرح کھائیں پئیں اور انہی جیسا رہن سہن اختیار کریں اور ساتھ ساتھ باواسطہ عمل اور قول سے تبلیغ جاری رکھیں تو ان مسلمانوں پر ضرور اثر ہوگا۔

ڈیوک میڈیٹا کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ ایک طرف تو ایک نیا قلعہ تعمیر کروا دے اور دوسری طرف مقامی آبادی کو ہوشیاری سے عسائی بنالیا جائے تو یہ حربہ نامی شیر اور بندرگاہ بہت مستحکم ہو جائے گی۔ درگوت کے لیے حربہ جنت سے کم نہیں تھا اور ڈیوک میڈیٹا اس جنت سے درگوت کو بے دخل کر دینا چاہتا تھا۔

جرم کے کئی ہوش مندوں نے طرابلس کے حکمران صعتان پاشا کو یہ ساری روداد لکھ کر بھیج دی اور آخر میں لکھا: ”صلی علیہ وسلم“ کی مذہبی اور دینی تصویر میں جس طرح مشغول ہیں وہ مشغول میں نہایت بھیاں تک شکل اختیار کر جائے گی۔ اس کا فوری سدباب ہونا چاہیے۔ یہ صورت تاخیر نہیں ہمارا اکابر شہ ہو۔“

صنعان پاشا کی مجبوری یہ تھی کہ درگوت نے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی اور عثمانی بحریہ عضو معطل ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ جبر کے خلاف کوئی جارحانہ کارروائی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اسے خود اپنا وجود خطرے میں نظر آ رہا تھا۔ صنعان پاشا نے یہ تحریریں وزیر اعظم رستم کو روانہ کر دیں کہ اس طرف فورا توجہ دی جائے۔

رستم نے فی الحال ان واقعات پر پردہ ڈال کر صورت حال سے سلطان کو باخبر رکھا۔ کیونکہ رستم فی الحال درگوت سے لڑ رہا تھا۔ صناعان پاشا نے قسطنطنیہ سے دور رہ کر بھی وہاں کی اصل خرابی کو سمجھ لیا تھا۔ اس نے سلطان سلیمان کو جرہ کی صورت حال سے براہ راست مطلع کر دیا اور صاف صاف لکھ دیا کہ جس دن جرہ کا قلعہ مکمل ہو جائے گا، صلیبی مجاہدین فوراً طرابلس کا رخ کریں گے۔

سلطان سلیمان نے صناعان پاشا کے اس خط کا رستم سے کوئی ذکر نہیں کیا اور اسے حکم دیا کہ درگوت کو کسی بھی قیمت پر واپس لایا جائے۔

صناعان پاشا کو لکھا گیا کہ اسے بہت جلد مکمل مل جائے گی، بدحواس ہونے کی ضرورت نہیں۔

صناعان پاشا نے جرہ کے باشعور اور ہوش مند لوگوں کو لکھ دیا کہ وہ بالکل نہ گھبرا سکیں، مغربی ان کی مدد کی جائے گی۔ ڈوریا کو اس خفیہ خط کتابت کا کوئی علم نہ تھا اور اسے صرف یہی خوف تھا کہ مذہبی جوش و خروش میں مبتلا جنوبی یورپ کے عیسائیوں کو اگر زیادہ دنوں تک جنگ سے باز رکھا گیا تو ان کے جذبے سرد پڑ جائیں گے۔ وہ بار بار ڈیوک میڈینا کو متنبہ کر رہا تھا کہ قلعے کی تعمیر اور جرہ کے مسلمانوں کی وڈائی اور مذہبی تحیر آتی ضروری نہیں ہے جتنی ضروری طرابلس کے خلاف جنگ ہے۔

اس بار بھی ڈیوک میڈینا نے ڈوریا کو یہی جواب دیا۔ ”تم بحری معاملات کے ماہر ہو اس لیے میری کوششوں کے نتائج کا تم اندازہ نہیں لگ سکتے۔ میں چاہتا ہوں کہ جرہ کو درگوت کے لائق نہ رکھا جائے کیونکہ میری نظر میں اصل فتح مندی یہی ہے کہ جرہ والوں کو ایسا بنا دیا جائے کہ اگر ہم جرہ سے چلے بھی جائیں تو درگوت ان کے لیے قابل قبول نہ رہے۔“

ایسٹن کے قلب کو ڈوریا نے آگاہ کیا کہ ڈیوک میڈینا قلعے کی تعمیر اور مذہبی تبلیغ و تلقین پر بلاوجہ اپنا وقت ضائع کر رہا ہے۔ اسے حکم دیا جائے کہ وہ فوراً طرابلس پر حملہ کرے اور جرہ میں وقت نہ برباد کیا جائے۔

قلب نے فوراً ڈیوک میڈینا کو لکھا۔ ”جرہ کا قلعہ تو تعمیر ہوتا رہے گا۔ اس سے زیادہ ضروری کام طرابلس کی تعمیر ہے۔ جس قسم کی منصوبہ بندی تو کر رہا ہے وہ حکومتوں کا کام

ہے۔ تیرے ہاتھ میں جنوبی یورپ کی کمان دی گئی ہے۔ آگے بڑھ اور طرابلس کو فوراً واپس لے لے۔“

قلب کا یہ فرمان ڈیوک میڈینا کو ملا تو وہ پڑھ کے بڑبڑانے لگا۔ ”یہ لوگ سیکڑوں میل دور بیٹھے صرف ہدایات دیتے رہتے ہیں، خود کچھ نہیں کرتے۔ قلب کو یہ نہیں معلوم کہ میں اب براہ راست قلب کے چچا فرڈی ہنڈ کے ماتحت ہوں یا پھر مجھے پاپائے اعظم حکم دے سکتا ہے۔ قلب کی تو اپنی کوئی حیثیت ہی نہیں۔“

ڈیوک میڈینا نے جرہ کے مسلمانوں میں گھل مل جانے والے عیسائیوں کو دیکھا۔ اب وہ بھی مسلمانوں کے ساتھ بیٹھ کے خربوزے کھا رہے تھے اور انہوں کے نشے میں جموم بھی رہے تھے۔

ڈیوک میڈینا کو اپنے آدمیوں کی صورت حال نے خوف زدہ کر دیا۔ یہاں سے وہ قلعے کی تعمیر کا معائنہ کرنے گیا۔ وہاں بھی کام ٹھپ تھا اور یہ لوگ انہوں کے نشے میں مست پڑے ہوئے تھے۔ جب انہیں یہ بتایا گیا کہ ڈیوک میڈینا معائنہ کرتا ہوا ان کی طرف آ رہا ہے تو وہ ذرا جمی نہ گھبرائے۔

ڈیوک میڈینا نے اپنے مذہبی امور کے ماہرین کو قلعے میں جمع کر لیا اور انہیں موجودہ صورت حال سے آگاہ کر کے حکم دیا کہ اب آپس ہی آدمیوں کو پیدا کرنے اور پیدا رہنے کی تلقین کی جائے۔ ورنہ یہ سب لفظی ہو جائیں گے اور طرابلس کی تعمیر تو کجا انہیں جرہ سے بھی بے دخل ہونا پڑے گا۔

اب اسے ڈوریا سے اتفاق کرنا پڑا۔ اس نے پادریوں کو حکم دیا کہ وہ خود تو تبلیغ و تلقین کرتے رہیں مگر جنوبی یورپ سے آئے ہوئے عیسائیوں کو مقامی لوگوں میں گھل مل جانے سے روکا جائے۔

پادری بھی جب حقیقی صورت حال سے واقف ہوئے تو انہیں اپنے عیسائی بھائیوں سے زیادہ مقامی مسلمانوں پر غصہ آیا جو خود تو عیسائی ہوئے تھے بلکہ عیسائیوں کو اپنا جیسا بنا لیا تھا۔ اسی جوش و غضب کے عالم میں ایک عیسائی پادری نے گوشت اور بزیوں کے بازار میں تبلیغ شروع کی اور تقریر کرتے ہوئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عیسیٰ کا موازنہ کرتے ہوئے حضرت عیسیٰ کو افضل فرما دیا شروع کر دیا۔

جاری ہے

کہانی کے تاریخی مآخذ

حرب صلیبیہ غارت گران بربر تاریخ نیپولین ہرملین ہرکیم سونامی مخروہ تاریخ افریقا ریلیجیئس سوسائٹی لین پول برائے لین پول ترجمہ: مولانا حالی مولوی خالد علی صدیقی

عجیب بات ہے کہ کمزور لمحات میں انسان ناقص ہو جاتا ہے مگر یہاں معاملہ اس کے برعکس نکلا۔ جب تک وہ بے بس صورت حال سے دوچار رہا، تب تک اس کے بخت کے ساتھ ساتھ اس کا ”بس“ بھی زوروں پر رہا مگر جیسے ہی اس کے قدموں نے چلتا سیکھا، جانے کیوں ہر خوش بختی اس سے روٹنے لگی۔ چلتا تو سب ہی سیدکے لپٹے ہیں مگر لغزشوں پر قابو پانا ہر کس و ناکس کی بات نہیں۔

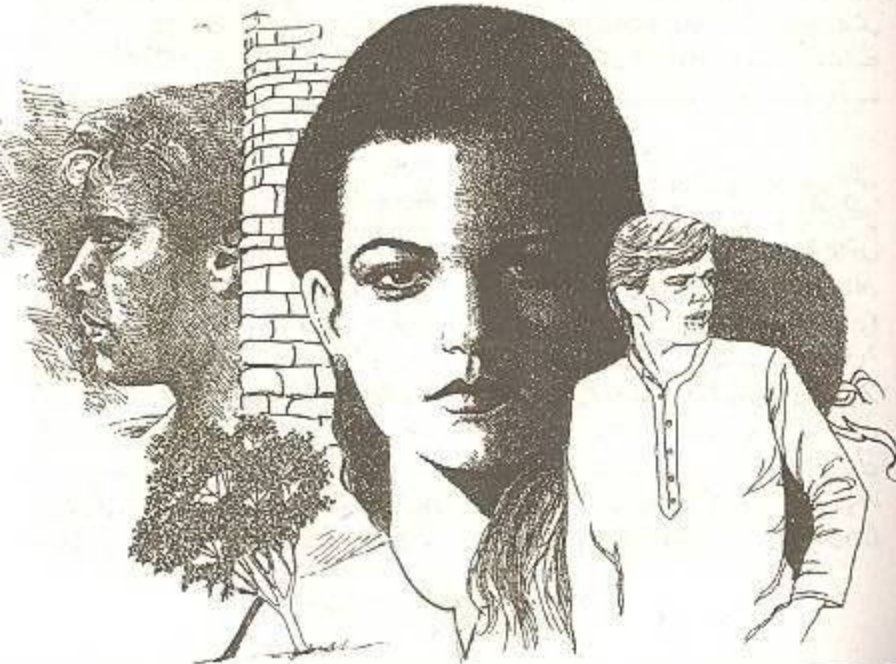
ایک دیرک اور عذاب پرست انسان کی چالاکی

کاشف زبیر

سہارا

میکس ایک ہوشیار آدمی تھا، جس نے زندگی بہت ہوشیاری اور پلاننگ سے گزاری تھی۔ اس کا شمار ان افراد میں ہوتا تھا جو اپنے ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل نکال لیتے ہیں۔ جب انہیں ضرورت ہوتی ہے تو وہ کسی کی مدد لینے سے نہیں ہچکچاتے ہیں لیکن وہ خود کسی کی مدد کرنے کے قابل نہیں ہوتے ہیں۔ میکس کا خیال تھا کہ وہ بہت ہوشیار آدمی ہے اور وہ اپنے سارے فیصلے خود کرتا تھا۔ وہ نہ کسی کو خود سے زیادہ ذہین سمجھتا تھا اور نہ ہی دوسروں پر اعتبار کرتا تھا۔

میکس میرا کا کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوا تھا اور اس کا تعلق ایک کاشت کار خاندان سے تھا لیکن اس میں شہریوں والی ہوشیاری اور چالاکی تھی۔ اس کے خاندان والے جب کرتے تھے کہ سید سے سادے کاشت کاروں میں یہ ہوشیار بچہ کہاں سے پیدا ہو گیا۔ بچپن میں اس کی حرکتیں دیکھ کر اس کے دادا نے پیش گوئی کی تھی۔



”یہ بڑا ہو کر بہت چالاک لگنے کا لیکن اس کی چالاکی اسے صرف عارضی فائدہ پہنچائے گی۔ کیونکہ زمین سے وابستہ لوگوں کو چالاکی راس نہیں آتی ہے۔ یہ صرف شہریوں کا خاصہ ہے۔“

میکس کے دادا کی پیش گوئی کم سے کم اس حد تک درست نکلی تھی کہ میکس بڑے ہونے کے ساتھ ساتھ زیادہ ہوشیار ہوتا جا رہا تھا اور اسی ہوشیاری کی وجہ سے وہ دوسروں سے زیادہ فائدے میں رہتا تھا۔ کیونکہ اس کے مقابلے میں سب سادہ فطرت لوگ تھے، ان میں وہ ہوشیاری اور چالاکی نہیں تھی جو میکس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ میکس چھپن میں دوسرے بچوں کے کھلونوں سے تو خوب کھیلتا اور اکثر ان کو توڑ بھی دیتا تھا لیکن اپنے کھلونوں کو ہاتھ بھی نہیں لگانے دیتا تھا۔ اسی طرح کھیل کے دوران اس سے دوسرے بچوں کو چوٹیں لگ جاتی تھیں مگر مجال ہے جو کسی اسے کوئی چوٹ لگی ہو۔ گویا اس کے ساتھ کے بچے نقصان میں تھے اور وہ نقصان سے محفوظ رہتا تھا۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ نقصان نہیں اٹھاتا تھا۔ اسے بھی چوٹیں لگتی تھیں اور نقصان ہوتے تھے لیکن یہ نقصان اور چوٹیں عام طور سے قدرت کی طرف سے ہوتی تھیں۔ جیسے اسے بچپن میں بیمار پالیا بہت گھبرائی تھیں۔ اس طرح اسے از خود چوٹیں بھی بہت لگی تھیں۔ اس کی چیزوں کا اس کے اپنے ہی ہاتھوں نقصان ہوتا تھا مگر وہ ان نقصانات کو کبھی خوشی برداشت کر لیا کرتا تھا لیکن کسی دوسرے کے ہاتھوں اسے کوئی نقصان ہو یہ اسے بالکل بھی گوارا نہیں تھا اور کوئی اس سے کسی معاملے میں آگے نکل جائے یہ بھی اسے برداشت نہیں تھا۔ اگر بھی اتفاقاً ایسی کوئی بات ہو جاتی تو وہ بھگامہ کر کے آسمان سر براٹھا لیا کرتا تھا۔ اس کی فطرت کچھ اس قسم کی تھی کہ ہر اچھی چیز اسے مل جائے اور اگر اسے نہ ملے تو کسی اور کو تو بالکل نہ ملے۔ یعنی اپنی غرور سے اسے گوارا بھی لیکن کسی دوسرے کو کچھ ملے یہ بالکل گوارا نہیں تھا۔

میکس کی طبیعت میں حسد کا مادہ بہت زیادہ تھا اور اسے کوئی دوسرا مشکل سے ہی برداشت ہوتا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ قدرت نے اس کے ماں باپ کو کوئی اور اولاد نہیں دی تھی۔ البتہ اس کے کزنز و جن کے حساب سے تھے اور وہ سب آس پاس رہتے تھے۔ اس لیے اسے کھیلنے کے لیے بچوں کی کمی نہیں تھی۔ بچے بھی سارے اس سے دبتے تھے۔ اس کی ہوشیاری کی وجہ سے اس کی سرداری مانتے تھے۔ وہ ان پر اپنی

حاکمیت جما کر خوش ہوتا تھا۔

یوں تو سب ہی میکس کے ہاتھوں ستائے ہوئے اور پریشان رہتے تھے لیکن میکس کی خالد کا بیٹا مورگن خاص طور سے اس کا نشانہ بننا تھا۔ وہ میکس سے پانچ سال چھوٹا تھا اور وہ بچپن سے میکس کا پسندیدہ شکار رہا تھا۔ میکس کے ہاتھوں سب سے زیادہ چوٹیں اسے لگتی تھیں اور سب سے زیادہ کھلونے اس کے ٹوٹتے تھے۔ جب وہ روتا دھوتا اپنی ماں اور باپ کے پاس شکایت لے کر جاتا تو وہ اسے صبر کی تلقین کر کے چپ کر دیتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ میکس بھی اپنی غلطی نہیں مانے گا اور اگر وہ مان بھی گیا تو مورگن کے باپ کا کزن یعنی میکس کا باپ اپنے بیٹے کی غلطی نہیں مانے گا۔ میکس کینے پن میں اپنے باپ پر گیا تھا۔

مورگن شریف اور سادہ طبیعت لڑکا تھا۔ وہ بچپن سے میکس کے مقابلے میں نہیں زیادہ بہتر صحت کا مالک تھا۔ جب آٹھ سال کا تھا تو میکس سے ایک دو سال چھوٹا لگتا تھا۔ دراصل میکس کو جلتے کڑھنے کی عادت بھی تھی اور اس کا اکثر وقت کسی نہ کسی کی کامیابی یا خوشی پر خون جلاتے ہوئے گزرتا تھا۔ جیسے اس کے ایک دور بار کے کزن اسٹیفن نے اسکول میں ساتویں درجے میں پہلی پوزیشن حاصل کی تو میکس بارے صدے کے پیار ڈھکیا اور اس وجہ سے وہ اسکول کی تنظیم نتیجہ کی تقریب میں بھی شامل نہیں ہو سکا تھا۔ اگلے سال اس نے تعلیم میں جان ماری شروع کر دی لیکن ہر ٹیسٹ کے بعد واضح ہوتا جا رہا تھا کہ وہ تعلیم کے معاملے میں اسٹیفن سے آگے نہیں نکل سکے گا۔ اس لیے میکس نے اسے پہلی پوزیشن حاصل کرنے سے روکنے کے لیے دوسرے

حزبوں پر غور شروع کر دیا۔

ان کے قصبے اسٹین ٹاؤن میں ایک چھوٹا سا سپر اسٹور تھا جہاں روزمرہ استعمال کی تمام چیزیں دستیاب تھیں لیکن بعض چیزیں ذرا مشکل سے ملتی تھیں، خاص طور سے نو جوانوں کو۔ جیسے خواتین ماڈلز کی تصاویر پر مبنی رسالے، مگر کیٹ اور بئیر وغیرہ۔ سپر اسٹور کا مالک بین اس معاملے میں قانون کا پابند تھا اور اس نے بھی سیل بڑھانے کے لیے نو جوانوں کو اس قسم کی چیزیں فروخت نہیں کی تھیں لیکن میکس کے شاطر ذہن نے ان کے حصول کے لیے ایک ترکیب سوچ لی تھی۔ سورج ڈوبنے کے بعد جب اسٹور میں لائٹس روشن ہوتی تھیں۔ میکس نے کسی طرح اسٹیفن کو اپنے ساتھ ملا دیا اور اس کے ذمے یہ کام لگایا کہ وہ اسٹور کے عقبی حصے میں واقع

بجلی کے بورڈ پر مین سوئچ بند کر دے۔ اسٹیفن راضی نہیں تھا لیکن میکس نے کسی نہ کسی طرح اسے راضی کر لیا تھا۔ اسٹیفن نے مین سوئچ بند کیا اور جیسے ہی تاریکی ہوئی میکس نے اپنا کام دکھایا اور وہاں سے نو دو گیارہ ہو گیا۔ اسٹیفن وہاں سے پہلے ہی جا چکا تھا۔ دس منٹ بعد دونوں ایک ویران گودام میں ملے تو میکس کے پاس ایک بیگ تھا۔ اسٹیفن جاننے کے لیے بے تاب تھا کہ میکس نے کیا چرایا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ میکس نے چاکلیٹ یا کھانے کی ایسی کوئی چیز چرائی ہوگی۔ لیکن جب میکس نے بیگ سے بئیر کے ڈبے، مگر کیٹ اور تصویر کی رسالے نکالے تو اسٹیفن کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ خاص طور سے رسالوں پر اس کی رال ٹیک تھی تھی۔ آج سے کوئی تین سال پہلے وہ یہاں توں میں اس قسم کی چیزیں آسانی سے دستیاب نہیں تھیں اور نو جوانوں کے بڑے ان کی کڑی نگرانی رکھتے تھے۔ اب ماحول بدل گیا ہے لیکن اس وقت نو جوانوں کو اس قسم کی سرگرمیاں بہت چھپ چھپا کر کرنی پڑتی تھیں۔

میکس نے زندگی میں پہلی بار فراخ دلی کا ثبوت دیتے ہوئے نہ صرف بیشتر تیر اور سرگرمی کے بکٹ اسٹیفن کے حوالے کر دیے بلکہ اس نے تصویر کی رسالے بھی اسے دے دیے تھے۔ مقصد صاف ظاہر تھا کہ اسٹیفن ان چکر میں پڑ کر اپنی تعلیم سے ہٹ جائے اور اگلی بار کلاس میں اول نہ آ سکے۔ میکس نے خود پہلی پوزیشن حاصل کرنے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی تھی اور اسے پروا بھی نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اسٹیفن اول نمبر پر نہ آئے۔ اس کی خواہش پوری ہوئی بلکہ اس کی کوشش کا سبب رہی اور اگلی بار اسٹیفن نے کوئی پوزیشن حاصل نہیں کی۔ بلکہ اس کا معیار اتنا گر گیا کہ وہ بہ مشکل ہی پاس ہو سکا تھا۔ اسٹیفن کا باپ اس معاملے میں بہت سخت تھا اور اس نے اسٹیفن کو وارننگ دے رکھی تھی کہ اس کے بارے میں کوئی ایسی ویسی خبر سن کر اس کی خیر نہیں ہو گی۔ یہی وجہ تھی کہ اسٹیفن کی کوئی دوست لڑکی نہ تھی۔ جب کہ اس کے تمام دوستوں کی گرل فرینڈز تھیں۔ وہ بے جا راکوں کے لیے ترسا ہوا تھا۔ میکس نے اسے رسالوں کی

ایسی لت لگائی کہ وہ بس اسی چکر میں رہنے لگا اور اس کے بعد اس نے خود اپنی رسالوں کو حاصل کرنا شروع کر دیا۔ ان کی وجہ سے وہ اپنی تعلیم پر بھی توجہ نہیں دے سکا تھا۔ اس کے ماں باپ سمجھتے تھے کہ وہ کمرے میں پڑھ رہا ہے جب کہ وہ رسالوں میں گھویا ہوا ہوتا تھا۔

جو ایک بار میکس سے چوٹ کھا لیتا وہ اس کے بارے میں محتاط ہو جاتا تھا اور وہ بارہ اس کے قریب کھینچنے سے گریز کرتا تھا۔ لیکن مورگن کی بد قسمتی کہ اس کا میکس سے بہت قریبی رشتہ تھا اور پھر وہ پاس پاس ہی گھروں میں رہتے تھے۔ اس لیے وہ خفیہ میں ہی ہانپنے کے لیے میکس کو ہر وقت دستیاب رہتا تھا۔ مورگن کا گھر ان میکس کے گھر کی طرح زیادہ خوشحال نہیں تھا۔ اس کے باپ کے پاس زمین کم تھی اور کنبہ بڑا تھا۔ مورگن کے چھ بہن بھائی تھے اور ان سب کی پرورش میں اس کا باپ بہت جان مارتا تھا تب کہیں جا کر انہیں ضروریات زندگی کی تمام چیزیں دستیاب ہوتی تھیں۔

مورگن اس معاملے میں بہت حساس تھا اور اس کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ اپنی ضروریات کے لیے اپنے باپ کو تنگ نہ کرے۔ بارہ سال کی عمر میں اس نے انہیں سے ایک پرانی سی سائیکل لے کر خود اس کی مرمت کر لی اور اس پر صبح کے وقت گھروں میں اخبار تقسیم کر کے اپنے اخراجات خود پورے کرنے لگا۔ جو رات بچ جاتی وہ اپنی ماں کے حوالے کر دیتا تھا۔ جب فصل لگانے یا کاٹنے کا سیزن ہوتا تو وہ اپنے دوسرے بہن بھائیوں کے ساتھ باپ کی زمین پر کام کرتا تھا۔ کیونکہ اس کا باپ مزدور کا فریج برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ میکس ڈھکے چھپے انداز میں مورگن اور اس کے گھر والوں کی غربت کا مذاق اڑاتا تھا۔ وہ اس کا اور اپنا موازنہ کرتا تھا۔ میکس کے پاس بہترین اور جدید قسم کی سائیکل تھی۔ جب مورگن کسی کام سے اپنی میچر نظر آنے والی سائیکل پر نکلتا تو میکس فوراً اپنی سائیکل نکال لاتا اور اس کے آس پاس ہی منڈلاتے ہوئے اس کی سائیکل کی خستہ حالی کا مذاق اڑاتا رہتا تھا۔ حالانکہ وہ صرف دیکھنے میں خستہ حال تھی ورنہ چلنے میں مورگن نے اسے خوب بتا رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ

النسر
القصہ

جملہ اشتہارات (جن کے مندرجات سے اداے کا کوئی تعلق نہیں ہوتا) نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ مشہرین کے لیے ادارے کی معرفت آنے والی ناک صالح کردی جاتی ہے۔ قارئین رابطے یا معلومات کے لیے براہ راست مشہرین سے بہرے کریں یا اس میں کسی نقصان یا شکایت کی صورت میں جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کی کوئی اخلاقی یا قانونی ذمے داری نہیں ہوگی۔

اخبار ڈالنے کا کام کر پاتا تھا۔ ورنہ سائیکل مسئلہ کرتی تو اسے یہ کام کیسے ملتا۔

ان کی گلی میں بیلن کا بھی گھر تھا۔ بیلن ابھی بارہ سال کی تھی لیکن اس نے قد کاٹھ نکال لیا تھا اور اس کے چہرے کے نقوش بہت دلکش تھے۔ میکس اکثر اسے متوجہ کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس روز بھی وہ بیلن کو اپنی سائیکل دکھا رہا تھا اور اس کی تعریف میں زمین آسمان ایک کر رہا تھا۔ مورگن کسی کام سے سائیکل لے کر نکلا تو میکس نے اس کی سائیکل کی طرف اشارہ کر کے بیلن سے کہا۔

”یہ وہ سائیکل ہے جس پر جارج واٹکینن سواری کیا کرتا تھا۔“

مورگن نے جواب دیا۔ ”تجبی یہ چلنے میں بہت اچھی ہے آج کل کی سائیکل اس کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔“

میکس اچھل پڑا۔ اسے لگا کہ مورگن نے اسے براہ راست چیلنج کر دیا ہے۔ ”کیا تم مجھ سے ریس لگانا چاہ رہے ہو؟“ اس نے تحارت سے کہا۔

”نہیں تو۔۔۔ لیکن اگر تم لگانا چاہو تو میں تیار ہوں۔“

میکس فوراً سرگرم ہو گیا اور اس نے بیلن کی طرف دیکھا۔ ”اگرچہ اس کی ضرورت تو نہیں ہے لیکن کیا تم ہمارے لیے جینے بڑبڑا رہے ہو؟“

”ہاں کیوں نہیں۔“ بیلن راضی ہو گئی۔

ملے ہوا کہ وہ اس پورے بلاک کا راز نظر لگا کر اسی جگہ پہنچیں گے اور جو پہلے پہنچے گا وہی فاتح ہوگا۔ بیلن نے ایک دو تین کہا اور انہوں نے ایک ساتھ سائیکل دوڑا دی تھی۔ یہ بلاک چوکور تھا اور اس میں اکثر چنگھیں خالی تھیں اس لیے بیلن انہیں دیکھ سکتی تھی۔ دونوں اپنی پوری قوت اور توجہ سے سائیکل چلا رہے تھے۔ کچھ دیر بعد میکس نے محسوس کیا کہ اس کا سانس اکٹھ رہا ہے اور اب اس سے سائیکل پہلے جیسے انداز میں نہیں چل رہی ہے۔ مورگن اس سے آگے نکلتا جا رہا تھا۔ مورگن کی صحت اس سے اچھی تھی اور اسے سائیکل چلانے کی مشق بھی زیادہ تھی۔ کچھ ہی دیر میں وہ میکس سے خاصا آگے نکل چکا تھا اور میکس تمام تر کوشش کے باوجود اس کے نزدیک بھی نہیں جا پا رہا تھا۔ جب وہ پھر کاٹ کر دوسری طرف پہنچے اور ایک جگہ مکانات سامنے آئے، اور میکس کو یقین ہو گیا کہ وہ بیلن کو نظر نہیں آ رہے ہیں تو اس نے اچانک ہی اپنی سائیکل ایک درخت سے ٹکرا دی اور پیچھے گر پڑا۔ آگے جاتے ہوئے مورگن نے مڑ کر دیکھا۔ اسے میکس گرا ہوا نظر آیا تو وہ واپس پلٹ آیا اور اس نے سہارا دے کر میکس کو اٹھایا۔ وہ اچانک

چلانے لگا۔

”مجھے تم نے گرایا ہے۔۔۔۔۔ جان بوجھ کر گرایا ہے۔“

مورگن حیران رہ گیا۔ ”میں کیسے گرا سکتا ہوں۔۔۔ میں تو تم سے بہت آگے تھا۔“

”جھوٹ مت بولو۔“ میکس نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”تم نے جیتنے کے لیے مجھے جان بوجھ کر گرایا ہے۔“

اس دوران میں بیلن بھی وہاں آئی تھی۔ اسے دیکھ کر میکس زیادہ شوق کرنے لگا۔ اس کا ہنسا تھا کہ وہ مورگن کو پیچھے چھوڑنے والا تھا کہ اس نے اسے جان بوجھ کر دھکا دے کر گرا دیا۔ مورگن بے چارہ تردید کر رہا گیا لیکن بیلن نے اسے جس طرح۔۔۔ ملامت بھری نظروں سے دیکھا تھا اس سے صاف ظاہر تھا کہ اس نے میکس کی بات پر یقین کر لیا ہے۔ گرنے سے میکس کے ہاتھ پاؤں پھل گئے تھے اور ماتھے پر بھی نیل کا نشان نظر آ رہا تھا۔

”تم نے اچھا نہیں کیا؟“ بیلن نے مورگن سے کہا۔

”بیلن یہ غلط ہے میں نے۔۔۔۔۔“ مورگن نے وضاحت کی کوشش کی لیکن بیلن اس کی بات سننے بغیر میکس کے ساتھ وہاں سے چلی گئی۔ میکس نے جاتے جاتے مڑ کر فاتحانہ انداز میں مورگن کی طرف دیکھا۔ جیسے کہ رہا ہو کہ تم مجھ سے کسی صورت نہیں جیت سکتے۔ اس دن کے بعد سے مورگن میکس سے بچ گیا تھا۔ اگرچہ میکس نے چند دن بعد اس سے اس طرح ملنے کی کوشش کی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ لیکن مورگن اب خود پیچھے ہٹ گیا تھا۔ وہ کوشش کرتا کہ جہاں میکس موجود ہو وہاں جانے سے گریز کرے۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ وہ کہیں کھیل رہا ہوتا اور میکس آجاتا تو وہ کھیل درمیان میں چھوڑ کر چلا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ میکس سمجھ گیا کہ مورگن نے اس دن والی حرکت پر اسے معاف نہیں کیا ہے۔ اس لیے وہ بھی کھیا کر اس سے دور ہو گیا۔

مورگن کے گھر کے حالات خراب ہوتے جا رہے تھے۔ کیونکہ اس کی ماں کو دل کا مرض ہو گیا تھا اور وہ اب صحت والا کوئی کام نہیں کر سکتی تھی۔ پھر اس کے علاج پر بھی بہت خرچ آ رہا تھا۔ مورگن کا باپ اتنا بڑا بار آ گیا تھا کہ مورگن کو بائی اسکول کے بعد کل وقتی ملازمت کرنا پڑی تھی۔ چونکہ ان کے علاقے میں چھوٹے کاشت کار زیادہ تھے جو اپنی زمینوں پر خود کاشت کرتے تھے اور ان میں سے شادی کوئی مزدور استعمال کرتا تھا۔ اس لیے مورگن کو ایوننگ چلا گیا۔ وہاں دولت مند کسان تھے جن کے پاس کی بوا سائیکل زمین ہوتی ہے اور ان کو ملازموں کی ہمیشہ ضرورت رہتی تھی۔ شروع میں مورگن کو کچھ پریشانی تو ہوئی

لیکن پھر اسے اچھا معاوضہ ملنے لگا اور وہ اپنے باپ کو رقم بھیجنے لگا تھا۔ دو سال بعد مورگن کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بڑے بھائی بھی اس کے پاس چلے آئے تھے اور مزدوری کرنے لگے تھے کیونکہ ان میں سے کسی کو اسکول سے آگے پڑھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ پھر مورگن کا باپ بھی اپنی زمین بیچ کر بیٹوں کے پاس چلا گیا تھا۔ مورگن کی بہنیں بھی شادی کر کے قصبے سے چلی گئیں اور اس طرح مورگن کے پورے خاندان نے قصبہ چھوڑ دیا۔ میکس نے اپنی خالہ کی زندگی میں بھی ان لوگوں سے خاص میل جول نہیں رکھا تھا۔ وہ کبھی مورگن کے گھر نہیں گیا تھا۔ اس لیے جب خالہ مر گئیں تو ان لوگوں سے تعلق رکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پھر مورگن اور اس کا سارا خاندان یہاں سے چلا گیا اور میکس ان کو بھول گیا۔

میکس نے اپنے باپ کی زمین سنبھال لی تھی۔ اس کے پاس کوئی دو سو ایکڑ زمین تھی جسے وہ اپنے ملازموں کی مدد سے کاشت کرتا تھا۔ وہ بہت اچھا کمانے لگا تھا۔ اس کے باوجود ملازموں کو کچھاد دیتے ہوئے اس کی جان جاتی تھی اور اس کی کوشش ہوتی تھی کہ کم سے کم معاوضے پر مزدوروں سے زیادہ سے زیادہ کام لے۔ یہی خاصیت میکس کو بھی مل گئی۔ بلکہ کبھی کے معاملے میں وہ اپنے باپ سے بھی کئی ہاتھ آگے تھا۔ جب اس کے باپ نے رٹنا روٹ لیا اور کام میکس کے ہاتھ میں آ گیا تو چند مہینوں میں برسوں پرانے ملازمین اسے چھوڑ کر بھاگ گئے۔ میکس کو ان کے جانے کی کوئی فکر نہیں تھی۔ اس نے دوسرے ملازم رکھ لیے کیونکہ ان کے علاقے میں روزگار کی کمی تھی اور مزدور آسانی سے مل جاتے تھے لیکن اس کے پاس ٹکا کوئی نہیں تھا کیونکہ اس کا رویہ بکایا ہوتا تھا کہ ملازم بھاگ جاتے تھے۔

☆☆☆

مورگن بس سے اتر آیا اور اپنا بیگ سنبھال کر اس نے چاروں طرف دیکھا۔ وہاں سب ویسا ہی تھا جیسا اس نے آج سے دس برس پہلے دیکھا تھا۔ وہ دس برس پہلے آخری بار یہاں آیا تھا اور اس کے بعد آج آیا تھا۔ اسے ایک ہفتے پہلے ہی میکس کی کال آئی تھی کہ اسے مورگن کی مدد کی ضرورت ہے۔ مورگن کا دل چاہا کہ وہ انکار کر دے لیکن پھر وہ مان گیا۔ اس کے خیال میں میکس کتنا برا آدمی لیکن اس کا فرسٹ کزن تھا اور اس کی ایک ہی خالہ تھی جس کا وہ اکوٹا بیٹا تھا۔ خالہ کا دس سال پہلے انتقال ہو چکا تھا اور وہ اسی موقع پر یہاں آیا تھا۔ اس وقت بھی میکس کا رویہ اتنا خراب تھا کہ وہ بس مدفن میں شرکت تک رکا اور پھر واپس چلا گیا۔ اسے

حیرت تھی کہ میکس کو اس کا فون نمبر کہاں سے مل گیا۔ بہر حال اس نے میکس سے کہا کہ اسے کچھ ضروری کام ہیں جنہیں نمٹنا کر وہ ایک ہفتے میں اس کے پاس آ جائے گا۔

وہ قصبے کے بس اسٹاپ پر اتر آیا تو اس کا خیال تھا کہ میکس اسے لینے آئے گا یا کسی کو بھیج دے گا لیکن نہ تو وہ خود آیا اور نہ ہی اس نے کسی کو بھیجا۔ اب مورگن کو کوئی ایک میل کا فاصلہ پیدل ہی طے کرنا تھا۔ وہ بیگ شانے پر ٹانگ کر روانہ ہو گیا۔ خوش قسمتی سے کچھ دیر بعد ہی پیچھے سے ایک پک اپ آئی اور اس سے ایک جوان آدمی نے ہما کر اسے قصبے تک لفٹ دینے کی پیش کش کی۔ مورگن پک اپ میں آ گیا۔ تعارف ہوا تو پتا چلا کہ وہ مورگن کے ایک دور کے چچا کا بیٹا نام تھا۔ جو اس سے گرم جوش سے پیش آیا تھا۔

”میں نے تمہیں بہت پہلے دیکھا تھا لیکن تمہارے بارے میں سنا ہے۔ آج کیسے آئے؟“

مورگن نے اسے بتایا۔ ”مجھے میکس نے فون کر کے بلایا ہے۔“

میکس کے نام پر اس نے برا سامنا بنایا تھا۔ ”میکس۔۔۔ اگر اس نے تمہیں بلایا ہے تو یقیناً اسے تم سے کوئی کام ہوگا۔“

”جی بات ہے میں خود بھی نہیں جان سکا کہ اس نے مجھے کیوں بلایا ہے۔ لیکن اس نے کہا تھا کہ اسے میری مدد کی ضرورت ہے۔“

”مدد کی ضرورت تو اسے ہے۔“ نام کا لہجہ طرے ہو گیا۔ ”اس کا گھٹنا تھریٹر مشین کے ہائیڈروک جیک میں آ گیا تھا جس سے بڑی چکن چور ہو گئی ہے۔ ڈاکٹروں نے اسے ایک سال تک چلنے پھرنے اور کام کرنے سے منع کر دیا ہے۔“

مورگن نے سر ہلایا۔ ”تو یہ بات ہے لیکن اس نے مجھے کیوں بلایا ہے۔ اگر اسے کام کا آدمی چاہیے تو وہ یہاں سے بھی مل جاتا۔“

”اسے نہیں مل سکتا۔“ نام نے کہا۔ ”وہ اپنے ملازمین کے ساتھ جوسلوک کرتا ہے، کوئی اس کے پاس کام کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا ہے۔ ایک نیم پاگل ریڈ آئٹل مل گیا ہے اس بے چارے سے وہ لکڑیوں کی طرح کام لیتا ہے۔ ایک دو اور ملازم مل جاتے ہیں لیکن کوئی اس کے پاس زیادہ عرصے نہیں ٹکتا ہے۔“

”اوہ تو یہ بات ہے۔“

نام نے اسے ہمدردی سے دیکھا۔ ”میرا تو مشورہ ہے کہ میکس کے لیے کام کرنے کے بجائے کہیں اور کام تلاش کر لو۔“

”فی الحال تو یہ ممکن نہیں ہے۔ میں اپنا کام چھوڑ کر چکا

ہوں اور پھر میں جس علاقے میں کام کرتا ہوں وہاں گزشتہ دو سال سے بارش نہ ہونے کی وجہ سے حالت بہت خراب ہے۔ زمین پر کام کرنے والے بے روزگار ہیں اور کہیں کام نہیں ہے۔

”حالت تو یہاں بھی اچھی نہیں ہے لیکن اگر ایسی بات ہے تو میکس کو مت بتانا ورنہ وہ سمجھ لے گا کہ تم مجبور ہو۔ اس کا رویہ اور بھی خراب ہو جائے گا۔“

مورگن نے دل میں سوچا کہ میکس کو اس سے زیادہ اور کون جان سکتا ہے۔ عمر کے سترہ سال تک وہ میکس کے ساتھ ہی رہا تھا۔ جب وہ یہاں سے گیا تو وائیونگ میں اسے اچھی نوکری مل گئی تھی۔ ماں کے مرنے کے بعد اس نے بھائیوں کو بھی وہاں بلایا تھا۔ اس کے بھائی اس کے مقابلے میں زیادہ ہوشیار تھے اور انہوں نے کئی سال تک کام کر کے رقم جمع کی اور وہیں زمین لے لی۔ اب وہ وہاں فارم تھے۔ مورگن کا باپ اس کے ساتھ رہا تھا اور دو سال پہلے اس کا بھی کینسر کے مرض میں انتقال ہو گیا تھا۔ پھر وہاں خشک سالی کی وجہ سے حالات خراب ہونے لگے۔ مورگن کے بھائی زیادہ پریشان تھے۔ ان کی زمینیں تھیں لہذا وہ زمین چھوڑ کر جا نہیں سکتے تھے۔ انہوں نے مزدور کا خرچ بچانے کے لیے مورگن سے مدد مانگی تھی اور مورگن نے ایک سال ان کے پاس کام بھی کیا جس کا اسے کوئی خاص معاوضہ نہیں ملا تھا۔ پھر پانی کی کمی کی وجہ سے فصلوں کی کاشت ہی ممکن نہیں رہی اس لیے مورگن بے روزگار ہو گیا۔

وہ ان دنوں جنوب کی طرف جانے کا سوچ رہا تھا جہاں روزگار تھا اور ممکن تھا اسے وہاں زمین مل جاتی کیونکہ شمال میں زمین اتنی مہنگی تھی مورگن جیسے شخص کے لیے یہاں زمین لینا ممکن نہیں تھا۔ پھر اسے میکس کی کال آگئی اور وہ یہاں آ گیا۔ نام کی باتوں سے لگا تھا کہ میکس ان دنوں سچ جج مصیبت میں تھا۔ اسے معلوم تھا کہ میکس کے ساتھ کام کرنا آسان نہیں تھا۔ وہ ایسا ہی شخص تھا جو سب ابا خاں تھا جس کے پاس رہنے والا شخص زخمی ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اس کے باوجود اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس کے پاس ضرور جائے گا۔

نام نے اسے میکس کے فارم کے سامنے اتار دیا۔ ”گنڈ بانی... اینڈ وٹ یو گنڈ لک۔“ کہہ کر اس نے پک اپ آگے بڑھا دی مگر کچھ دور جا کر روک دی اور کھڑکی سے سر نکال کر بولا۔ ”میکس کو مت بتانا کہ میرے ساتھ یہاں تک آئے ہو ورنہ مجھے پھنسا دیں گے۔“

مورگن نے ہاتھ بلایا اور فارم کی طرف بڑھ گیا۔ اس علاقے میں عام طور سے زمین کی حد بندی کے لیے لوگ

معمولی سی پاڑھ لگا لیتے تھے یا درخت لگا لیتے تھے۔ یہ بھی اضافی آمدنی کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ لیکن میکس نے اپنے فارم کی گرد و ہری خار دار پاڑھ لگا رکھی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ فارم نہیں کوئی سونے کی کان ہو جس کی حفاظت کا اتنا بندوبست کیا گیا تھا۔ یہی نہیں اس نے ہر دس گز بعد وارننگ والے بورڈ لگا رکھے تھے جن پر لکھا تھا۔ ”خبردار غرض زمین ہے۔۔۔ دور رہیں۔“

پچانک البتہ کھلا ہوا تھا جس سے مورگن اندر داخل ہو گیا۔ میکس نے اسے بتایا تھا کہ اس نے قصبے والا مکان چھوڑ دیا تھا اور اب فارم پر ہی گھر بنایا تھا۔ مورگن نے دیکھا کہ گھر بڑا اور خوب صورت تھا۔ لگتا تھا میکس نے اس پر خاصی رقم خرچ کی تھی۔ مکان کے احاطے میں ایک شاندار لینڈ کروزر کھڑی تھی اور برآمدے میں میکس ایک وہیل چیئر پر بیٹھاے نوشی کر رہا تھا۔ اس کی صحت گری تھی اور چہرہ ستا ہوا اور دہلا ہوا تھا۔ اس نے مورگن کو دیکھ کر کسی گرم جوشی کا اظہار نہیں کیا تھا بس اتنا کہا۔

”ہیلو کیسے ہو تم؟“ اور پھر سے اپنے پیگ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”میں ٹھیک ہوں۔“ مورگن نے کسی قدر تذبذب سے کہا۔ اس کا خیال تھا کہ میکس نے اسے پچانے نہیں ہے۔ ”میں مورگن ہوں۔“

”ہاں میں تمہیں پہچان چکا ہوں۔“ میکس نے اطمینان سے کہا۔ اب بھی اس نے نہ تو کسی خاص رد عمل کا اظہار کیا تھا اور نہ ہی مورگن کو پیچھے کے لیے کہا تھا۔ حالانکہ سامنے ہی کرسیاں رکھی تھیں۔ میز پر ایک وٹسکی کی بوتل بھی رکھی تھی لیکن گلاس ایک ہی تھا جو میکس کے ہاتھ میں تھا۔ مورگن خاصی قوت برداشت رکھتا تھا لیکن اس وقت اسے غصہ آ گیا۔ اس نے ایک میز چم پر چٹا اور ذرا آگے جھک کر بولا۔

”میں کوئی تین سو کو میز پر دور سے پانچ گھنٹے کا سفر کر کے اس لیے نہیں آیا ہوں کہ تمہارا سے نوشی کا اسٹائل دیکھوں مجھے ایک منٹ کے اندر بتاؤ کہ تم نے مجھے کیوں زحمت دی ہے؟“

اس کے تنہور دیکھ کر میکس ذرا اب گیا تھا۔ اس نے گلاس رکھ دیا اور بولا۔ ”سوری اصل میں مجھے تکلیف ہو رہی تھی بسے دبانے کے لیے میں بی بی رہا ہوں۔“

مورگن جانتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ وہ اپنی فطرت سے مجبور تھا لیکن اس کی معذرت نے مورگن کا غصہ

خفتا کر دیا تھا۔ وہ خود ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ ”اوکے... اگر تمہاری تکلیف کم ہوگئی ہے تو تم مجھے بتاؤ کہ تم نے مجھے کیوں بلایا ہے؟“

میکس نے شانے اچکائے۔ ”میں تمہیں کیوں بلا سکتا ہوں۔“ اس نے چاروں طرف پھیلے فارم کی طرف اشارہ کیا۔ ”مجھے فارم سنبھالنے کے لیے ایک آدمی کی ضرورت ہے اور میرا خیال ہے تم یہ کام کر سکتے ہو۔“

فارم مورگن نے اندر آتے ہوئے دیکھا تھا جس کی حالت بہت خراب تھی۔ زمین کی مناسب دیکھ بھال نہیں ہو رہی تھی۔ بائیں طرف موجود اسٹیری کے درخت خشک اور بے ترتیب تھے۔ زمین بھی ہٹا ہوا اور زرخیزی سے محروم نظر آ رہی تھی۔ مٹی کی کاشت کا وقت آ گیا تھا لیکن ابھی تک فارم پر اس کی کاشت کے کوئی آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ اس نے کہا۔

”ہاں میں یہ کام کر سکتا ہوں۔“

میکس مسکرایا۔ ”اسی لیے میں نے تمہیں بلایا ہے۔“ میکس کا انداز ایسا تھا جیسے مورگن کو اس کام کے لیے منتخب کرنا بھی اس کی کوئی ذاتی قابلیت ہے۔ مورگن کو پھر غصہ آنے لگا تھا۔ ”میں نے یہ کہا کہ میں یہ کام کر سکتا ہوں یہ نہیں کہا ہے کہ میں کروں گا۔ جب تک کہ میری اس سلیٹ میں تم سے کسی بات نہیں ہو جاتی۔“

میکس ایک بار پھر چوک گیا۔ اس نے جلدی سے کہا۔ ”تمہارے اس طرح آنے کا مقصد کیا ہے؟“

”میں نے سوچا کہ تم سے بات ہو جائے گی اور پھر ہمارے دوستوں اور جاننے والوں سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔“ مورگن نے اس پر واضح کر دیا کہ وہ نہ تو اس کا دوست بنے اور نہ جاننے والا ہے۔ وہ صرف اس سے کام کی بات کرنے آیا ہے۔ میکس ان دنوں شاید بہت مشکل میں تھا کیونکہ اس کی ٹانگ پلاسٹر میں جکڑی ہوئی تھی اور وہ زمین پر کام کرنے تو کیا اس پر آمد سے سے بچنے اترنے کے قابل بھی نہیں تھا۔ اس لیے اسے ایک ایسے آدمی کی ضرورت تھی جو اس کی جگہ زمین پر کام کر سکے۔ نام کی زبانی مورگن سن چکا تھا کہ یہاں اب کوئی میکس کے لیے کام کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

”اوہ اچھا۔“ میکس کا چہرہ پیکا ہو گیا تھا۔ ”خیر تم نے دیکھ لیا ہوگا کہ اس فارم کو سنبھالنے کے لیے ایک تجربے کار آدمی کی اشد ضرورت ہے۔“

مورگن نے پہلی بار میکس کی ٹانگ کی طرف دیکھا۔ ”تمہیں یہ چوت کب لگی؟“

”دو ہفتے ہو گئے ہیں۔ ابھی ایک آپریشن ہوا ہے۔“

تین مہینے بعد دوسرا اور پھر آٹھ مہینے بعد تیسرا آپریشن ہو گا۔ اس کے بعد بھی مجھے چار مہینے فزیو تھراپی کرنا ہوگی تب میں چلنے پھرنے کے قابل ہو سوں گا۔“

”یعنی تمہیں مکمل طور پر بڑے دار آدمی کی ضرورت ہے؟“

”نہیں میں گمرانی تو کر سکتا ہوں؟“

مورگن نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اس صورت میں، میں کام نہیں کر سکتا۔ تم یہ کام کسی عام مزدور سے بھی لے سکتے ہو۔ اگر تم مجھ سے کام لینا چاہتے ہو تو یہ فارم مکمل طور پر میرے سپرد کرنا ہوگا۔“

”تمہارے سپرد؟“ میکس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”ہاں جنہیں صرف نتائج سے مطلب ہو نا چاہیے اور تم میرے کام میں کوئی مداخلت نہیں کرو گے۔“

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔“ میکس نے اعتراض کیا۔ ”یہ میرا فارم ہے اور مجھے بتانے کے لیے یہاں کیا کرنا ہے۔“

”وہ ٹھیک ہے لیکن اگر تم آدمی اور حوری ہدایت کاری کرو گے تو اس سے معاملات خراب ہوں گے۔“ مورگن نے شانے اچکائے۔ ”میں اس صورت میں کام نہیں کر سکتا گا۔ کئی بات تو ہے کہ اگر تم ٹھیک ہوتے تو میں یہ کام کرنے سے انکار کر دیتا لیکن تم بہر حال میری خالہ کے بیٹے ہو، اس لیے میں یہ کام کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن میں نے اپنی اولین شرط بیان کر دی ہے۔“

میکس نے اسے حیرت سے دیکھا۔ ”تو تمہاری کوئی اور شرط بھی ہے؟“

”ہاں میں معاوضہ تنخواہ کی صورت میں نہیں بلکہ ہونے والے کل نفع کے تہائی حصے کی صورت میں لوں گا۔“

میکس کی آنکھیں پھل گئیں۔ ”تمہاری حصہ؟“

مورگن نے سر ہلایا۔ ”نفع کا... اخراجات نکال کر جتنا بھی نفع ہوگا اس کا تیسرا حصہ میں لوں گا۔ اس میں تمہارے لیے بھی آسانی ہے۔ ایک تو تمہیں مجھے تنخواہ نہیں دینی پڑے گی۔ تم مجھے جو بھی دو گے وہ یک مشت ہوگا۔ اس طرح تمہیں ہر ہفتے یا مہینے ادائیگی سے نجات مل جائے گی۔ دوسرے میں زیادہ کمانے کے لیے کہیں زیادہ محنت کروں گا۔ صرف کام کے اوقات نہیں دیکھوں گا۔“

”لیکن تمہاری حصہ بہت زیادہ ہے۔“

”زیادہ نہیں ہے... اگر تم مجھے معاوضہ دو گے تو میں کم سے کم آٹھ سو ڈالرز ہفتہ لوں گا اور اگر تم مجھے ایک سال تک یہ معاوضہ دو گے تو تم مجھے چالیس ہزار ایک سو ساٹھ

ڈالرز کی ادائیگی کرو گے۔ جب کہ اس حالت میں تم اس فارم سے شاید ایک لاکھ ڈالر بھی نہیں نکال سکتے ہو گے۔ جبکہ فرض کر لو کہ خالص نفع ایک لاکھ ڈالر ہے تو تمہیں مجھ کو تین ہزار ڈالر ادا کرنا ہوں گے۔“

”اور اگر نفع زیادہ ہوا تو؟“ میکس نے اعتراض کیا۔
”مورگن منکر کیا جیسے اسے اسی سوال کی توقع تھی۔“ تمہیں کس چیز پر اعتراض ہے اپنے دو تہائی حصے پر یا میرے ایک تہائی حصے پر؟ اگر میں ایک ڈالر منافع میں رہوں گا تو تم میری جگہ دو ڈالر منافع میں رہو گے۔“

”لیکن یہ میرا فارم ہے اور اس پر سارا خرچ میں کروں گا اور نفع میں سے تہائی تمہیں دے دوں۔“
”ہاں صرف ایک سال کی بات ہے پھر تم خود سے کما سکو گے۔ میں ایک سال کا معاہدہ کروں گا۔“

میکس سوچ میں پڑ گیا تھا۔ اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اس خیال سے اس کا دل اندر ہی اندر کٹا جا رہا تھا کہ اس کے فارم پر کام کر کے مورگن ایک اچھی رقم کما سکتا ہے۔ حالانکہ خود اس نے بھی اپنے فارم سے سال میں ایک لاکھ ڈالر کا نفع حاصل نہیں کیا تھا۔ کیونکہ وہ اس پر مستقل کام نہیں کروا رہا تھا اور نہ ہی اس نے زمین کی حالت سدھارنے کے لیے اس پر خرچ کیا تھا۔ ملازم بھی وہ بہت وقت ضرورت ہی رکھتا تھا اور اسے معاوضہ اتنا کم دیتا تھا کہ وہ دل لگا کر کام ہی نہیں کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ایک طرف تو فارم کی حالت دن بہ دن خراب ہوتی جا رہی تھی تو دوسری طرف اس سے حاصل ہونے والی آمدنی میں کمی آ رہی تھی لیکن میکس اس معاملے میں اپنی غلطی تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا بلکہ وہ دوسروں کو الزام دیتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اسے ملازم ہی کا بل اور حرام خورد خوری جو محنت کرنے کے بجائے کام سے جی چراتے ہیں۔

میکس کو سوچ میں ڈیکھ کر مورگن کھڑا ہوا۔ ”تم سوچو اور دو دن میں مجھے جواب دے دو۔ میں ہر جگہ ہاں کہوں گا۔“
اگلے روز ہی میکس نے مورگن کو بلا لیا تھا۔ ”مجھے تمہاری شرط منظور ہے لیکن تمہیں جو ملے گا پورے ایک سال بعد ملے گا۔“

”ظاہر ہے۔“ مورگن نے سر ہلایا۔ ”میری ایک شرط یہ بھی ہے کہ تم میرے کام میں کوئی مداخلت نہیں کرو گے اور میں جو باتوں کا مجھے مہیا کرو گے۔“

”منظور ہے۔“ بشرطہ خاص کہ وہ کام سے متعلق چیز ہو۔“
”معاہدہ تحریری ہو گا۔“ مورگن نے کہا۔ ”اور اس میں ہر چیز طے کی جائے گی۔“

مورگن کی آمد کی اطلاع قصبے میں پھیل گئی تھی اور جب اس کے رشتے داروں کو پتا چلا کہ وہ میکس سے ایک معاہدہ کر رہا ہے تو تقریباً سب نے اسے منع کیا تھا۔ حالانکہ میکس بھی ان لوگوں کا رشتے دار ہی تھا لیکن اسے کوئی پسند نہیں کرتا تھا اور مورگن کو سمجھانے والوں کا کہنا تھا کہ میکس کی فطرت میں دھوکا اور شر ہے لہذا وہ اس کے لیے کام نہ کرے۔ لیکن مورگن نے بتایا کہ وہ معاہدہ کر چکا ہے اور اب اس سے پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔

معاہدے کے تحت میکس اس کے کام میں مداخلت نہیں کر سکتا تھا۔ اسے صرف اخراجات کی فراہمی اور نتائج سے سروکار تھا۔ مورگن نے اپنی رہائش کے لیے پاس ہی ایک چھوٹا سا گھر کرائے پر لے لیا تھا۔ اس کے جانے والے حیران تھے کہ اس نے میکس سے اس قسم کا معاہدہ کیوں کیا تھا جس میں بہت زیادہ امکان تھا کہ آخر میں اسے نقصان اٹھانا پڑے گا کیونکہ میکس ایسا شخص نہیں تھا جو اپنی ذات سے کسی کو فائدہ اٹھانے دے۔ مورگن سب لوگوں کی رائے سنتا اور دوسرے کان سے نکالتا رہتا تھا۔

اسٹین ٹاؤن میں آمد کے ایک ہفتے بعد مورگن نے فارم پر سب قاعدہ کا شروع کیا۔ رٹائنڈ لڑکا مکمل بہت سختی لیکن ذہنی لحاظ سے پیمانہ تھا۔ ممکن ہے وہ سفید فام ہوتا تو کسی کی جرات نہ ہوتی اس سے اس طرح بگاڑ لینے کی۔ لیکن میکس اس سے ظالمانہ حد تک کام لیتا تھا۔ دوسرے وہ صرف جسمانی محنت کے کام کر سکتا تھا، اس سے تکنیکی کام نہیں لیا جا سکتا تھا۔ مورگن نے میکس سے کہا۔ ”مجھے ایک مزدور کی ضرورت ہے جو مشینوں کو بھی استعمال کر سکے۔“
”وہ تو بہت مہنگا پڑے گا۔“ میکس نے کہا۔ ”تم خود بھی تو مشینیں استعمال کر سکتے ہو۔“

”مجھے اور بھی بہت سارے کام ہیں۔ مجھے ایک آدمی کی اشد ضرورت ہے۔ فصل لگانے کے دنوں میں دو آدمی اور درکار ہوں گے لیکن ابھی ایک سے کام چل جائے گا۔“

کتبوں میکس کا یہ سوچ کر دم نکلنے لگا کہ ابھی صرف ایک آدمی چاہیے بعد میں مزید وہ دن کی ضرورت پڑے گی۔ اس نے بھی فارم میں دو سے زیادہ ملازم نہیں رکھے تھے۔ لیکن معاہدے کے تحت وہ مورگن کا مطالبہ پورا کرنے کا پابند تھا ورنہ مورگن کام چھوڑ کر جانے کا مجاز تھا جبکہ اگر مورگن بلا وجہ کام چھوڑ کر جاتا تو میکس اس پر حرج جانے کا دعویٰ کر سکتا تھا۔ مجبوراً اسے مورگن کا مطالبہ ماننا پڑا تھا۔

فارم کی حالت مورگن کے اندازے سے بھی زیادہ

خراب تھی۔ زمین میں زرخیزی کی کمی تھی۔ اس نے مٹی کا بل ٹیٹ کر لیا تو بعض ضروری عناصر کی کمی پائی گئی تھی۔ مورگن نے اس کی کوپرا کرنے کے لیے خاص کھادیں منگوائیں اور اس دوران میں ملے ملازم ٹیٹ کی مدد سے زمین ہموار کرتا رہا۔ اس نے میکس سے خاردار تاریں پٹانے کو کہا تھا لیکن اس نے انکار کر دیا۔ ”تم اس پکڑ میں مت پڑو ورنہ اپنے کام پر توجہ دو۔“

مکمل کے پاس کرنے کے لیے کوئی کام نہیں تھا اس لیے مورگن نے اسے فارم کی حدوں کے ساتھ پوکیش کے پودے لگانے کا کام دے دیا۔ یہ درخت اس علاقے میں بہت تیزی سے بڑھتے تھے اور دو سال میں پچیس ٹیس فٹ بلند ہو جاتے تھے۔ مختلف صنعتوں میں ان کی بہت مانگ تھی جیسے کاغذ اور گٹا بنانے میں یہ خام مال کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔ زمین ہموار کر کے مورگن نے اس پر اچھی نسل کی کٹی لگا دی۔ کٹی پورے فارم پر نہیں لگائی تھی بلکہ مورگن نے جگہیں چھوڑ چھوڑ کر لگائی تھیں اور درمیانی جگہوں پر اس نے سبزی کاشت کی۔ اس دوران میں اسے ایک ملازم کی ضرورت اور پڑی تھی۔ یہ ملازم میکس نے بڑی مشکل سے فراہم کیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ مورگن نے اب تک آخر خرچ کر دیا تھا جو وہ دو سال میں بھی نہیں کرتا تھا۔

”خیر جی جی اس بار تمہیں اتنا کام دے گا جو تم نے پہلے تین سال میں بھی نہیں کیا ہو گا۔“ مورگن نے اسے جواب دیا۔
ایک مہینے میں مورگن محنت کر کے اور بہترین منصوبہ بندی سے فارم کو ایک نئی شکل میں لے آیا تھا۔ کٹی کے سرسبز پودے سر اٹھا چکے تھے اور سبزیاں تو خاصی بڑھ گئی تھیں۔ مورگن نے آلو، چنڈر، شام، بندوق بھی اور مٹر کاشت کیے تھے۔ مکمل نے فارم کے کناروں پر پوکیش کے درخت لگانے کا کام مکمل کر لیا تھا۔ اب وہ فصل کی دیکھ بھال میں دوسروں کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ وہ مورگن کے ساتھ کام کر کے بہت خوش تھا کیونکہ میکس نے بھی اسے ایک ملازم سے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی جب کہ مورگن اس سے اچھے انداز میں پیش آتا اور اس کا خیال رکھتا تھا۔

میکس کی زمین میں نیچے اچھا پانی تھا لیکن اس کے پاس پانی کھینچنے والا پمپ اور پانی فصلوں کو دینے والے اسپرنگھو بہت پرانے اور تقریباً تباہ تھے۔ مورگن نے وہ تبدیل کر کے کیونکہ پوری فصل کو بروقت پانی مہیا کرنا ضروری تھا تب ہی کم سے کم وقت میں اور ایک ساتھ فصل تیار ہوتی۔ کیونکہ یہ علاقہ شمال سے نزدیک ہے۔ اس لیے یہاں

نومبر میں برف باری کا آغاز ہوجاتا تھا اور اگر اکتوبر کے آخر تک فصل نہ سکے تو امکان ہوتا تھا کہ وہ بھی رگ جائے گی۔ اسی طرح سبزیوں کو جلدی تیار کرنے کے لیے پانی کی اشد ضرورت تھی۔ میکس نے دل پر پتھر رکھ کر مورگن کا یہ مطالبہ بھی پورا کر دیا۔ نئے پمپ اور اسپرنگھو سے اس کا کام آسان ہو گیا تھا۔ اکتوبر کے آخر میں سبزی کی فصل تیار تھی اور مٹی کینے سے پہلے مورگن نے ملازموں کی مدد سے سبزی زمین سے لٹکائی تھی اور اسے مقامی منڈی میں بھی پہنچا دیا تھا۔ اس نے یہ کام اتنی مہارت اور نظم کے ساتھ کیا کہ میکس کا ایک ہی پمپ ٹرک سوٹن سے زیادہ سبزی کو منڈی تک پہنچانے کے لیے کافی ثابت ہوا تھا۔ ٹرک خستہ حال تھا لیکن مورگن نے اس کی مرمت بھی کر لائی تھی۔ ایک ہفتے کے اندر سبزی منڈی پہنچ چکی تھی۔ چونکہ علاقے میں سب سے پہلے میکس کے فارم سے سبزی آتی تھی اس لیے تاجروں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔ مورگن نے سبزی اعلیٰ معیار کی لگائی تھی اور فصل بہت اچھی تیار ہوئی تھی اس لیے اس کی قیمت بھی اچھی لگتی تھی۔

میکس کو جب ایک لاکھ تیس ہزار ڈالر کا چیک ملا تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا تھا۔ اول تو وہ فارم پر سبزی نہیں لگاتا تھا کیونکہ سبزی میں محنت بہت ہوتی ہے اور بھی سبزی لگائی بھی تو معمولی درجے کی لگائی تھی جس سے اسے کچھ نفع ملا تھا۔ مورگن نے اسے چیک دیتے ہوئے کہا۔ ”سبزی پر آنے والا خرچ اندازاً چالیس ہزار ڈالر ہے یعنی اس میں تمہیں نوے ہزار ڈالر کا خالص نفع ہوا ہے۔“

میکس نے سمجھلے ہوئے کہا۔ ”وہ تو سال کے آخر میں پتا چلے گا۔ اخراجات بھی کم نہیں ہیں۔“

”مٹی کی فصل کینے والی ہے ہمیں ایک دانے نکالنے والی مشین کی ضرورت ہے۔“

”مشین کی کیا ضرورت ہے، مجھے ایسے ہی فروخت کر دیتے ہیں۔“ میکس نے جلدی سے کہا۔

”اس صورت میں ہمیں پچیس فی صد قیمت کم ملے گی۔“ مورگن نے کہا۔ ”میرا اندازہ ہے کہ اس فصل کے تمہیں دو لاکھ ڈالر مل سکتے ہیں اگر ایسے ہی فروخت کیا تو ڈیڑھ لاکھ ڈالر ملیں گے۔“

میکس آسانی سے ہانے والا نہیں تھا لیکن پچاس ہزار ڈالر نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ مشین کوئی بارہ ہزار ڈالر کی تھی جسے خرید کر بھی وہ ان میں ہزار کے نفع میں رہتا جب کہ مشین تو سالوں استعمال ہو سکتی تھی۔ وہ مان گیا اور مورگن نے فوری طور پر مشین اور یورپوں کا آرڈر دے

دیا۔ میکس کے پاس اجناس کی ذخیرہ گاہ بہت چھوٹی تھی۔ اس لیے جو بھی کئی ننگی جاتی اسے منڈی پہنچانا لازم تھا۔ میکس چاہتا تھا کہ ملازموں کو فارغ کر دے لیکن اس کے بجائے مورگن نے انہیں پہلے سے زیادہ معاوضے پر رکھ لیا تھا۔ میکس کو پتا چلا تو وہ غصے سے بھر گیا۔ اس نے مورگن کو بلایا۔

”تم نے ان لوگوں کو پھر کیوں رکھ لیا ہے جب کہ ان کی کوئی ضرورت نہیں ہے؟“ اس نے کڑے لہجے میں پوچھا۔

”ضرورت ہے۔“ مورگن نے کہا۔ ”مکھی سے نکلے دانے یہی لوگ یورپوں میں بھر کر میرے ساتھ منڈی تک پہنچائیں گے۔“

”یہ کام تو دوسرے بھی کر سکتے ہیں جو ان سے کم معاوضہ لیں گے۔“

”میں چاہتا ہوں کہ ہر ما کے بعد یہ بیہنیں آئیں، تب ہی میں انہیں اضافی کام دے رہا ہوں۔ یہ اس فارم کو کچھ بچے ہیں۔ اگر انہیں کو ایک مہینے میں چند ہزار ڈالرز اضافی دے دیئے جائیں تو یہ اگلے سال آکر ہمیں زیادہ فائدہ پہنچائیں گے۔“

میکس کو اس بار بھی خاموش ہونا پڑا کیونکہ وہ دیکھ چکا تھا کہ مورگن کی وجہ سے اسے کس قدر فائدہ ہو چکا تھا۔ اس کے بینک اکاؤنٹ میں لاکھ ڈالرز سے زیادہ کی رقم آچکی تھی اور اس سے زیادہ آنے والی تھی۔ مکھی کی فصل میکس کی توقع سے زیادہ شاندار ثابت ہوئی تھی۔ وہ اس کے اترنے سے پہلے اپنا دوسرا آپریشن کرانے اسپتال روانہ ہو گیا تھا۔ ایک ہفتے بعد وہ آیا تو نصف فصل اتر چکی تھی اور باقی اتر رہی تھی۔ مورگن فصل اتروانے کے ساتھ ساتھ کھانے کے ہاتھ اس کے دانے نکلوا کر یورپوں میں بھر کر منڈی پہنچا رہا تھا۔ نومبر کے پہلے ہفتے میں جب پہلی برف باری ہوئی تو اسی دن مکھی کی فصل کی آخری پوریاں منڈی روانہ ہو چکی تھیں۔

دو ہفتے میں ساری فصل اتار کر اسے یورپوں میں بھر کر منڈی بھیجنا آسان کام نہیں تھا۔ مورگن اپنے چار ساتھیوں سمیت روزانہ سولہ گھنٹے کام کرتا تھا تب کہیں جا کر یہ کام مکمل ہوا تھا۔ اس کی گائی ہوئی مٹی اتنی شاندار ثابت ہوئی تھی کہ تاجروں نے اس کی بڑھ چڑھ کر بولی لگائی تھی۔ چند دن میں مجموعی طور پر دو لاکھ بارہ ہزار ڈالرز ملائی مٹی میکس کے اکاؤنٹس میں آچکے تھے۔ اب کوئی کام نہیں تھا، اس لیے مورگن نے سوائے کانک کے تمام ملازموں کو مع یوںس کے فارغ کر دیا۔ اس نے یوںس کے بارے میں میکس کو نہیں بتایا تھا لیکن جب اس نے بعد میں چیک کیا تو مورگن پر برس پڑا۔

”یہ یوںس کس خوشی میں دیے گئے ہیں۔ جب کہ ان

لوگوں کو ان کے کام کی مکمل ادائیگی کر دی گئی ہے۔“

”یہ ان کی بہترین کارکردگی کا انعام ہے۔“

میکس کچھ دیر مورگن کو ذہنی نظروں سے دیکھتا رہا تھا پھر اس نے کہا۔ ”سنو مورگن یہ میرا فارم ہے اور میں انعامات کا قائل نہیں ہوں۔“

”لیکن میں تو یوں اور ابھی میں تمہارے ساتھ نفع نقصان میں شریک ہوں۔“

”پھر بھی یہ فارم میرا ہے۔“

”معاوضے کی رو سے تم میرے معاملے میں دخل نہیں دے سکتے، لیکن اگر تمہیں اس بات سے اختلاف ہے تو تم انعام میں دی جانے والی رقم میرے حصے سے کاٹ سکتے ہو۔“ مورگن نے بے پروائی سے کہا۔

میکس تھکا کر رہ گیا تھا۔ فصولوں سے ہونے والے نفع سے زیادہ معاوضے نے اس کے ہاتھ باندھ دیے تھے۔ اس نے کانک کے بارے میں پوچھا۔ ”تم نے اسے کیوں رکھا ہوا ہے؟“

”میں نے مکھی کی بیج جانے والی فصل بھی کٹا کر رکھ لی ہے اور کانک اسے زمین سے کاٹ کر جانوروں کے چارے میں تبدیل کرے گا۔ سردیوں میں اس علاقے میں چارہ مہنگا ہو جاتا ہے۔ یہ چارہ کچھ اچھی رقم کما سکتی ہے۔“

مورگن نے کپڑے پودوں کے بڑے بڑے ڈھیر بٹا کر انہیں تریالوں سے ڈھک دیا تھا۔ تاکہ وہ بارش اور برف باری سے محفوظ رہیں۔ مورگن نے کانک کو کام کا طریقہ سکھایا تھا اور وہ اس کے مطابق پودوں کو زمین کی مدد سے کاٹ کر چارے کی صورت میں پیک کر رہا تھا۔ ابھی منڈی میں خشک چارے کی قیمت اتنی نہیں تھی کیونکہ جانور پالنے والوں نے اچھی چارہ جمع کر رکھا تھا۔ سرمایے کے آخر میں جب ان کا جمع کیا ہوا چارہ ختم ہونے کے قریب ہوتا تھا تب وہ منڈی سے چارہ لیتے تھے اور اس وقت قیمت اچھی ملتی تھی۔ کانک کئے ہوئے چارے کی پوریاں بنا کر ان کو اسی طرح تریال کے نیچے رکھ رہا تھا اور وہ خوش تھا کیونکہ سرمایے کے چارہ مہینے اسے کام نہیں ملتا تھا اور وہ گھروں کے سامنے سے برف صاف کر کے کچھ رقم کمایا کرتا تھا۔ اس بار اسے روزگار ملا ہوا تھا۔ یہ کام اتنا تھا کہ وہ تین مہینے تک آرام سے کر سکتا تھا پھر ایک مہینہ مارچ کے خاتمے تک فارم پر گندم کی کاشت کے لیے تیاری شروع ہو جاتی۔ مورگن نے اسے کہا کہ وہ آرام سے کام کرے کیونکہ ایک مہینے میں وہ اس سے درختوں کی دیکھ بھال اور صفائی کا کام لے گا جو اب خاصے بڑھ چکے تھے اور امکان تھا کہ ایک سال میں یہ پندرہ ڈنٹ سے زیادہ اونچے ہو جائیں گے۔

کیونکہ مورگن کو اب کوئی کام نہیں تھا اس لیے وہ دن میں ایک چکر لگا کر اور کانک کے کام کا جائزہ لے کر چلا جاتا تھا۔ جس دن برف باری ہو جاتی تو کانک بھی کام پر نہیں آتا تھا، اس لیے مورگن بھی آرام کرتا تھا۔ اس کے پاس چھوٹا سا دو کمروں کا کاناچ تھا جہاں وہ خود کھانا بناتا اور اس کا وقت اکیلے گزارتا تھا۔ ہاں جب موسم بہتر ہوتا تو وہ قصبے کی طرف چلا جاتا تھا۔ اس روز اسے کچھ سامان لینا تھا تو وہ پیر اسٹور چلا آیا تھا۔ وہاں سامان لیتے ہوئے اس کی نظر ایک عورت پر پڑی اور اسے اچھے لگے اس نے اسے نہیں دیکھا ہے۔ وہ سامان لے کر کاؤنٹر پر گئی جہاں اسٹور کا مالک ایڈم موجود تھا۔ اس نے عورت کو متنبہ کیا کہ کتنا غلط کیا تو مورگن سمجھا کہ وہ اسے کیوں جانی پہچانی لگ رہی تھی۔ وہ بے ساختہ اس کی طرف بڑھا۔

”ہیلو..... مجھے پہچانا؟“

ہیلن نے غور سے اسے دیکھا اور نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں۔“

”میں مورگن ہوں ہم ایک ہی گلی میں رہتے تھے۔“

”اوہ اچھا.....“ ہیلن نے سرسری سے انداز میں کہا اور ایڈم کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اس کے انداز میں سر دھری محسوس کر کے مورگن سمجھے ہو گیا تھا۔ اس نے سامان لیا اور باہر نکل آیا۔ اسے لگا کہ ہیلن چین کی وہ بات نہیں بھولی تھی جب اس کی میکس سے سامان کے دس دس ہوئی تھی اور میکس نے اس پر گرانے کا الزام لگا کر ہیلن کی ہمدردیاں جیت لی تھیں۔ جب مورگن یہاں سے گیا تو ہیلن اس وقت ہائی اسکول کے آخری سال میں تھی۔ مورگن کا خیال تھا کہ اس کی میکس سے دوستی ہے اور شاید وہ آپس میں شادی کر لیں لیکن بعد میں اسے اس بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملی تھی۔ ہیلن یہاں سے چلی گئی تھی۔ مورگن کو پھر اس کا خیال نہیں آیا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ میکس نے شادی نہیں کی تھی۔

دو دن بعد وہ فارم کی طرف گیا۔ کانک اپنا کام کر رہا تھا۔ مورگن میکس سے ملا۔ اس نے اب اس کے سہارے بلکہ پھانک چلنا شروع کر دیا تھا لیکن ابھی وہ اس ناگ پر زور نہیں دے سکتا تھا۔ مورگن اس سے کہنے آیا تھا کہ گندم کے لیے بیج ابھی سے لے لے کیونکہ سیزن شروع ہو گیا تو قیمت بڑھ جائے گی اور اچھا بیج مشکل سے ملے گا۔ میکس نے اسے ٹال دیا۔ ”ابھی تو کئی مہینے پرے ہیں۔“

”ہاں لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا جائے گا تمہیں بیج مہنگا ملے گا۔“

میکس سوچ میں پڑ گیا تھا لیکن اس نے مورگن کی

بات کا جواب نہیں دیا۔ اس کے بجائے اس نے کہا۔ ”تمہیں پتا چل گیا ہوگا۔ ہیلن واپس آگئی ہے۔“

”ہاں میں نے اسے پیر اسٹور میں دیکھا تھا۔“

”دیکھا تھا یا اس سے فری ہونے کی کوشش کی تھی؟“

میکس کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔

”ہیلن میں نے تو اس سے سابقہ پڑوی ہونے کے ناتے پہلو باندھے تھے لیکن اس نے سچ سے جواب نہیں دیا۔“

”وہ کل مجھ سے ملنے آئی تھی۔“ میکس کا لہجہ ابھی ہو گیا جیسے اسے توقع ہو کہ مورگن یہ بات جان کر جل جائے گا۔ ”وہ یوسٹن چلی گئی تھی لیکن اب شہر سے اس کا دل بھر گیا ہے اور وہ اپنی زمین پر کام کرے گی۔“

مورگن نے اس کی بات کا اثر نہیں لیا تھا۔ ”میں نے سنا ہے اس کے پاس سوا کیلرز زمین ہے۔“

”ہاں اور وہ مزید خرید رہی ہے۔ سچ اپنی زمین فروخت کر رہا ہے۔ ہیلن کی زمین کے ساتھ ہی ہے۔“

مورگن سچ کو بھی جانتا تھا۔ وہ براہ راست کار تھا لیکن اب بوڑھا ہو گیا تھا اور اس کی کوئی اولاد بھی نہیں تھی۔ اس لیے مجبوراً وہ زمین بیچ رہا تھا۔ اس کے پاس بھی سوا کیلرز سے زیادہ زمین تھی۔ سچ، ہیلن کا باپ اور میکس کا باپ اسٹین ٹاؤن کے بڑے زمیندار تھے باقی لوگوں کے پاس اپنی زمین نہیں تھی۔ سچ کی زمین میکس کی زمین سے بھی کئی ہوئی تھی۔ مورگن نے پوچھا۔

”کیا تم نے سچ سے زمین لینے کی کوشش نہیں کی تھی؟“

میکس نے برا سامنا بنایا۔ ”مکھی... لیکن بڑھے کا دماغ خراب ہے۔ پہلو تو انکار کر دیا جب میں نے دوبارہ پیش کش کی تو مجھ سے پانچ لاکھ ڈالرز مانگ رہا تھا۔“

”میرے خیال میں تو ٹھیک مانگ رہا تھا شاید اس علاقے میں زمین کی قیمت اس سے زیادہ ہی ہے۔“

”ہاں لیکن ابھی کوئی خرید نہیں ہے۔“

میکس نے شاید مورگن سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ بوڑھا سچ اتنا کمزور بھی نہیں تھا کہ اپنی زمین اونے ہونے سے بچ دیتا۔ اس نے کمایا تھا اور آرام سے اپنا بوڑھا گزار سکتا تھا۔ لیکن وہ زمین کو بے آباد نہیں چھوڑنا چاہتا تھا اور خود اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ زمین کا کاشت کر داسن۔ ان دنوں اقتصادی بد حالی کی وجہ سے زمین کی خرید و فروخت بند تھی۔ میکس نے شاید اسی کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ حالانکہ وہ اپنی زمین تو صحیح طریقے سے کاشت نہیں کر پا رہا تھا لیکن اس کے اندر سب سے بڑا بین جانے اور سب

میکس مطمئن نہیں تھا اس نے سر ہلایا۔ ”دیکھتے ہیں ورنہ میں کسی باہر کو بلاؤں گا۔“

پھر میکس اس سے گندم کے بارے میں پوچھنے لگا۔ وہ بھی کھیتوں کی طرف نہیں آ سکتا تھا کیونکہ ڈالرز نے اسے تاہوراز میں پھنسا دیا تھا اور وہ اپنے مکان سے باہر ڈھیل چیر استعمال نہیں کرتا تھا۔ یہ اس کا شاید کوئی نفسیاتی مسئلہ تھا۔ اس دوران میں ہیلین سے اس کی ملاقاتیں جاری تھیں۔ کئی بار آتے جاتے ہیلین سے مورگن کا سامنا ہوا لیکن وہ اسے نظر انداز کر کے گزر جاتی تھی۔ اس کے رویے پر بعض اوقات مورگن کو طیش آ جاتا تھا لیکن پھر وہ خود کو ٹھنڈا کر لیتا تھا۔ مئی کے آغاز میں بارشیں شروع ہو گئیں۔ یہ بارش گندم کے لیے بہت ضروری تھی۔ مورگن خوش تھا، بارشوں کی وجہ سے اسے امید تھی کہ گندم کی فصل بھی شاندار ہوگی۔ اس روز وہ کام ختم کر کے گھر کی طرف روانہ ہوا تو بارش ہو رہی تھی۔ مورگن نے برساتی دھنچکا رکھی تھی۔ وہ فارم سے نکل کر قصبے کی طرف جانے والی جی سڑک پر آیا تو اسے ایک چھوٹی کارر کی نظر آئی۔ دراصل کار کا پچھلا پیہ ایک گاڑی سے جھنسا گیا تھا اور ڈرائیور کی کوشش کے باوجود کار گڑھے سے نہیں نکل پاری تھی۔ مورگن نے کھڑکی کا شیشہ بجایا۔

”کیا میں تمہاری کوئی مدد کر سکتا ہوں؟“

ڈرائیور نے شیشہ پیچ کر دیا تو مورگن جھجک گیا۔ سامنے ہیلین تھی۔ وہ پریشان لگ رہی تھی۔ ”وہ..... کار پھنس گئی ہے۔“

”تم رئیس مت دو میں کوشش کرتا ہوں۔“

مورگن نے ادھر ادھر سے پتھر اور شیشے جمع کر کے ٹائر کے سامنے رکھیں اور ہیلین سے کہا۔ ”جب میں گاڑی کو دھکا دوں تو تم رئیس دینا۔“

مورگن نے دھکا دیا تو کار آرام سے گڑھے سے نکل گئی۔ ہیلین نے کار روک دی۔ مورگن پاس آیا تو اس نے کہا۔ ”تمہارا شکر یہ..... کہاں جا رہے ہو؟“

”گھر جا رہا ہوں۔“ مورگن نے جواب دیا۔

ہیلین پچھلی سیٹ پر اس نے پیش کش کی۔ ”میں تمہیں چھوڑ دیتی ہوں۔“

”اس کی ضرورت تو نہیں ہے لیکن تم کہتی ہو تو.....“ مورگن گھوم کر اندر آ گیا۔ ہیلین نے کار آگے بڑھا دی۔ کچھ دیر خاموشی رہی تھی۔

”تم میکس کے لیے کام کر رہے ہو؟“

”ہاں جہاں میں کام کرتا تھا وہاں خشک سالی کی وجہ سے کام نہیں رہا تھا۔“

”میکس بتا رہے تھے اس سے شراکت پر کام کیا ہے؟“

”ہاں اگر مجھے مشکل ہو رہی ہے کیونکہ سال سے پہلے میکس مجھے ایک ڈالرز بھی ادا نہیں کرے گا لیکن یہ میرے لیے بہتر ہے میں جتنی محنت کروں گا اس کا صلہ حاصل کروں گا۔“

ہیلین نے کسی قدر بے چینی سے پہلو بدلا۔ ”لیکن یہ اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا نہیں ہے؟“

مورگن حیران ہوا۔ ”مجبوری سے فائدہ وہ کیسے؟“

”میکس خود سے کام کرنے کے قابل نہیں ہے اور تم نے اس سے فائدہ اٹھا کر اس سے شراکت داری کا معاہدہ کر لیا۔“

”یہ اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا نہیں ہے اس کا اور میرا مشترکہ فائدہ ہے۔ وہ اس قابل نہیں ہے کہ کام کر سکے اور اگر میں اس کی ملازمت کرتا تو وہ ہر معاملے میں ٹانگ اڑاتا۔ اس کے اکثر ملازم اس کے اسی خراب رویے کی وجہ سے بھاگ جاتے ہیں۔ دوسرے وہ تنخواہ اتنی کم دیتا ہے کہ کوئی مشکل سے ہی اس پر کام کرنے کو تیار ہوتا ہے۔ اگر کوئی کرتا بھی ہے تو بے دلی سے کرتا ہے۔ جب میں نے فارم پر کام شروع کیا تو اس کی حالت بہت خراب تھی۔“

”لیکن میکس کا کہنا ہے کہ فارم بہت اچھی حالت میں تھا اور تم نے اسے خراب کیا ہے۔“

”وہ ایک گھبراہٹ میں آدمی ہے۔“ مورگن کا جواب تھا۔

”ایک بار پہلے بھی اس نے جھوٹ بول کر تم کو گھبراہٹ سے بدعنوان کیا تھا اور اب بھی وہ یہی کام کر رہا ہے۔ اس وقت میرا کوئی گواہ نہیں تھا لیکن اب پورا قصبہ میرا گواہ ہے تم برابر والے بچے سے پوچھ لو کہ جب میں نے فارم پر کام شروع کیا تھا تو اس کی کیا حالت تھی؟“

ہیلین چپ ہو گئی۔ کچھ دیر میں مورگن کا گھر آ گیا۔ اس نے مورگن کو اتارا اور ایک بار پھر اس کا شکریہ ادا کر کے چلی گئی۔ مورگن کو کسی قدر اندازہ ہو گیا کہ ہیلین کے اس رویے کی کیا وجہ تھی۔ میکس ہیلین کو اس کے بارے میں بیکار تھا اور مورگن نہیں سمجھ سکا کہ وہ ایسا کیوں کر رہا تھا۔ کیا اسے مورگن سے کوئی خوف تھا یا کوئی اور وجہ تھی۔ امکان تو یہی تھا کہ وہ یہ حرکت اپنی فطرت کے مطابق کر رہا تھا۔ اگلے روز وہ فارم پہنچا تو میکس گھر کے پاس کھڑا زمین کا معائنہ کر رہا تھا۔ مورگن کو اسے دیکھ کر غصہ آ گیا اور اس نے میکس کے پاس جاتے ہی پوچھا۔

”تم نے ہیلین کو میرے بارے میں کیا کہا ہے؟“

میکس چونکا نہیں تھا۔ اس نے پرسکون انداز میں پوچھا۔ ”تم نے کیا سنا ہے؟“

”ہیلین کے خیال ہے میں تمہاری مجبوری سے میں فائدہ اٹھا رہا ہوں۔“

”یہ اس کا اپنا خیال ہے۔“ میکس کا انداز بے پروائی والا ہو گیا۔

”اس کے ذہن میں یہ خیال کہاں سے آیا؟“

”میں سے کم نہیں نہیں ڈال..... اور وہ خود بھی تو سب دیکھ رہی ہے۔“

”کیا دیکھ رہی ہے؟“

”میں نے میری عارضی معذوری سے فائدہ اٹھا کر مجھ سے ایسا معاہدہ کر لیا جس میں تمہیں تمہاری حیثیت اسے نہیں زیادہ حاصل ہو گیا ہے۔“

”مورگن نے جواب دیا۔ ”ورنہ تم اس فارم پر کام کر کے اتنا نہیں کمائے تھے۔“

”یہ تمہارا خیال ہے۔“ میکس کا لہجہ تیز ہو گیا تھا۔

”اچھا اور دوسرے لوگوں کے بارے میں کیا خیال ہے۔“ مورگن نے پھر کیا۔ ”اب تک ہیلین صرف تمہاری باتیں سنتی رہی ہے میں نے اسے مشورہ دیا ہے کہ وہ قصبے کے دوسرے لوگوں سے بھی تمہارے بارے میں معلوم کر لے کہ میرے آنے سے پہلے تم اس فارم کو کس طرح چلا رہے تھے۔“

میکس کا منہ بند کیا تھا۔ ”تم کون ہوتے ہو اسے مشورہ دینے والے؟“

”تو تم کون ہوتے ہو ہیلین کو میرے بارے میں بہانے والے۔“

میکس کچھ دیر اسے گھورتا رہا۔ ”مت بھولو کہ تم میرے ملازم ہو؟“

”ملازم نہیں ایک سال کے لیے شراکت دار اور تیسرے حصے کا حق دار۔“ مورگن نے مسکرا کر کہا اور کھیت کی طرف چلا گیا۔ میکس تھلا کر رہ گیا پھر اس نے زیر لب کہا۔

”میں تمہیں دیکھ لوں گا۔“

مئی کے آخر تک پودے خاصے بڑے ہو گئے تھے اور ان کی نشوونما کی رفتار تیز تھی۔ بارشوں نے فصل پر مثبت اثر کیا تھا۔ جیسے جیسے سال پورا ہوا تو اس کا وقت پاس آ رہا تھا۔ میکس کی فکر بڑھتی جا رہی تھی اور اس کا یہ سوچ گرم نگاہا جا رہا تھا کہ اسے مورگن کو ایک بہت بڑی رقم حصے کے طور پر دینا ہو گی۔ اس نے اب تک جو کم کر دیا اس میں اس کا حصہ ایک لاکھ ڈالرز کے قریب ہو گیا تھا اور گندم اور بھری کی فصل فروخت کرنے کے بعد یہ حصہ کہیں زیادہ ہو جاتا۔ جب کہ

مورگن کے لگے ہوئے درخت بھی خاصے بڑے ہو گئے تھے۔ ان کی فروخت سے بھی بڑی رقم حاصل ہوتی۔ میکس کا اندازہ تھا کہ اسے کوئی پونے دو لاکھ ڈالرز کے آس پاس رقم مورگن کو دینا ہوگی اور اس کے خیال میں وہ اتنی رقم کا حقدار نہیں تھا۔ میکس نے اس چیز کو فراموش کر دیا تھا کہ مورگن کی وجہ سے ہی اس نے اتنا کمایا تھا کہ ایک دو سال کچھ نہ کرنا تب بھی اسے کوئی فرق نہیں پڑتا اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ وہ اس کا فارم منظم کر کے جا رہا تھا۔ لیکن اپنی فطرت کے مطابق اس نے یہ سب نظر انداز کر دیا تھا اور اب اسے فکر تھی کہ مورگن کے حصے میں کس طرح کی رقم ہے۔

جون کے شروع میں گرم اور خشک موسم کا آغاز ہوا جو گندم کو بکانے کے لیے ضروری تھا۔ مورگن نے اس بار کم بھری لگائی تھی کیونکہ گرمیوں میں اس کی اتنی مانگ نہیں ہوتی تھی۔ پھر بھی گندم کے پکنے سے پہلے ہی بھری لگ گئی تھی اور اس نے منڈی میں سپلائی شروع کر دی۔ جون کے آخر تک گندم کاٹ لی جاتی۔ مورگن اس سے پہلے ساری بھری منڈی پہنچا دینا چاہتا تھا۔ گندم کی فصل اس کی توقع سے زیادہ اچھی ہوئی تھی اور اسے امید تھی کہ وہ کم سے کم پانچ سو ٹن گندم اٹھا سکے گا۔ اس کی اچھی قیمت مل جائے گی اور سب سے پہلے میکس کے فارم کی گندم مارکیٹ میں آئے گی جب کہ باقی بھگیوں سے ایک ہفتے بعد گندم آئے گی۔ اس لیے اس کی اچھی بولی لگ سکے گی۔

بارش والے دن کے بعد مورگن کی ہیلین سے ایک دو بار ملاقات ہوئی تھی اور اس نے منحوس کیا کہ وہ اب اس سے بہتر انداز میں پیش آرہی تھی گویا اس کے ذہن میں میکس کی پھیلائی ہوئی غلط باتوں کا جال کٹ رہا تھا۔ لیکن اس کے انداز میں اب بھی ایک پچھلاہٹ نمایاں تھی اور مورگن کے خیال میں شاید یہ بطحانی فرق کی وجہ سے تھا۔ ہیلین کے پاس بہت بڑی زمین تھی اور وہ بچے کی زمین بھی حاصل کر لیتی تو میکس سے زیادہ زمین ہو جاتی۔ جب کہ مورگن ایک غریب آدمی تھا۔ اس کے پاس کوئی ذاتی زمین نہیں تھی۔ اس کے باپ کی زمین فروخت ہو چکی تھی۔

مورگن کام کر کے فارم سے گھر جا رہا تھا کہ اس نے بچے کے گھر سے ہیلین کو ٹکٹے دیکھا۔ اس بار وہ پیدل تھی۔ شام کے وقت خوش گوار ہوا چل رہی تھی اور پیدل چلنے کے لیے بڑا اچھا موسم تھا۔ ہیلین اسے دیکھ کر رک گئی۔

”ہائے..... کیا حال ہے؟“

”تم دیکھ رہی ہو۔“ مورگن نے اپنے مٹی سے اٹے

وجود کی طرف اشارہ کیا۔ ”تم سچ سے ملنے آئی تھیں؟“
 ہیلن نے سر ہلایا۔ ”ہاں میں اس سے زمین کا سودا کرنا چاہ رہی ہوں لیکن وہ قیمت ذرا زیادہ مانگ رہا ہے۔“
 قیمت زیادہ ہے لیکن سچ کی زمین بہت اچھی ہے اور یہ ایک دو سال میں اپنی قیمت ادا کر دے گی۔“
 ”ہاں لیکن فی الحال میرے پاس اتنی رقم نہیں ہے اور بینکوں سے قرض بڑی مشکل سے اور کڑی شرائط پر مل رہا ہے۔ اگر میں نے ساری جمع پونجی سچ کو دے دی تب بھی زمین کی قیمت ادا نہیں کر سکتی اور پھر مجھے زمین پر کام کرنا ہے تو اس کے لیے بھی رقم چاہیے ہوگی۔“
 ”ہاں یہ تو ہے۔“ مورگن نے کہا اور پھر خلوص سے بولا۔ ”اس سلسلے میں میری کسی مدد کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔“
 ہیلن نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ ”تم میری کیا مدد کر سکتے ہو؟“
 ”جیسی میں میکس کی کر رہا ہوں۔“
 ”میں مدد تو نہیں کرتے معاہدہ ہے۔“
 مورگن سرد آہ بھر کر رہ گیا۔ لیکن بھی میکس کے انداز میں سوچ رہی تھی۔ اس کے نزدیک بھی زمین کا مالک ہونا اور دولت مند ہونا ہی اہم تھا۔ کوئی اگر اپنے ہزاروں جرے کو پیش کرے تو یہ ان کے نزدیک ملازم رکھنے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ مورگن نے اپنے تجربے اور ہنر سے میکس کو اس سے کہیں زیادہ فائدہ پہنچایا تھا جتنا وہ خود کام کر کے حاصل کرتا تھا۔ اس کے باوجود وہ اس کے خلاف سازش کر رہا تھا اور ہیلن کی نظر میں اسے ایک موقع پرست بنا کر پیش کر رہا تھا۔ میکس جیسے لوگ دوسروں سے فائدہ اٹھا لیتے ہیں لیکن اپنی ذات سے کسی کو فائدہ ہونے نہیں دیتے۔
 ”تم نے میکس سے معاہدہ کیا ہے کہ ایک جولائی سے اگلے سال میں جون تک اسے فارم سے جوٹھ ہوگا تم اس میں تہائی کے حصے دار ہو گے۔“
 ”صرف نقد میں نہیں بلکہ نقصان میں بھی شریک ہوں۔“ مورگن نے سچ کی۔
 ہیلن چڑکی۔ ”میکس نے یہ تو نہیں بتایا تھا۔“
 مورگن کی مسکرائی۔ ”وہ تمہیں صرف وہی بتاتا ہے جو اس کے مفاد میں ہو اور جس سے اسے نقصان ہو وہ باتیں چھپاتا ہے۔“
 ہیلن نے اس کی طرف دیکھا۔ ”جب وہ تمہیں پسند نہیں ہے تو تم اس کے لیے کام کیوں کر رہے ہو؟“

”اس کام کے لیے میں اس کے پاس نہیں آیا تھا۔ اس نے مجھے خود اپنی مدد کے لیے بلایا تھا اور خوب سوچ سمجھ کر یہ معاہدہ کیا تھا۔ اب وہ تمہارے سامنے مظلوم بن رہا ہے۔ تم ذرا منڈی میں جا کر وہاں تاجروں سے پوچھ لو کہ ایک سال پہلے تک وہ انہیں کیا فروخت کرتا رہا ہے اور اس سال اس کے فارم سے منڈی میں کیا آیا ہے تمہیں خود ہی سب معلوم ہو جائے گا۔“ مورگن نے تیز لہجے میں کہا اور ہیلن سے آگے نکل گیا۔ نہ جانے کیوں اسے بہت غصہ آ رہا تھا۔ حالانکہ اسے میکس سے کوئی اچھی توقع نہیں تھی لیکن ہیلن کا انداز دیکھ کر اسے تکلیف ہو رہی تھی۔ وہ اب بھی مشکوک تھی کہ مورگن نے میکس کی معذوری اور مجبوری سے فائدہ اٹھایا تھا۔
 اگلے روز مورگن فارم پہنچا تو میکس اس کا منتظر تھا اور اس کے چہرے پر ہمدردی کے تاثرات تھے۔ مورگن سمجھا کہ شاید اسے ہیلن سے ہونے والی گفتگو کا علم ہو گیا ہے۔ لیکن اس نے مورگن کو بازو سے پکڑا اور اسے باغ میں لے آیا۔ اس کا پاؤں تقریباً ٹھیک ہو گیا تھا اور اب وہ بغیر سہارے کے چل رہا تھا۔ ایک مہینے بعد اس کا آخری آپریشن کر کے اس کے گھٹنے کی ٹنگنگ ختم کر دی جاتی جس کے بعد وہ اپنے اس پاؤں کو پوری طرح استعمال میں لاسکتا تھا۔ فی الحال تو پاؤں لکڑی کی طرح سیدھا تھا۔ وہ مورگن کو اس پودے کے پاس لایا جو مر جھکا ہوا تھا اور مورگن نے اسے سہارا دینے کے لیے اس کے ساتھ ایک لکڑی لگا دی تھی۔ میکس نے اس کی طرف اشارہ کیا۔
 ”یہ دیکھو یہ کیا ہوا ہے؟“
 مورگن نے دیکھا کہ اس نے سہارے کے لیے جو لکڑی لگائی تھی اس نے زمین میں جڑ پکڑ لی تھی۔ اگرچہ اس نے اپنا کام بھی کیا تھا اور قیمتی پودے پر بھی بہار آ رہی تھی۔ مورگن کا خیال درست تھا۔ اسے سہارے کی ضرورت تھی اور جب اسے سہارا مل گیا تو وہ پھر سے سر بہر ہو رہا تھا۔
 ”ہاں اب یہ ٹھیک ہو رہا ہے۔“
 ”میں اس کی نہیں اس لکڑی کی بات کر رہا ہوں جس نے جڑ پکڑ لی ہے۔“ میکس نے ٹھٹھا کر کہا۔
 ”اس کا کوئی مسئلہ نہیں ہے جب پودا پوری طرح سر بہر ہو جائے گا تو یہ لکڑی مع جڑ کے نکال دی جائے گی۔“
 ”نہیں اس وقت تک یہ میرے قیمتی پودے کو خراب کر دے گا اور زمین میں اپنی جڑیں پھیلا دے گا۔“ میکس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ”اے زمین سے نکال دو۔“
 ”اگر لکڑی کو زمین سے نکال دیا تو یہ پودا سہارے

سے محروم ہو جائے گا اور پھر سے مر جھانے لگے گا۔“
 ”یہ اب ٹھیک ہے اور اسے سہارے کی ضرورت نہیں ہے۔“ میکس نے اصرار کیا۔ ”اسے نکال دو۔“
 ”جیسی تمہاری مرضی۔“ مورگن نے شانے اچکائے اور کھڑی لا کر زمین خودی اور پوکش کی شاخ کو جڑ سمیت زمین سے نکال دیا۔ میکس مطمئن نظر آنے لگا۔
 ”اب ٹھیک ہے۔“
 مورگن فارم پر چلا آیا۔ اس نے شاخ ایک طرف پھینک دی اور کام میں لگ گیا۔ سبزی کی آخری کھپ رواں کی کے لیے تیار کی جا رہی تھی۔ اس کے بعد گندم کی کٹائی کا آغاز ہو جاتا۔ میکس کے پاس ایک چھوٹا سا تھریش تھا اس سے ساری زمین کی گندم کاٹنے میں ایک ہفتہ لگ جاتا اور اس میں زیادہ مزدوروں کی ضرورت پڑتی کیونکہ گندم کا دانہ پوروں میں پیک کرنا تھا۔ شام کو کام سے فارغ ہو کر مورگن نے میکس سے کہا۔
 ”میں چار مزدوروں کی ضرورت ہوگی۔“
 اس نے محو کر مورگن کو دیکھا۔ ”تمہارا دامغ درست ہے۔ تین افراد پہلے ہی کام کر رہے ہیں اور تم مزید چار کا مطالبہ کر رہے ہو۔“
 ”یہ جارحانہ طور پر ایک ہفتے کے لیے چاہئیں اور ان کی مدد سے گندم جلد منڈی تک پہنچا کر زیادہ قیمت حاصل کی جاسکتی ہے۔“
 ”اس کی اتنی جلدی نہیں ہے۔“ میکس نے بے پروائی سے کہا۔
 مورگن نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”کیوں جلدی نہیں ہے۔۔۔ اگر دوسروں کی فصل بھی مارکیٹ میں آگئی تو قیمت گر جائے گی اور تمہیں وہ قیمت نہیں ملے گی۔“
 ”یہ میرا مسئلہ ہے۔“ میکس کا لہجہ سرد ہو گیا تھا۔ ”گندم کی کٹائی ایک جولائی سے شروع کی جائے گی۔“
 ”ایک جولائی تک تو بہت دیر ہو جائے گی۔“ مورگن چلا اٹھا۔
 ”میں نے کہا نا کہ یہ میرا مسئلہ ہے۔“
 مورگن سمجھ گیا تھا میکس اسے گندم کی فروخت سے حاصل شدہ نفع سے محروم رکھنا چاہتا ہے۔ معاہدے کی رو سے وہ صرف تیس جون تک ہونے والی آمدنی میں حصے دار تھا۔ مورگن نے اس کی طرف حیرت سے دیکھا۔ ”میکس تم ایسا کیوں کر رہے ہو؟“
 وہ مسکرایا۔ ”ایک سال پہلے تم نے میری مجبوری کا

فائدہ اٹھایا تھا اور اب میں مجبور نہیں ہوں۔“
 ”یہ معاہدے کی خلاف ورزی ہے۔“
 ”بالکل کبھی نہیں ہے۔“ میکس نے اپنی جیب سے معاہدے کی کاپی نکال کر لہرائی۔ ”اس میں کہیں بھی نہیں لکھا ہے کہ میں اپنے فارم کی پیداوار مخصوص مدت میں بیچنے پر مجبور ہوں۔“
 مورگن ششدر رہ گیا تھا۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ میکس ایسی چالاکی دکھائے گا۔ واقعی وہ معاہدے کی رو سے فارم کی پیداوار ایک مخصوص مدت میں بیچنے کا پابند نہیں تھا۔ اب وہ گندم کی کٹائی اور منڈی میں سپلائی ایک جولائی کو شروع کرتا تو مورگن کو اس کے نفع میں سے کچھ نہیں ملتا۔ اس نے فارم کے کنارے لگے پوکش کے درختوں کی طرف دیکھا اور بولا۔
 ”میں فیصلہ تمہارا ان درختوں کے بارے میں ہے؟“
 ”ہاں میں نے سوچا ہے ان کو مزید ایک سال بعد فروخت کر دوں گا۔“ میکس عیاری سے بولا۔
 مورگن نے اسے گھورا۔ ”تم یہ مت سمجھو کہ تم چھوٹ جاؤ گے میں عدالت میں جاؤں گا۔“
 ”اس صورت میں اپنے بقیہ حصے سے بھی اس وقت تک کے لیے محروم ہو جاؤ گے جب تک یہ معاملہ عدالت میں چلے گا اور اس میں بہت طویل عرصہ لگ سکتا ہے۔“
 مورگن کو احساس ہوا کہ اس کی پوزیشن بہت نازک ہو گئی تھی۔ درحقیقت وہ پچھلے ایک سال سے بغیر کسی آمدنی کے بہت مشکل سے گزارا کر رہا تھا اور اب اس کے پاس کچھ بھی عدالت کے اخراجات اور وکیل کی فیس دینے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ اس نے خون کے گھونٹ پی کر کہا۔ ”ٹھیک ہے تب تم میرا اب تک کا حصہ ادا کر دو۔“
 ”وہ میں نہیں جون کو تمہیں اس شرط کے ساتھ دوں گا کہ تم لکھ کر دو کہ اب تمہیں مجھ سے کچھ نہیں لینا ہے۔“
 ”میکس تم نے ایک بار پھر میرے ساتھ زیادتی کی ہے۔“ مورگن کے لہجے میں شہوہ آ گیا تھا۔ ”میں نے تو تمہارے ساتھ اٹھا کیا ہے۔“
 ”یہ اچھا کیا ہے۔ اب بھی تم ایک مزدور کی سال بھر کی آمدنی سے دو گنا لے جاؤ گے۔“
 ”میں مزدور نہیں ہوں میں نے پورا ایک فارم چلایا ہے۔“
 میکس نے حقارت سے اسے دیکھا۔ ”تم ایک مزدور ہو اور تم نے اپنی اوقات سے ادنیٰ نچاڑنے کی کوشش کی تھی۔“

امید ہے اب تمہیں اپنی اوقات یاد آگئی ہوگی۔“
”افسوس کہ میں نے سمجھا کہ تم میرے ساتھ پھر دھوکا نہیں کرو گے لیکن تم اب بھی ایک دھوکے باز ہی ہو۔ بچپن میں بھی تم نے مجھے تینوں کی نظروں سے گرانے کے لیے جھوٹ بولا تھا۔“

میکیس ہنسا۔ ”میں آج بھی جھوٹ بول کر اسے حاصل کر لوں گا۔ اس کے ساتھ اس کی زمین اور پھر چچ کی زمین بھی میرے پاس آ جائے گی اور میں تم جیسے درجنوں ملازم رکھ سکوں گا۔ اگر تمہیں ملازمت کی ضرورت ہو تو پھر میرے پاس آ جانا میں کرن ہونے کے ناتے انکار نہیں کروں گا۔“
”تم جیسے آدمی کے پاس ملازمت کرنے سے بہتر ہے میں بے روزگاری رہوں۔“ مورگن نے غمی سے کہا۔ ”مجھے شروع سے شک تھا کہ تم تینوں کے ساتھ بھی تھکس نہیں ہو۔“
”لیکن مجھے شک بھی نہیں تھا۔“ قریب سے تینوں کی آواز آئی تو وہ دونوں اچھل پڑے۔ بارش میں درختوں کی وجہ سے انہیں پتائی نہیں چلا کہ تینوں کب وہاں آ گئی۔ تینوں میکیس کو گھور رہی تھی جو کچھ بدحواس ہو گیا تھا پھر اس نے جلدی سے خود کو سنبھالا۔

”تم کب آئیں؟“
”بہت دیر ہوئی۔“ وہ بولی۔ ”تمہاری باتیں سن رہی تھی۔“
”تینوں تم نے جو ستادہ اصل میں مورگن کو.....“
”اب مجھے مزید بے وقوف بنانے کی کوشش مت کرو۔“ تینوں نے اس کی بات کاٹی۔ ”میں نے خود سنا ہے تم اس سے کہیں زیادہ کہنے ثابت ہوئے ہو جتنا میں دوسروں سے تمہارے بارے میں سنی آئی ہوں۔“ تینوں نے کہا اور پلٹ کر وہاں سے چلی گئی۔ میکیس اس کے پیچھے آوازیں دیتا رہا لیکن تینوں نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ میکیس کھایا تا ہو کر واپس آیا اور مورگن پر برس پڑا۔

”تم یہاں کیا کر رہے ہو۔ کل سے یہاں قدم نہ رکھنا۔“
مورگن مسکرایا۔ ”تم بھول رہے ہو کہ میں تیس جون تک یہاں کام کرنے کا پابند ہوں۔“

”کوئی پابند نہیں ہو اب جاؤ یہاں سے۔“
”اے نہیں جب تک تم مجھے تحریری طور پر منع نہیں کرو گے کہ میں اب یہاں آنے کا پابند نہیں ہوں میں آتا رہوں گا۔“
اگلے روز میکیس نے اسے تحریری طور پر منع کر دیا اور تیس جون کو اس کے حصے کے چورا نوے ہزار ڈالر ادا کر دیے۔ اس نے ایک جولائی سے گندم کی کٹائی شروع کر لی لیکن پہلے تو اسے مزدور ہی نہیں ملے۔ بڑی مشکل سے اس نے دو گئے

معاوضے پر تین مزدور حاصل کیے تو انہوں نے نہایت سستی سے پندرہ دن میں جا کر گندم کی کٹائی مکمل کی اور اس وقت تک میکیس کی بد قسمتی کہ گندم کی قیمت چالیس فی صد تک گر گئی تھی اور اسے فروخت میں خاصا نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ میکیس کے لیے یہ صدے کی بات تھی کہ اسے اتنا نقصان اٹھانا پڑا تھا۔

لیکن بڑے صدے ابھی باقی تھے۔ ایک دن وہ صبح گھر سے نکلا تو اس نے مورگن کو چچ کی زمین پر کام کرتے دیکھا۔ وہ ہانڈھ کے پاس آیا۔ ”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“
”جو تم دیکھ رہے ہو۔“ مورگن نے کہا۔ ”میں نے چچ سے اس کی زمین پانچ سال کے لیے کرائے پر لے لی ہے اور اب میں اسے کاشت کروں گا۔“

میکیس دنگ رہ گیا تھا پھر اس نے سنبھل کر پوچھا۔ ”تمہارے پاس رقم کہاں سے آئی؟“
مورگن نے دونوں ہاتھ سامنے کیے۔ ”جو لوگ ان ہاتھوں کو استعمال کرتا جانتے ہیں انہیں کام حاصل کرنے کے لیے رقم کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔“

مورگن نے ایک سال کا کرپا دیے کر زمین لے لی تھی اور اب بھی اس کے پاس اتنی رقم تھی کہ وہ سارے سال کے اخراجات پورے کر سکتا تھا۔ اس کے ایک ہفتے بعد اس نے تینوں کی درخواست پر اس کی زمین کا کام بھی سنبھال لیا تھا۔ مورگن کے پاس مزدور اور مشینیں چالنے والے تھے اور اسے کام لینا بھی آتا تھا۔ وہ میکیس کے فارم سے آتے ہوئے وہ شاخ لیتا آیا تھا جسے اس نے پتی پودے کو سہارا دینے کے لیے زمین میں لگا دیا تھا اور شاخ نے جڑ پکڑ لی تھی۔ اس نے یہ پودا اپنے گھر کے سامنے لان میں لگا دیا تھا جس نے وہاں بھی جڑ پکڑ لی تھی۔ وہ قیمتی پودا جسے اس شاخ نے سہارا دیا تھا سہارے سے محروم ہونے کے بعد ایک بار پھر مر جھا گیا تھا۔

یہی حال میکیس کے فارم کا ہوا۔ مورگن کے بعد اس نے خود اسے کاشت کرنا شروع کیا اور چند ہی مہینوں میں فارم اپنی سابق حالت پر لوٹ گیا۔ کاکل اور دوسرے اچھے کام کرنے والے مورگن کے ساتھ چلے گئے تھے اور میکیس کو اب اپنے جیسے لوگ دستیاب تھے۔ اس لیے فارم کو پہلی حالت میں آنا ہی تھا۔ ایک سال بعد جب مورگن نے اتنا کمایا کہ اس نے چچ سے زمین کا ایک ٹکڑا خرید کر اس پر اپنے لیے مکان کی تعمیر شروع کر دی تو میکیس کے لیے سب سے بڑا دھچکا مورگن اور تینوں کی شادی کی خبر ثابت ہوئی تھی۔ اس وقت اسے لگا اس نے بہت کچھ ہوتے ہوئے بھی سمجھ کچھ کھو دیا ہے۔



علم چاہے جیسا بھی ہو، اگر دماغ کے کسی حصے میں جگہ بنالے تو کبھی رائگاں نہیں جاتا۔ وہ جو قدموں کی دھول تھا، اچانک ان علم والوں کے لیے کتنا معتبر بن گیا کہ دنیا حیران تھی مگر..... اس نے خان میں مل کر بتا دیا کہ اب اسے ان بلندیوں کی حاجت نہیں رہی۔

”علم کی جاگیر دار کی میراث نہیں“ کی ایک پراثر تفسیر

نزاکت ریاض مہر وی

آگیا

کلو میچ سے سہ پہر تک چودھری فتح محمد اور اس کے آدمیوں کے عتاب کا نشانہ بنا رہا۔ اس پر کے لائیں اور لاشیاں برساتی جاتی رہیں۔ نہ صرف چابکوں سے اس کے جسم کو اڑھڑا گیا بلکہ اسے گاؤں کی گلیوں میں گھسیٹا گیا اور تو اور اسی پر بس نہیں کیا، چودھری کے کارندے اس کے منہ پر کالک ٹھوپ کر گدھے پر سوار کر کے تمام گاؤں کی گلیوں میں اسے گھماتے رہے۔ اس دوران میں گاؤں کے شرارتی لڑکوں کا ایک ٹولہ ان کے پیچھے پیچھے تھا۔ جو کلو کے متعلق واہیات قسم کے نعرے لگاتے اور اسے پتھر بھی مارتے رہے۔ اس کے ساتھ ہر وہ ذلت آمیز سلوک کیا گیا جس سے نہ صرف اس کا جسم بلکہ روح بھی گھاس ہوتی رہی۔

چودھری فتح محمد کا حکم تھا کہ اس کے ساتھ ایسا سلوک کیا



جائے کہ آئندہ کسی اور کو اس کی حویلی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی بھی جرات نہ ہو۔ چودھری کو زیادہ غصہ اس بات پر تھا کہ کلو جیسے معمولی آدمی نے اس کی حویلی سے طلائی زیورات چوری کر لیے تھے۔ یہ بات چودھری کے لیے انتہائی شرمناک تھی کہ کوئی ”مانی کالال“ اس کی حویلی سے چوری کر کے زندہ سلامت واپس چلا گیا تھا۔ اس سے بھی زیادہ شرمناک بات یہ تھی کہ وہ ”مانی کالال“ گلو تھا۔ وہ کلو جو دھان پان سا، مختصر سے وجود کا مالک تھا۔ جسے دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ دھان پان سا کلو چودھری فتح جیسے سفاک آدمی کی حویلی میں رات کے وقت گھسنے کا ارادہ بھی کر سکتا ہے، لیکن صبح جب گاؤں کے تمام گھروں کی تلاشی لینے کا سلسلہ شروع ہوا اور مولوی صلاح الدین کے حجرے سے وہ طلائی زیورات برآمد ہوئے تو اس موقع پر موجود کلو نے اچانک ایک کمال جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے چودھری فتح محمد کے سامنے ایسے اعتراف کر لیا جیسے مولوی صاحب کا پڑھایا ہوا کوئی سبق سنار پا ہو۔ ”چودھری صاحب! زیورات میں نے چوری کر کے مولوی صاحب کے حجرے میں چھپائے تھے۔ میں نے سوچا تھا کہ بعد میں جب معاملہ سر پڑے گا تو زیورات نکال کر شہر لے جا کر بیچ دوں گا اور ہمیشہ کے لیے گاؤں چھوڑ دوں گا۔“ اور کلو کا بیان مکمل ہوا ہی تھا اور دھار پاس کھڑے مولوی صلاح الدین کا ہاتھ اٹھا اور چٹاخ کی آواز کے ساتھ کلو کے چہرے پر نشان ثبت کر گیا۔

”کہنے ہمک حرام، بیچ کی اولاد دکھاؤ! نا اصلیت، جس تھا ہی میں تو برسوں سے کھانا چلا رہا ہے، اسی میں چھید کر دیا۔“ تجھے ذرا لاج نہیں آئی یہ کہ یہہ کام کرتے ہوئے۔“ مولوی صلاح الدین کا غصہ دیکھنے سے تعلق نہ لگتا تھا۔ وہ کلو کو صلوٰۃ میں سنانے کے ساتھ ساتھ اس پر لاشیاں بھی برساتے جا رہے تھے۔ اس وقت یہ دھان پان سا کلو کا جانے کیوں مضبوط چٹان بنا رہا۔ منہ سے اف تک نہ کی۔ چودھری فتح محمد اور اس کے کارندے بھی ان کا ساتھ دے رہے تھے۔ گاؤں کے دوسرے کئی لوگ بھی کلو کو برا بھلا کہہ رہے تھے۔ ہر شخص کلو کے خلاف اپنی آواز بلند کر کے سچائی کا بھرپور ساتھ دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اتنا کچھ ہو جانے کے باوجود اس مٹی کے مادھو کے منہ سے کراہوں کے علاوہ کوئی آواز نہ نکل رہی تھی۔ اس کی زبان پر کوئی فریاد کوئی احتجاج نہ تھی۔ وہ جانتا تھا کہ جو قدم وہ اٹھا چکا ہے اب ہر فریاد ہر احتجاج بی معنی ٹھہرے گی۔ بس یہی سوچ کر اس نے اپنے آپ کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ سد پھر تک وہ بالکل مرنے کے

قریب پہنچ گیا تو چودھری نے اپنے کارندوں کو حکم دیا۔ ”اس بے غیرت کی اولاد دوگواؤں کی حدود سے باہر پھینک آؤ۔“ مر گیا تو مر گیا۔ زندہ غیاغ نیک تو نہیں دفعان ہو جائے گا۔ دوبارہ گاؤں کا رخ نہیں کرے گا۔“

☆☆☆

کلو گاؤں کی سب سے ناپسندیدہ شخصیت تھا۔ اس میں ایسا تھا بھی کیا کہ اسے پسند کیا جاتا۔ تارکلو جیسی سیاہ رنگت۔ بعد سے نفوس اور قد کے لحاظ سے بھی بونا سا تھا۔ اور سب سے بڑا عیب یہ تھا کہ وہ بے حد غریب تھا ورنہ دولت تو ایسی چادر ہے جو ہر داغ کو ڈھانپ لیتی ہے۔ ہر خاخی کو چھپانے والی یہ چادری نہ اس کے چروں کے پاس رہی تھی اور نہ ہی اسے میسر تھی۔ اس کے آباؤ اجداد سب نے غریبی کی رفاقت میں زندگی کا سفر طے کیا تھا اور یہی غریبی اب اس کے بھی ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔

ماں نے اس کا نام مانتا رکھا تھا مگر اس کے ظاہر کو دیکھتے ہوئے سب اسے کلو ہی کہتے تھے۔ شاید اس لیے کہ ان کے پاس وہ آنکھیں نہ تھیں جو اس کی ماں کے پاس تھیں۔ بقول شخصے ”دنیا کہے کالا کالا ماں کے میرے گھر کا اجالا“ کے مصداق ماں کے لیے تو وہ چاندنی تھا۔ ایک روشن چمک چاند۔ کلو کا باپ اس کی پیدائش سے پہلے مر گیا تھا۔ جب وہ سات سال کا تھا کہ اس کی ماں کوئی لی نے لیا۔ اس زمانے میں اس مرض کا علاج نہ تھا اور اگر علاج ہوتا بھی تو کیا۔ اس کا عزیز رشتے دار کوئی تھا نہیں اور کسی دوسرے کو کیا پڑی تھی اس کے دوا دارو کی۔ وہ ایک سال تک چار پائی پر بڑی کھاسی اور تڑپتی رہی۔ زندگی اور موت کی جنگ سال بھر گھوا اپنی خالی خالی آنکھوں سے دیکھتا رہا جیسے اسے کچھ نہ آ رہا ہو کہ وہ اس روتی ہوئی عورت کے لیے کیا کرے۔ موت کے سامنے نہ کسی کی چلی ہے اور نہ ہی چل سکے گی۔ موت ازل سے زندگی پر حاوی ہے اور اب تک رہے گی۔ سو یہاں بھی زندگی بارگاہی اور موت اپنی فتح کا جشن مناتے ہوئے معصوم کلو کا واحد سہارا بھی چھین کر لے گئی۔ ماں کے مرنے سے آٹھ سالہ کلو کی دنیا ہی اجڑ کر رہ گئی۔ اس نے باپ کو کبھی دیکھا تھا اس کے لیے وہ ماں اور باپ دونوں ہی تھی۔ گویا کلو کے لیے تو اس کا باپ بھی اسی روز مرا تھا۔ ماں کے مرنے سے اس کی خوشیاں بھی مر گئیں۔ اس کی ہنسی مر گئی اور۔۔۔ اس کے مرنے سے تو مانتا ب بھی مر گیا۔ اب تو وہ کلو تھا۔ صرف کلو۔ اسے مانتا ب سمجھنے والی، مانتا ب کہہ کر پکارنے والی مر گئی تھی۔ اس کی ماں کے مرنے کے بعد چند دن تک گاؤں والوں نے

ہمدردی جتنا ہی بھر رفتہ رفتہ سب اسے بھولتے چلے گئے۔ ایک مولوی صلاح الدین ہی تھے جن کے گھر سے اسے کھانے کو روٹی بھی مل جاتی اور ان کے بیٹے غیاث الدین کے پرانے کپڑے، جوتے بھی۔ اس نے کبھی کسی کی آنکھوں میں اپنے لیے شفقت و محبت نہ دیکھی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آتا تھا کہ ہر کوئی اسے حقارت کی نظر سے کیوں دیکھتا ہے۔ اس کے ہم عمر بچے اسے اپنے ساتھ کھینے نہیں دیتے تھے۔ کلو کی بھی کیا قسمت تھی۔۔۔ اس نے اپنے بچپن کے خوبصورت اور کھیلنے کوڑنے کے دن بھی اپنی جمپوڑی میں محسوس ہو کر گزر اردے تھے۔ کبھی زیادہ جی گھبراتا تو کھیتوں کی طرف نکل جاتا اور گھنٹوں تنہا اس کے ساتھ ایسا سلوک کیوں کرتی ہے۔۔۔ اگرچہ وہ بھی دھیرے دھیرے معاشرے میں اپنی حقیقت کو تسلیم کر چکا تھا مگر پھر بھی۔۔۔ اس کے اندر چھپا ہوا ایک معصوم بچہ بھی کبھی ہنسنے لگتا اور بھی اپنی بے بسی پر ہلنے لگتا تھا ایسے میں اس اپنی ماں بہت یاد آتی جو کم از کم اس کے آنسوئی اپنے دامن سے پونچھ لیتی تھی۔

کلو جب اپنے ہم عمر بچوں کو کلام پاک پڑھنے کے لیے مسجد جاتے دیکھتا تو اس کے دل میں پڑھنے کا شوق جھل جاتا۔ مولوی صلاح الدین کاؤں کی مسجد کے امام تھے۔ وہ نہ صرف امامت۔۔۔ کرتے بلکہ بچوں، بچوں کو کلام پاک بھی پڑھاتے تھے۔ وہ چودھری تھے اور بہت مالدار آدمی تھے۔ گاؤں میں ان کی کافی زمینیں تھیں۔ گاؤں کی دوسری بڑی شخصیت چودھری فتح محمد کی تھی۔ جو مولوی صاحب کا چچا زاد تھا مگر کردار و عمل کے لحاظ سے دونوں ایک دوسرے کی ضد تھے۔ فتح محمد انتہائی مغرور، ظالم اور عیاش شخص تھا۔ گاؤں کے اکثر غریب لوگ اس کے مزارعے تھے۔ ہر گس مزاج کی وجہ سے مولوی صلاح الدین اور چودھری فتح محمد کے درمیان کبھی نہ بن سکی تھی۔ مولوی صاحب اسے خلاف شرع کاموں سے روکتے تھے اور وہ ان کی کوئی بات مانتا نہ تھا۔ اسی لیے مولوی صاحب نے اس سے قطع تعلقی کر لیا تھا۔

کلو کے دل میں کئی بار خیال پیدا ہوا کہ وہ مولوی صاحب سے کلام پاک پڑھنے کی خواہش کا اظہار کر دے مگر وہ کبھی ان سے یہ بات کہہ نہ پایا۔ حالانکہ یہ کوئی بری بات نہ تھی جسے کہتے ہوئے وہ جھجکتا غمگین لوگوں کے رویوں نے اسے اس قدر احساس کمتری کا شکار کر دیا تھا کہ وہ یہی سمجھنے لگا تھا کہ پڑھنا صرف امیر اور اونچے گھرانوں کے بچوں کا حق ہے یا شاید ان بچوں کا جن کے سرو پر ماں باپ کا گھٹا سایہ موجود

توالتین حضرت گھر بیٹھے داخلہ لیں

انگلش لیکنگ کا کورس	انگریزی	ہندی	پنجابی
رائیو لیکنگ	اینگریز	پنجابی	پنجابی
رائیو لیکنگ	اینگریز	پنجابی	پنجابی
اسکول ٹیچنگ میٹھو	صناعت	ذوق گرافی	مینیوٹرنگ
ایکسپریس	شمی	نہر ساری	بلنگ
مونیٹرنگ	لاہور	کینڈیٹر	کولنگ
ایکسپریس	اینگریز	اینگریز	اینگریز
پیشہ ورانہ	پیشہ ورانہ	پیشہ ورانہ	پیشہ ورانہ

1237

مگر وہ ان کے اندر کہیں موجود ضرور تھا۔ اسی روایتی چودھری کے اکسانے پر وہ اس سے لیے دیے رہتے تھے۔ وہ بہت نیک انسان تھے مگر ذات پات کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ اپنے چودھری ہونے پر بڑے نازاں رہتے تھے۔ کونے فوراً سے جو شہر مولوی صاحب کی بات گروہ میں باندھ لی اور ایسی ذہانت دکھائی کہ سب دیکھتے رہ گئے۔ کلو کو جب پرھنا آیا تو اس نے کتابوں کو اپنی تنہائیوں کا ساتھی بنا لیا کیونکہ اسے کتابوں کی باتیں سمجھ آنے لگی تھیں۔ ان کتابوں نے اسے زندگی کا مقصد بتا دیا تھا۔ دھیرے دھیرے ان کتابوں نے جب اسے زندگی جینے کے ہنر سے آگاہی دی تو کچھ کام کرنے کا بھی جی پاپا۔ اب اسے اچھا نہیں لگتا تھا کہ وہ بغیر محنت کیے مولوی صاحب کے ہاں سے کھاتا رہے۔ پہلے پہل اس نے اس کا یہ چل نکالا کہ مولوی صاحب کے کہے بغیر ان کے گھر کے کام کاج کرنے لگا۔ ان کے کھیتوں پر کام کرنا ان کے موبیلیوں کو سنبھالنا اور اسی طرح کے کئی اور کام اس نے اپنے ذمے لے لیے تھے۔ جب کلو جوان ہوا تو مولوی صاحب کی اجازت سے قریبی شہر جاکر محنت مزدوری کرنے لگا۔ وہ دن بھر جہاں بھی کام کرتا، شام کو لازمی گاؤں واپس آ جاتا۔ رات وہ اپنی چھوٹی بچی میں بسر کرتا۔ اسے اس چھوٹی بچی سے خصوصی اہمیت تھی کیونکہ وہاں اس کی ماں نے زندگی گزار لی تھی اور وہیں اس نے دم توڑا تھا۔ وہ چھوٹی بچی اس کے لیے کسی مقدس مقام کی طرح تھی۔ جس کے لیے اس کے دل میں بے پناہ احترام موجود تھا۔

☆☆☆

مولوی صلاح الدین کا بیٹا غیاث الدین بھی جوان ہو گیا تھا۔ مولوی صاحب کی چھ اولادیں تھیں۔ اللہ نے انہیں پانچ بیٹیوں کے بعد بیٹے سے نوازا تھا۔ اس لیے غیاث الدین بے حد لاڈلا تھا۔ کوئی بھی چیز جب ”حد“ کے دائرے سے نکل کر ”بے حد“ کی دہلیز پر قدم رکھتی ہے تو بگاڑ کا باعث بنتی ہے۔ غیاث الدین کو بھی ”بے حد“ لاڈ پھارنے لگا تو لاڈلا تھا۔ وہ بری مخلوق کا دلدادہ تھا۔ مزاج خاص روایتی چودھریوں جیسا تھا۔ وہ بچپن ہی سے اپنے باپ سے کچھ مختلف سا تھا اور مولوی صاحب باوجود کوشش کے اسے اپنے رنگ میں نہ رنگ سکے تھے۔ یہ بات بچا تھی کہ مولوی صاحب نے اسے بے پناہ لاڈ پھارے بالا تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے اس کی اچھی تربیت بھی کی تھی۔ وہ اپنے اصولوں پر سمجھوتے کے قابل نہ تھے۔ باپ غیاث الدین کی ماں کی طرف سے اسے کافی ڈھیل دی تھی۔ ہر ماں کی طرح اس ماں پر بھی بعض اوقات

مستغائب آ جاتی تھی اور وہ اس کی بعض بے جا ضدیں اور فرمائشیں پوری کرنے پر مجبور ہو جاتی تھیں۔ جب غیاث الدین نے پہلی بار ساتھ والے گاؤں کے کچھ دوستوں کے ساتھ کھونٹے کے لیے شہر جانے کی ضد کی تو اس کی ماں نے بیٹے کی محبت سے مجبور ہو کر اس کی وکالت کی تو مولوی صاحب کو اجازت دینی پڑی۔ پھر اس کے بعد ایسے ”نور“ اکثر ہونے لگے۔ بیٹا تفریح کے لیے شہر کھونٹے جاتا تھا لیکن وہاں جا کر وہ اور اس کے دوست کس قسم کی ”تفریح“ کرتے تھے۔ اس سے مولوی صاحب اور ان کی بیگم ناواقف تھیں۔ جب انہیں آگاہی ہوئی تو اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ غیاث الدین جو نے اور شراب نوشی کا عادی ہو چکا تھا۔ باپ اپنے ”وعظ“ میں جن مشاغل کو حرام کہتا تھا بیٹا انہی مشاغل کا دلدادہ تھا۔ گاؤں میں باتیں ہونے لگیں۔ مولوی صاحب پر انگلیاں اٹھنے لگیں۔ کئی لوگوں نے ان کے پیچھے نماز تک پڑھنے سے انکار کر دیا۔ چودھری فتح محمد بھی اپنے دل کی بجز اس نکالنا رہتا تھا۔ مولوی صاحب بیٹے پر سختی کرتے تو وہ گھر سے بھاگ جانے کی دھمکی دیتا اور یہی ان کی کمزوری تھی کہ وہ اسے اپنی آنکھوں سے دور ہوتا بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ وہ بہت مجبور تھے۔ انہوں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ وہ اس کی ہدایت کے لیے دعا مانگ کر سکتے تھے۔ سو دلدادہ ہر وقت کرتے رہتے تھے۔

☆☆☆

مولوی صلاح الدین حسب معمول نماز تہجد کے لیے اٹھے۔ لائین جلائی۔ وضو کیا اور مسجد کی طرف روانہ ہو گئے۔ رات کچھ زیادہ ہی بولناک اور تاریک تھی۔ سردی بھی معمول سے زیادہ تھی۔ انہوں نے سردی سے بچنے کے لیے خاطر خواہ انتظام کر رکھا تھا مگر سردی پھر بھی مزاج پر کئی پر آمادہ تھی۔ وہ ایک ہاتھ میں لائین اور دوسرے میں لائین سنبھالے مسجد کی طرف رواں تھے۔ صبح والا واقعہ اب بھی ان کے ذہن میں تازہ تھا۔ وہ بہت گہرے صدمے سے دوچار ہوئے تھے۔ ان کا دل و دماغ اس صدمے کے حصار سے نکل نہیں پایا تھا۔ انہیں اس بات کی ہرگز توقع نہ تھی کہ جس شخص کو انہوں نے برسوں سہارا دیے رکھا۔ وہ انہیں ان کے احسانات کا ایسا صلہ دے گا۔ یہ تو سراسر ان کی بدنامی تھی کہ مال ان کے گھر سے برآمد ہوا تھا۔ اور خدا نخواستہ کلو اعتراف جرم نہ کرتا تو آج وہ کسی کو بھی منہ دکھانے کے لائق نہ رہتے۔ بہر حال ایک بات ان کے لیے باعث اطمینان تھی کہ کلو کی اہلیت ان پر ظاہر ہوئی۔ انہی سوچوں میں غفلان

دیکھا وہ مسجد کے احاطے میں داخل ہوئے۔ وہ جو اتار رہے تھے کہ ان کی نظر مسجد کے چھوٹے سے محن کے عین وسط میں پڑی کسی چیز پر پڑی۔ ”کیا ہے؟“ وہ زہرباب بڑبڑائے۔ اگلے چند لمحوں میں وہ لائین اور لائین سمیت اس ”چیز“ کے پاس موجود تھے۔ وہ کوئی آدمی تھا جو اس طرح سنا ہوا پڑا تھا جو دور سے کوئی ٹھہری سی معلوم ہوتا تھا۔ اس کے چہرے پر اس کا داہنا بازو تھا جس سے اس کا چہرہ چھپا ہوا تھا۔ ”کون ہو بھائی؟“ مولوی صاحب نے لائین اس کے چہرے کے قریب کر کے اس کا بازو اس کے چہرے سے ہٹایا۔ چہرے پر نظر پڑتے ہی نفرت کی آگ ان کے پورے وجود میں دھک اٹھی۔ ”یہ کم بخت ابھی تک مرا نہیں۔“ وہ غصے سے بڑبڑائے۔ دفعتاً ان کی نظر کلو کے دانے ہاتھ میں دے ایک کانڈ پر پڑی۔ نہ جانے کس خیال کے تحت انہوں نے وہ کانڈ اس کے ہاتھ سے نکال لیا۔ وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ کلو سوراہا ہے۔ انہوں نے شبنم سے بیگیا ہوا کانڈ لائین کے قریب کیا۔ وہ لکھائی گلوہی کی تھی۔ ان کی نظر تھری پر دوڑنے لگی۔ لکھا تھا۔

”استاذ محترم! ایک نہایت ضروری بات آپ کو بتانا مقصود تھی۔ میں اگر آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا تو آپ میرے من سے ایک لفظ بھی سنا گا وہ نہ کرتے۔ اس لیے کانڈ قلم کا ہمارا لے رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ تجھ کی نماز کے لیے سب سے پہلے اہی مسجد میں آئیں گے اور میرا یہ خط آپ تک پہنچ جائے گا۔ مجھے نہیں لگتا کہ میں بچ پاؤں گا۔ ویسے بھی میری زندگی تو بے کار ہی ہے۔ شاید اب تو دھرتی پر بوجھ سمجھا جائے لگا ہوں بس اسی لیے اب جینے سے جی ہی اجاڑ ہو گیا ہے۔ شاید اسی لیے یہ ڈوری نوٹنے ہی والی ہے لیکن اس سے پہلے میں جانتا ہوں کہ اصل بات آپ کو بتا دوں۔ زیورات چوری کرنے والا میں نہیں بلکہ آپ کا اپنا بیٹا غیاث الدین ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میرے پیٹ کو روٹی اور دن کے لیے کپڑا آپ ہی کے وسیلے سے میسر تھا۔ میں کمزور سا انسان بس اتنا ہی حق ادا کر سکا۔ میرے حسن! آپ کا بیٹا صرف جوئے اور شراب کا ہی نہیں، چوری کا بھی عادی ہے۔ خدا را! یہ راہ راست پر لایے تاکہ آئندہ وہ آپ کے لیے ذلت اور بدنامی کا باعث نہ بنے۔ گزشتہ رات جب میں مسجد کی طرف آ رہا تھا تو میں نے غیاث الدین کو ایک پولی ہاتھ میں لیے اپنے گھر کی دیوار چاند کر اندر جاتے دیکھا تھا۔ شاید اس کی نظر مجھ پر نہیں پڑی تھی۔ اس وقت تو مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں سے آیا ہے اور اس پولی میں کیا ہے؟

لیکن صبح جب وہی پولی آپ کے حجرے سے برآمد ہوئی تو ساری بات میری سمجھ میں آ گئی۔ مجھے معلوم تھا کہ اب چودھری فتح محمد آپ کے ساتھ انتہائی بدترین سلوک کرے گا۔ کیونکہ اس کی کوشش تو ہمیشہ یہی رہی ہے کہ کسی طرح آپ کا سر نچا رہے۔ مگر مجھے یہ سب منظور نہیں تھا۔ اس لیے میں نے چودھری کا الزام اپنے سر لے لیا۔ میں آپ کی عزت بچانے کے لیے یہی کر سکتا تھا۔ میرے محسن غیاث الدین کو تنہا یہ کہہ کر وہ ایسے افعال سے باز آ جائے۔ روٹی اور کپڑے کے علاوہ مجھے آپ کی ذات سے علم و آگاہی کا شعور بھی ملا ہے مولوی صاحب جس نے مجھے زندگی کے معنی بہت اچھے انداز میں نبھائے ہیں۔ میں تو سمجھتا تھا کہ میری زندگی کا کوئی مقصد نہیں ہے۔ مگر جب اس کا احساس ہوا تو میں نے لمبے بھر کی تاخیر نہیں کی اس کا حق ادا کرنے میں۔ بس آخری خواہش یہی ہے کہ آپ تک کسی طرح میری یہ بات پہنچ جائے کہ آپ کی مجھ پر محنت رانگاہیں نہیں کی۔ میں نے ایسا کوئی گناہ نہیں کیا کہ آپ کا سر نچا ہو جائے۔ بحیثیت انسان مجھ سے جو غلطیاں، کوتاہیاں ہوئی ہوں انہیں معاف فرما دیجئے گا۔“

اس سے آگے کانڈ خالی تھا۔ مولوی صلاح الدین کی آنکھوں سے نکلنے والے آنسو جھپکے ہوئے کانڈ کو مزید بھگو رہے تھے۔ وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ وہ دیر بچھے اور کلو کو بھگتور ہے تھے۔

”اللہ جامیر ہے بیٹے، اللہ جا پتا اب اٹھ جا۔ میں نے تجھے سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ مجھ سے بھول ہوئی ہے میرے بیٹے معاف کر دے مجھے۔“ وہ چیخ رہے تھے مگر اب تو سب کچھ لا حاصل تھا۔ کلو بہت دور جا چکا تھا اور جاتے جاتے ثابت کر گیا کہ اچھا ہی بارائی کی کسی میراث نہیں ہے۔ کسی ایک ذات یا قوم کے لیے مخصوص نہیں ہے۔ بہت اونچی ذات کا آدمی بھی بہت گھٹا سوچ کا مالک ہو سکتا ہے اور بہت معمولی سے آدمی کی شخصیت بھی اعلیٰ اوصاف سے مزین ہو سکتی ہے۔ کلو چل بسا تھا لیکن مولوی صلاح الدین کی آنکھیں کھول گیا تھا۔ انہیں عملاً بتا گیا تھا کہ ہیرا ہیرا ہی ہوتا ہے خواہ وہ پکڑے کے ذریعہ ہی کیوں نہ پڑا ہو۔

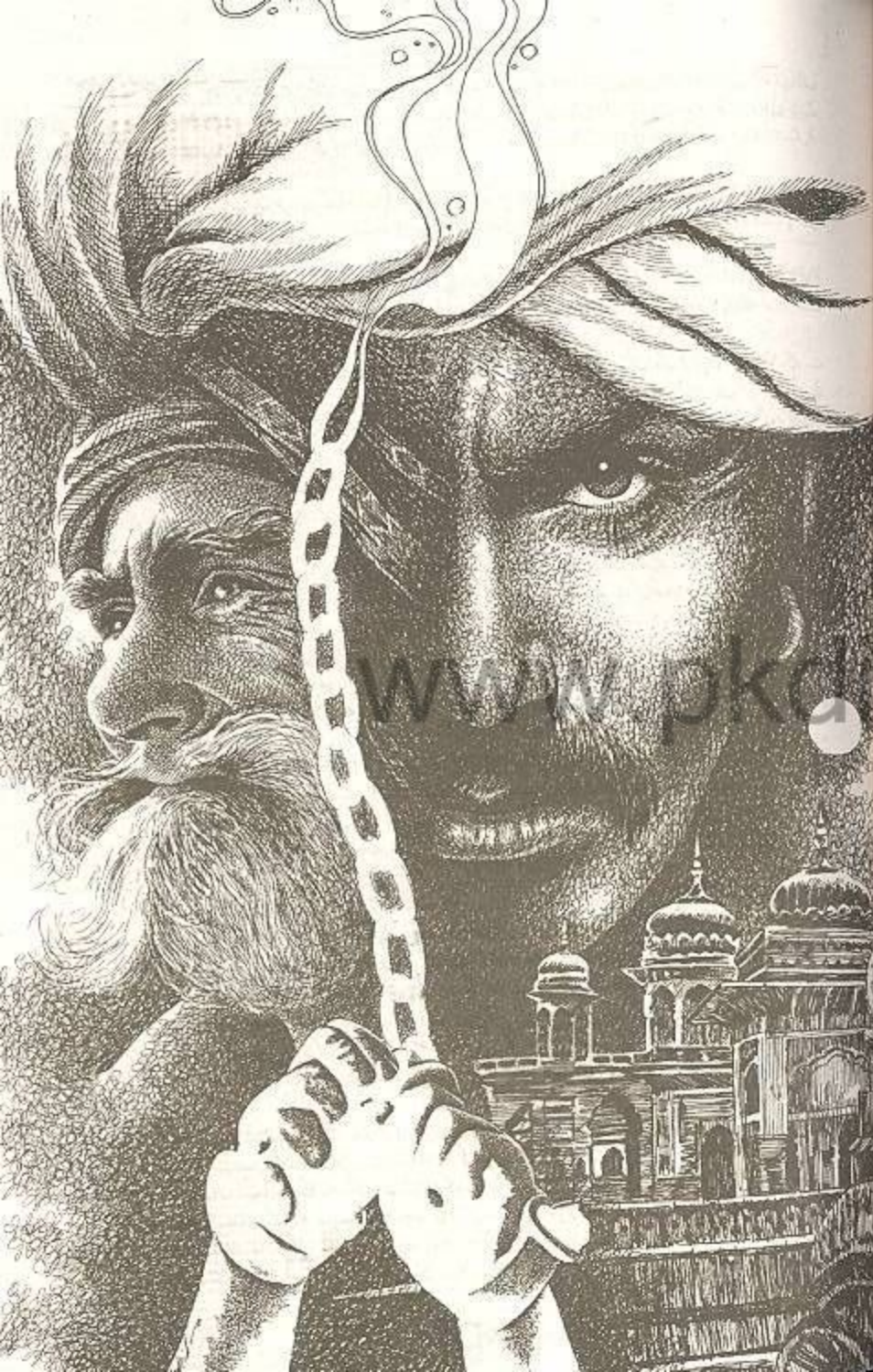
وہ چاند تو نہ تھا مگر چاند کے گرد دکھتا ہوا ایسا بالہ جو خود کو ماند کر کے چاند کی روشنی بڑھانے کا باعث بنتا ہے۔ اس نے بھی یہ سب کچھ تنہا اپنی ذات پر سر کر اپنے محسن کے چاند کو محفوظ کر دیا تھا۔



کھانا

کوئی اگر وقت کی صورت دیکھنا چاہے تو
انسان کے بدلنے روپ دیکھے۔۔۔۔۔ وقت کا کام
بظاہر گزر جانا ہے مگر۔۔۔۔۔ پھر سے کسی نئے روپ
نئے پیراہن میں ڈھل کر پلٹ بھی آتا ہے۔ سمندر کا
سکوت یہ یقین دلاتا ہے جیسے سب کچھ ٹھیک ہے
لیکن۔۔۔۔۔ اس کی گہرائی میں کتنے طوفان مچلتے ہیں
کوئی نہیں جانتا۔۔۔۔۔ اس کی زندگی بھی کسی طوفان
بلاخیز سے کم نہیں تھی۔۔۔۔۔ جس کا مشغلہ تلاطم
و طغیانی اور جس کی شوخی بادویاراں جیسی تھی۔۔۔۔۔
جس کی باغی فطرت اسے بے چین رکھتی۔۔۔۔۔ فہم و فراست
آسمان سے باتیں کرتی اور سماعت و بصارت ہمیشہ دور کی
کوڑی لاتی تھی۔۔۔۔۔ اس کی طلسماتی شخصیت کے آگے کیا تخت
وتاج اور کیا سلطنت کی اوقات۔۔۔۔۔ وقت بھی جیسے اس کے آگے
ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔۔۔۔۔ حسن اس کا غلام اور محبت اس کی کنیز
تھی مگر۔۔۔۔۔ اسے ایک طویل سفر درپیش تھا۔۔۔۔۔ کیونکہ اسے صفحہ
قرطاس پر ایک طویل داستان رقم کرنے کے لیے جنگلوں سے بستی اور
بستی سے صحرا کی سمت دشوار گزار حالات سے برسرِ پیکار رہنا تھا

عس درگس یزوتوں کا سلسلہ ایک عراوردی طویل داستان



میں مجاہد عظیم قاضی اعظم غازی صلاح الدین نہیں ہوں مگر نہ میرا بچپن تھا۔ میں انیس سو چھ 1906ء میں پیدا ہوا۔ 1935ء (انیس سو چھتیس) میں اپنی زندگی کے دلچسپ واقعات بیان کرنے کے لیے داستان گوئی شروع کی۔ 1936ء (انیس سو چھتیس) میں صرف ایک برس بعد ہی اپنا کام الیامی سناتے سناتے چپ ہو گیا۔ یہیں سے میری زندگی کو کچھ نکالنا کہ میں کم ہو گیا کیا میری زندگی مجھ سے روٹھ گئی تھی..... انہیں۔ زندگی روٹھ جاتی تو میں مر چکا ہوتا۔ میں تو زندہ ہوں۔

یہ 2006ء (دو ہزار چھ) ہے۔ ٹیکسٹ میسجز کے بعد میں اپنی داستان کو نوے برس کے جوڑو برپا ہوں۔ میری یہ روادار 1935ء (انیس سو پینتیس) کے پسماندہ دور سے شروع ہو رہی ہے۔ ایک برس کے بعد ہی اچانک ایسے واقعات پیش آئے کہ یہ نئے فتنے بکائی، نئے ہنگامے برپا کرتی ہوئی 2006ء (دو ہزار چھ) کے جدید دور میں نکلتی گئی ہے۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں نام کا مسلمان تھا۔ کبھی چھٹی لے کر اپنے والدین اور شریک حیات ساجدہ کے ساتھ کچھ دن گزارنے دہلی آجاتا تو دو چار وقت کی نماز پڑھ لیا کرتا تھا۔ ورنہ ایک ہمدرد راجا کی خدمت گزاری سے فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔ میں اس گڑھ کے راجا جھاپو پر جان کا انج رکھ شک یعنی پاؤں کا روٹھا۔

سب مجھے نولاد کا مجھہ کہتے تھے۔ میں نے پولو کی صلاح کا ایک سر ارا کر دوسرے سے کو تمام کر ماس روک کر اسے موڑ دیا تھا۔ پھر سے ہوئے ساڑھے نو کرا جاتا، اس کے بیگوں کو گرفت میں لے کر اسے زمین پر پھیچاڑ دیتا تھا۔ یہ اقد جف کراہے گا۔ میں انسان ہوں لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے جنگی بل بھی بھارت دی ہے۔ خدا جسے جانتا ہے اسے خدا اور صلاحیتوں سے مالا مال کر دیتا ہے۔ میرے کو گھسنے کی جس اتنی تیر ہے کہ کسی بھی دشمن کی بو یا کربت میں اس کا پیچھا کر سکتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے غیر معمولی قوت و طاقت بھی عطا کی ہے۔ میں ایک بار کسی کی آواز سن لوں اور وہ دنیا کے کسی حصے میں بھی جا کر پورا ہے تو میں اپنی اس غیر معمولی قوت و طاقت کے ذریعے اس کی ایک ایک بات سن لیتا ہوں۔

مجموعہ بری زندگی میں اس وقت انتخاب آیا اور میرے فتنوں کی تعداد بڑھتی گئی جب راجا برہمچاری لکھنؤ میں آئی اور ہجرتی پھول دتی مجھ پر ہزار جانے سے فریفتہ ہو گئی۔ وہ راجا جیسے ہی ایک مسلمان سے اسے منسوب نہیں کر سکتا تھا۔ لہذا اس نے میری فتنوں میں لکھنؤ بند کر دیا۔ ادھر راجا کے سامنے میں نے مجھ پر ہتھلے کیے۔ میں دُشمنی ہو کر ایک ایسے عالم میں پہنچ گیا جہاں بابا سائیں مہادت میں مصروف رہا کرتے تھے۔ میں بری طرح فتنوں سے چور زندگی سے دور رہا۔ راجا تھا کہ میں بابا سائیں کی روحانی کرامات مجھے زندگی کی طرف واپس لے آئیں۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ اس اعظم بڑے رہنے سے کس قدر روحانی قوت حاصل ہوتی ہے۔ انہوں نے ایسی ہی روحانی کرامات کے ذریعے مجھے کئی کے اندر پھول دتی کے پاس پہنچا دیا۔ کوئی پہرہ بیدار نہ دیکھ نہ سکا۔ وہاں پھول دتی نے دین اسلام قبول کیا اور بابا سائیں نے ہمارا نکاح بڑھایا۔ اس طرح ہم ریشہ زور دان میں شغلب ہو گئے۔ میں بعد میں وہاں سے چلا آیا۔ پھر عرصے بعد معلوم ہوا کہ پھول دتی ماں بننے والی ہے۔ راجا اور اس کے تمام خاندان والے جے راجن رہ گئے کہ ایک نوادری میں کل میں لکھنؤ بند کر دیا۔ کوئی مر دواس کے قریب نہیں گیا۔ پھر دوسرے حاملہ ہو گئی۔ پھول دتی نے ڈنکے کی چوٹ پر کہا کہ وہ میرے بیچے کی ماں بننے والی ہے۔ ہندو خاندان کے لوگ یہ دیکھنا برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ لہذا برہمچاری لکھنؤ نے فیصلہ کیا کہ پھول دتی کو لندن بھیجا جائے۔ وہاں رازداری سے چھٹی ہوئی اور بچے کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔

میں اپنی قوتِ سماعت کے ذریعے ان کے سازشی منصوبوں سے واقف ہو گیا تھا۔ جس ہوائی جہاز سے پھول وئی لندن جا رہی تھی میں بھی اسی جہاز میں پہنچ گیا۔ وہاں دوستوں سے زیادہ دُشمنِ سزا کر رہے تھے۔ مجھے بھی کبھی کسی وقت بھی موت کے کھاتے اتار سکتے تھے۔ لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ وہ جہاز ایک حادثے کا شکار ہو کر قلبِ ممبئی کی طرف برف میں چھنسا گیا۔ وہاں کچھ مر گئے، کچھ زخمی ہوئے۔ ہمارے حصے میں بھی موت آئی مگر عجیب طرح سے آئی کہ میں مرنے کے بعد زندہ ہوا اور اپنی روداد سنا رہا ہوں۔ اس برفانی علاقے میں پھول وئی دشمنوں کی گولیوں کا نشانہ بن گئی۔ میں بھی بری طرح زخمی ہونے کے بعد دو گھر بڑوں کے ساتھ برفانی زمین کی گہری تہ میں چھنسا گیا۔ وہ جگہ میرے لئے قبر بن گئی تھی۔

تقریباً ستر برس کے بعد میں نے زندگی کی سانس لیتے ہوئے سورۃ الاحقاف کا ایک اور سورۃ البقرہ کی تلاوت کی۔ پہلے اس بات سے منکر تھا کہ اللہ تعالیٰ صرف قیامت کے دن سر نہ والوں کو اٹھائے گا اس سے پہلے دوبارہ زندگی نہیں ملتی۔ قرآن مجید میں ایسی جو باتیں کہی گئی ہیں، وہ محض قصے کہانیاں ہیں اور میں تقریباً ستر برس تک مرد رہنے کے بعد ایسے ہی قصے کہانوں والی آج کی حلاوت کر رہا تھا۔ مجھے ایسی ہی زندگی مل رہی تھی جس کا ذکر قرآن مجید میں ہو چکا ہے۔ یہ بات ہو رہا تھا کہ کلام پاک میں محض قصے کہانیاں نہیں ہیں۔ انسان کو سمجھانے کے لیے ہر تکانہ واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ ان حوالہ جات کے مطابق میں اپنی دنیا میں واپس آ چکا ہوں۔ دنیا والے نے ان میں ہیں۔ ورنہ ملتِ متحدہ آج رحمتِ عظیمین والے اور دنیا کے انتہائی بڑے کارڈ کارڈز اور مساحین کے ہتھے ہیں۔ ہندو دھرم والے یقین سے کہتے ہیں کہ یہ آدھارن کا سلسلہ ہے۔ یہودی اور عیسائی پتھو اور اپنی آسمانی کتابوں کے مطابق یہ تسلیم کر رہے ہیں کہ میرے ساتھ دو انگریز جن میں ایک یہودی اور ایک عیسائی ہے انہوں نے بھی دوبارہ حتم لیا ہے۔ اخبارات اور محقق فی وی کی ویڈیو کے ذریعے ہماری حیات بعد الموت کا تذکرہ اور بحث و مباحثہ جاری ہے۔

میں ہندوستان واپس آ گیا ہوں۔ مجھے خیر خزانے کی فکر تھی۔ یہ خیال تھا کہ میری بیوی ساجدہ نے میرے بیٹے عمیر بن غازی کو خزانے کا راز بتایا ہوگا۔ وہ اصرار کرتا ہوگا۔ وہیں بیٹے نے میری ملاقات ہو سکتی ہے۔ ہندوستان آ کر معلوم ہوا کہ ستر برس پہلے میری بیوی ساجدہ میرے بیٹے عمیر اور بیٹی رابعہ کے ساتھ پاکستان چلی گئی تھی۔ وہ سب لاپتا ہو گئے تھے۔ لیکن جب میں شکار گاہ کے خانے میں پہنچا تو مجھے وہاں خزانے کے قریب ہی ایک چمڑی بیگ ملا۔ جس میں اور بہت سے ضروری سامان کے ساتھ میرے بیٹے عمیر بن غازی کی کبھی مرنے کوئی ڈائریاں بھی تھیں۔ ان کے علاوہ مجھے وہاں سے ایک لاوہ انگوٹھی اور ایک سو اچھے کھٹ کا عصا ملا۔ ڈائری کے ابتدائی اوراق پڑھنے کے بعد معلوم ہوا کہ عمیر کی اولاد دیں نا خف ہیں۔ انہوں نے عمیر کا جیسا حال کر دیا ہے۔ لیکن میرا بیٹا بیاری اور انتہائی کمزوری کی حالت میں بھی حاضر دماغی سے کام لے رہا ہے۔ لہو کے رشتوں کو لہو کے جیساں کو خزانے تک پہنچانے کے بجائے الجھنا رہا ہے۔

۲ باب عزیمت و واقعات سرحد حفظ، فرمایئے

تھا۔۔۔۔۔

سے لکر مقدس غار کے وہاں تک دو کلو میٹر کا فاصلہ تھا۔ وہ ہمیشہ غیر آباد رہنے والا جنگل بھارت سرکار کے لیے غیر اہم تھا۔ میں نے سرکاری خزانے میں پچاس لاکھ روپے جمع کیے تو وہاں دو کلو میٹر کے رقبے پر مشتمل زمین میرے نام ہوئی۔

”میرے اندر اتنی مستی بھری تھیں کہ میں ایک جگہ سکون سے بیٹھ نہیں پا رہا تھا۔ کبھی ادھر سے ادھر ٹھیل رہا تھا“ کبھی جاگ رہا تھا۔ میرے بس میں ہوتا تو کھلے آسمان کی بلندیوں کی طرف اڑتا چلا جاتا۔

میں نے اپنے ایک جاں نثار کو فون پر کہا۔ ”مجھے کیلنڈر کی ضرورت ہے۔ میں ایک دو برس کے نہیں پچھلے ستر برسوں کے ستر کیلنڈر چاہتا ہوں۔“

اس نے کہا۔ ”آل رائٹ سر! میں ابھی معلوم کرتا ہوں کہ انہیں کہاں کہاں سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔“

میرا میرا ہی راہ پر چل پڑا تھا، جہاں اسے بڑھاپے میں انعام کے طور پر جوانی کا تحفہ ملنے والا تھا۔ اب میں یہ نہیں کہوں گا کہ ایسا ہماری دنیا میں نہیں ہوتا ہے اور نہ ہی قصص القرآن کو محض سننے سنانے والے قصے کہیں گا۔

میرے ساتھ یہ ہوا کہ میں نے ستر برس تک موت کی مہمبری خیر سونے کے بعد دوبارہ زندگی حاصل کی۔ میرے عیسائی کے ساتھ یہ ہو رہا تھا کہ وہ عمر کی اپنی کنفی

نکلتے والا تھا۔ آگے بڑھاپے کی طرف نہیں پیچھے جوانی کی سمت سفر کرنے والا تھا۔
 دونوں باپ بیٹے کی واپسی ہو رہی تھی۔ میں موت

کے بعد زندگی کی طرف واپس آیا تھا، وہ بڑھاپے سے جوانی کی سمت واپس پور ہا تھا۔ میرا خیال ہے، میری زندگی کے جو ستر برس گم ہو گئے۔

میرے حساب سے عمیر محترم برس کا تھا۔ وہ جوانی کی

یہ میری قیاس آرائی تھی۔ کیا ہونے والا ہے یہ اللہ

میں نے رابطہ ختم کر دیا۔ کرسی کی پشت سے ٹپک لگا کر

میں نے پھر ڈائری لکھ لی۔ اس کی تحریر پڑھتے ہی میں اس کے ماحول میں پہنچ گیا۔ اس نے لکھا

سجل المبيعات 73 سبتمبر 2010

تھا۔ میرا بڑا چاہا پہلی بار باؤٹ ٹرن ہو کر ایک انوکھے سفر کا آغاز کرنے والا تھا۔

☆☆☆

پولیس اور انٹیلی جنس والے فارم ہاؤس میں پہنچ گئے تھے۔ انہیں یہ معاملہ آسانی سے سمجھ میں نہیں آ سکتا تھا کہ وہاں دو کتوں اور تین انسانوں کو کس نے ہلاک کیا ہے؟ واردات ایک اجڑے ہوئے فارم ہاؤس میں کیوں کی گئی ہے؟ میں ان کے لیے سب سے پہلے فراہم کر چکا تھا۔ انہوں نے دو لاشوں کے قریب مٹی پر لکھے ہوئے فون نمبرز پڑھے تھے۔ آئندہ ان نمبروں کے ذریعہ وہ معلومات حاصل کر سکتے تھے۔ کتوں کے ٹریزر اسلام آباد سے آئے تھے۔ وہ لاہور میں ان کے متعلق کچھ معلوم نہیں کر سکتے تھے۔

انٹیلی جنس کے ایک افسر نے نادر شاہ کے فون نمبرز بیچ کئے۔ وہ فون میری تحویل میں تھا۔ میں نے کانگ ٹون سن کر اسے کان سے لگایا۔ اس افسر نے پوچھا۔ ”کیا میں آپ کا نام معلوم کر سکتا ہوں؟“

میں نے کہا۔ ”آپ صرف نام ہی نہیں حرام موت مرنے والوں کے مکمل پتے بھی معلوم کرنا چاہیں گے؟“

اس نے جلدی سے کہا۔ ”ٹھیک ہم قانون کے محافظ ہیں۔ آپ حتی الامکان ہم سے تعاون کریں۔“

میں نے نادر شاہ کی رہائش گاہ کا پتا کر کہا۔ ”باقی دو لاشیں ان کتوں کے ٹریزر کی ہوں گی۔ لاہور میں شاید پولیس اور انٹیلی جنس والوں کے پاس ایسے بلند ہاؤز نہیں ہوں گے۔ میرا اندازہ ہے انہیں اسلام آباد سے لایا گیا ہے۔“

میں نے اتنا کہہ کر رابطہ ختم کیا۔ پھر اس فون کی سم نکال لی۔ وہ افسر مزید معلومات حاصل کرنے کے لیے کال کر رہا ہوگا اور رابطہ نہ ہونے پر بھیخار ہوا ہوگا۔ میں جانتا تھا اب وہ نادر کے گھر پہنچ کر مزید معلومات حاصل کرنے لگا اور میرا خیال درست تھا۔ انہیں یہی کرنا تھا۔ وہ لوگ نادر شاہ کی کوٹھی میں پہنچ گئے۔ میری جی شرمین کو ان سے معلوم ہوا کہ وہ یہ وہ ہو گئی ہے اور نادر شاہ کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال بھیج دیا گیا ہے۔ پہلے تو اسے یقین نہیں آیا۔ وہ اپنی جوان اولاد کے ساتھ اسپتال گئی پھر خاوند کی لاش کو شناخت کرتے ہی رونے لگی۔ افسر نے پوچھا۔ ”کیا آپ اپنے شوہر کے قاتلوں کی نشاندہی کریں گی؟“

وہ جانتی تھی کہ یہ باپ بیٹے اور داماد کے درمیان جان لیوا دشمنی کا نتیجہ ہے۔ اس کے بابا جانی نے باپ پھر مراد اور سلطان نے اپنی بیٹی اور بہن کے سہاگ کو کتوں کے آگے ڈال دیا ہے۔

شرمین نے فوراً ہی کسی کو انرا نہیں دیا۔ اسے بڑے بھائی منور پر بھروسہ تھا۔ وہ پہلے اس سے بات کرنا چاہتی تھی اور اس کے مشورے کے مطابق کوئی بیان دینا چاہتی تھی۔ اس نے کہا۔ ”میرے میاں آج صبح بھائی جان کے ساتھ فارم ہاؤس گئے تھے۔ میں پہلے ان سے بات کروں گی۔ پھر آپ کے سوالوں کے جواب دوں گی۔“

”آپ کے بھائی جان کون ہیں اور کہاں ہیں؟“

”ان کا نام منور غازی ہے۔ انہیں بھی فارم ہاؤس میں ہونا چاہیے تھا۔ میں ابھی گھر سے اسپتال آنے تک کئی بار ان سے فون پر رابطہ کرنے کی کوششیں کر چکی ہوں۔ لیکن یہی معلوم ہو رہا ہے کہ نمبر بند ہے۔“

افسر نے کہا۔ ”جب منور غازی آپ کے شوہر کے ساتھ گیا تھا تو یقیناً وہ واردات کے وقت وہاں موجود رہا ہوگا؟“

”خوشخوار کتوں کو دیکھ کر کہیں چھپ گیا ہوگا۔“

ایک افسر نے کہا۔ ”جیسے والے کو اب قانون کے محافظوں کے پاس آنا چاہیے۔ قاتلوں کی نشاندہی کرنی چاہیے۔“

”شاید وہ اب بھی اپنے لیے خطرہ محسوس کر رہا ہے۔ وہ ہماری رہنمائی کے لیے وہاں زمین پر فون نمبرز لگ کر گیا ہے۔“

دوسرے افسر نے کہا۔ ”جب وہ فون نمبرز لگ رہا ہے تو قاتلوں کے نام اور پتے بھی بتا سکتا ہے۔ میں نے فون پر اس سے بات کی تھی۔ اس نے صرف نادر شاہ کی کوٹھی کا پتا بتایا پھر فون بند کر دیا۔ اب وہ نمبر مسلسل بند جا رہا ہے۔“

ایک جاسوس نے کہا۔ ”وہ مقتول کا سالہا ہے۔ یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ ہم سے چھپ رہا ہے۔ مگر وہ اپنی بہن کو تو فون پر اطلاع دے سکتا تھا کہ وہ یہ وہ ہو چکی ہے اور اپنے روپوش رہنے کی وجہ بھی بتا سکتا تھا۔“

انہی وہ تمام جاسوس بھیک رہے تھے۔ منور پر شبہ کر رہے تھے کہ اسی نے شاید بہنوئی کو قتل کرایا ہے اور اگر اس نے ایسا نہیں کیا ہے تو پھر کیوں چھپ رہا ہے؟ وہ لوگ منور کی کوٹھی میں آکر ایسے ہی سوالات کر رہے تھے۔ لیکن خاطر خواہ جوابات نہیں مل رہے تھے۔

منور کی بیوی اور جوان بیٹیاں بیٹے اس کے گم ہو جانے سے پریشان تھے۔ فون پر رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ اُدھر شرمین کے دل میں یہ شبہ جڑ پکڑ رہا تھا کہ اس کے بھائی جان نے اپنے بہنوئی کو قتل کیا ہے دار کو ہلاک کیا ہے۔ شرمین اور منور کی بیوی کے درمیان بڑی دوستی تھی۔ بڑا اعتماد تھا۔ اب وہ اعتماد اور دوستی ختم ہو رہی تھی۔ ان کے درمیان اختلافات شروع ہونے والے تھے۔ منور نے واقعی نادر کی موت کا سامان کیا تھا۔ وہ بے قصور نہیں تھا مگر مظلوم تھا۔ زخموں کے

باعث شرم مردہ اور نیم مرد ہو کر ایک خفیہ علاج گاہ میں پڑا ہوا تھا۔

بلا اسے کب تک چھپا کر رکھ سکتا تھا؟ وقت گزرنے کے ساتھ اسے منظر عام پر اور بیوی بچوں کے درمیان آنا تھا اور اکٹوات وارث بننے کے سلسلے میں پھر سے جدوجہد کا آغاز کرنا تھا۔ مگر اسے کو پھر کئی وقت میری شیشی چھری تلے آنا تھا۔

باپ بلا اپنے آقا شوکت شاہنواز کو خزانے کا راز بتا کر مطمئن ہو گیا تھا۔ آئندہ اس کا آقا پھر سے معاملات سے شغفے والا تھا اور منور کو بھی خاطر خواہ سیکورٹی دینے پر راضی تھا۔ اس نے بے کو ہدایت دی تھی کہ مجھ سے رابطہ کرے اور ٹیلی فون کے ذریعے مجھے اپنے آقا سے متعارف کرائے۔ فی الحال اس کے پاس میرا فون نمبر نہیں تھا۔

میں نہیں جانتا تھا وہاں کیا ہو رہا ہے؟ میں تو اپنے طور پر خالص سکون برپا کرنا چاہتا تھا۔ ان سب کے فون نمبر حاصل ہو چکے تھے۔ میں نے بے کو ہدایت کیے۔ اس نے کانگ ٹون سنئی۔ یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ خطرے کی گھنٹی سن رہا ہے۔ اس نے فون کو کان سے لگایا پھر پوچھا۔ ”ہیلو۔ کون...؟“

میں نے بھاری ہولی آواز میں کہا۔ ”فارم ہاؤس۔“

ایک دم اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ وہ ذرا سا الجھا پھر سبیل کرخت کچھ میں بولا۔ ”میں نام پوچھ رہا ہوں۔ کون ہو تم؟“

میں نے کہا۔ ”دوست۔“

وہ چونک کر خلا میں تنکے لگا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے فارم ہاؤس کا منظر تھا۔ وہاں دو کتوں کی اور تین انسانوں کی لاشیں دکھائی دے رہی تھیں۔ پہلے اس نے سخت لہجہ اختیار کیا۔ اس بار ذرا نکست خوردہ سا ہو کر بولا۔ ”تم تم پر اسرار بننے کی کوشش کر رہے ہو۔ آ آخر کہنا کیا چاہتے ہو؟“

”آگے کچھ کہنے سے پہلے ہی تم سارا کھیل سمجھ چکے ہو۔“

”ہاں۔ ٹھیک ہے۔ سمجھ گیا ہوں۔ محل کر بولو۔“

میں نے کہا۔ ”اپنے خاص آدمی کو وہاں سے اٹھا کر لے گئے۔ باقی لاشوں کو پکڑا سمجھ کر چھوڑ دیا۔ یہ نہیں سوچا کہ جیسے گدڑی میں گل ہو سکتا ہے۔ ویسے ہی کچرے سے موبائل فون اور ان کی شناخت مل سکتی ہے۔“

وہ فون کو کان سے لگا کر تمہم سارہ گیا تھا۔ میں نے کہا۔ ”تم نے اپنے فون کے ذریعے نادر شاہ سے اور کتوں کے مالک سے رابطہ رکھا تھا۔ وہاں تمہارے نمبرز سیو تھے۔“

اس نمبر پر ابھی میں بول رہا ہوں۔ اس کے بعد قانون کی گرجتی برقی آوازیں سنائی دیں گی تو بھاگتے اور چھپتے پھر آگے۔“

وہ بولا۔ ”نہیں۔ تم۔ تم ایسا کچھ نہیں کرو گے۔“

”موت سے ملاقات ہوتے ہی زندگی کی بغض ڈوب جاتی ہے۔ مجھ سے ملنے کی اعتقاد آرزو نہ کرنا۔ ڈوب جاؤ گے۔“

”تم چاہتے کیا ہو...؟“

”مجھے تمہارے کرنا اور تمہارے دیکھنا اچھا لگتا ہے۔ مجھ سے کسی طرح کا سمجھوتہ نہیں ہوگا۔ میں ہر روز ٹھہر ٹھہر کر مرنے لے کر تمہارے ڈوبنے اور ابھرنے کے مناظر دیکھتا رہوں گا۔“

وہ ذرا چپ رہا۔ پھر بولا۔ ”مجھے کچھ اندازہ ہو رہا ہے۔ شاید میں تمہیں پہچان رہا ہوں۔“

”مجھے پہچانتے رہنا۔ پہلے اپنی سلامتی کی فکر کرو۔ تم اس ڈی کو فارم ہاؤس سے لے جاتے وقت یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ تمہاری دونوں گاڑیوں کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔“

یہ ایک اور دھماکا تھا۔ اس نے گھبرا کر پوچھا۔ ”کیا تم نے اسپتال تک پہنچا کیا تھا؟“

”فکر نہ کرو۔ میں اس کے ذمہ بھرنے تک پولیس اور انٹیلی جنس والوں کو وہاں نہیں پہنچاؤں گا۔ میں نے کہا تھا۔ بڑے آرام سے ہر روز انجوائے کرتا رہوں گا۔“

وہ ذرا سوچتا رہا۔ پھر بولا۔ ”میں سمجھ رہا ہوں تم کون ہو؟ تم... تم بہت ہی خطرناک بوڑھے ہو۔ ہماری پھیلی کا پھوڑا ہو۔ تمہیں پکڑنے کے لیے مٹھی بند کرتے ہیں تو پھوڑے سے ٹیسٹیں اٹھنے لگی ہیں... عیس بن غازی! میں تمہیں پہچان رہا ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”سننا ہے، عیس بن غازی بیمار اور کمزور ہے۔ ہڈیوں کا ڈھانچا ہے۔ ایسا شخص ہسپتال سے کیسے اٹھے گا؟ فارم ہاؤس اور پھر اسپتال تک کیسے پہنچے گا؟“

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ میں نے کہا۔ ”چلو تم نے بو لیا۔ میں وہی ہوں، تم نے دو بار انگوٹھ دیکھے ہو۔ تیسری بار مار ڈالنے کے لیے خون خوار کتوں کے ساتھ آئے تھے۔ اب کیا ارادہ ہے؟“

”میری تم سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے۔ میں نے بھاری دھمکیاں دے کر تمہیں نقصان پہنچانا چاہا۔ اب یہی نقصان پہنچانے والا توقع سے زیادہ تمہیں فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ تم ایک بار مجھے آزما کر دیکھ لو۔“

”مجھے کس طرح آزمانا چاہیے؟ اور کیوں آزمانا چاہیے؟“

”میں اپنی بہتری کے لیے تمہاری بہتری چاہتا ہوں۔“

میں نے عزت مآب شوکت شاہنواز سے تمہارا ذکر کیا تھا۔ وہ ایسے خفاظنی انتظامات کریں گے کہ موت بھی اجازت حاصل کیے بغیر تمہارے قریب نہیں آسکے گی۔

”واہ کیا بات ہے؟ یعنی میں ان کی پناہ میں رہ کر کبھی نہیں مروں گا؟“

وہ ذرا سنبھل کر بولا۔ ”نہیں۔ میرا مطلب ہے۔

جب تک تقدیر میں لکھا ہے تم جیو گے۔ بڑے بڑے شاطر خطرناک دشمن یوں بار بار تمہیں انوا نہیں کریں گے۔“

”مگر میں تو بار بار انوا ہوتا چاہتا ہوں۔ تم لوگوں نے مجھے اس کھیل کا عادی بنادیا ہے۔“

”خدا کے لیے میری بات کو مذاق نہ سمجھو۔ تم نہیں جانتے، تمہیں عزت مآب شوکت شاہنواز۔“

میں نے بات کاٹ کر کہا۔ ”اس عزت مآب کرپٹ سیاستدان کی عزت کیا ہے؟ جب حکومت گرتی ہے تو یہ لوگ

بھی اوندھے منہ گر پڑتے ہیں یا ملک چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں۔ مجھے سبز باغ نہ دکھاؤ۔ صرف اپنی بات کرو۔“

”اپنی بات کیا کروں؟ تم نے پہلے ہی کہہ دیا ہے مجھ سے سمجھو نہیں کرو گے۔“

”اس کے باوجود اتنی مہربانی کروں گا کہ پولیس والوں کو اس اسپتال تک نہیں پہنچاؤں گا۔“

”میں تمہاری اس مہربانی کو کبھی نہیں بھولوں گا۔“

”یہ احسان دو شراکے پر کروں گا۔ ایک تو یہ کہ منور کو اس اسپتال سے کسی دوسری جگہ منتقل نہیں کرو گے۔ میرے آدمی اس کی اور تمہاری نگرانی کر رہے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ جگہ تبدیل کی جائے۔“

”ٹھیک ہے۔ اس میں ہماری بہتری ہے۔ منور کا علاج سب سے اہم رازداری سے ہوتا رہے گا۔“

”دوسری شرط یہ ہے کہ سری داستو کے متعلق پوری معلومات فراہم کرو۔ اس کا فون نمبر اور رہائشی پتہ بتاؤ۔ وہ

یہاں آکر تمہارے علاوہ اور کتنے لوگوں سے کام لے رہا ہے؟“

”اس نے کہا۔“ سری داستو بہت چالاک ہے۔ اگرچہ وہ منور اور نادر سے گٹھ جوڑ کر کے ہمارے ملک میں آیا ہے۔ تاہم ان سے بھی چھپ کر اپنی رہائش گاہیں بدلتا رہتا ہے۔ ہم

سب سے فون کے ذریعے رابطہ رکھتے ہیں۔“

”اس نے تلوں کے ذریعے مجھ تک پہنچنے کا زبردست منصوبہ بنایا تھا۔ اسے کامیابی کا سو فیصد یقین ہوگا۔ وہ مجھے اپنے قابو میں کرنے کے لیے لاہور ضرور آیا ہوگا۔“

”ہو سکتا ہے آیا ہو لیکن مجھ سے تم نے لو... میں نہیں

جانتا۔ میں تو کرائے کا بندہ ہوں۔ منور ہو یا سری داستو سب ہی مجھ سے کام لیتے ہیں۔ مگر اپنے اندر کے معاملات چھپاتے ہیں۔“

”منور کے مرجانے سے تمہیں کیا نقصان پہنچے گا؟ اسے کیوں جانا چاہتے ہو؟“

”پچیس لاکھ کی منیت رہ گئی ہے۔ وہ مرجانے گا تو اتنی بڑی رقم ڈوب جائے گی۔“

”تم پیسوں کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہو۔ یقیناً اس کرپٹ سیاستدان شوکت شاہنواز سے بھی اچھی خاصی رٹیں ملتی ہوں گی؟ کوئی بھی واردات کرنے کے بعد وہ تمہیں تحفظ فراہم کرتا ہوگا؟“

”ہاں۔ میں بڑی سے بڑی واردات کرنے کے بعد قانونی گرفت سے نکل آتا ہوں۔ میں کہہ چکا ہوں شوکت صاحب تمہیں بھی تحفظ فراہم کر سکتے ہیں۔“

”وہ ایسا کیوں کرے گا؟ اسے مجھ سے کیا دلچسپی ہے؟“

”وہی دلچسپی جو تمہاری اولاد کو تم سے ہے۔ اور جس کی کشش سری داستو کو انڈیا سے یہاں منتقل لائی ہے۔“

میں نے سوچنے کے انداز میں پوچھا۔ ”یعنی شوکت شاہنواز بھی خزانے میں حصہ دار بننا چاہتا ہے؟“

”ہاں۔ وہ بہت وسیع اختیار اور وسیع رکنے ہیں۔ صرف ان سے دوسری کر کے تمام دشمنوں کو بڑی آسانی سے ٹھکانے لگا سکو گے۔“

”وہ خزانہ اتنا دہشت گردی ہے کہ میں دوسری نہ کروں تب بھی وہ میرے پیچھے پڑے گا۔ میں انتظار کروں گا اور دیکھوں گا کہ وہ طلب گار کیا کرنے والا ہے؟“

”تم دوسری نہیں کرو گے تو شوکت صاحب جیسے پہاڑ کو دشمن بنا لو گے۔ کیا جی مصیبتوں کو دعوت دینا دانشمندی ہے؟“

”یہی سوال اپنے آقا شوکت شاہنواز سے کرو۔ کیا مجھ سے دشمنی کر کے جی مصیبتیں مول لینا دانشمندی ہوگی؟ اب اس مسئلے میں کچھ نہ بولو۔ سری داستو کو فون کرو۔ اسے بتاؤ

کہ میں اس کے پیچھے ہونے کیوں کا تمہارا بیٹھا رہا ہوں اور ابھی تم سب میری نظروں میں میری نگرانی میں ہو۔ اب میرے خلاف کوئی بھی اٹھایا ہوا قدم تمہیں موت کی طرف لے جائے گا۔“

میں نے بے سے رابطہ ختم کر کے خود ہی سری داستو کو فون پر مخاطب کیا۔ ”ہیلو بڑو! تمہارے کئے اور تمہارے

اتحادی منور اور نادر شاہ کہاں ہیں؟“

وہ بولا۔ ”تم واقعی شیطان ہو۔ میں سمجھ نہیں پا رہا ہوں کہ میری طرف سے ہونے والے حملے کا علم تمہیں کیسے ہو گیا

اور تم نے کس طرح نادر اور منور کی اتر میں ان ٹریزرز تک پہنچا دی تھیں؟ ہائی داؤس... تم نے اپنی جان تو بچالی ہے۔ مگر اپنے بیٹے کو خسرانا بنا دیا ہے۔“

”تم اپنا اندر دیر چھپا کر رکھو۔ وہ میرے ہاتھ لگے گا اور میں اسے کسی کتے کے آگے ڈالوں گا تو گنگے میں ڈھونک لٹکا دے گا۔“

وہ خاموش رہا۔ کچھ سوچتا رہا۔ میں نے پوچھا۔ ”چپ کیوں لگ گئی؟“

اس نے پوچھا۔ ”تم کماری کلاوتی تک کیسے پہنچ گئے؟“

”وہ کلاوتی کتوں کے ٹریزر ز اور باہر بلا جیسے جتنے بھی تمہارے آلہ کار ہیں۔ میں ان کی گردنیں ناپ رہا ہوں۔ آج کل کسی بھی وقت تمہاری شامت آسکتی ہے۔“

”میں مرنے یا مارنے آیا ہوں۔ ڈرنے نہیں آیا۔ مجھے یہاں آنے سے پہلے منور اور نادر نے بتایا تھا کہ تم بہت ہی بیمار اور کمزور ہو گئے ہو۔ بستر پر لٹھے بیٹھے کے قابل نہیں ہو۔ میں نے تمہاری ویڈیو فلم بھی دیکھی ہے۔ تم بیڈیوں کا

ڈھانچا بن گئے ہو۔ کیا میری ایک حیرانی دور کرو گے؟“

میں نے پوچھا۔ ”حیرانی کیا ہے؟“

”میری معلومات کے مطابق تم تقریباً مردہ ہو چکے ہو۔ مگر زندہ اور صحت مندوں سے زیادہ ایکشن میں ہو۔ ایسی حالت میں کس طرح چل پھر رہے ہو؟ کس طرح میرے

حملے سے بچ گئے؟ کیا کوئی جادو منتر لیا ہے؟ کبھی طاقتور بن جاتے ہو اور کبھی کمزور دکھائی دیتے ہو؟“

میں نے فوراً ہی جواب نہیں دیا۔ آنکھیں بند کر لیں۔ چشم تصور میں رب کریم کے آگے سجدہ شکر ادا کیا۔ پھر کہا۔ ”میری صحت مندی اور توانائی تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ یہ ایمان کی باتیں ہیں۔ تم اسے جادو ہی سمجھتے رہو گے۔“

”تمہارے جیسا بے ایمان اور مکار ایمان کی بات کر رہا ہے۔ تجب سے کیا دین دھرم والے بن رہے ہو؟“

”الحمد للہ... میں مجرمانہ دھندے چھوڑ چکا ہوں۔“

”یہ تو میرے لیے بہت بڑی خوشخبری ہے۔ پھر تو ہمارے درمیان کوئی عداوت نہیں رہے گی؟ ذرا جلدی سے

بتا دو! اب تو حلال کی کمانی کھاؤ گے نا؟“

”ہیک۔ آئندہ رزق حلال حاصل کرتا رہوں گا۔ اسکلنگ چور بازاری اور غیر قانونی ہتھکنڈوں سے باز آچکا ہوں۔ صرف ایک ایماندار جیولر کی حیثیت سے زندگی گزاروں گا۔“

”پھر تو کالے دھندوں سے کمانی ہوئی دولت اور وہ

خزانہ بھی تمہارے لیے حرام ہو چکا ہے۔“

”درست کہہ رہے ہو۔“

”وہ تمہارے کسی مصرف کا نہیں رہا۔ اسے میرے اور اپنے بیٹوں کے حوالے کر دو۔“

”جو چیز میرے لیے حرام ہوگئی۔ اسے میں بھول گیا ہوں۔ میری بیٹی دولت اور جانا دے۔ اس میں سے ایک حصہ میری حلال کمانی سے حاصل کیا ہوا ہے۔ باقی تین حصے بیت المال میں جا میں گئے۔“

اس نے بڑی بے چینی سے پوچھا۔ ”اور وہ چالیس من سونا...؟“

”اسے میں اپنے رب کے حوالے کر چکا ہوں۔ وہ جہاں بھی چھپا ہوا ہے۔ جو بھی اس خزانے کا حقدار ہے اللہ تعالیٰ اسے وہاں پہنچا دے گا۔“

”میرا بھگوان مجھ کو اور تمہارا خدا منور کو اس خزانے تک ضرور پہنچائے گا۔ تم بہت دھری سے باز آکر ہمارے لیے یہ نیک کام کر سکتے ہو۔ مگر یہ توقع فضول ہے۔ تم بھی ہمارے کام نہیں آؤ گے۔“

”درست سمجھ رہے ہو... کام نہیں آؤں گا۔ تمہارا کام تمام کروں گا۔ مجرمانہ دھندے چھوڑنے کا مطلب یہ نہیں ہے

کہ مجھ کو کچھ دلوں گا۔ کماری کلاوتی نے بتایا ہوگا کہ میں اس کی گردن دیوے اسلام آباد آنے والا ہوں؟ بس کچھ لو کہ آنے ہی والا ہوں۔ مجھے یقین ہے وہاں تمہیں ڈھونڈ نکالوں گا۔ دیش آل.....“

میں نے رابطہ ختم کر دیا۔ عصر کی اذان ہو رہی تھی۔ میں وضو کرنے کے لیے اٹھ گیا۔ عصر کے بعد مغرب کی نماز پھر عشا کی نماز تھی اور آج عشا کے بعد میں از سر نو ایک الونجی زندگی شروع کرنے والا تھا۔

☆ ☆ ☆

مجھ سے عداوت کرنے والے ناکام اور نامراد ہو رہے تھے۔ تمہاں میں سر پکڑ کر سوچ رہے ہوں گے کہ انہوں نے اب

تک کیا کھویا اور کیا پایا؟ اور یقیناً انہیں یہی حساب مل رہا ہوگا کہ پایا کچھ نہیں ہے سراسر نقصان ہی اٹھاتے آ رہے ہیں۔

نادر شاہ کی بیوی یعنی میری بیٹی شریں بیوہ ہو گئی تھی۔ منور کی بیوی یعنی میری بہو بقیس نہیں جانتی تھی کہ شہر سلامت

ہے یا نہیں؟ ایک دھڑکا سا لگا ہوا تھا کہ شاید وہ بھی بیوہ ہو گئی ہے۔ بیجاری نہیں جانتی تھی کہ سہاگ سلامت تو ہے مگر آدھا

تخت آدھا بن رہا ہے۔ جب بھی واپس آئے گا تو شوہر بن کر نہیں

کمانی بن کر رہے گا۔

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

یہ پرانی کہاوت ہے کہ گیتوں کے ساتھ گھن بھی پھا جاتا ہے۔ ان کے درمیان شرارہ خواخواہ پس رہی تھی۔ منور اور نادر نے اس کے ذریعے مجھے ٹریپ کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ یہ قصد اب پرانا ہو چکا تھا۔ میں نے شرارہ سے وعدہ کیا تھا کہ اسے منور کی کوٹھی سے نکال لاؤں گا بعد میں منور بھی راضی ہو گیا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ نادر کوٹھکا لگانے کے بعد شرارہ کو وہاں سے گھر جانے کی اجازت دیدے گا۔

شرارہ ایک بار مجھ سے ملنا چاہتی تھی۔ میرے اور اس کے درمیان فون پر گفتگو ہوتی رہی تھی۔ اب اس نے موجودہ حالات سے گھبرا کر مجھے فون پر مخاطب کیا۔ ”آپ کہاں ہیں؟ یہاں منور صاحب کی کوٹھی میں پولیس اور انٹیلی جنس والے آ رہے ہیں۔ سنا ہے نادر شاہ کا مژدر ہو گیا ہے اور منور صاحب لا پتا ہیں۔ نیچے ڈر لگ رہا ہے۔ میں ان کے ساتھ یہاں کوٹھی میں آئی تھی۔ پتا نہیں میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟“

میں نے تسلی دی۔ ”فکر نہ کرو۔ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔“ ”آپ نہیں جانتے یہاں کیا ہو رہا ہے؟ پولیس والے میرے بارے میں بھی سوالات کر رہے ہیں۔ پتلیس بائلی نے انہیں مطمئن کرنے کے لیے کہا ہے کہ میں ان کی بہن ہوں۔ آج آئی ہوں، کل چلی جاؤں گی۔ خدا کے لیے مجھے یہاں سے نکالیں۔“

میں اس کی پریشانی کو سمجھ رہا تھا۔ وہ پچھلے دو دنوں سے جیسے ایک قیدی کی حیثیت سے تھی۔ اپنی مرضی سے کوٹھی کے باہر قدم بھی نہیں رکھ سکتی تھی۔ وہ بولی۔ ”یہ تو میں اچھی طرح سمجھ گئی ہوں! آپ بہت زبردست ہیں۔ جو آپ سے دشمنی کرتا ہے منہ کی کھاتا ہے۔ آپ کا کچھ نہیں جاتا۔ میں آپ کی پناہ میں آتا جانتی ہوں۔ مجھے ابھی اپنے پاس بلا لیں۔“

”میں کانٹوں پر چلنے والا ایک تنہا رانی ہوں اور آئندہ بھی تنہا ہی رہوں گا۔ میری پناہ میں رہنے کی بات نہ کرو۔ میں نے ایک بار ملنے کا وعدہ کیا ہے۔ کل صبح یہ وعدہ پورا کر دوں گا۔“ اس نے پریشان ہو کر کہا۔ ”کل بہت دور ہے۔ آپ کو خدا اور رسول کا واسطہ۔! مجھے آج بلکا ابھی یہاں سے نکالیں اور ملاقات کریں۔“

میں سوچنے لگا۔ اس نے کہا۔ ”آج آپ سے ضرور ملوں گی۔ بس میری اتنی سی خواہش پوری کریں۔ خدا آپ کی مرادیں پوری کرے گا۔“

اس کی یہ بات دل کوٹھی۔ آج عشا کے بعد میری بہت بڑی اور بہت ہی اٹوٹھی مراد پوری ہونے والی تھی۔ میں

مستوں سے بھرا ہوا تھا۔ ایسے میں اس کی ایک خوشی پوری کرتا میرا فرض تھا۔ میں نے کہا۔ ”فون بتلیس کو دو۔“ اس نے پوچھا۔ ”آپ مجھے بلا رہے ہیں نا؟“ میں نے کہا۔ ”پتلیس کو بلاؤ۔ اسے فون دو۔“ وہ قدرے مایوس ہو کر بولی۔ ”اچھا۔ ابھی بلاتی ہوں۔“ تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ پھر میری بھوک آواز سنائی دی۔ ”بابا جانی! آپ نے مجھے بلایا ہے؟ مجھے یقین نہیں آ رہا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”یقین کر لو۔ میں ہی بول رہا ہوں۔“ وہ میری آواز سن کر یقین کرتے ہی رونے لگی۔ روتے ہوئے کہنے لگی۔ ”بابا جانی! ہم برباد ہو رہے ہیں۔ آپ کے سب سے لاڈلے صاحبزادے لا پتا ہیں۔“

وہ بہت کچھ بتانے والی تھی۔ میں نے کہا۔ ”آگے کچھ نہ کہو۔ میں تم لوگوں کے تمام حالات سے باخبر رہتا ہوں۔ منور کے لیے آئندہ بہاد۔ وہ کچھ روز کے بعد واپس آجائے گا۔“

وہ خوش ہو کر بولی۔ ”خدا کا شکر ہے۔ میں سمجھ گئی! آپ نے بیٹے کی بہتری کے لیے اسے کہیں چھپا کر رکھا ہے۔“ ”تم کبھی بھی سمجھتی رہو۔ پولیس اور انٹیلی جنس والوں سے یہ سنا کہنا کہ مجھے فون پر باتیں کر چکی ہو۔“ ”مجھے نہیں کہیں گی۔ میں نے تو یہ بیان دیا ہے کہ آپ بھی لا پتا ہیں اور ہم آپ کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔“

”اس بیان پر قائم رہو۔ شرارہ کو وہاں سے جانے دو۔ ابھی ایک کھٹے کے اندر ایک گاڑی وہاں آئے گی۔ شرارہ کو اس گاڑی میں روانہ کر دو۔“

”آپ کا حکم سنا آٹھوں پر.... آپ منور سے کہہ دیں کہ ہم سب خیریت سے ہیں۔ پہلے ان کے لیے رو رہے تھے۔ اب نہیں رو میں گے۔“

میں نے کہا۔ ”مگر آئندہ کچھ لوگی۔ خوش نظر آؤ گی تو انٹیلی جنس والوں کو خبر ہوگا۔ وہ سمجھ لیں گے کہ ہمیں منور کی خیریت معلوم ہو چکی ہے۔ پھر وہ تمہارے پیچھے پڑ جائیں گے۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”نہیں۔ میں خوش نظر نہیں آؤں گی۔ پہلے کی طرح ہائے ہائے کرتی رہوں گی۔ ابھی فون بند کرتے ہی روننا شروع کر دوں گی۔“

میں نے کہا۔ ”فون شرارہ کو دو۔“ وہ فون اسے دیتے ہی رونے لگی۔ شرارہ نے اسے جبرانی سے دیکھا۔ حیرانی اس بات کی تھی کہ کسی کو شش کے بغیر چشم زدن میں آنکھوں سے آنسو چھٹک پڑے تھے۔

شرارہ نے فون کوکان سے لگا کر کہا۔ ”تجربہ ہے آپ

سے فون پر رونے کا وعدہ کیا اور اب وہ واقعی دھاروں آنسو بہاتی ہوئی چلی گئی ہیں۔“

”میرے بیٹے بیٹیاں اور بہنیں سب ہی ڈرامے باز ہیں۔ انہیں چھوڑ دو اور وہاں سے اپنی روائی کی تیاری کرو۔ ابھی ایک گاڑی تمہیں لینے آئے گی۔“

وہ بھیجی ہوئی تھی۔ خوشی سے اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ ایک دم سے چپک کر بولی۔ ”میں آپ کے پاس آ رہی ہوں ناں؟“

میں نے جواب نہیں دیا۔ سوچنے لگا کہ وہ مغرب کی نماز کے بعد یہاں پہنچے گی۔ مختصری ملاقات ہوگی۔ پھر میرے آدمیوں کی نگرانی میں ٹھوکر نیا بیک چلی جائے گی۔ میں اپنی خفیہ رہائش گاہ کا راستہ کی گود کھانا نہیں چاہتا تھا۔ اسے بھی بلا تا مناسب نہیں تھا۔ لیکن میں اس سے ملنے کے لیے کسی دوسری جگہ نہیں جاسکتا تھا۔

آج عشا کے بعد میری زندگی میں ایک انقلاب آنے والا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ وہ یہاں آئے گی۔ اس سے دو چار باتیں کروں گا۔ اس طرح ملاقات کرنے کا وعدہ پورا ہو جائے گا تو وہ عشا سے پہلے چلی جائے گی۔

میں نے ایک جاں نثار کو ہدایت دی کہ وہ منور کی کوٹھی میں جائے اور شرارہ کو وہاں سے لے آئے۔ لیکن گاڑی کی کچلی سیٹ پر بٹھانے کے بعد اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی جائے۔ جب وہ میری رہائش گاہ کے اندر پہنچ جائے گی تب پٹی کھولی جائے گی۔ پھر وہ واپس چلے گی۔ تو اسی طرح پٹی باندھ کر رخصت کیا جائے گا۔ اسے بھی معلوم نہیں ہو سکے گا کہ وہ کس علاقے کی کس کوٹھی میں مجھ سے ملنے آئی تھی؟

میں نے خوب سوچ سمجھ کر اسے وہاں بلایا تھا۔ مغرب اور عشا کے درمیان اتنا وقفہ ہوتا ہے کہ ایک مختصری ملاقات ہو سکتی تھی۔ لیکن وہ مقررہ وقت پر نہ آئی۔ راستے میں دو جگہ ٹریفک کے جھوم نے اسے روک لیا تھا۔ وہ میری کوٹھی میں آئی تو عشا کی اذان ہو رہی تھی۔ میرا ایک جاں نثار اسے ڈرائنگ روم میں چھوڑ کر چلا گیا۔ آخر اذان پکار رہی تھی۔ اور وہ آگئی تھی اور مجھے نماز کی طرف جانا تھا۔ میں اس سے کہتا چاہتا تھا کہ وہ انتظار کرے۔ اب ایک آدھ گھنٹے کے بعد ہی ملاقات ہو سکے گی۔

میں یہ کہنے کے لیے ڈرائنگ روم میں آیا تو اسے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ وہ ایک جسم کی طرح کھڑی ہوئی تھی۔ آنکھوں پر پٹی باندھی ہوئی تھی۔ وہ مجھے نہیں دیکھ رہی تھی۔ میں اسے یوں تک رہا تھا جیسے ستر برس گزارنے کے بعد پہلی بار عورت کو دیکھ رہا ہوں۔

ایسی عورت کو جو مجھے نہیں دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں کا جادو نہیں جگارتی تھی۔ مگر ادھر تھا کہ ایک سخت سر چڑھ کر بولنے لگا تھا۔

وہ چپ تھی۔ مگر اس کی سائیں لپٹی ہوئی خاموشیاں مجھے پکار رہی تھیں۔ میرے اندر شور مچا رہی تھیں۔ ماضی میں نہ جانے کتنی عورتیں آئیں اور گئیں۔ مگر اس کا سراپا کبہ رہا تھا۔ ”میرے جیسی کوئی نہیں آئی ہوگی۔ میں تمہاری زندگی کی چمکی اور آخری عورت ہوں۔ میرے بعد ساری دنیا یہاں آئے گی۔ مگر کوئی عورت بھی نہیں آئے گی۔“

میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اس میں کسی کشش ہے؟ میں کیوں اس کی طرف کھینچا چلا جا رہا ہوں؟ اچانک ہی میرے اندر کے نمازی نے کہا۔ ”یہ آزمائش کی گھڑی ہے۔ آگے جاتا ہے۔ نماز کی طرف.... یا... حسن جسم کی طرف؟“

انٹلی جنس حسن روشن کر کے منتظر تھا کہ ادھر جاتا ہے دیکھو یا ادھر آتا ہے پروانہ۔ میں اگلے قدموں چلتا ہوا ڈرائنگ روم سے جانے لگا۔ شاید اس نے میری آہٹ سن لی تھی۔ بڑے جس سے بولی۔ ”آپ آگے؟“ مجھے یہاں لانے والے نے کہا ہے آپ خود آ کر یہ پٹی کھولیں گے۔ میں جاتے جاتے دروازے پر رک گیا۔ پھر بولا۔ ”نماز کا وقت ہو گیا ہے۔“

”ہاں میں نے اذان سنی ہے۔“

”تمہیں انتظار کرنا ہوگا نماز کے بعد ملاقات ہوگی۔“ اس نے پوچھا۔ ”ملاقات کسے کہتے ہیں؟ اگر ملاقات میں ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ بولنے اور سننے ہیں تو ہم بول رہے ہیں اور سن رہے ہیں۔ آدمی ملاقات ہو چکی ہے۔ آپ مجھے دیکھ رہے ہیں۔ میں دیکھ نہیں پا رہی ہوں۔ یہ نا انصافی ہے۔ آپ نماز سے پہلے انصاف کریں۔ آنکھوں سے پٹی ہٹا کر جائیں۔“

اگر نماز کے لیے وقت ہوا اس سے پہلے بندے کے حقوق ادا کیے جاسکتے ہوں اور انصاف کرنا ممکن ہو تو ضرور کرنا چاہیے۔ مگر میں قریب جانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ آگ نہیں تھی۔ جلا نہیں سکتی تھی۔ مگر بندے کو اس کی اپنی کمزوری جلا دیتی ہے اور میرے پاس ابھی اپنی کمزوری اور قوت اراوی کو زماٹنے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے کہا۔ ”اپنے ہاتھوں سے پٹی کھول سکتی ہو۔“

اجازت ملنے ہی اس نے پٹی کھول دی۔ میں ذرا قاصدے پر اس کے رو رہا تھا۔ وہ پلٹیں چھپکائے بغیر مجھے نکلنے لگی۔ میں نے کہا۔ ”تم نے میری جو تصویر اپنے ذہن میں بنائی تھی۔ وہ مٹ چکی ہوگی۔ میں ہڈیوں کا ڈھانچا ہوں۔“

وہ بولی۔ ”یقین کریں میں نے یہی تصویر بنائی تھی۔
پچھلے دو دنوں سے آپ کے بیٹے اور داماد کی باتیں سن کر
میرے دل و دماغ میں یہی خاک بٹارتا رہا تھا۔“
”کیا اس ملاقات سے مایوسی ہو رہی ہے؟“
”ہاں ہو رہی ہے۔ آپ کتنا آنے کے انداز میں دور
کھڑے ہیں۔“

”میں عبادت کے لیے جا رہا ہوں۔ کیا نماز پر حقیقی ہو؟“
اس نے انکار میں سر ہلایا۔ ”نہیں۔۔۔۔۔“
پھر کہا۔ ”ہاں۔۔۔۔۔“
”آج پہلی ملاقات ہے۔ تم جو مانگو گی وہ تجھے کے طور
پر دوں گا۔ لیکن کیا ابھی تم مجھے ایک تھک دو گی؟“
”میری اوقات کے مطابق جو طلب کریں گے وہ
دوں گی۔“

”میں تم سے نماز کی ادائی چاہتا ہوں۔“
وہ چٹکتا ہوا اپنے لباس کو دیکھنے لگی۔ میں نے
کہا۔ ”تمہارے پاس وہ بیک رکھا ہوا ہے۔ یقیناً دوسرا لباس
ہوگا۔ کسی بھی کمرے میں جا کر شاور لو۔ لباس تبدیل کرو۔ نماز
ادا کرو۔ پھر انتظار کرو۔ ایک آدھ گھنٹے بعد ملاقات ہوگی۔“
میں وہاں سے پلٹ کر اپنے بیڈ روم میں آگیا۔
دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ تاکہ وہ اندر نہ آئے۔ لا شعوری
طور پر میری حالت ایسی تھی جیسے وہ چچھا کر رہی ہو اور میں اپنی
پارسی کا مجرم رکھنے کے لیے جھگڑتا پھر رہا ہوں۔ اس نے
ابھی درست کہا تھا کہ میں اس سے کتنا رہا ہوں۔

آج کی رات آج کی نماز مجھے اپنی جان سے زیادہ
عزیز تھی۔ میں کسی کی مداخلت نہیں چاہتا تھا۔ نہ چاہنے کے
باوجود انہیں مرڈود ایک فتنہ جگانے والی کو میرے گھر کی چار
دیواریں میں میرے استے قریب لے آیا تھا۔ ہمارے
درمیان کوئی رکاوٹ نہیں رہی تھی۔ صرف ایک بند دروازہ تھا
جو کسی بھی کمزوری کے باعث کھل سکتا تھا۔

میں وضو کرتے وقت اتنی ہی پڑھتا رہا۔ بار بار ”مُحَمَّدٌ
تَمِّمَنَّ بِذَلِكَ رُوحَ شَيْطَانٍ مُرِيدٍ“ کو بھگا رہا۔ یہ یقین ہو گیا کہ سخت
آزمائش سے گزر رہا ہوں۔ ہمارے مضبوط ارادے سے
باس آنے والی عورت کو دور بھگا سکتے ہیں۔ مگر سیلابی ریلے کی
طرح ذہن میں آنے والے خیالات کو بھگانا تقریباً ناممکن
ہو جاتا ہے۔ مجھے ناممکن کو ممکن بنانا تھا۔ میں وہی غیر بن
غازی ہوں جو پچھلے دس مہینوں سے اپنے اور بچوں کے
ہاتھوں سے ذبح کھا رہا۔ مگر مجھے توڑنے والے کسی صورت
توڑ نہ سکے۔

میرے ارادے ہمیشہ فولادی رہے ہیں۔ تمام رات
کھلے آسمان کے نیچے ہر فباری سے لڑتا رہا تھا۔ موت میرے
قریب آ کر بارگاہی تھی۔ میرے ایسے غمخیز ارادوں کے آگے
عورت کیا چیز ہے؟
میں مصیبت پر آگیا۔ رسول کریم ﷺ دعا میں مانگا
کرتے تھے۔ ”خدا یا! میں بڑے اخلاق بڑے اعمال اور بری
خواہشات سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔“

پناہ مانگنے کے سلسلے میں یہ ہدایت کی جاتی ہے کہ شیطان کی
طرف سے تمہیں اکساہٹ ہو تو اللہ کی پناہ مانگو اور کہو۔ ”میرے
پروردگار! میں شیطان کی اکساہٹوں سے پناہ مانگتا ہوں۔“
میں نے نماز شروع کی تو تمام دروازے والے خیالات
دماغ سے فنا ہو گئے۔ صرف اور صرف عبادت کا ٹھنڈا جذبہ گیا۔
”میرے معبود! میں نے ایک بار مجھے جوانی دی۔
میں نے فرستے میں اسے پانی کر دیا۔ ایک بچہ جیتے کھلنے کو
نادانی میں توڑ پھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ میں نے بھی بچکانہ اور
احتمالاً حزن کشی میں اور تیری دی ہوئی جوانی کو بیمار یوں کا گھر
بنا ڈالا۔“

جوانی منہ زور آندھی ہوتی ہے۔ ہوش و حواس بہا لے
جاتی ہے۔ اس دور میں ساری رنگینیاں یاد رہتی ہیں۔ صرف
خدا یاد رکھتا آتا۔ میں نے بھی تجھے بھلا دیا تھا۔
میں شرمسار ہوں۔ تم مجھے جیسے گناہگار بندے پر رحمتیں
نازل کر رہا ہے۔ تیری رحمتیں اور نوازیں ذہن سے ہلا
ہیں۔ آج یہ وعدہ کرتا ہوں از سر نو ملنے والی جوانی کے ایک
ایک لمحے میں شیطان پر غلبتیں بھیجتا رہوں گا اور تیرے
بندوں کے کام آتا رہوں گا۔ ایسے تمام دنیاوی معاملات سے
دور رہوں گا جو گمراہی کی طرف لے جاتے ہیں۔ تو نے مجھے
قوت ارادی دی ہے۔ حوصلہ دیا ہے۔ مجھے اور حوصلہ دے
آمین۔۔۔۔۔“

میں عشا کی نماز ادا کر چکا تھا۔ دعا مانگنے کے بعد
بڑے جذبے سے سجدے میں گر پڑا۔ ان لمحات میں شاید
جوانی کی طرف مڑ گیا تھا۔ اگر ایسا تھا تو یہ نیا سفر سجدے سے
شروع کر رہا تھا۔ میرے بس میں ہوتا تو سجدے میں ہی
رہتا۔ سر نہ اٹھاتا۔ مگر حکم خداوندی ہے کہ صرف دین کے
ساتھ نہیں دنیا کے ساتھ بھی چلو۔

نئی زندگی شروع ہو چکی تھی۔ یہ کیسے معلوم ہو کہ شروع
ہو چکی ہے؟ میں نے انکھیں بند کر کے محسوس کرنے کی کوشش
کی۔ ”کیا میرے اندر کوئی تبدیلی ہو رہی ہے؟۔۔۔۔۔؟“
سجدے کے وقت جسم کا خون دماغ کی طرف کھینچا آتا

ہے۔ ایسا لگتا ہے سر جھکاتے ہی اپنے رب کے سامنے کچھے
چلے آتے ہیں۔ کچھ پائے کا احساس ہوتا ہے۔ میں کیا
پارہا تھا؟ یہ فوراً ہی معلوم نہیں ہو سکتا تھا۔

ایک نوزائیدہ بچہ نہیں جانتا کہ کس کا دودھ پی رہا ہے؟
وہ رفتہ رفتہ مٹا کی خوشبو سے آشنا ہوتا ہے اور ماں کو پہچانتا
ہے۔ اس وقت میں بھی نوزائیدہ بچے کے مانند تھا۔ اپنے اندر
ہونے والی تبدیلیوں کو سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ یقیناً آگے جا کر
معلوم ہو سکے گا کہ میں کیا سے کیا ہو رہا ہوں؟

میرے کمرے کے باہر شرارہ ڈرائنگ روم میں انتظار
کر رہی تھی۔ میں نے اسے نماز پڑھنے کے لیے کہا تھا۔ وہ
شاہد لے کر لباس تبدیل کر کے میری ہدایت پر عمل کر سکتی تھی
مگر اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ دراصل میں نے اس پہلو کو نظر
انداز کر دیا تھا بلکہ بھول گیا تھا کہ عورتوں کی کچھ مجبوریاں بھی
ہو سکتی ہیں۔

وہ بڑی بے چینی سے میرا انتظار کر رہی تھی۔ بار بار
وال کلاک کی طرف دیکھ رہی تھی۔ دل کہہ رہا تھا کہ بس میں
آنے ہی والا ہوں۔ اسے مجھ جیسے بڈیوں کے ڈھانچے سے
متاثر نہیں ہونا چاہیے تھا۔ شاید وہ متاثر نہ ہو۔ کوئی اور بات
ہو۔ کوئی اور ضرورت اسے میری طرف کھینچ لاتی ہو؟

وہ ایک گھنٹے بعد اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ عشا کی نماز دو
تک ہوئی ہے۔ گمراہی ہو چکی تھی۔ وہ ڈرائنگ روم
سے نکل کر دوسرے کمروں کی طرف گئی۔ دو بیڈ روم کے
دروازے کھلے تھے۔ تیسرا اندر سے بند تھا۔ وہ دستک دینا چاہتی
تھی۔ پھر حرکت گئی۔ دروازے سے کان لگا کر سننے لگی۔

اندر گہری خاموشی تھی۔ اسے وہ خاموشی پر اسرار لگ
رہی تھی۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹ کر دروازے کو دیکھ کر سوچنے
لگی ”کیا کمرے؟ دستک دے گی تو اسراریت ختم ہو جائے گی۔
دروازہ کھل جائے گا۔ معلوم نہیں ہو سکے گا کہ میں بند کمرے
میں اب تک کیا کرتا رہا ہوں؟“

اس نے سر اٹھا کر روشن دان کو دیکھا کچھ سوچا پھر ایک
اونچا اسٹول لا کر اس پر چڑھ گئی۔ یوں اس کا آدھا چہرہ اوپر دو
آنکھیں روشن دان تک پہنچ گئیں۔ کمرے کا بیشتر حصہ دکھائی
دے رہا تھا۔ میں بھی نظر آ رہا تھا۔

اس وقت میں ہاتھ پاؤں کی ہلکی پھلکی سی ورزش کرتے
ہوئے خود کو آزار مار رہا تھا کہ ممکن محسوس ہوتی ہے یا نہیں؟ خدا کا
شکر ہے ان لمحات میں مجھ پر توانائی محسوس کر رہا تھا۔ وہ بڑی
حیرانی سے سوچ رہی تھی کہ میں نے اسے نماز پڑھنے کی تلقین
کی تھی اور خود بند کمرے میں آ کر اس کو بڑھاپے میں ورزش

کر رہا ہوں؟

وہ مجھے بڑی توجہ سے دیکھ رہی تھی۔ اسے یوں لگ
رہا تھا جیسے میں کچھ تبدیل ہو گیا ہوں۔ بالکل ہی بوڑھا نہیں
لگ رہا ہوں۔ اس نے تقریباً دو گھنٹے پہلے مجھے ڈرائنگ روم
میں دیکھا تھا۔ اتنی ہی دیر میں ایسی کیا تبدیلی ہوئی تھی؟ وہ
مجھے کی کوشش کر رہی تھی۔

میں ایک مار کر لے کر کیلنڈر کے سامنے آگیا۔ وہاں
چھ ستمبر کی تاریخ پر دائرہ لگا ہوا تھا۔ تاریخ آگے بڑھتی ہے۔
مجھے سات ستمبر پر نشان لگانا چاہیے تھا۔ لیکن میں نے پانچ ستمبر
پر دائرہ لگایا۔ یہ اس کے لیے حیرانی کی بات تھی۔ وہ مجھے
آنکھیں میاڑ میاڑ کر دیکھ رہی تھی۔ یہ کیسی مجھ ہی نہیں سکتی تھی
کہ میں ایسی کتنی کی طرف کیوں جا رہا ہوں؟

وہ اسٹول سے اتر گئی۔ ڈرائنگ روم کی طرف جاتے
ہوئے ناقابل فہم باتوں پر غور کرتی رہی۔ پھر اس نے اپنے
فون پر میرے نمبر کیسے میرا فون بیڈ کے سر ہانے والی میز
پر رکھا ہوا تھا۔ میں نے وہاں آ کر نمبر دیکھ کر احساس ہوا کہ
میں اسے بڑی دیر سے نظر انداز کر رہا ہوں۔ مجھے وعدے کے
مطابق اس سے ملاقات کرنی تھی۔

میں نے فون کو کان سے لگا کر کہا۔ ”سوری۔ کچھ دیر
ہو رہی ہے۔ ابھی آتا ہوں۔“

اس نے کہا۔ ”فون بند نہ کریں۔ میری ایک بات کا
جواب دیں۔ کیا آپ دوسروں کو کھینچتے کرتے ہیں اور خود
اس پر عمل نہیں کرتے؟“

میں نے تعجب سے پوچھا۔ ”تم کہنا کیا چاہتی ہو؟“
”آپ نے مجھے نماز پڑھنے کے لیے کہا اور خود بند
کمرے میں رہ کر اتنی دیر سے ورزش کر رہے ہیں۔“

میں نے حیرانی سے بند دروازے کو دیکھتے ہوئے
پوچھا۔ ”کیا تم دروازے کی اوٹ سے جھانک رہی تھیں؟“

”پہلے میری بات کا جواب دیں۔ میں نے آپ کے
بیٹے اور داماد کی کئی باتوں سے اندازہ لگایا تھا اور جس طرح
آپ دشمنوں کو زیر کر رہے ہیں، اس سے بھی یقین ہو رہا تھا
کہ بوڑھے اور کمزور نہیں ہیں اور ابھی آپ کو دیکھ کر یہ بات
مجھ میں آ رہی ہے کہ جناب کو جوان بننے کا بہت شوق ہے۔“
مجھے یوں لگا جیسے وہ میری برسوں کی خواہش کو پڑھ
رہی ہو۔ میں نے پوچھا۔ ”کیا تم یہاں ایسی ہی ایلی سیدی
باتیں کرنے آتی ہو؟“

”میں نہیں آپ ایلی سیدی کر رہی ہیں۔ چھ
تاریخ کے بعد سات پر نشان لگانا چاہیے تھا۔ آپ نے گزری



شمرقند

سرمردہ بازار

کے ساتھ
اعلیٰ کوالٹی گلاس مفت



PET
بوتل میں دستیاب ہے

اس Summer میں صرف شمرقند اسٹاک کی دستیابی تک اکتیم جاری رہے گی

اگرچہ اب بھی میں یوزھا دکھائی دیتا ہوں۔۔۔ مگر بال سیاہ ہو گئے ہیں۔ میرے ساتھ جو قدرتی معاملات ہیں انہیں تودہ سمجھ پائے گی اور نہ میں قدرت کا بھید کھولنا چاہوں گا۔“
میں پہلے سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ مختصری ملاقات کے لیے آئے گی تو گھر کی بھیدی بننے کی راہ نکال لے گی۔ تاکہ جھانک کرنے والیاں بڑی تیز طرار ہوتی ہیں۔ میں نے سوچ لیا کہ اس سے کچھ باتیں کروں گا پھر اسے رخصت کر دوں گا۔

میں بڑے روم سے نکل کر ڈرائنگ روم میں آیا۔ وہ ایک صوفے پر بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھ کر کھڑی ہوئی۔ سر ہلکا ہوا۔۔۔ ہو گئی۔ پتا نہیں اس میں کسی کشش تھی کہ مجھے اچھی لگ رہی تھی۔ اس نے میرے سر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا میں جھوٹ کہہ رہی تھی؟ آپ نے خضاب نہیں لگایا ہے؟“
میں نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔ ”ہاں لگایا ہے۔ مگر یہ نہ سمجھو کہ میں نے نماز نہیں پڑھی۔ پہلے پڑھی ہے پھر یہ بال سیاہ ہوئے ہیں۔“
وہ بڑی آوازیں سے مسکرا کر بولی۔ ”یعنی مجھے دیکھتے ہی جوان بننے کا ارادہ کر لیا؟“

میں نے ہنچکاتے ہوئے کہا۔ ”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے ملاقات کرنے کا وعدہ پورا کیا ہے۔ کچھ کہنا ہے تو کہو۔۔۔ اس کے بعد میرے آہی نہیں کر سکتا تھا۔“
وہ بولی۔ ”پہلی بات تو یہ کہ میں چٹکی بجا کر بندوں کو پھانس لیتی ہوں۔ مگر آپ کو پھانسنے نہیں آتی ہوں۔ احسان فرماؤں نہیں ہوں۔ آپ میرے محسن ہیں۔ میں آپ کا بڑے سے بڑا کام کروں گی۔ آپ کی ہر بات مانوں گی مگر اپنے بدن کو ہاتھ لگانے نہیں دوں گی۔“

وہ شاید اپنا بھاء بتا رہی تھی۔ میں نے ناگواری سے کہا۔ ”تم ضرورت سے زیادہ بولتی ہو۔ میں نے تمہاری آرزو نہیں کی ہے۔ تمہیں طلب نہیں کیا ہے۔ تم بہت زیادہ خوش نہیں۔۔۔“

وہ بات کاٹ کر بولی۔ ”پلیز یہاں کوئی تیسرا نہیں ہے۔ جو بچ ہے اس کا اعتراف کریں۔ میں بازاری عورت ہوں۔ کسی بھی مرد سے لگاؤں چار کرتے ہی اس کی نیت کو بھانپ لیتی ہوں۔“

اس نے خود کو بازاری کہا تو میں نے بحث نہیں کی۔ وہ سمجھ رہی تھی۔ میں اس کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ”جب بازاری ہو تو یہ کیوں کہہ رہی ہو کہ بدن کو ہاتھ لگانے نہیں دوں گی؟“

ہوئی پانچ تاریخ پر نشان لگایا ہے۔ کیا آپ اس طرح وقت کو پیچھے کی طرف لے جاتا چاہتے ہیں؟“
میں نے کیلنڈر کی طرف دیکھا۔ پھر ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگا۔ روشن دان پر نظر پڑی۔ تب میں نے کہا۔ ”اچھا تو تم روشن دان سے دیکھ رہی ہیں؟“
”ہاں دیکھ رہی تھی۔ کیا یہ غلط ہے کہ آپ کو جوان بننے کا شوق ہے؟ اتنا شوق ہے کہ نماز پڑھنے کے وقت بالوں میں خضاب لگاتے رہے؟“

میں نے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ ”یہ کیا بکواس ہے؟ میں اپنے کمرے میں آکر نماز پڑھ رہا تھا۔ خضاب نہیں لگا رہا تھا۔“
”عجب ہے۔ ابھی دو گھنٹے پہلے دیکھا تھا تو سر کے بال سفید تھے۔ اب خضاب لگائے بغیر سیاہ کیسے ہو گئے؟“
اس کے سوال نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے فوراً ہی پلٹ کر آئینے کے سامنے آکر دیکھا تو حیرت سے ایک خوشگوار سا جھٹکا لگا۔ میرے سر کے بال اور بھوئیں سیاہ ہو گئی تھیں۔ کوئی بھی دیکھتا تو یہی کہتا کہ میں نے خضاب لگایا ہے۔ میں ایک دم سے پلٹ کر کنبے کے رخ کرتے ہوئے عجب سے میں ہنسی لگائی۔

میری سرتوں کی انتہا نہیں تھی۔ بڑا حباب سے واپس جوانی کا سفر شروع ہو چکا تھا۔ اس سے واضح نشانی اور کیا ہو سکتی تھی کہ ابھی عشا کی نماز ادا کرنے کے بعد کسی وقت میرے بال سیاہ ہو گئے تھے۔

ہمارا معبود جنگ قادریہ مطبق ہے۔ چل بھر میں سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ بناتا ہے۔ وقت کا پیچھے کی طرف گھما دیتا ہے۔ کیلنڈر کی تاریخ پیچھے لے جاتا ہے۔ وہ رب کریم مجھے بڑا حباب کے کھنڈر سے نکال کر جوانی کے گل و گلزار کی سمت لے جا رہا تھا۔ اس واضح نشانی کو دیکھ کر پختہ یقین ہو گیا کہ واپسی کا سفر شروع ہو چکا ہے۔ میرا رب مجھ سے راضی ہے اور آئندہ مجھے اس معبود کی رضا کے مطابق زندگی گزارنی چاہیے۔ میں نے عجب سے میں رہ کر اپنے رب سے وعدہ کیا کہ چٹکی غلطیاں نہیں دہراؤں گا۔

دروازے پر دستک سنائی دی۔ میں نے سر اٹھا کر فون کی طرف دیکھا۔ وہ بند ہو چکا تھا۔ شرارہ دروازے پر آگئی تھی۔ اس کی آواز سنائی دی۔ ”آپ فون پر نہیں بول رہے تھے اس لیے آئی ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”ڈرائنگ میں چلو میں آ رہا ہوں۔“
میں قالین پر سے اٹھ کر سوچنے لگا۔ ”اس نے ڈرائنگ روم میں سفید بالوں والے بوڑھے کو دیکھا تھا۔

”میں نے یہ بھی کہا ہے کہ آپ میرے محسن ہیں۔ آپ کو نقصان نہیں پہنچاؤں گی۔ اپنی پیاریاں آپ کو نہیں لگاؤں گی۔“ میں نے متثر ہو کر اسے دیکھا۔ پھر کہا۔ ”تم بہت اچھی ہو۔ یہ بات ہوں کہ تم پر دل آگیا ہے۔ مگر میرے ذہن میں دور تک گناہ کا تصور نہیں ہے۔ میں تمہیں اچھی طرح سمجھنے کے بعد اپنے دین اور شریعت کے مطابق شریک حیات بنانا چاہوں گا۔“

اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ میری یہ بات اس کی توقع سے کہیں زیادہ تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ کبھی کوئی اسے ایسی عزت دینا چاہے گا۔ ابھی وہ بازاری انداز میں آنکھیں میکا رہی تھی۔ اب اچانک ہی اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ وہ ہنسنے لگے میں بولی۔ ”یہ ممکن نہیں ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ آپ مجھ سے نکلیں اور میں آپ کو مار ڈالوں۔“

میں نے کہا۔ ”ہماری دنیا میں بدترین بیماریوں کا علاج ہو جاتا ہے۔ میں تمہیں لندن لے جاؤں گا۔ بڑے تجربہ کار ڈاکٹروں سے علاج کراؤں گا۔“

”آگے نہ بولیں۔ آپ کی یہ محبت یہ جذبہ مجھے مار ڈالے گا۔ اب تک تو یہی سن رہی ہوں کہ دنیا کے کسی ڈاکٹر کے پاس ایڈز کا علاج نہیں ہے۔ یہ طے ہو چکا ہے کہ میں ناقابل علاج ہوں۔“

میں نے سر جھکا لیا۔ اس کے لیے دل میں درد پیدا ہو رہا تھا۔ جیسے پائینے کا یقین ہو اور وہ ملتے ملتے بھی نہ مل پائے تو اس کے لیے اور زیادہ شش پیدا ہو جاتی ہے۔ اس نے کہا۔ ”میں آپ سے مدد حاصل کرنے آئی ہوں۔“

میں نے بڑے جذبے سے کہا۔ ”زبان کھولو۔ تمہاری ہر ضرورت پوری کروں گا۔“

”میری چھوٹی بہن دس برس کی ہے۔ اس کے لیے پریشان ہوں۔ صاف نظر آتا ہے کہ اسے کوئی عزت سے بیاہ کر نہیں لے جائے گا۔ وہ ایک بازاری عورت کی بہن کہلائی رہے گی۔“

”میں تمہاری پریشانیوں کو سمجھ رہا ہوں۔ مگر نہ کرو۔ تم دونوں بہنوں کو عزت ملے گی۔ ایڈز کا علاج کسی حد تک ہو رہا ہے۔ بعض مریض بھالی کی طرف آرہے ہیں۔ میں تمہارا علاج کراؤں گا۔ تم ایک ہفتے کے اندر بہن کے ساتھ لندن جاؤ گی۔ وہاں مستقل رہائش اختیار کرو گی۔ تمہاری بہن کی تعلیم و تربیت وہیں ہونی رہے گی۔ جب واپس آؤ گی تو تمہاری حیثیت بدل چکی ہوگی۔ تمہاری بہن کسی بھی عزت دار گھرانے میں بیاہی جائے گی۔ یہ میرا وعدہ ہے۔“

وہ میری محبت اور ہمدردیاں پاتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں خاموش بیٹھا رہا۔ اسے رونے دیا تاکہ اندر کا سارا غبار نکل جائے اور آج کے بعد وہ کبھی آنسو نہ بہائے۔ تھوڑی دیر بعد اس نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ”میں نے آپ کے بیٹے اور داماد سے سنا ہے کہ پڑوسی ملک سے بھی آپ کا ایک دشمن آیا ہوا ہے۔ آپ سب ہی پر بھاری پڑ رہے ہیں۔ سب ہی کے ہاں کہ بظاہر بوڑھے پیار اور کمزور دکھائی دیتے ہیں مگر حقیقت ایسے نہیں ہیں۔“

اس نے نظریں اٹھا کر مجھے دیکھا پھر کہا۔ ”آج پہلی بار آپ کو دیکھ رہی ہوں۔ کسی بھی طرح پیار اور کمزور نظر نہیں آرہے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”رہ کریم کا بیٹا بھی شکر ادا کروں کم ہے۔ میں شیطان کے حربوں سے بچنے لگا ہوں۔ مجھے جو توانائی حاصل ہو رہی ہے۔ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ایسی رحمتیں صرف نصیب والوں پر نازل ہوتی ہیں۔“

”آپ مرد ہیں۔ شیطان کے حربوں سے بچ نکلے ہیں۔ میں عورت ہوں ایک شیطان سے بری طرح مات کھا چکی ہوں۔ اس نے مجھے دو گڑی کا بنا دیا ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”کون ہے وہ...؟“

”وہ ایک عیاش جاگیردار اور سیاستدان بہت ہی با اختیار اور بے لگام ہے۔ آپ نے شوکت شاہنواز کا نام سنا ہوگا؟“

میں صوفے پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ میرے مخالفین کی فہرست میں اس کے نام کا اضافہ ہوا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”تم اس کے بارے میں کیا جانتی ہو؟“

”اس کے بارے میں شاید مجھ سے زیادہ کوئی نہیں جانتا ہوگا۔“

”میں بہت چاہتا ہوں۔“

اس نے کہا۔ ”اس کے باپ دادا کے زمانے سے ایک قلمی ادارہ قائم ہے۔ اس ادارے میں غریب اور لاوارث لڑکیوں کا ہاشل اور سکول ہے۔ وہاں مفت کھانا کپڑا اور تعلیم و تربیت دی جاتی ہے۔ پانچ برس سے لے کر بیس برس کی انتہائی حسین و جمیل لڑکیوں کو اس ادارے میں تعلیم و تربیت کے لیے داخلہ ملتا ہے۔“

بنت میرے پیچھے پڑ گیا۔ اس نے میرے ابا کو اپنی کٹھی میں طلب کیا۔ اسے مشورہ دیا کہ مجھے ادارہ تعلیم و تربیت میں داخل کرا دے۔

ہم بہت غریب تھے۔ کبھی ابا کا کر لانا تو تینوں وقت کھاتے تھے۔ ورنہ فاقے ہوتے تھے۔ اس نے ابا کو پچاس ہزار روپے دیے تو وہ مجھے اس ادارے میں چھوڑ کر چلا گیا۔ وہ ذرا چپ ہوئی۔ اپنی انگلیوں پر پتی پڑھتے ہوئے بولی۔ ”میں آٹھ برسوں تک وہاں رہی۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ میرے ساتھ کتنی شرمناک حرکتیں کرتا رہا ہوگا؟“

”چنگ۔ میں اندازہ کر سکتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”دولت مند عیاش طرح طرح کے شوق رکھتے ہیں۔ اسے کم سن لڑکیوں سے کھیلنے کا شوق تھا۔ وہ بچہ بن کر ان کے ساتھ آٹھ بجو کھیلتا تھا۔ تاریکی میں انہیں ڈھونڈتا تھا۔ پکڑتا تھا انہیں اچھی طرح ٹٹولتے ہوئے کہتا تھا کہ تم ایسا ہو... نہیں ہو... ڈولی ہو... تم شرارہ ہو۔“

وہ بڑی دلچسپ معلومات پیش کر رہی تھی۔ میں توجہ سے سن رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”بھئی وہ اپنی آنکھوں پر پتی باندھ کر کہتا تھا کہ میں تم میں سے کسی کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ صرف ہونٹوں سے اور زبان سے چھو کر پیمان لوں گا۔ چلو ادھر ادھر ہو جاؤ۔ ہم سب جگہ بدل کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔“

وہاں مجھ سے بھی کم عمر لڑکیاں مختصر سے لباس میں ہوتی تھیں۔ وہ انہیں ڈھونڈتا ہوا غریب پہنچتا تھا۔ اس کے ہاتھ پیچھے بندھے ہوتے تھے۔ وہ اپنے ہونٹوں سے اور زبان سے بدن کے کتنے ہی حصوں کو گدگداتا تھا۔ لڑکیاں ہنسی تھیں۔ وہ ہنسنے ہنساتے کھیلتے کھلاتے انہیں جوانی کی دلیلیں پر پہنچاتا تھا۔“

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ ”میں ان لڑکیوں میں سے ہوں جن پر جوانی آئی نہیں لائی تھی ہے۔ یہ عیش و عشرت میں مست رہنے والے جوانی سے پہلے بچوں کو جوان بنادیتے ہیں۔ جب بوڑھے ہوتے ہیں تو خود جوانی کی طرف آنے کے لیے مجنون اور سلا جیت کا سہارا لیتے ہیں۔“

میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔ مجھے کسی عارضی سہارے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں قدرتی طور پر واپس جا رہا تھا۔

شرارہ نے کہا۔ ”جب میں تیس برس کی بھرپور جوان عورت بن گئی تو شوکت کی دلچسپی ختم ہوئی۔ وہ جگہ جگہ چھنے کا عادی تھا۔ اس کا پیارا برکت شاہنواز بچے ہوئے چل کھانے کا دلدادہ تھا۔ ہوس کے معاملے میں وہ باپ جیسے مختلف ذوق کے حامل تھے۔ مجھے ادھر زنا سفر کر دیا گیا۔“

وہ بڑے دکھ سے بڑے کرب سے بولی۔ ”یہ کیسے لوگ ہوتے ہیں؟ ان میں ایک ذرا سی شرم ذرا سی غیرت نہیں ہوتی۔ باپ دھیرے دھیرے فصل پکاتا تھا۔ بعد میں بیٹا آرام سے کھاتا اور جگہ کی کرتا رہتا تھا۔ ایسی غیر انسانی، غیر اخلاقی لکڑی حقیقت سن کر آپ کو کیسا لگ رہا ہے؟“

میں نے غدا مت سے کہا۔ ”بڑی شرم آ رہی ہے۔ ایسے لوگوں کے گناہ ظاہر نہیں ہوتے۔ ہو جائیں تو ہم انہیں زندہ نہ چھوڑیں۔ میرا وعدہ ہے کہ وہ باپ جیسے حرام موت مر رہے۔“

وہ اطمینان سے گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔ ”میں یہی چاہتی ہوں۔ برکت شاہنواز ایڈز کا مریض ہے۔ اللہ کرے وہ کھل کا مرنا آج مر جائے۔ کتنی ہی لڑکیوں کو ایسے مہلک مرض سے نجات مل جائے گی۔“

وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ میرے سامنے آگئی۔ دل کی دھڑکنیں کچھ بے اعتدالی ہوئے لگیں۔ سچ تو یہ ہے کہ میں ایک بار اسے چھونا چاہتا تھا۔ وہ میرے دل میں اتر گئی تھی۔ کیا ہوا اگر وہ بری طرح تو بچی کھوئی گئی تھی۔ بیماریوں کا گھر بنا دی گئی تھی۔ گہری تعمیر نو ہو سکتی ہے۔ جیسے سنے سے میری تعمیر ہو رہی تھی۔

بیاد کا جذبہ کانٹوں میں بھی پھول کھلاتا ہے۔ میرے اندر یہ جذبہ تھا کہ اسے صحت مندی کی طرف لانے کی ہر ممکن کوشش کرتا رہوں گا۔

اس نے قالین پر گھٹنے ٹیک دیے۔ میرے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”آپ مجھے سمندر پار بھیج کر میرا علاج کراتا چاہتے ہیں۔ میری بہن کو نیک نامی دینا چاہتے ہیں۔ خدا ان نیک ارادوں میں آپ کو کامیاب کرے۔ آج سے میں آپ کے نام ہو گئی۔“

میں نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ جیسے اسے پالیا۔ دل اس کی طرف کھینچا جا رہا تھا۔ مگر فاصلہ لازمی تھا۔ اس نے کہا۔ ”آج سے میں ایک ہی دعا مانگتی رہوں گی کہ میرا مہلک مرض ایک دن ایک رات کے لیے ختم ہو جائے اور میں اپنے پیارے تمام حسرتیں پوری کر لوں۔ اس کے بعد ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کر لوں گی۔“

میں نے اس کے ہاتھ کو ہاتھوں میں لے کر کہا۔ ”مرنے کی باتیں نہ کرو۔ تمہارا بھرپور علاج ہوگا۔ تم میرے لیے جیو گی۔ بولو جیو گی تاں میرے لیے؟“

وہ میرے گھٹنے پر بیٹھائی ٹیک کر بولی۔ ”اللہ...! آپ مجھے کتنا پیار دے رہے ہیں؟ میں نے تو بھی ایسا سوچا بھی نہ

تھا۔ میں میرا دل چاہتا۔۔۔

وہ اچانک ہی چمک گئی۔ اس نے اسرا کر مجھے دیکھا۔ پھر کھڑی ہوئی۔ پیچھے ہٹ کر بولی۔ ”میں جاری ہوں۔ مجھے جانا چاہیے۔ مجھے ڈر ہے، شہر کی تو آپ کے آگے دھیر ہو جاؤں گی۔“

وہ پلٹ کر اپنے بیک کے پاس گئی۔ وہاں رک کر بولی۔ ”میری آنکھوں پر پانی باندھ دیں۔ آپ کی اس پناہ گاہ کو خفیہ رہنا چاہیے۔“

میں نے فون کے ذریعے ایک جاں نثار کو طلب کیا۔ پھر شرارہ سے کہا۔ ”تم کھلی آنکھوں سے دیکھتی ہوئی یہاں سے جاؤ گی۔ اپنی بہن کے ساتھ میری گلبگر والی کوئی میں رہو گی۔ پچھلی زندگی کو بھول جاؤ۔ نئی زندگی شروع کرو۔“

ایک جاں نثار نے آکر سلام کیا۔ میں نے کہا۔ ”انہیں ٹھوکر ناز بیک لے جاؤ۔ یہ ابھی بہن کے ساتھ واپس آئیں گی۔ گلبگر والی کوئی کی چابیاں ان کے حوالے کر دو۔ دو دنوں کے اندر دونوں بہنوں کے پاسپورٹ بنواؤ۔ علاج کے سلسلے میں لندن جانے کے لیے ویزا مل جائے گا۔ باقی انتظامات میرے لندن آفس والے کریں گے۔“

اس نے اپنا ایک اٹھا کر بڑے جذبے سے بڑی محبت سے مجھے دیکھا۔ پھر خدا حافظ کہہ کر چلی گئی۔

پہلی ملاقات میں ہم ایک دوسرے سے یوں وابستہ ہو گئے تھے، جیسے ہمارے درمیان پرانی شناسائی ہو۔ انہی بات نہیں ہے کہ میں چند گفتگوں میں اس کا دیوانہ عاشق بن گیا تھا۔ بیشک اس پر دل آ گیا تھا مگر جی جان سے اس کے کام آنے کی اور بھی وجوہات تھیں۔

سب سے بڑی اور اہم وجہ یہ تھی کہ شرارہ نے ایسے وقت میرے گھر میں قدم رکھا تھا جب مجھے نئے سرے سے نئے انداز سے ایک عجزانی زندگی مل رہی تھی۔ انہی مسرتوں کے ہجوم میں وہ جیسے جشنِ محبت منانے آئی تھی۔ اس نے میری مسرتوں کو دوبارہ یاد دلایا تھا۔

دوسری اہم وجہ یہ تھی کہ نئی زندگی کی ابتدا ہوتے ہی میں نیکی کمانے کی راہ پر چل پڑا تھا۔ ایک ایسی مصیبت زدہ کے کام آ رہا تھا جسے ہوس پرستوں نے مہلک بیماری لگا دی تھی۔ آئندہ میری زندگی کا مقصد یہی ہو گا کہ مظلوموں کے کام آتا رہوں اور یہ میری بہت بڑی نیکی ہوگی جب میں شرارہ کی بہن کو نیک نامی دوں گا۔

میں اپنے بیڈروم میں آ گیا۔ وہاں میرا موبائل فون منگنا رہا تھا۔ میں نے اسے اٹھا کر دیکھا۔ وہ میرے لیے

ابھی نمبر تھا۔ میں نے بن دیا کہ اسے کان سے لگاتے ہوئے پوچھا۔ ”جی۔ فرمائیے۔۔۔“

دوسری طرف سے کہا گیا۔ ”ہم کیا فرمائیں؟ سنا ہے آپ ہم سے بات کرنا بھی نہیں چاہتے؟“

میں نے کہا۔ ”سوری رائگ نمبر۔۔۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”جسٹ آمنٹ۔ فون بند نہ کرنا۔ میں رائگ نمبر نہیں ہوں میری بن غازی۔۔۔“

میری چٹائی پر ٹنگٹیں پڑ گئیں۔ میں نے پوچھا۔ ”کون ہو تم؟“

”میں یہ فون نمبر کیسے معلوم ہوا؟“ وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”تم پوری دنیا سے چسپ سکتے ہو۔ لیکن مجھ سے بھی نہیں چسپ سکو گے۔ میں تو روپوش رہنے والوں کو تار کیوں میں بھی ڈھونڈ نکالتا ہوں۔“

”اچھا۔۔۔ یہ تو آلو کی خامیٹ ہے۔“ ”کوئی بات نہیں۔ مجھے آلو کہہ کر خوش ہو جاؤ۔ مجھ سے دوستی کرو گے تو طرح طرح سے خوش رکھوں گا۔“

”پھر تو یہ بھی یاد دو کہ دوستی کس بنیاد پر ہوگی؟“ ”مجھے چالیس من سوئے کا حصہ دار بنالو۔ بڑے فائدے میں رہو گے۔ کوئی دشمن تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرات نہیں کر سکے گا۔“

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اچھا تو آپ ہیں عزت مآب شوکت شاہنواز۔۔۔ آپ کہاں ہیں؟ میں تو حضور کو کھٹے لگانے کا فیصلہ کر رہا تھا۔“

وہ ذرا دیر چپ رہا۔ پھر بولا۔ ”کیا یہ بات سنجیدگی سے کر رہے ہو؟ مجھے تو اطلاع ملی ہے تم مجھے خود سے کتر مجھ سے رہو۔ دوستی کرنا تو کیا۔۔۔ مجھ سے بات کرنا بھی نہیں چاہتے؟“

”آپ بے جیسے دو ٹکے کے بد معاش کو ٹڈل میں بنا رہے تھے۔ میں کسی غنڈے کو اپنے اور آپ کے درمیان راز دار بنانا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اسے بھڑک دیا۔ مگر یہ طے کر لیا کہ آپ سے خفیہ طور پر ملاقات کروں گا۔ کیونکہ یہ جانتا ہوں کہ میرا سارا خزانہ آپ کی مدد سے محفوظ رہے گا۔“

وہ خوش ہو کر بولا۔ ”واہ کیا بات ہے؟ تم نے بڑی سمجھ داری سے فیصلہ کیا ہے۔ دل خوش کر دیا ہے۔“ ”مگر میری شرط ہے۔ آپ بے کو تو کیا؟ اپنی اولاد کو بھی ہمارے اس معاملے میں راز دار نہیں بنائیں گے۔“ ”تم اطمینان رکھو۔ ہمارے درمیان کوئی تیسرا راز دار نہیں رہے گا۔“

”بس تو پھر ہماری ملاقات ہو جانی چاہیے۔ آپ یہ طے کریں کہ کب اور کہاں ہوگی؟ کیونکہ میں روپوش رہتا

چاہتا ہوں۔ اس لیے شہر سے باہر ملاقات کرنا چاہوں گا۔“ ”میں ابھی آدھے گھنٹے میں سوچ کر ملاقات کا وقت اور جگہ بتاؤں گا۔“

”ایک اور بات کہنا چاہتا ہوں۔“ ”ہاں ہاں کہنے والی جو بھی بات ہے بے جھجک کہو۔“

”بات یہ ہے کہ جب ہم دوست بن رہے ہیں تو ہمارے درمیان بے تکلفی ہونی چاہیے۔ میں کچھ زیادہ ہی کن موچی ہوں۔ روپوش رہ کر زندگی کی رنگینیوں سے محروم ہو گیا ہوں۔ اس لیے چاہتا ہوں کہ۔۔۔“

میں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”اس میں جھجکنے والی کیا بات ہے؟ میں بھی رنگیلا راجا ہوں۔ کل جہاں بھی ملاقات ہوگی۔ وہاں شراب اور شباب کا زبردست انتقام ہوگا۔“

”مگر اس طرح ہماری ملاقات خفیہ نہیں رہے گی۔“ ”رہے گی۔ فکر نہ کرو۔ جو حسینا میں ہمیں خوش کرنے آئیں گی وہ میری زبرد خرید ہوں گی۔ ان کا ہمارے معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔“

میں نے کہا۔ ”ایک اور بات کہنا چاہتا ہوں۔ کہوں گا تو آپ چاہیں کیا سوچیں گے؟“

”بھئی! اب ہم بے تکلف دوست بن چکے ہیں۔ جو بھی بات ہے، کل کر کہہ ڈالو۔“ میں نے سمجھتے ہوئے کہا۔ ”وہ دراصل میرا شوق و ذوق اور طرح کا ہے۔ مجھے پھر پور جواں حسینا میں اچھی نہیں لگتیں۔ مجھے تو کم سن لڑکیاں اچھی لگتی ہیں۔“

اس نے زوردار قہقہہ لگایا پھر کہا۔ ”بھئی! تم تو میرے ہم مزاج دم خیال ہو۔ ہماری دوستی خوب رنگ لائے گی۔ کل ایک درجن تھلیاں اپنے پر پھیلانے تمہارے آس پاس منڈلائی رہیں گی۔“

میں نے حیرانی ظاہر کی۔ ”ایک درجن۔۔۔؟“ وہ بولا۔ ”اس سے بھی زیادہ ہو سکتی ہیں۔ تمہارا یہ شوق دیکھ کر ملاقات کی جگہ سمجھ میں آگئی ہے۔ شاید وہ دو گلو میٹر آگے ادارہ تعلیم و تربیت کی ایک وسیع و عریض عمارت ہے۔ کل شام چھ بجے وہاں آسکو گے؟“

”میں نے وہ عمارت دیکھی ہے۔ کل ٹھیک چھ بجے وہاں پہنچ جاؤں گا۔“ ”غازی! پھر ایک بار کہتا ہوں۔ تم نے دل خوش کر دیا ہے۔ ہماری دوستی پکی ہوگی۔ ہم آخری سانسوں تک ساتھ رہیں گے۔“

میں نے کہا۔ ”یہ میرا وعدہ ہے۔ آخری سانس لیتے وقت کوئی ہونہ ہو میں تمہارے ساتھ رہوں گا۔“

ہمیں پھر کئی وقت فون پر باتیں کرنا تھیں۔ اس وقت رابطہ ختم کر دیا گیا۔ میں بیڈ کے سرے پر بیٹھ کر سوچنے لگا۔ یہ سستی گری ہوئی شرمناک بات ہے کہ لوگ معصوم اور کم سن بچیوں کو ہوس کا نشانہ بناتے ہیں؟ ایسا ایک ہوس کا کھلا زری میرے ہتھے چڑھنے والا تھا۔ میں نے شرارہ سے وعدہ کیا تھا کہ ان باپ بیٹے کو ان کے بدترین گناہوں کی بدترین سزا میں دوں گا۔

میں نے فون پر اپنے جاں نثار اور دست راست اعظم جانی کو بتایا کہ دوسرے دن شوکت شاہنواز سے نمٹنا ہے۔ کل صبح ہی تمام جاں نثاروں کو ادارہ تعلیم و تربیت میں پہنچا کر بڑی راز داری سے مورچے بنائے ہیں اور یہ معلوم کرنا ہے کہ اس کا بیٹا برکت شاہنواز کہاں ہے اور اسے کس طرح ٹریپ کیا جاسکتا ہے؟

میں اسے ضروری ہدایات دینے کے بعد بستر پر لیٹ گیا۔ پھر جب تک نیند نہیں آئی تب تک قرآنی آیتیں پڑھتا رہا اور خدا کا شکر ادا کرتا رہا۔ اس رات سوئے کے بعد دوسری صبح نئی زندگی کا نیا سورج دیکھنے والا تھا۔

☆☆☆

انٹیلی جنس والے ان خونخوار کتوں کے متعلق معلومات حاصل کر رہے تھے۔ یہ پتا چلا کہ ہلاک ہونے والے کتوں کو اسلام آباد سے لایا گیا تھا۔ ان کے مالک اور ٹریڈ کا پتا ٹھکانا معلوم ہو رہا تھا۔ مگر وہ بھی ہلاک ہو چکے تھے۔ یہ بتانے والا کوئی نہیں تھا کہ دوسری واسطو بڑیوں کے لیے کام کر رہے تھے۔

دوسری طرف پولیس والے مراد اور سلطان کی جان کو آگئے تھے۔ منور اور نادر شاہ کی بیویوں اور جواں اولاد نے بیان دیا تھا کہ اس خاندان میں وراثت کا جھگڑا چل رہا ہے۔ اس جھگڑے کے نتیجے میں مراد اور سلطان نے نادر کو ہلاک کر لیا ہے اور منور کو اغوا کر کے کہیں قیدی بنا کر رکھا ہے یا اس کی لاش چھپا دی گئی ہے۔

ایسے بیانات کے بعد مراد اور سلطان کی گرفتاری لازمی تھی۔ مگر وہ خفایت نامہ کی از گرفتاری حاصل کر چکے تھے۔ اگرچہ قانونی کٹنگے میں نہیں آئے تھے۔ لیکن پولیس اور انٹیلی جنس والے دن رات ان کی نگرانی کر رہے تھے اور ان کے ذاتی معاملات میں مداخلت کر رہے تھے۔

دو کتے اور تین انسان پر اسرار طریقے سے مارے گئے تھے اور منور لاپتہ تھا۔ یہ ایسا حکمین معاملہ تھا کہ پولیس والے ندرشوت

لے رہے تھے شان دونوں بھائیوں کا پیچھا چھوڑ رہے تھے۔
مراد نے فون پر مجھے مخاطب کیا اور کہا۔ ”بابا جانی!
آپ کو معلوم ہو چکا ہوگا کہ نادر شاہ مارا گیا ہے اور سنور نہیں
غائب ہو گیا ہے۔ ان کی بیویوں اور بچوں نے ہمارے خلاف
بیان دیا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”بیان دینے سے کیا ہوتا ہے؟ نہ تم نے
وہ واردات کی ہے۔ نہ تمہارے خلاف کوئی چشم دید گواہ ہے۔
تمہیں کوئی عدالت سزا نہیں دے سکے گی۔“
”یہ سزا نہیں کیا تمہیں کی کہ ہم پیشیاں جھگڑتے رہیں گے؟
خواتین اپنے بھائی اور بہنوئی کے قاتل کہلاتے رہیں گے۔“

میں نے کہا۔ ”تجربہ ہے باپ کو قتل کرانے کا منصوبہ
بناتے وقت اور انہیں کراتے وقت نہ کسی طرح کی شرم تھی نہ
پریشانی۔ اب کچھ نہ کر کے پریشان ہو رہے ہو؟“

”آپ شرمندہ نہ کریں۔ اب تو میں اور سلطان آپ کا
اعتماد حاصل کرتے۔ آپ کی تمام پونجی کے وارث بننے کے
لیے بھائی اور بہنوئی کو راستے سے ہٹا دینا چاہتے تھے۔
مگر تقدیر ہم پر مہربان ہے۔ ایک تو خود ہی جہنم میں چلا گیا۔
منور بھائی بھی شاید مر چکے ہیں۔ اگر نہیں تو ہمارے ہاتھوں
مرنے کے لیے کہیں سائیں لے رہے ہوں گے۔“

وہ اپنے باپ کے سامنے بے جھجک کہہ رہا تھا کہ
میرے ایک بیٹے کو مار ڈالے گا۔ منور نے بھی اٹھوٹا وارث
بننے کے لیے یہی کہا تھا۔ جن خاندانوں میں دولت اور اقتدار
کی جنگیں لڑی جاتی ہیں۔ وہاں باپ بیٹے اور بھائی بھائی کھلی
جان لیوا دشمنی کرتے ہیں۔ یہ ہماری ہزار ہا صدیوں کی تاریخی
سچائی ہے۔

میں نے کہا۔ ”تمہیں یہ سن کر افسوس ہوگا کہ میرے
خیالات میرے ارادے بدل گئے ہیں۔ میں اپنی کمائی کا جتنا
حصہ تمام اولاد کو دے چکا ہوں۔ اس کے بعد ایک پھوٹی
کوڑی بھی نہیں دوں گا۔“

اس نے بیٹنی سے پوچھا۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“
”جو سن رہے ہو وہی کہہ رہا ہوں۔“

اس نے جیسے تپ کر پوچھا۔ ”اور وہ خزانہ...؟“
”اسے میں خدا کے سپرد کر چکا ہوں۔“

”آپ تو زبان کے سچے اور کھرے تھے۔ وہ سچائی کیا
ہوئی؟ کیوں وعدہ کر کے مکر رہے ہیں؟“

”جہاں خزانہ چھپایا گیا تھا وہ زمین مکر رہی ہے۔ وہ
خزانہ اب وہاں نہیں ہے۔ اندر ہی اندر جگہ بدل چکا ہے۔“
”آپ فضول چکا نہ باتیں کر رہے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”کیا تم نے سنا نہیں پڑھا نہیں کہ اللہ
تعالیٰ نے کتنے خزانے زمین میں چھپا رکھے ہیں؟“
”آپ اپنے خزانے کی بات کریں۔“

میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔
”ایک حدیث سنو... حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں رسول اللہ
ﷺ نے فرمایا کہ جلد ہی وہ زمانہ آنے والا ہے جب دریائے
فرات سونے کا خزانہ برآمد کرے گا۔ یعنی اس کا پانی خشک
ہو جائے گا اور اس کے نیچے سے سونے کا خزانہ برآمد ہوگا۔
پس جو شخص وہاں موجود ہو۔ اس کو چاہے کہ اس خزانے میں
سے کچھ نہ لے۔“

مراد نے جھنجھلا کر کہا۔ ”یہ کسی احمقانہ بات ہے کہ خزانہ
آنکھوں کے سامنے ہوا اور کوئی اس میں سے کچھ نہ لے؟“

”اس حدیث میں تم جیسوں کے لیے سبق ہے... اور
حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ
قیامت اس وقت تک نہیں آئے گی جب تک دریائے فرات
سونے کا پہاڑ برآمد نہیں کرے گا۔ لوگ اس کی وجہ سے یعنی
اس دولت کو حاصل کرنے اور اسے اپنے قبضے میں لینے کے
لیے جنگ و جدل اور قتل کریں گے۔ پس ان میں سے
ننانوے فیصد مارے جائیں گے اور چھ فیصد بچیں گے۔
میں زندہ بچ جاؤں اور مقصد میں کامیاب ہو جاؤں۔ یعنی ہر
فصل اس موقع پر لڑے گا کہ شاید میں ہی کامیابی حاصل
کروں اور اس دولت پر قبضہ ہو جاؤں۔ اگرچہ ننانوے فیصد
لوگ اس موقع میں اپنی جان کھو بیٹھیں گے۔ (مسلم)“

میں فون پر یوں رہا تھا۔ وہ سن رہا تھا۔ میں نے کہا۔
”کیا تم دیکھ نہیں رہے ہو؟ خزانہ حاصل کرنے کے لیے تم نے
باپ کے نطفے کو پانی کر دیا؟ مجھے ہلاک نہ کر سکے۔ اب
بھائی ہو کر اپنے نئے بھائی کو اس موقع پر ہلاک کر دے گا سب
مر جائیں گے۔ آخر کار وہ سونا وہ خزانہ تمہارے ہی حصے میں
آئے گا۔“

”آپ فضول قصے کہانیاں سنا کر بچوں کی طرح
بہلا رہے ہیں۔ آپ بہت گہرے ہیں بابا جانی! یقیناً وہ خزانہ
کسی خاص مقصد کے لیے چھپا رکھا ہے؟ پتا نہیں آپ نے کتنی
شادیاں کی ہیں اور کتنی اولادیں ہیں؟ جن کی خاطر خزانے پر
سانپ بن کر بیٹھ گئے ہیں۔“

سلطان نے اس سے فون لے کر کہا۔ ”آپ آخری
فیصلہ سنا دیں۔ خزانے کے سلسلے میں کیا کر رہے ہیں؟ اسے
کس کے حوالے کریں گے؟“

میں نے کہا۔ ”میں دیا مقداری سے ایک نئی زندگی

شروع کر رہا ہوں۔ خیر خزانے سے ضرورت کے مطابق کچھ
لیتا رہوں گا۔ باقی کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ وہ جہاں ہے وہیں
رہے گا۔“

”آپ باطل ہو گئے ہیں۔ کیسے مان لیں کہ اسے ہاتھ
نہیں لگائیں گے؟“

”نہ مانو۔ پہلے میری مخالفت کر کے تم لوگوں نے کیا پایا
ہے جو آئندہ کچھ پائو گے؟ میری ایک بیٹی اور تین داماد مر چکے
ہیں۔ ایک بڑا بیٹا آدھا زندہ آدھا مردہ ہے۔ تمہارا اور مراد
کا بھی کچھ ایسا ہی انجام ہوگا۔“

سلطان نے ہیلو ہیلو کیا۔ پھر فون کو دیکھ کر جھنجھلا
تے ہوئے اسے بند کر دیا۔ مراد نے کہا۔ ”متم کھا کر کہہ سکتا ہوں!
بڑے میاں نے دو چار شادیاں کی ہیں۔ ان عورتوں سے
ہونے والی اولاد کو اپنا سب کچھ دینے کے لیے ہمیں دھتکار
رہے ہیں۔“

سلطان نے کہا۔ ”اور میں تم کھا کر کہتا ہوں! یہ بڑھا
ہمارا باپ نہیں ہے۔ ماں زندہ ہوئی تو پوچھتے۔ ہماری اصل نسل
کیا ہے؟“

”اصل نسل پر خاک ڈالو۔ خزانے کی بات کرو۔ یہ
بڑھا ہمیں اس کی بوجھ میں لگنے نہیں دے گا۔ پتا نہیں اس نے
اسے کہاں چھپا کر رکھا ہے؟“

سلطان پاؤں پٹختا ہوا اور اسے اصرار جاتے ہوئے
بولاً۔ ”اسے دو بار غوا کر لیا گیا۔ مضر رساں دوا میں کھلا کر کمزور
بنایا گیا۔ اسید کی دہ نیم مردہ ہو کر زندگی کی جھجک مانگے گا اور
ہمیں مدفون خزانے تک پہنچا دے گا مگر وہ تو شیطان ہے۔
مرتے مرتے اٹھ بیٹھا ہے۔“

”جھنجھلانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ کوئی تدبیر سوچو۔“
”تمام تدبیریں خاک ہو چکی ہیں۔ اب تو ہماری عقل
نے کام کرنا بھی چھوڑ دیا ہے۔“

مراد نے کہا۔ ”آرام سے بیٹھو اور سنو! ہم بابا جانی کو
جسمانی طور پر کمزور نہ بنا سکے۔ اگر ان کی ایک آدھ کمزوریاں
ہمارے ہاتھ آئیں گی تو ہم انہیں مجبور کر سکیں گے۔“

سلطان اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے
بیٹھ گیا۔ مراد نے کہا۔ ”ان کی کوئی ایسی زبردست کمزوری
ہمیں مل جائے کہ وہ ہمارے آگے گھٹنے جھکنے پر مجبور ہو
جائیں۔ سوچو... بابا جانی جیسے عیش و عشرت میں ڈوبے رہنے
والے بڑی بڑی غلطیاں کرتے ہی رہتے ہیں۔“

وہ دونوں سوچنے لگے کہ میں کتنے مالک میں جاتا رہا
ہوں؟ اور اکثر ایسا مصروف رہا ہوں کہ برسوں گزر جاتے

تھے اور انہیں میری خبر نہیں ملتی تھی۔ انہیں یہ معلوم نہیں ہوتا تھا
کہ میں ان سے دور لا پتہ کر کسی زندگی گزار رہا ہوں؟
سلطان نے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد کہا۔ ”میں نے
بابا جانی کو ایک آدھ بار ڈائری لکھتے دیکھا ہے۔ اگر ان کی
ایک ڈائری بھی مل جائے تو اسے پڑھ کر ان کے بہت سے
خفیہ معاملات اور بہت سی اہم باتیں معلوم ہو سکیں گی۔“

”ان کی گھبرگ والی کوئی پچھلے دس ماہ سے بند پڑی ہے۔
اگر ہم اندر جائیں اور بیڈروم میں چھٹی کیس تو ان کی الماری سے
ڈائری کے علاوہ اور بھی بہت کچھ حاصل کر سکیں گے۔“

”ہم نے کئی بار ادھر سے گزرتے ہوئے دیکھا ہے۔
کوٹھی کے احاطے میں ایک چوکیدار اور گیٹ پر ایک سکیورٹی
گارد دکھائی دیتا ہے۔ وہ دس مہینوں میں مطمئن ہو گئے ہوں
گے کہ ادھر نہ کسی رشتے دار کو آتا ہے اور نہ اب تک کوئی چور
ڈاکو آیا ہے نہ آئے گا۔ یقیناً وہ ڈیوٹی دینے والے رات کو سو
جاتے ہوں گے۔“

”ان کی فکر نہیں ہے۔ جاتے رہیں گے تو ہم انہیں ہمیشہ
کی نیند سلا دیں گے۔ ہمارے ریلوے اور سے سائیکس لگا رہے گا۔
بے آواز فائر کر کے دروازوں کے لاک توڑ سکیں گے۔“

وہ اب میری کسی ایک کمزوری تک جھنجھنے کے لیے بے
چین تھے۔ اپنے باپ کے گھر میں چوری کرنے کی پلاننگ
کے ایک ایک پہلو پر غور کر رہے تھے۔ پھر انہوں نے فیصلہ
کر لیا کہ آج رات ہی یہ نیک کام کر گزریں گے۔

وہ اسی وقت واردات کے لیے تیار یاں کرنے لگے۔
مراد نے کہا۔ ”وہ بڑھا جہاں بھی ہے بڑے آرام اور سکون
سے ہے۔ ہمیں اس کا سکون برباد کرنا چاہیے۔“

مراد نے پوچھا۔ ”اب کیا ارادہ ہے؟“
”اٹلی جنس والے ہمارے پیچھے پڑے ہیں۔ ہم
کیوں نہ انہیں بڑے میاں کے پیچھے لگا دیں؟“

”کس طرح پیچھے لگاؤ گے؟ کوئی نہیں جانتا کہ وہ کہاں
چھپے ہوئے ہیں؟“

”ان کا فون غمیر تو معلوم ہے۔ اٹلی جنس والے اس
نمبر کے ذریعے ان کی خفیہ پناہ گاہ کا پتا لگاتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے پتا نہ بھی لگے تو فون کے ذریعے ان کا
سکون غارت کرتے رہیں گے۔“

سلطان نے اٹلی جنس کے ایک افسر سے رابطہ کیا۔
پھر کہا۔ ”رانا صاحب! میں سلطان غازی بول رہا ہوں۔
آپ تو ہمارے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ اصلی قاتل کو باطل ہی
نظر انداز کر رہے ہیں۔“

”کون ہے اصلی قاتل؟“

”ایک ادب پتی سونے کا بیوہ پاری ہے۔“
”سونے کے بیوہ پاری تو تمہارے والد محترم بھی ہیں؟“
”میں اسی محترم اور معزز کہلانے والے باپ کے خلاف زبان کھولنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ وہ اپنے داماد اور شاہ سے نفرت کرتے تھے۔ انہوں نے ہی اسے ہلاک کرایا۔ جب آپ انہیں گرفتار کریں گے تو اندر کی بہت سی باتیں سامنے آئیں گی۔“

”اگر انہوں نے داماد کو قتل کرایا ہے تو بیٹا کہاں ہے؟ منور جانے واردات پر تار شاہ کے ساتھ تھا۔“
”منور حقیقتاً تار کو بچائیں کر فارم ہاؤس لے گیا تھا۔ یہ ہمارے باپ کی پلائنگ تھی۔ انہوں نے ہی منور کو کہیں چھپا رکھا ہے۔“

”یہ باتیں تم کیسے جانتے ہو؟“
”ابھی تو ڈیڑھ پہلے بابا جانی نے مجھ سے اور مراد بھائی سے فون پر باتیں کیں اور دھمکیاں دی تھیں کہ وہ تار کی طرح ہمیں بھی تھکانے لگا دیں گے۔“

”اسفر نے کہا۔“ یہ بات حلق سے نہیں اتر رہی ہے کہ ایک ہوش مند باپ اپنے بیٹے کو قتل کرنا کتنا جاہل ہے؟“
”جی ہاں۔ باپ بیٹے کا رشتہ ایسا ہے کہ کوئی یقین نہیں کرے گا۔ مگر حقیقت اس تصور کے برعکس ہے۔ اگر آپ ہمارے خاندانی معاملے کو راز میں رکھیں گے تو میں ایک کڑوی حقیقت آپ کو بتانا چاہوں گا۔“

”میں وعدہ کرتا ہوں تمہارا خاندانی معاملہ راز میں رہے گا۔“

سلطان فون پر ایک گہری سانس چھوڑتے ہوئے بولا۔
”میں اور مراد بھائی بابا جانی کی اولاد نہیں ہیں۔ انہوں نے فون پر صاف صاف کہہ دیا ہے ہم دونوں بھائی ان کے نطفے سے نہیں ہیں۔ وہ ہماری ماں کی بہت بڑی غلطی کو اب تک برداشت کرتے آئے ہیں۔ اب نہیں کریں گے۔ انہوں نے ہمیں ایک بیٹے کی مہلت دی ہے اور کہا ہے کہ ہم لندن والی رہائش گاہ میں چلے جائیں۔ ابھی اس خاندان میں واپس نہ آئیں۔ اگر آگئے تو پھر نادری طرح اپنی موت کا انتظار کریں۔“
اسفر نے قائل ہو کر کہا۔ ”اب یقین ہو رہا ہے۔ تم نے ایسی شرمناک حقیقت بتائی ہے جو کوئی نہ بتاتا۔ تمہاری سچائی نے مجھے متاثر کیا ہے۔ میں تمہاری شرمناک سچائی کا راز دار بن کر رہوں گا۔“

سلطان نے مسکرا کر مراد کو آنکھ ماری پھر کہا۔ ”رانا صاحب!

ان کا فون نمبر میں نے سبوتا کیا ہے۔ آپ نوٹ کر لیں۔“
اس نے نمبر جتاتے کر رابطہ ختم کر دیا۔ پھر مراد سے کہا۔
”چلو نکلو یہاں سے۔ آج ہم اس بڑے کی لکھی سے کچھ نہ کچھ ضرور حاصل کر لیں گے۔ پتا نہیں وہ کس خفیہ پناہ گاہ میں سوراہا ہوگا؟ ابھی رانا صاحب اس کی نیندیں اڑائیں گے۔“
میں واقعی گہری نیند میں تھا۔ مختصر سی نیند سے اٹھ کر تہجد کی نماز پڑھنے والا تھا۔ ایسے وقت فون کے بزنر نے جگا دیا۔ خیال آیا کہ شرارہ نیاز بیک ٹھوکر پٹخ مچی ہوگی۔ وہاں سے بہن کے ساتھ واپس آ رہی ہوگی۔ وہی کسی ضرورت سے کال کر رہی ہے۔

میں نے فون اٹھا کر دیکھا تو انجانے نمبر تھے۔ کوئی پہلی بار مجھے کال کر رہا تھا۔ میں نے اسے کان سے لگا کر پوچھا۔ ”ہیلو فرمائیے۔“

دوسری طرف سے پوچھا گیا۔ ”آپ عمیر بن غازی بول رہے ہیں؟“

”جی ہاں۔ آپ کون ہیں؟ رات کے ایک بجے مجھے کیوں یاد کر رہے ہیں؟“

”ہماری نوکری ہی ایسی ہے۔ کبھی کبھی آپ جیسے معزز افراد کی نیندیں خراب کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ میں اسٹیج جس کا چیف رانا دلاشاہد بول رہا ہوں۔“
میں نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ ”فرمائیے میں آپ کے کس کام آ سکتا ہوں؟“

”تین دن پہلے جی سر رضا قریشی نے آپ کے اغوا ہونے کی رپورٹ درج کرانی تھی۔ ہم آپ کو تلاش کرتے رہے ہیں۔ پچھلے دس مہینوں کی میڈیکل رپورٹ کے مطابق آپ ستر برس کے بوڑھے ہیں۔ طرح طرح کی بیماریوں نے آپ کو نیم مردہ بنا دیا ہے۔ آپ اٹھنے بیٹھنے کے قابل بھی نہیں ہیں۔“

”جی ہاں۔ یہ درست ہے۔“

”پھر آپ اس جگہ سے کیسے فرار ہو گئے؟ جہاں آپ کو اغوا کر کے لے جایا گیا تھا؟“

”جہاں مجھے لے جایا گیا تھا۔ وہاں دو پارٹیوں کے درمیان زبردست فائرنگ ہو رہی تھی۔ ایسے وقت میرے وفادار جاں نثار لڑکے تھے جو مجھے وہاں سے نکال کر یہاں لے آئے ہیں۔“

”یہاں یعنی کہاں؟ ہم قانون کے محافظ ہیں۔ آپ کو بھرپور سیکورٹی فراہم کریں گے۔ ہمیں اپنے پاس بلائیں۔“

میں نے کہا۔ ”مجھے دو بار اغوا کیا گیا۔ پولیس اور اسٹیج جنس والوں نے میرے لیے کیا کیا؟“

”آپ کی شکایت بجا ہے۔ مگر سارے پولیس والے اور جاسوس تامل نہیں ہوتے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں۔ میری گھرائی میں آپ پر آنچ نہیں آئے گی۔“

”یعنی پھر قانون کے محافظوں پر بھروسہ کروں اور تیسری بار دشمنوں کے ہاتھ لگ کر موت کے گھاٹ اتر جاؤں؟“

”آپ دشمنوں کی نشان دہی کریں۔ میں ان سے نمٹ کر آپ کا اعتماد حاصل کروں گا۔“

میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ ”دشمن میرے اپنے گھر میں ہیں۔ ان سے میں خود نمٹ رہا ہوں۔ آپ کی کارکردگی کو آزمانے کے لیے انڈیا سے آئے ہوئے ایک دشمن کے بارے میں بتا رہا ہوں۔ اس کا نام سری واستو بڑ بولا ہے۔ وہ اپنے دس دس سونے کا ایک ادب پتی بیوہ پاری کہلاتا ہے۔ مگر حقیقتاً ایک اسمگلر ہے۔“

رانا دلاشاہد نے کہا۔ ”معاف کیجئے گا؟ آپ کے متعلق بھی یہی کہا جاتا ہے۔ مگر کوئی ثبوت نہ ملنے کے باعث آپ پر ہاتھ نہیں ڈالا جا رہا ہے۔“

”آپ کتنے عرصے سے میرے خلاف مواد تلاش کر رہے ہیں؟“

اس نے کہا۔ ”پچھلے پانچ برسوں سے۔“

”یعنی پچھلے پانچ برسوں سے ناکام ہو رہے ہیں؟ ایک بھی ثبوت نہیں ملا۔ مان لیں کہ میں اسمگلر نہیں ہوں یا پھر آپ کی کارکردگی ناقص ہے۔ اپنی ناک کے نیچے جرم کرنے والے کو پکڑ نہیں پارے ہیں۔ پھر ایک بیمار اور بوڑھے کی حفاظت کیسے کریں گے؟“

”میں بحث نہیں کروں گا۔ آپ انڈیا سے آنے والے سری واستو کے متعلق بتائیں؟“

”میں اتنی ہی جانتا ہوں کہ وہ اسلام آباد میں ہے۔ مجھے تلاش کیے اور لے کیے بغیر اس ملک سے نہیں جائے گا۔“

میں نے اس کا فون نمبر بتاتے ہوئے کہا۔ ”میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا، کیا فون بند کر سکتا ہوں؟“

”نہیں۔ ابھی فٹیش جاری ہے۔ چند سوالات دہ گئے ہیں۔“

”باقی سوالات آپ دن میں کسی بھی وقت کر سکتے ہیں۔“

”پلیز۔ میں زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ یہ بتائیں آپ کا بڑا بیٹا منور کہاں ہے؟“

میں ذرا چپ رہا۔ ابھی تہجد کی نماز پڑھنے والا تھا۔ اگر اپنی کسی بے گناہ کی جان بچانی ہو تو شیطان صفت لوگوں

سے جھوٹ بولا جاسکتا ہے۔ رانا دلاشاہد شیطان نہیں تھا۔ اپنے فرائض کی ادائیگی کے لیے کچھ معلومات چاہتا تھا۔

میں نے جھوٹ سے توبہ کی اور سچ کہا۔ ”داؤد اسپتال میں بڑی رازداری سے اس کا علاج کیا جا رہا ہے۔“

”واردات کے وقت وہ فارم ہاؤس میں تار شاہ کے ساتھ تھا۔ پھر اسپتال کیسے پہنچ گیا؟“

”آپ کو تمام سوالات کے جوابات وہاں مل جائیں گے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں ابھی اس اسپتال میں سچ جھاؤں گا۔ ڈاکٹر داؤد کو ڈاکٹر وکٹن بھی کہا جاتا ہے۔“

”جی ہاں۔ وہ اسی نام سے مشہور ہوتا جا رہا ہے۔“

”اس کے متعلق بھی کوئی اچھی رپورٹ نہیں ہے۔ وہ ہماری بلیک لسٹ میں ہے۔ ہائی داؤے۔ آپ نے ابھی کہا ہے کہ میں آپ کے گھر میں ہیں اور ان سے آپ نمٹ رہے ہیں؟“

”ہاں۔ ابھی میں نے یہی کہا ہے۔“

”اور آپ نے انہیں دھمکی دی ہے کہ وہ لندن والی رہائش گاہ میں نہیں جائیں گے تو آپ انہیں موت کے گھاٹ اتار دیں گے؟“

”آپ ایسی بے سچی باتیں کیوں کر رہے ہیں؟ میں نے کسی کو دھمکی نہیں دی ہے۔“

”کیا آپ نے ابھی سلطان غازی سے فون پر باتیں نہیں کی تھیں؟“

”میں نے سونے سے پہلے مراد اور سلطان دونوں سے باتیں کی تھیں۔“

”اور آپ ان دونوں کو دشمن سمجھتے ہیں؟“

”میں انہیں دشمن سمجھوں یا نہ سمجھوں مگر ایک باپ ہوں۔ اپنے بیٹوں کو مار ڈالنے کی بات کبھی نہیں کروں گا۔“

رانا نے کہا۔ ”یہ آپ کی گھریلو اور ازادواجی زندگی کا راز ہے۔ میں نے سلطان سے وعدہ کیا ہے کہ اپنی تفصیلی رپورٹ میں اس سچ حقیقت کا ذکر نہیں کروں گا۔“

”کون سی سچ حقیقت؟“

”یہی کہ مراد اور سلطان آپ کے اپنے بیٹے نہیں ہیں۔ آپ کی وائف کی بد چلنی کا نتیجہ۔“

بات پوری ہونے سے پہلے ہی میں نے دھاڑتے ہوئے کہا۔ ”یو شٹ اپ ناں سنس۔ تم نے میری پاکباز مرحوم شریک حیات پر بکچر اچھالنے کی جرات کیسے کی؟“

”میں نے جرات نہیں کی ہے۔ آپ کے صاحبزادے سلطان نے ابھی فون پر بتایا ہے کہ وہ اور مراد آپ کے نطفے سے نہیں ہیں۔ اگر اس نے جھوٹ کہا ہے اور مجھے گمراہ کیا ہے

تو میں اللہ تعالیٰ سے معافی چاہتا ہوں۔ میں نے دانستہ ایک ماں کے تقدس کو نہیں سمجھا تھا۔ جبکہ آپ کے صاحبزادے نے یہ بچہ اچھا کیا ہے۔

میں نے ذرا نرم ہو کر کہا۔ ”سوری رانا صاحب! مجھے غصے میں سخت لپچہ اختیار نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں چاہوں گا“ آپ میری سچائی کا یقین کرنے کے لیے ہم باپ بیٹوں کی ڈی این اے رپورٹ حاصل کریں۔ تب دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔“

”غازی صاحب! مجھے یقین ہے“ آپ سچ کہہ رہے ہیں۔ البتہ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ وہ بیٹے آپ کے خلاف زہریلوں اگل رہے ہیں؟“

”صرف اس لیے کہ میں اپنی دولت اور جائیداد میں سے اپنی اولاد کو بچتا دے چکا ہوں۔ اس سے زیادہ ایک کوڑی بھی نہیں دینا چاہتا اور میرے اسی اہل فیصلے نے انہیں میرا دشمن بنا دیا ہے۔“

”ہاں۔ یہ بات سمجھ میں آرہی ہے۔ میں مراد اور سلطان کا محاسبہ کروں گا۔ فی الحال آپ آرام کریں۔ ضرورت ہوئی تو دوسرے دن رابطہ کروں گا۔“

میں نے فون بند کر دیا۔ مجھے یہ سوچ کر غصہ آ رہا تھا کہ انسان دولت حاصل کرنے کے لیے کیوں اتنا کر جاتا ہے کہ اپنی مرحوم ماں کی پارسا پر بچہ اچھا لے ہوئے اسے شرم نہیں آتی؟ لغت ہے ایسی اولاد پر۔ میں نے طے کر لیا کہ ان دونوں کو بڑی عمر تک سیرائیں دوں گا۔

میں نے گھڑی دیکھی۔ تھپہ پڑنے کے بعد سونے کا ارادہ تھا۔ ایسے وقت پھر فون کا بزر بولنے لگا۔ میں نے نمبر پڑھے تو دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ خوشبو کا ایک جھونکا سا آیا۔ شرارہ کا لہجہ ہی تھا۔ میں نے فون کو کان سے لگا کر کہا۔ ”ہاں بولو کیا کھینچ رہی ہیں؟“

”جی ہاں۔ اب بہن کے ساتھ واپس آرہی ہوں۔ گھر پر والی کو بھی تو بہت بڑی ہوگی؟ کیا میں چھوٹی بہن کے ساتھ وہاں تنہا رہ سکوں گی؟“

”تمہیں رہا نہیں ہوگی کوئی کے باہر ایک چوکیدار اور ایک سیکورٹی گارڈ ڈیوٹی پر رہتے ہیں۔ اندر میرا ایک جاں نثار رہے گا۔ دوسرے دن دو چار نوکر اور نوکرانوں کا بندوبست ہو جائے گا۔“

”آپ بہت اچھے ہیں۔ آپ کی شان میں کچھ کہنے کے لیے الفاظ نہیں مل رہے ہیں۔ مجھے یہ سب کچھ جمل رہا ہے خواب سا لگ رہا ہے۔“

”رفتہ رفتہ یقین ہو جائے گا کہ یہ خواب نہیں تعبیر ہے۔“

”آپ شاید سو رہے تھے؟“

”نہیں۔ تھپہ پڑنے جا رہا تھا۔“

”پھر تو فون بند کرنا چاہیے۔“

”ایسی جلدی بھی نہیں ہے۔ تم نے اپنی بہن کا نہ تعارف کرایا ہے نہ متا یا ہے۔“

”میں انہی بتانے والی تھی۔“

”نہ بتاؤ فون اسے دو۔“

چند ساعتوں تک خاموشی رہی۔ پھر ایک بچی کی مترنم آواز سنائی دی۔ ”بیلا السلام علیکم۔“

میں نے کہا۔ ”علیکم السلام۔ میں اس وقت کس سے بات کر رہا ہوں؟“

”آپ اندازے میں کر رہے ہیں۔“

”صرف دعا؟ یہ تو بہت تنہا سا چھوٹا سا نام ہے؟“

”میرا بڑا نام ہے۔ ندرانی بنت خیر دین ولد میر دین ولد دین محمد ولد۔“

میں نے کہا۔ ”بس بس بس۔ اگر بریک نہ لگائی جائے تو یہ نام پھلتا پھولتا چلا جائے گا۔“

شرارہ نے اس کا کان پکڑ لیا۔ اپنی ہنسی روکتے ہوئے بولی۔ ”شر کر گئیں گی کیوں کہوں سے اس طرح مذاق کرتے ہیں؟“

میں نے کہا۔ ”ندرا اپنی بائی سے کہو! مجھے زندہ دلی پسند ہے۔“

اس نے کہا۔ ”یہ کہہ رہے ہیں انہیں پسند ہے۔“

شرارہ نے پوچھا۔ ”کیا پسند ہے؟“

وہ بولی۔ ”جانتیں؟ شاید آپ کو کہہ رہے ہیں۔“

وہ شرمانے لگی۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”تم اتنی سی عمر میں ایسی چکر باز ہو۔ ابھی ادھر سے ادھر جاتے جاتے بات سمجھاؤ۔“

وہ بولی۔ ”میں نے اپنی طرف سے کچھ نہیں کہا ہے۔ باجی جب سے آئی ہیں آپ ہی کے کن گارڈ ہیں۔ آپ مسجائیں عظیم انسان ہیں فرشتہ ہیں۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ آپ انسان ہیں تو فرشتہ کیسے ہو گئے؟ اگر فرشتہ ہیں تو انسان تو نہ ہوئے ناں؟“

شرارہ نے اس سے فون چھین کر کہا۔ ”ہیلو! میں تیری پٹائی کروں گی۔ ان کے آگے میرا سر جھکا ہے۔ ان سے کہتی ہے کہ انسان تو نہ ہوئے۔ چلو... معافی مانگو۔“

ندر فون واپس لے کر کچھ بولنا چاہتی تھی۔ میں نے کہا۔ ”خبردار! معافی نہ مانگنا۔ تم نے اعتراض کرنے والی

کوئی بات نہیں کی ہے۔ میں تم سے خوش ہوں۔ تمہاری باتیں سن رہا ہوں۔ بہت انجوائے کر رہا ہوں۔ تمہاری باجی مجھ سے کچھ زیادہ ہی متاثر ہو گئی ہیں۔ مجھے فرشتہ بنا کر آسمان پر پہنچا رہی ہیں۔ ان سے کہو مجھے زمین پر ہی رہنے دیں۔ میری یہ باتیں انہیں سنا دو۔“

شرارہ کی آواز سنائی دی۔ ”میں سن رہی ہوں۔ فون اس سے لے لیا ہے۔ یہ کم بخت شوخی میں آ کر بڑوں کا لحاظ کرنا بھول جاتی ہے۔“

”پلیز۔ اس کی بچکانہ شوخی کو سمجھو۔ اس نے کوئی گستاخی نہیں کی ہے۔ آئندہ اسے شوخی اور شرارت سے بچھی نہ روکنا۔ کہیں تم نے اسے ڈرلا تو نہیں دیا؟“

”یہ بڑی ڈھیٹ ہے۔ خود بھی نہیں روئے گی دوسروں کو ڈرلا دے گی۔“

میں ہنسنے لگا۔ شرارہ بھی ہنسنے لگی۔ میں نے کہا۔ ”رانی بہت پیارا نام ہے۔ تمہارا بھی ایسا ہی کوئی نام ہوتا چاہیے۔ کیا شرارہ پیدا کی نام ہے؟“

”نہیں... وہ ذرا دکھ سے بولی۔ ”میں بارہ برس کی بچی تھی۔ جب مجھے چنگاری سے شعلہ بنا دیا۔ تب میں نے اصل نام پر رد و ڈال دیا اور یہ بازار نام شرارہ رکھ لیا۔“

”اچھا کیا نام ہے؟“

”مصلی نام میرے حالات میرے کردار کے بالکل برعکس ہے۔“

”اب وہ موجودہ حالات کے مطابق درست ہوگا۔ تم میری پناہ میں آ کر عزت اور نیک نامی حاصل کرتی رہو گی۔“

وہ بولی۔ ”خدا کا شکر ہے میرا پیدا کی نام مجھے واپس مل رہا ہے۔ آج سے پھر میرا نام حجاب ہے۔ حجاب آرام۔“

”بہت پیارا نام ہے۔ آئندہ تم اپنے عمل سے کردار سے ثابت کرو گی کہ حجاب مرنا نہیں ہے۔ ذرا دھندلا جاتا ہے۔ ذرا کمزور پڑ جاتا ہے۔ سہارا تو پھر سے تازہ دم ہو جاتا ہے۔“

”آپ کی باتوں سے مجھے بہت حوصلہ ملتا ہے۔“

”اپنی پیاریوں سے بھی لڑتے رہنے کا حوصلہ کرتی رہو۔ انشاء اللہ محبت کا ملہ نصیب ہوگی۔ اچھا خدا حافظہ میں نماز پڑھتے جا رہا ہوں۔“

اب تک میں فون کو کان سے لگائے جیسے حجاب کے پاس پہنچ گیا تھا۔ رابطہ ختم ہوتے ہی اپنے کمرے میں دماغی طور پر حاضر ہو گیا۔ میری زبان نے پختارہ لیتے ہوئے کہا۔ ”میں... حجاب۔“

اُدھر وہ میری کوٹھی کی طرف جا رہی تھی۔ ادھر مراد اور سلطان وہاں پہنچ گئے تھے۔ احاطے کے بڑے کھنٹی گیٹ پر تالا لگا ہوا تھا۔ سیکورٹی گارڈ کین کے باہر کرسی پر بیٹھا آنکھیں بند کیے خراٹے لے رہا تھا۔ اس کی کن قدموں کے پاس زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ وہ دونوں دبے قدموں چلتے ہوئے اس کے پاس آ گئے۔

احاطہ ہی اس نے بڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا۔ مراد نے زمین پر پڑی ہوئی کن کو اٹھالیا۔ سلطان نے سائیکسٹر لگے رولور کی نال اس کی کپٹنی سے لگا دی۔ وہ پرانا ملازم تھا۔ دونوں کورسوں سے پہچانتا تھا۔ اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ”آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟“

مراد نے کہا۔ ”ہم تو کچھ نہ کرتے۔ تمہارے ہاتھ پاؤں باندھ کر کوٹھی کے اندر پٹے جاتے۔ مگر تم ہمیں پہچانتے ہو۔ ہم جیسے ہی یہاں سے جائیں گے۔ تم پولیس والوں کے ساتھ ہماری شامت بن کر چلے آؤ گے۔“

سلطان نے پوچھا۔ ”نہیں کوٹھی کے اندر جانے دو گے؟“

وہ عاجزی سے بولا۔ ”صاحب جی! میں کسی کو احاطے کے اندر قدم رکھنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ حکم کا بندہ ہوں۔ برسوں سے یہاں کا نمک کھا رہا ہوں۔“

سلطان نے ناگواری سے کہا۔ ”یہاں تمہارے حساب کا نمک ختم ہو چکا ہے۔ اب کوئی کھاؤ۔“

اس نے ٹیکر دیا۔ سائیکسٹر نے گولی چلنے کی آواز دیا دی۔ موت بے آواز آ کر اس تنگ حلال کو اپنے ساتھ لے گئی۔ وہ دونوں احاطے میں لان سے گزرتے ہوئے کوٹھی کے چاروں طرف گھوم کر جائزہ لینے لگے۔ چوکیدار پچھلے دروازے کے پاس نیم تاری میں سو رہا تھا۔ مراد نے کن کے دستے سے اس کے سر پر ایک ضرب لگائی۔ نیند کی حالت میں سر پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ وہ تکلیف سے کراہتے ہوئے گرا۔ پھر بیہوش ہو گیا۔

انہوں نے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے وہیں چھوڑ دیا۔ وہ ابھی طرح جانتے تھے کہ وہاں کوئی تیسرا ملازم نہیں ہے۔ پچھلے دروازے کی چٹنی باہر سے لگی تھی۔ وہ اسے کھول کر اندر آ گئے۔

انہیں معلوم تھا کہ کوٹھی کے اندر میرا بیڈ روم کہاں ہے؟ وہ دروازہ منسل تھا۔ ایک فائر کرتے ہی لاک ٹوٹ گیا۔ دروازہ کھلا اور وہ سیدھے الماری کے پاس آئے۔ دوسرے فائر سے الماری کے پت بھی کھل گئے۔ کوئی مشکل

جس میں آری تھی۔ کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔

اگرچہ حجاب اور ندرانی میرے جان نثار کے ساتھ ادھر چلا جا رہی تھیں۔ مگر پتا نہیں کب تک پہنچنے والی تھیں؟ فی الحال ان بھائیوں کو کوئی لٹکارنے والا نہیں تھا۔

انہوں نے الماری کے اندرونی سیف کو کھول کر دیکھا۔ وہاں نوٹوں کی گڈیاں اور جائداد سے تعلق رکھنے والی دستاویزات رکھی ہوئی تھیں۔ ایک ڈائری بھی دکھائی دے رہی تھی۔ مراد نے فوراً ہی لپک کر اسے اٹھالیا۔ پھر مایوس ہو کر کہا۔ ”یہ ایسے سواری کی ہے۔ تیس برس پرانی۔“

سلطان نے اسے لے کر کہا۔ ”خزانہ برسوں سے جمع کیا جا رہا ہوگا۔ اس کا ذکر اس میں ضرور ہوگا۔ ہم گھر جا کر اسے پڑھیں گے۔ ضرور کوئی کام کی بات معلوم ہوگی۔“ مراد فاقس اٹھا کر جائداد کی دستاویزات پر سرسری سی نظریں ڈال رہا تھا۔ سلطان نے کہا۔ ”جائداد کے ان کاغذات سے ہمیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ یہاں زیادہ دیر کرنا مناسب نہیں ہے۔ چلو۔“

وہ بولا۔ ”بابا جانی نے بینکوں کے لا کرز میں بہت کچھ چھپا کر رکھا ہوگا۔“ وہ کہتے کہتے چونک گیا۔ کھلی ہوئی فائل کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”یہ نقشہ کیسا ہے؟“

سلطان بھی توجہ سے دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔ ”یہ کسی عمارت کا یا شہر کا نقشہ نہیں ہے۔ یہ درمیان میں سرخ دائرہ دیکھیں۔ پیچیدہ لکیروں کے ذریعے اس دائرے تک پہنچنے کی رہنمائی کی گئی ہے۔“

مراد نے بڑے جوش اور جذبے سے کہا۔ ”ایسا لگتا ہے کسی خزانے تک رہنمائی کی گئی ہے۔“

سلطان نے فائل کو اس کے ہاتھ سے چھین کر کہا۔ ”مجھے بھی یہ خزانے کا نقشہ لگ رہا ہے۔ ان لکیروں کے ذریعے جن مقامات سے گزرتا ہے۔ وہاں کے نام بھی لکھے ہوئے ہیں۔“

”اور یہ افریقی طرز کے نام ہیں۔“

وہ بڑی جیتاری سے نقشے پر نظریں دوڑا رہے تھے۔ مراد نے ایک جگہ انگلی رکھ کر کہا۔ ”یہ دیکھو! یہاں لکھا ہے ایلاف۔۔۔۔۔۔ یہ لیبیا کے جنوب میں ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ ہمیں یاد ہے ہم یہاں چاہتے ہیں؟“

سلطان نے ہاں کے انداز میں سر ہلا کر فائل کو بند کرتے ہوئے کہا۔ ”ہاں۔ ہم نے ایک کی لاش گرائی ہے۔ دوسرے کو زخمی کیا ہے۔ ہمیں فوراً یہاں سے جانا چاہیے۔ پھر بیچ کر آرام

سے نقشے کو بھی سمجھیں گے اور ڈائری بھی پڑھیں گے۔“

سلطان کے ہاتھ میں نقشے والی فائل تھی۔ مراد نے ڈائری اپنے پاس رکھ لی تھی۔ وہ دونوں تیزی سے چلتے ہوئے پچھلے دروازے سے باہر آئے۔ ٹائٹ چوکیدار وہاں رسیوں سے بندھا پڑا تھا۔ اس وقت ہوش میں آتے ہوئے کراہ رہا تھا۔ مراد نے گن کے دستے سے پھر اس کے سر پر ضرب لگائی وہ شور مچانا چاہتا تھا۔ مگر منہ سے آواز نہ نکل سکی۔ پھر ایک بار بیہوش ہو گیا۔

وہ دونوں کوٹھی کے پچھلے حصے سے دوڑتے ہوئے اگلے حصے کی طرف جانا چاہتے تھے۔ پھر ایک دم سے ٹھک گئے۔ ایک کار اچاٹے کے آگنی گیٹ کے سامنے آ کر رک گئی تھی۔ بارن بجا کر ٹائٹ چوکیدار کوٹھی کی گاڑی کو بلایا جا رہا تھا۔ سلطان نے پریشان ہو کر کہا۔ ”جتنی رات کو یہاں کون آیا ہے؟“

مراد نے کہا۔ ”کوئی بھی آیا ہو۔ پچھلے گیٹ سے نکل چلو۔“ وہ دونوں وہاں سے بھاگتے چلے گئے۔ اگلے گیٹ کے سامنے کار رکھی ہوئی تھی۔ حجاب اور ندرانی پچھلی سیٹ پر تھیں۔ میرے جاس نثار نے پہلے بارن بجا کر چوکیدار کو بلانا چاہا تا کہ وہ آ کر گیٹ کھولے۔ جب کوئی نہ آیا تو وہ کار سے اتر گیٹ کے ساتھ والے کین میں پہنچا۔ پھر سیکیورٹی گاڑی کی لاش دیکھ کر ٹھک گیا۔

ایک دم سے دماغ نے سمجھا کہ اس پاس خطرہ ہے۔ اس نے کوٹھی کی طرف دیکھا۔ ادھر خاموشی تھی اور خاموشی طوفان کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ وہ دوڑتا ہوا کار کی اسٹیرنگ سین پر آ گیا۔ اسے اشارت کر کے آگے بڑھانے لگا۔ حجاب نے پوچھا۔ ”کیا ہوا ہم کوٹھی میں نہیں جا سکتے؟“

اس نے کہا۔ ”جسٹ آمنٹ۔ ابھی بتاتا ہوں۔“ اس نے ڈیش بورڈ سے فون اٹھا کر نمبر شیج کیے۔ میں نماز پڑھنے کے بعد سونے جا رہا تھا۔ کانگ فون سن کر رک گیا۔ فون کوکان سے لگا کر پوچھا۔ ”ہیلو عاقب! کیا گھبرگ پچھ گئے؟“

عاقب نے کہا۔ ”پہنچ تو گئے ہیں۔ لیکن یہاں گز بو ہو گئی ہے۔ کسی نے سیکیورٹی گاڑی کو گولی مار کر ہلاک کیا ہے۔“ میں نے پریشان ہو کر کہا۔ ”یا خدا! یہ کیا ہو گیا؟ جس نے اسے قتل کیا ہوگا؟“ دونوں بہنوں کو دروازوں سے دور لے جاؤ۔

”میں یہی کر رہا ہوں۔ انہیں وہاں سے دور لے آیا ہوں۔ آپ حکم دیں۔ مجھے کیا کرنا چاہیے؟“ حجاب اور ندرانی میرے پاس لے آؤ۔ یہ معلوم ہونا

چاہیے کہ میری کوٹھی میں کیا ہو رہا ہے؟ میں دوسرے جاس نثاروں کو وہاں روانہ کر رہا ہوں۔“

میں نے اس سے رابطہ ختم کیا۔ پھر دوسرے جاس نثار اعظم ثانی کو فون پر مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”گھبرگ والی کوٹھی کے سیکیورٹی گاڑی کو گولی مار کر ہلاک کیا گیا ہے۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ فوراً وہاں پہنچو اور معلوم کرو یہ واردات ڈاکوؤں نے کی ہے یا میرے ذہن وہاں گھسے ہوئے ہیں؟ پولیس والوں کے پہنچنے سے پہلے صحیح صورت حال معلوم کرو۔“

اعظم ثانی اپنے ساتھیوں کے ساتھ ادھر روانہ ہوا۔ ادھر حجاب اور ندرانی میرے پاس آئیں۔ میں چاہتا تھا حجاب میری زندگی میں ہونے والے ہنگاموں سے دور اسی کوٹھی میں رہے۔ مگر حالات پھر اسے میرے قریب لے آئے تھے۔

میں نے ندا کو پہلی بار دیکھا۔ وہ اپنی بہن سے مشابہت رکھتی تھی۔ میں نے اس کی پیشانی چوم کر حجاب سے کہا۔ ”یہ بڑی ہوئی تو بالکل تمہاری جیسی ہوئی۔“ وہ کسی خیال میں گم تھی۔ چونک کر بولی۔ ”جی۔ آپ نے کیا کہا؟“

میں نے پوچھا۔ ”تم کس سوچ میں گم ہو؟“ وہ میں سوچ رہی ہوں۔ آپ گھبرگ والی کوٹھی میں ہوئے تو کیا ہوا؟ دشمن آپ کی جان لینے آئے ہوں گے۔ آپ ان کے ہاتھ نہیں آتے تو بیچارے ملازم کی جان لے لی۔“

”میرے ساتھ یہی ہوتا ہے۔ میں کسی سے لڑنے نہیں جاتا۔ دشمن خود ہی لڑنے مرنے چلتے آتے ہیں۔ کوٹھی میں جو بھی آیا ہوگا میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔ اس نے اپنی شامت کو پکا رہا ہے۔“

ندار نے جہاں ہی لیتے ہوئے کہا۔ ”باجی! بھوک لگ رہی ہے اور تیند بھی آ رہی ہے۔“

میں نے چونک کر کہا۔ ”میں نے خیال ہی نہیں کیا کہ تم دونوں نے اب تک کچھ کھا نہیں ہوگا۔ آؤ چکن میں چلو۔“ ہم تینوں چکن میں آ گئے۔ حجاب نے کہا۔ ”آپ آرام کریں۔ میں کھانا تیار کر لوں گی۔“

میں نے کہا۔ ”میں اتنا کھا ہوں کہ دوسرے دن کے لیے بھی بچ جاتا ہے۔ تمہیں پکانا نہیں پڑے گا۔ فریق میں بہت کچھ ہے۔“

اس نے فریق سے کھانا نکال کر گرم کرتے ہوئے پوچھا۔ ”آپ کیا کھانا پسند کریں گے؟“

”میں کچھ کھا ہوں۔ مزید کھانے کی گنجائش نہیں ہے۔“

”پھر تو آپ کو سونا چاہیے۔ تین بج رہے ہیں۔ تین گھنٹے بعد پھر نماز کے لیے اٹھنا ہے۔“

”دشمن سونے کہاں دیتے ہیں؟ یہ معلوم کرنا بہت ضروری ہے کہ میری کوٹھی میں کیا ہو چکا ہے؟ اعظم ثانی میرا دست راست ہے۔ بہت ہی ذہین اور حاضر دماغ ہے۔ وہ واردات کرنے والوں کا سراغ ضرور لگائے گا۔“

تھوڑی دیر بعد ہی اس نے فون پر کہا۔ ”سر! کوٹھی کے سامنے سیکیورٹی گاڑی کی لاش پڑی ہے اور پچھلے حصے میں چوکیدار بیہوش پڑا تھا۔ اسے ہوش میں لایا گیا ہے۔ اس کی مرہم پٹی کی گئی ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ اس پر جس نے حملہ کیا تھا؟ کیونکہ وہاں نیم تار لگی تھی۔ کچھ دیکھنے دیکھنے سے پہلے ہی اس کے سر پر ضرب لگائی گئی تھی۔“

میں نے پوچھا۔ ”وہ حملہ کرنے والے کوٹھی کے اندر گئے ہوں گے؟“

”جی ہاں۔ واردات کرنے والے پیشرور چور ڈاکو نہیں ہیں۔ انہوں نے کوٹھی کے قیمتی سامان کو ہاتھ نہیں لگایا۔ وہ صرف آپ کے بیڈروم میں گئے تھے۔ انہوں نے کمرے کے قتل دروازے کے الماری کے پٹ اور سیف کے لاک کو فائرنگ کے ذریعے توڑا ہے۔“

وہ بول رہا تھا کہ الماری کی کسی چیز کو چھینا نہیں گیا ہے۔ صرف سیف کا سامان باہر بکھرا پڑا ہے۔ نوٹوں کی چار گڈیاں بھی پڑی ہوئی ہیں۔ یعنی وہاں دولت چرانے نہیں آئے تھے۔

اعظم ثانی نے کہا۔ ”آپ بتائیں سیف میں کیا کچھ تھا؟ پھر معلوم ہو سکے گا کہ یہاں سے کیا چرایا گیا ہے؟“ میں نے کہا۔ ”فائلوں کے نام اور نمبر پڑھو۔“

وہ پڑھنے لگا۔ میں نے سننے کے بعد کہا۔ ”وہ ایک فائل نمبر جی دن لے گئے ہیں۔“

اس نے کہا۔ ”یقیناً وہ آپ کے لیے اہم ہوگی۔“ ”ہاں۔ اہم تھی۔ کیا وہاں انہیں سو اسی کی ایک ڈائری ہے؟“

”جی نہیں۔ یہاں کوئی ڈائری نہیں ہے۔ اگر اسے بھی چرایا گیا ہے تو یقیناً وہ بھی اہم ہوگی؟ جناب! امیری عقل کہتی ہے کہ چرانے والے اپنے ہی گھر کے لوگ ہیں۔“

”ہاں۔ یہ واردات مراد اور سلطان نے کی ہے۔ فائل جی دن میں ایک خاص مقام تک پہنچنے کا نقشہ ہے۔ مگر وہ بیچارے اس سے کچھ حاصل نہیں کر سکیں گے۔ تم پہلے رضا قریشی کو اطلاع دو۔ تاکہ وہ ہمیں قانونی تحفظ فراہم کرے۔“

پھر پولیس والوں کو اطلاع دو۔ اپنے مسلح ساتھیوں کو وہاں سے ہٹا دو۔ میں صبح کی نماز کے بعد رابطہ کروں گا۔“

حجاب نے کہا۔ ”پلیز۔ آپ سو جائیں۔ ایک آدھ گھنٹے کی نیند ہو جائے گی۔“

میں نے وہاں سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”اچھی بات ہے۔ کل باتیں ہوں گی۔“

میں نے اپنے کمرے میں آکر دروازے کو اندر سے بند کیا۔ پھر عصا کو بیڈ پر رکھ کر اس کے ساتھ لیٹ گیا۔ وہ میرے دن رات کا ساتھی تھا۔ میں اس کے ساتھ بے خوف و خطر گہری نیند سے گزرتا رہتا تھا۔

مرد اور سلطان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ انہیں پورا یقین تھا کہ خفیہ خزانے تک پہنچنے کا نقشہ ان کے ہاتھ لگ گیا ہے۔

مراد نے کہا۔ ”کل تک بابا جانی کو معلوم ہو جائے گا کہ ان کی فائل میں ون چرائی گئی ہے۔ وہ ہم پر شرع کریں گے۔ کوٹھی کے گیٹ پر ہونے والے مزدبیس میں ہمیں اچھا نہیں لگے گا کہ ہم خزانہ حاصل کرنے کے لیے لیپڈائپ جائیں۔“

سلطان نے کہا۔ ”کسی طرح کی بھی رکاوٹ پیدا ہونے سے پہلے ہی ہم یہاں سے فلاحی کریں گے۔ ابھی اسے ٹریولنگ ایجنٹ کو فون کریں۔ کل ہم کسی بھی پہلی فلائٹ سے نکل چکیں گے۔“

سلطان کارڈ ڈرائیو کر رہا تھا۔ مراد فون پر ٹریولنگ ایجنٹ سے باتیں کرنے لگا۔ وہ ہر دو چار مہینوں میں یورپ امریکا جاتے آتے رہتے تھے۔ ایئر ویز ایجنسی والوں سے پرانے مراسم تھے۔ دوسری رات اٹھ بجے کی فلائٹ میں ان کے لیے دو تین اڈے ہوئیں۔

پھر ایک اندیشہ پیدا ہوا کہ میں ایئر پورٹ پر انہیں روک سکتا ہوں۔ مراد نے ایجنٹ سے کہا۔ ”ہم آج صبح کسی بھی فلائٹ سے کراچی جائیں گے۔ وہاں سے لیپڈائپ کے لیے روانہ ہوں گے۔ اسی حساب سے ہمارے ٹکٹ بنائے جائیں۔“

ان کے گھر پہنچنے تک حسب مشاغل تیار ہو گئے۔ دو گھنٹے بعد انہیں کراچی کے لیے روانہ ہونا تھا۔ وہ خزانہ حاصل کرنے کے لیے جوش سے بھرے ہوئے تھے۔ ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے بیویوں اور بچوں سے خزانے کا ذکر نہیں کیا۔ یہ کہہ دیا کہ چانک ضروری کام سے جا رہے ہیں۔ ان سے فون پر رابطہ رکھیں گے۔

جب میں فجر کی نماز کے بعد گہری نیند سو رہا تھا تب وہ ایک فلائٹ کے ذریعے لاہور سے کراچی روانہ ہو گئے۔ جہاز

میں آرام سے بیٹھ کر انہیں جی ون فائل کو پڑھنے اور نقشے کو اچھی طرح سمجھنے کا موقع ملا۔

وہ اسے بڑی توجہ سے پڑھنے لگے۔ پوری فائل میں خزانے کا ذکر نہیں تھا۔ ایک ٹیمیکل آئٹم کی بلیک مارکیٹنگ ڈیلنگ اور اسٹاکنگ کا ذکر تھا۔ اس نقشے کا تعلق بھی اسی ٹیمیکل آئٹم سے تھا۔

مراد نے کہا۔ ”بابا جانی بہت چالاک ہیں۔ انہوں نے کل کر خزانے کی بات نہیں کی۔ درپردہ علاقہ انداز میں ٹیمیکل آئٹم کی بات کی ہے۔“

سلطان نے کہا۔ ”بے شک۔ یہ آئٹم دوسروں کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔ مگر ہم سمجھ رہے ہیں۔ یہ بڑی مقدار میں ہے۔ اسی لیے اسے بڑی کارٹیکری سے چھپایا گیا ہے۔ اپنی یادداشت میں محفوظ رکھنے کے لیے یہ نقشہ بنایا گیا ہے۔“

وہ کراچی پہنچ گئے۔ وہاں سے تین گھنٹے بعد ایک فلائٹ سے قاہرہ جانے والے تھے۔ پھر وہاں سے دوسری فلائٹ کے ذریعے لیپڈائپ کے شہر طرابلس پہنچ کر بائی روڈ الحاف شہر کی طرف جاتا تھا۔ اس کے بعد فائل جی ون کے نقشے کے مطابق سفر شروع ہونے والا تھا۔

وہ دونوں میری طرف سے اندیشوں میں مبتلا تھے۔ مراد نے فون کے ذریعے اپنی بیوی صفیہ کو مخاطب کیا۔ ”ہیلو میں یوں رہا ہوں۔ وہاں سب خیریت ہے نا؟“

صفیہ نے کہا۔ ”خیریت نہیں ہے۔ وہ اٹھلی جنس والا رانا وٹا د احمد آپ کو اور سلطان بھائی کو گرفتار کرنے آیا تھا۔ میں نے کہہ دیا۔ آپ دونوں بھائی بچڑی گئے ہیں۔ میں آپ کو بار بار فون کرتی رہی۔ اس افسر نے بھی رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ مگر آپ کا وہ فون نمبر بند پڑا ہے۔ یہ سب نمبر سے ابھی بات کر رہے ہیں۔“

”ہاں۔ یہ نمبر کسی کو نہ بتانا۔ ابھی بات کرتے ہی اسے مٹا دینا۔ کیا اس افسر نے بتایا ہے کہ کس جرم میں ہمیں گرفتار کرنا چاہتا تھا؟“

صفیہ نے کہا۔ ”بابا جانی کی کوٹھی کا سیکورٹی گارڈ مارا گیا ہے۔ انہوں نے ایک باپ ہو کر بیٹوں کا لٹا لٹا کر لیا۔ آپ دونوں کے خلاف بیان دیا ہے۔ یہ کہا ہے کہ گارڈ کو ہلاک کرنے کے بعد آپ ان کے سیف سے اہم دستاویزات چرا کر لے گئے ہیں۔“

مراد نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”ہم سناپ نہیں ہیں۔ مگر بابا جانی کے لیے یہ کیا بات درست ہے کہ سناپ نکل گئے ہیں۔ وہ لکیر پٹیتے رہیں گے۔ مگر ہمیں اپنی منزل تک پہنچنے سے روک

نہیں پائیں گے۔ تم فکر نہ کرو ہم خیریت سے ہیں اور خیریت سے ہی رہیں گے۔“

اس نے فون بند کر دیا۔ سلطان بھی کان لگائے سن رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”بابا جانی اب ہمارے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ ہمیں سوئے تک پہنچنے میں دیں گے۔ پتا نہیں رکاوٹ پیدا کرنے کے لیے کیسے حربے استعمال کریں گے؟“

”ہم نادان نہیں ہیں۔ لیپڈائپ کرتے نہیں رہیں گے۔ ہماری حفاظت کے لیے کرائے کے جنگجو فائل ہمارے ساتھ رہیں گے۔ ہم بابا جانی کو دھمکی دیں گے کہ انہوں نے ہمارا راستہ روکا تو ہم خزانے کا بھید کھول دیں گے۔ خزانے کا نقشہ لیپڈائپ کے اعلیٰ حکام تک پہنچا دیں گے۔“

سلطان نے کہا۔ ”یہ زبردست دھمکی ہوگی۔ بابا جانی کو ہم سے سمجھنا کرنا پڑے گا۔ واقعی وہ بھی نہیں چاہیں گے کہ یہ فائل یہ نقشہ اور خزانے کا راز لیپڈائپ کے حکمرانوں کے لیے ترنوالہ بن جائے۔“

وہ کراچی سے لیپڈائپ کے لیے روانہ ہو گئے۔ پاکستان سے نکلنے ہی سلطان نے کہا۔ ”شکر ہے بابا جانی اور رانا وٹا د رکاوٹ نہ بن سکے۔ ہم آسانی نکل آئے ہیں۔“

مراد نے کہا۔ ”ہم قاہرہ پہنچ کر بابا جانی سے بات کریں گے۔ پھر معلوم ہوگا کہ وہ ہماری کامیابی پر کس طرح جھنجھلا رہے ہیں؟ ہمارے خلاف کیا بولنے والے ہیں اور آئندہ کیا کرنے والے ہیں؟“

”یہ باتیں بعد میں ہوں گی۔ آپ وہ ڈائری نکالیں۔ اسے پڑھ کر دیکھیں کہ اس پتھر واکس سے کیا نکلتا ہے؟“

مراد نے بریف کیس سے وہ ڈائری نکالی۔ اس ڈائری پر ایک کور چڑھا ہوا تھا۔ اس کی زپ کھول کر اسے اندر سے نکالا گیا تو کی تصویریں بھی نکل آئیں۔ وہ ایک ایک تصویر کو ہاتھ میں لے کر دیکھتے گئے۔ سلطان کے ہاتھ میں میری تصویر تھی۔ اس نے کہا۔ ”بابا جانی کسی قدر جوان لگ رہے ہیں۔ یقیناً یہیں برس پہلے اتاری گئی ہے۔“

مراد نے اپنے ہاتھ کی تصویر دکھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ ہماری رابعہ پھولی ہیں۔ تھی خوبصورت لگ رہی ہیں؟“

سلطان نے ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”رابعہ پھولی ایک سیدھی سادی مشرقی خاتون تھیں۔ مگر تصویر میں تراشیدہ زلفیں ہیں۔ آتی بروز بنائی گئی ہیں۔ وہ بھی ایسا میک اپ نہیں کرتی تھیں۔“

انہوں نے تصویر کو پلٹ کر دیکھا۔ پیچھے لکھا ہوا تھا۔ ”رانا مانی سسر۔“

مراد نے کہا۔ ”یہاں لکھا ہے میری بہن رانا جیکہ رابعہ لکھا چاہیے تھا۔“

مراد نے کہا۔ ”رابعہ پھولی ایک ماڈرن نہیں تھیں۔ یہ کوئی غیر مسلم لڑکی رانا ہے۔ بابا جانی نے اسے میری بہن رانا لکھا ہے۔ شاید اس لیے کہ یہ پھولی کی ہم شکل ہے۔“

تیسری تصویر ذہن رانا کی تھی۔ چہرے میں ایک شخص اسے پسائی رسومات کے مطابق انگلی پینا رہا تھا اور میں ایک سیکورٹی افسر کی وردی میں وہاں کھڑا ہوا تھا۔ ان کی شادی کرانے والا پادری اور دوسرے لوگ بھی وہاں موجود تھے۔

مراد نے کہا۔ ”یہ تصویر سمجھا رہی ہے کہ یہ ہماری رابعہ پھولی نہیں ہیں۔“

”ہم کہاں تصویروں میں الجھ گئے ہیں؟ ڈائری پڑھیں۔“

”بس یہ دو تصویریں رہ گئی ہیں۔“

چوتھی تصویر ایک حسین لڑکی کی تھی۔ اسے پلٹ کر دیکھا گیا۔ وہاں اس کا نام لکھا ہوا تھا نیسی بیس۔

مراد نے کہا۔ ”نام سے یہودی لگتی ہے۔ ہمارے بڑے میاں پتا نہیں کیسی نیسی حسین لڑکی کو پہلے سے ہیں؟“

انہوں نے آخری تصویر اٹھا کر دیکھی تو چونک گئے۔ نیسی ایک بچے کو گود میں لیے پیار کر رہی تھی۔ میں اس کے پاس بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ انہوں نے نورانی تصویر کو پلٹ کر تحریر پڑھی۔ وہاں لکھا ہوا تھا۔ ”میں میری ڈارلنگ نیسی اور ہمارا بیٹا نامان۔“

مراد اور سلطان نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ سلطان نے ناگواری سے کہا۔ ”یہ ہے ہمارا باپ۔۔۔ پتا نہیں کہاں کہاں اولادیں پیدا کرتا رہا ہے؟“

مراد نے کہا۔ ”ان کا ایک بیٹا نامان جوان ہو چکا ہوگا اور نہ جانے کئی اولادیں جوان ہو کر خزانے کی صفے دار اور دعوے دار بننے کے لیے برتوں رہی ہوں گی؟“

”ہمیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ ہم ان سب سے پہلے اس مدفن خزانے تک پہنچیں گے۔“

یہ کہتے ہی وہ ہنسنے لگا۔ مراد نے کہا۔ ”ہم نے ابھی کچھ حاصل نہیں کیا ہے۔ ابھی سے اتنا خوش نہیں ہونا چاہیے۔“

وہ بولا۔ ”میں اس بات پر فخر رہا ہوں کہ بابا جانی نے بچوں کی کہانی سنا لی تھی۔ کہا تھا کہ زمین سے نکلنے والے خزانے کے چشما طلبکار ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے سے لڑتے لڑتے مر جاتے ہیں۔ مرنے سے پہلے سب ہی سوچتے ہیں کہ میں ہی آخر میں خزانہ حاصل کرنے کے لیے زندہ رہ جاؤں گا۔“

مراد نے کہا۔ ”ایسا ہوتا ہے اور ہمارے ساتھ بھی ایسا ہو سکتا ہے۔ دعا کرو بابا جانی کی جن اولادوں سے ہم بے خبر ہیں وہ اس خزانے کی طرف نہ آرہے ہوں۔“

”ایسا نہیں ہوگا۔ صرف ہم وہاں پہنچیں گے۔“

”مکی تو قصبے میں کہا گیا ہے۔ سب یہی سوچتے ہیں کہ ہم پہنچیں گے۔ ہم حاصل کریں گے۔ مگر وہ خزانہ کی کوئی ملتا۔“

”مراد بھائی آپ مایوس کرنے والی باتیں نہ کریں۔ ڈائری پڑھیں۔“

وہ ڈائری کی ورق گردانی کرنے لگے۔ پہلے صفحے پر جہاں ڈائری درج کرنے والے کا نام لکھا جاتا ہے۔ وہاں لکھا ہوا تھا۔ شہزادہ سلمان سعدی...

دونوں بھائیوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ جہاں میرا نام ہونا چاہیے تھا۔ وہاں کسی اور کا نام لکھا ہوا تھا۔ سلطان نے کہا۔ ”کیا یہ بابا جانی کی ڈائری نہیں ہے؟“

مراد نے کہا۔ ”اگر ان کی نہیں ہے تو ان کے سیف میں کیوں رکھی ہوئی تھی؟ اس ڈائری کی کوئی اہمیت ہے تب ہی بابا جانی نے اسے سنبھال کر رکھا تھا۔ ہم پڑھیں گے تو اس کی اہمیت معلوم ہوگی۔“

وہ ایک ایک صفحے کو سرسری طور پر دیکھتے ہوئے گزرنے لگے۔ ایک صفحے پر لکھا تھا۔ ”رانا میری مرحوم بہن رابعہ کی ہم شکل ہے۔ اسے دیکھ کر یوں لگا جیسے وہ پھر سے جی اٹھی ہے۔ میں نے اسے جی جان سے اپنی بہن بتالیا ہے۔“

یہ تحریر پڑھتے ہی وہ دونوں الجھ گئے۔ رانا کی تصویر اٹھا کر دیکھنے لگے۔ وہ چرچ میں وہیں بنی ہوئی تھی۔ ایک شخص اسے اٹھوئی پہنارہا تھا اور میں ان کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ یہ نہ سمجھ میں آنے والی بات تھی۔ ڈائری کسی سلمان سعدی نے لکھی تھی کہ رانا اس کی بہن رابعہ کی ہم شکل ہے۔ جبکہ رابعہ میری بہن تھی اور میرے بیٹے بھی یہی کہہ رہے تھے کہ رانا ان کی پھوپھی کی ہم شکل ہے۔

میں رانا کی شادی کی تصویر میں دکھائی دے رہا تھا۔ جبکہ کسی سلمان سعدی کو وہاں ہونا چاہیے تھا۔

یہ تو ہنگامہ نہ بنی بات ہوگی۔ اگر کہا جائے کہ میں تصویر میں نہیں تھا۔ میرا ایک ہم شکل سلمان سعدی وہاں تھا۔ یعنی بہن کی بھی ایک ہم شکل اور میرا بھی ایک ہم شکل... یوں میری روداد بڑی مضحکہ خیز ہو جائے گی۔

کیوں نہ اس داستان کو اچھٹے سے پہلے ہی سلجھا دوں کہ وہ ڈائری میں نے ہی لکھی تھی۔ میں نے ہی رانا کو بہن بتایا تھا اور میں ہی تصویر میں نظر آ رہا تھا۔ کسی شہزادہ سلمان

سعدی کا الگ سے کوئی وجود نہیں تھا۔ میں ماضی میں دو مختلف ناموں سے زندگی گزارتا رہا ہوں۔ آگے چل کر اپنی دہری زندگی کی وضاحت کروں گا۔ فی الحال مراد اور سلطان کو اچھٹے دیا جائے اور وہ الجھ رہے تھے۔

تصویر میں نظر آنے والے کو سلمان سعدی تسلیم نہیں کر رہے تھے۔ آخر مراد نے کہا۔ ”سیدی سی بات سمجھ میں آرہی ہے کہ رانا کے ساتھ تصویر میں بابا جانی ہی ہیں۔ ڈائری لکھنے والا سلمان وہاں موجود نہیں ہے۔“

”مگر ڈائری لکھنے والے نے یہ کیوں لکھا ہے کہ رانا اس کی مرحوم بہن رابعہ کی ہم شکل تھی؟ جبکہ رابعہ پھوپھی بابا جانی کی بہن تھیں؟“

وہ اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ”میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ چلو کھڑکی دیر کے لیے فرض کر لو کہ بابا جانی فرضی نام سے یہ ڈائری لکھتے رہے ہیں۔ فی الحال آگے تو پڑھو... کیا لکھا ہے؟“

انہوں نے آگے پڑھنا شروع کیا۔ ایک صفحے پر بنیسی کا ذکر آیا کہ وہ کسی طرح حیرتی زندگی میں آئی پھر میرے ایک بیٹے کی ماں بن گئی اور یہ بات میرے بیٹوں کی سوچ اور ان کے مزاج کے خلاف تھی۔ وہ میرے خلاف تبصرے کرنے لگے۔ انہیں میری خفیہ شادیوں کے علاوہ یہ بھی معلوم ہو رہا تھا کہ میں خطرناک حد تک بھرتا زندگی گزارتے ہوئے بڑی بڑی خفیہ خلیوں سے ٹکراتا رہا ہوں۔

وہ پڑھتے پڑھتے رک گئے۔ ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ مراد نے کہا۔ ”بابا جانی ہم سے دور جاتے تھے۔ پھر مہینوں اور برسوں تک ہم ان کی صورت نہیں دیکھتے تھے۔ یہی کبھی فون کے ذریعے خیر خیریت معلوم ہو جاتی تھی۔“

”ہاں وہ برسوں میں بھی چند دنوں کے لیے قلمی لائف گزارنے آتے پھر چلے جاتے تھے۔ کیا بار بار طویل عرصے تک لاپتہ رہ کر ایسی خطرناک بھرتا زندگی گزارتے رہے ہیں جیسا کہ اس ڈائری میں لکھا ہے؟“

”نہیں سلطان! یقین نہیں آتا۔ یہ سچ کچھ کسی سلمان سعدی کی ڈائری ہے۔“

سلطان نے کہا۔ ”پھر وہی سوال پیدا ہوگا کہ کسی سلمان نے ہماری پھوپھی کو اپنی بہن رابعہ کیوں لکھا ہے؟ پھر انجینس پیدا ہوں گی۔ پھر آپ کے سر میں درد ہوگا۔“

وہ مسکھاتے ہوئے بولا۔ ”ہم نے ایک قلم دیکھی تھی۔ ڈاکٹر جیکل اینڈ مسٹر ہائیز۔ اس فلم میں ایک شخص دن کے وقت فرشتہ خصلت انسان بن کر رہتا ہے اور رات کو شیطان

بن جاتا ہے۔ کیا بابا جانی کبھی میر بن عازی اور کبھی سلمان سعدی بن جاتے ہیں؟“

”ہم یہی مان لیں تو بہتر ہے۔ ورنہ آپ کی طرح میرا سر بھی پکڑانے لگے گا۔“

”شاید آگے پڑھتے رہنے کے بعد ہم دہری شخصیت کا معاملہ کر سکیں۔“

وہ پھر سے پڑھنے لگے۔ پھر سے اچھٹے لگے۔ جب میرے دست راست اعظم مائی نے بتایا تھا کہ وہ دونوں بیٹے فائل جی ون اور ڈائری لے گئے ہیں تب ہی میں سمجھ گیا تھا کہ میرے ماضی کے بہت سے رازوں سے پردہ اٹھے گا۔ اس سے پہلے ہی مجھے ان سے وہ ڈائری اور فائل جیمین لینی چاہیے۔

اس وقت فجر کی اذان ہو چکی تھی۔ میں نے سوچا۔ پہلے نماز پڑھ لوں۔ پھر ان سے نمٹ لوں گا۔ یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ ایسی پھرتی دکھائیں گے۔ صبح کی فلائٹ سے کراچی چلے جائیں گے۔

میرا جاں نثار عاقب ان کی کونھی میں پہنچا تو میری بہو نے کہا۔ ”وہ دونوں پنڈی گئے ہیں۔ اس نے عاقب سے اور انٹیلی جنس کے چیف رانا وٹساد سے جھوٹ بول کر انہیں بھٹکا دیا تھا۔ میں ان کے لاپتہ ہوتے ہی سمجھ گیا کہ وہ نشتے کواچھے طور پر کھینچنے کے بعد لیبیا کی طرف گئے ہیں۔“

ان سے فون پر رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ انہوں نے فون یا تو بند کر دیا تھا یا پھر سمر بدل دی تھی۔ اگر وہ ملک سے باہر جا چکے ہوں گے تو یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ میں کس طرح ان کا اطمینان عمارت کر سکتا ہوں؟

لیبیا کے دارالسلطنت طرابلس اور دوسرے شہروں میں میرے جاں نثار موجود تھے۔ میں نے ای میل کے ذریعے مراد اور سلطان کی تصویریں ان سب کے پاس پہنچا دیں اور سمجھا دیا کہ انہیں ٹرپ کرنے کے بعد سب سے پہلے فائل جی ون اور ڈائری حاصل کرنی ہے۔ اس کے بعد میں بتاؤں گا کہ ان کے ساتھ کیسا سلوک کرنا ہے۔

دن کے دس بجے تھے۔ میں اپنے بیڈر آ کر لیٹ گیا۔ پچھلی رات سونے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس لیے لیٹتے ہی گہری نیند میں ڈوب گیا۔ ایسی گہری نیند آئی کہ شاید میں شام تک یا رات تک سو تارہ جاتا۔ مگر میرے ذہن میں نماز نقش ہو گئی تھی۔ میں تلہری اذان ہوتے ہی ہڑ ہڑا کٹھ بیٹھا۔

ایسے ہی وقت فون کا بزرگ سنا دیا۔ میں نے تھکی سی اسکرین کو دیکھا۔ حجاب کال کر رہی تھی۔ میں نے ہٹن دبا کر

فون کو کان سے لگایا پھر کہا۔ ”تم نے مجھے گہری نیند سونے کے لیے چھوڑ دیا۔ اب نماز کے لیے جگا رہی ہو۔“

وہ بولی۔ ”آپ پچھلی رات سے بہت تھکے ہوئے ہیں۔ وعدہ کریں نماز پڑھنے کے بعد کھانا کھائیں گے پھر آرام سے سو جائیں گے۔“

”بس بہت آرام کر لیا۔ کچھ ایسی مصروفیات ہیں کہ ان سے نشتے کے لیے تازہ دم رہوں گا۔ ایک تھکے بعد گرم روٹی پکاؤ۔ میں نماز پڑھ کر آؤں گا۔“

میں فون بند کر کے ہاتھ روم میں چلا گیا۔ غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر نماز ادا کی۔ آج شام چھ بجے شوکت شاہنواز سے غمنا تھا۔ میں نے اپنے دست راست اعظم مائی اور عاقب سے فون پر باتیں کیں۔ یہ معلوم کیا کہ وہ ادارہ تعلیم و تربیت کی عمارت میں پہنچ کر کس طرح موڑے بارے ہیں؟ انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ اس عمارت کے غریب ملازمین کو بھاری رقم دے کر خرید رہے ہیں۔ میرے وہ تمام جاں نثار شام چھ بجے سے پہلے ان ملازمین کی جگہ ڈیوٹی پر رہیں گے اور کوئی ان پر شبہ نہیں کر سکے گا۔

ہاسٹل کی انجارج ایک پوڑھی خاتون تھی۔ وہ سنے ملازمین کو دیکھ کر کچھ بڑبڑا کر گئی تھی۔ یہ سنے کیا گیا کہ اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے کہیں قیدی بنا کر رکھا جائے گا۔ اس ہاسٹل کے پچھلے حصے میں ایک بڑا سا خوبصورت ساحل کدہ بنایا گیا تھا۔ جہاں بھی باپ جاتا تھا اور بھی بیٹا جا کر رنگ رلیاں مٹاتا تھا۔

میں نے سہ پہر تین بجے کے بعد حجاب اور عارانی کے ساتھ کھانا کھایا۔ ان کے ساتھ خوب ہنستا بولتا رہا۔ کھانے کے بعد ایک جاں نثار نے آکر ان دونوں بہنوں کی تصویریں اتاریں۔ تاکہ ان کے پاسپورٹ اور ضروری کاغذات تیار کیے جا سکیں۔

ایسے وقت میرا فون گنگنا نے لگا۔ میں نے اسکرین پر شوکت شاہنواز کے نمبر پڑے۔ پھر حجاب سے کہا۔ ”اب میں مصروف رہوں گا۔ تھوڑی دیر بعد یہاں سے چلا جاؤں گا۔“

واپسی میں کچھ دیر ہوگی۔ مگر رات کا کھانا تم دونوں کے ساتھ کھاؤں گا۔“

میں نے اپنے بیڈر کی طرف جاتے ہوئے فون کا ہٹن دبا دیا۔ اسے کان سے لگا یا۔ پھر کہا۔ ”جناب! ابھی میں آپ ہی فون کرتے والا تھا۔“

شوکت نے کہا۔ ”میں صبح سے انتظار کر رہا تھا اب تک فون نہ کرنے کی وجہ کیا ہے؟ کیا دہری کر کے بھول رہے ہو؟“

”ایسی بات نہیں ہے۔ میں زبان کا دھنی ہوں۔ دراصل میری طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی۔ بے لے آپ کو بتایا ہوگا۔ میں ایک بیمار بوڑھا ہوں۔ چلنے پھرنے کے قابل نہیں ہوں۔ ایک لمبی سہارے دو چار قدم چلتا ہوں۔ پھر تھک کر بیٹھ جاتا ہوں۔“

”ہاں۔ بے لے نے سمجھنے بتایا تھا اور میں حیرانی سے سوچ رہا تھا کہ اس قدر بیمار اور کمزور ہونے کے باوجود آج شام کس طرح حیناؤں سے دل بہلاؤ گے؟“

میں نے کہا۔ ”آپ نے وہ شعر تو سنا ہوگا...؟“

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آتھی تو دم سے رہنے دو ابھی ساغر و مینا میرے آگے.....

بیشک میں بوڑھا اور بیمار ہوں۔ جوانی کو پکڑ نہیں سکتا مگر اسے چھو تو سکتا ہوں۔ اس عمر میں دیکھنے اور چھونے کی ہوس ہی پوری ہو جائے تو بہت ہے۔“

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”نکرتہ گرد۔ تمہاری ہوس ضرور پوری ہوگی۔ ویسے بے لے نے یہ بھی بتایا ہے کہ تمہیں بوڑھا اور بیمار سمجھنے والے دھوکا کھا جاتے ہیں۔ پچھلے کئی مہینوں سے تم بیڈ پر پڑے رہنے کے باوجود کسی کی گرفت میں نہ آ سکے۔ بار بار رسیاں تو ڈر کر کھینچ گئے۔“

”میں نہ تو کوئی جادوگر ہوں اور نہ ہی سیرمن۔ ہاں خوش قسمت ضرور ہوں۔ کسی نہ کسی طرح دشمنوں کے چھبے سے نکل ہی جاتا ہوں۔ صرف آپ سے ملنے کی خاطر آج یہی بار اپنی خفیہ پناہ گاہ سے نکلوں گا۔“

”مجھے بہت خوشی ہوگی۔ آج اپنے وعدے کے مطابق مجھ سے ملاقات کرو گے تو تم پر پوری طرح بھروسہ کرنے لگوں گا۔“

”میں نے بھی سوچ لیا ہے آج آپ کا اعتماد حاصل کر کے ہی رہوں گا۔ ٹھیک چھ بجے وہاں ضرور پہنچوں گا۔“

اس نے مطمئن ہو کر رابطہ ختم کر دیا۔ ہمارے درمیان یہ طے ہوا تھا کہ ہم بالکل تمام ملاقات کریں گے۔ کوئی تیسرا ہمارے درمیان ہمارے آس پاس نہیں ہوگا۔ میں ایسا بھی نادان نہیں تھا کہ اس کی بات پر یقین کر لیتا۔

بے لے نے اچھی طرح اس کے کان بھرے تھے۔ یہ بات ذہن میں نقش کر دی کہ میں بظاہر بوڑھا بیمار اور ہڈیوں کا ڈھانچا دکھائی دیتا ہوں۔ مگر بہت خطرناک ہوں۔ شاہنواز بھی نادان نہیں تھا۔ چھٹا ہوا سیاستدان تھا۔ وہ اس پہلو سے سوچ سکتا تھا کہ بے لے کے بیان کے مطابق جنبش میں بہت ہی خطرناک ہوں اور اپنی حفاظت آپ کر سکتا ہوں تو پھر ایک

سیاستدان سے دوستی کیوں کر رہا ہوں اور پھر دوستی کرنے کی خاطر اپنی خفیہ پناہ گاہ سے کیوں نکل رہا ہوں؟

شوکت نے یہ سوچ کر دکھا کہ ایک بار مجھ سے ملاقات ہو جائے۔ پھر خزانے کا راز معلوم کیے بغیر میرا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ بیشک یہی بات تھی۔ اس نے یہی طے کیا تھا کہ مجھے ایک خفیہ پناہ گاہ میں لے جائے گا اور اس وقت تک چھپ کر رہنے کے لیے راضی کرے گا جب تک اسے خزانہ نظر نہیں آئے گا۔

اگر میں اس کی بات نہیں مانوں گا اور اس کی خفیہ پناہ گاہ میں چھپ کر رہنے سے انکار کروں گا تو وہ مجھے جبراً وہاں قیدی بنا کر رکھے گا۔ جس طرح میرے جاں نثار بڑی رازداری سے ادارہ و تعلیم و تربیت کی عمارت میں پہنچے ہوئے تھے۔ اسی طرح بے لے اور اس کے حواری بھی شام چھ بجے سے پہلے وہاں پہنچ گئے تھے۔

اعظم ثانی نے مجھ سے فون پر کہا۔ ”سر! یہاں ملا اپنے حواریوں کے ساتھ پہنچا ہوا ہے۔ وہ سب سیکورٹی گاڑڈ کی وردی میں ہیں۔ ان میں سے کچھ عمارت کے اندر ہیں اور کچھ باہر چھپے ہوئے ہیں۔“

میں نے پوچھا۔ ”کیا تم لوگوں کا لان سے سامنا ہوا ہے؟“

”جی ہاں۔ وہ عمارت کے اندر آتے جاتے ہیں دیکھ رہے ہیں۔ معمولی ملازم بکھڑے ہیں۔ اس لیے مجھے شبہ نہیں کریں گے کہ ہم انہیں نیچے دکھائی دے رہے ہیں۔ پھر یہ کہ ہمارے صرف تین آدمیوں سے ان کا سامنا ہوا ہے۔ باقی ہم سب ان سے گزرا رہے ہیں اور چھپ رہے ہیں۔“

ایسے وقت شوکت کا بنا برکت شاہنواز آگیا۔ وہاں شام میں آنے کا مقصد یہ تھا کہ ہاشل کی جوان لڑکیوں کے ساتھ رات کالی کرنا چاہتا تھا۔ بے لے نے فوراً ہی شوکت کو اطلاع دی۔ ”جناب عالی! آپ کے صاحبزادے اچانک ہی یہاں آگئے ہیں۔ میں آپ کا غلام ہوں انہیں یہاں سے جانے کے لیے نہیں کہہ سکوں گا۔ آپ ابھی فون پر انہیں سمجھا لیں۔ ان کی موجودگی سے بات بگڑ سکتی ہے۔“

شوکت نے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ میں ابھی اسے فون پر کھاتا ہوں۔ وہ چلا جائے گا۔“

اسی وقت اعظم ثانی نے مجھ سے فون پر کہا۔ ”سر! آپ نے حکم دیا تھا کہ شوکت کے بیٹے برکت کو بھی ٹرپ کیا جائے گا۔ اتفاق سے وہ یہاں پہنچ گیا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”جب گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کی طرف آتا ہے۔ جب وہ آگیا ہے تو وہاں نہیں جانے گا۔“

اسے وہاں سے اٹھاؤ اور ایسی جگہ پہنچاؤ کہ باپ اپنے بیٹے کو تلاش ہی کرنا نہ پائے۔“

اور باپ نے بیٹے کو فون پر کھایا تھا کہ وہ ایک بہت ضروری کام سے وہاں آ رہا ہے۔ لہذا بیٹے کو نہیں رہنا چاہیے۔ اسے فوراً وہاں سے جانا چاہیے۔

وہ اٹھوٹا بیٹا شہنشاہوں کی طرح زندگی گزارتا تھا۔ باپ کا فرمانبردار تھا۔ لہذا وہاں سے واپس جانے لگا۔ بے لے نے عمارت کی چھت پر کھڑے ہو کر اسے دور تک جاتے ہوئے دیکھا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو اس نے شوکت سے فون پر کہا۔ ”آپ کے صاحبزادے چائے ہیں۔ کیا غازی کا فون آیا تھا؟“

”ہاں۔ ابھی اس نے بتایا ہے کہیں راستے میں ہے۔ وقت پر پہنچ جائے گا۔ ابھی میں وہاں پہنچنے والا ہوں۔“

بیٹا چاہتا تھا۔ اب باپ ٹھوڑی دیر بعد وہاں پہنچ گیا تھا۔ وہ بھی سوچ نہیں سکتا تھا کہ بیٹے کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ عاقبت نے اپنے دو مسلح ساتھیوں کے ساتھ بہت آگے جا کر اس کا راست روک لیا تھا۔ وہ تھا تھا۔ ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ لہذا آسانی سے ان کی گرفت میں آگیا۔

میں جس کا ذہن میں وہاں آیا۔ اس کے پچھلے حصے میں وہیل چیر رہی ہوئی تھی اور اس چیر میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہاں لانے والے ملازموں نے مجھے وہیل چیر سمیت باہر نکالا۔ بلا چھپ کر مجھے دیکھ رہا تھا۔ فون پر شوکت سے کہہ رہا تھا۔ ”میں نے تین دن پہلے غازی کو جیسا دیکھا تھا وہی بوڑھا بیمار اور کمزور دکھائی دے رہا ہے۔“

پھر اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”بوڑھے عاشق جوان محبوبہ سے ملنے اور اسے متاثر کرنے کے لیے بالوں میں خضاب لگاتے ہیں۔ یہ بڑے میاں بھی جیسے محبوبہ سے ملنے آئے ہیں۔“

شوکت نے کہا۔ ”موت ایک محبوبہ ہے۔ گلے پڑ جاتی ہے تو چھوڑتی نہیں ساتھ لے جاتی ہے۔ اسے آئے تو دو۔“

”ہاں۔ وہ آ رہا ہے۔ مگر بیروں سے چل کر نہیں بوڑھا آخر بوڑھا ہی ہوتا ہے۔ بے چارہ وہیل چیر پر آ رہا ہے۔“

وہ خوش ہو کر بولا۔ ”اس کا مطلب ہے ہم اسے آسانی سے قیدی بنا کر رکھ سکیں گے؟“

”پہلے بھی ہم نے دو بار آسانی سے انوکھا کیا تھا۔ اس بار بھی وہ ہمارے لیے بڑی آسانیاں پیدا کر رہا ہے۔ بالکل تنہا آیا ہے۔ مجھے تو کچھ خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔“

”یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟ جبکہ وہ اپنے مسلح محافظوں کے ساتھ نہیں ہے۔ بالکل تنہا ہے۔“

”یہی بات مجھے کھٹک رہی ہے۔ جو گاڑی اسے یہاں لائی تھی۔ اس میں دو افراد تھے۔ وہ یہاں سے چائے ہیں۔ یعنی غازی نے یہاں سے جانے کے لیے گاڑی بھی نہیں رکھی ہے۔“

شوکت نے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ اسے آنے دو۔ میں جلد ہی معلوم کروں گا کہ وہ کچھ پیچھے چھ پر اعتماد کر کے دوستی کرنے آیا ہے یا کوئی چال چل رہا ہے؟ ویسے یقین نہیں آتا کہ ایک تنہا شخص یہاں آکر ہمارے خلاف کیسے کوئی چال چلے گا اور کامیاب ہوگا؟“

وہ اپنے خوبصورت سے عیش کدے کے دروازے پر کھڑا میرا منتظر تھا۔ فون پر بے لے سے باتیں کر رہا تھا۔ پھر مجھ پر نظر پڑتے ہی بولا۔ ”وہ آگیا ہے۔ میں بعد میں بات کروں گا۔“

پھر آگے بڑھ کر بڑی فراخ دلی سے مسکراتے ہوئے بولا۔ ”خوش آمدید مسٹر عیسیٰ بن غازی!“

اس نے ہاتھ بڑھا کر مجھ سے مصافحہ کیا۔ پھر کہا۔ ”تم تو بالکل ہی ہڈیوں کا ڈھانچا ہو۔ ایسی بیماری اور کمزوری کی حالت میں مجھ سے تمہارے تھپٹے آئے ہو۔ واقعی زبان کا دھنی ہو۔“

میں مصافحہ کرنے کے بعد عصا کو زمین پر ٹیک کر وہیل چیر سے اٹھتے ہوئے بولے ہوئے ایسے کاچنے لگا جیسے واقعی ناتواں ہوں۔ بڑی مشکل سے اٹھ رہا ہوں۔ اس نے آگے بڑھ کر میرے ایک بازو کو تھام کر پوچھا۔ ”کیا یہاں سے اندر کمرے تک چل سکو؟“

میں آگے بڑھ کر رک رک کر چلتے ہوئے بولا۔ ”ہاں۔ یہ عصا میرا بہت بڑا سہارا ہے۔ میں اس کے سہارے ضرورت کے مطابق چلتا پھرتا رہتا ہوں۔“

میں اس کے ساتھ آہستہ آہستہ ایک ایک قدم چلتا ہوا ایک وسیع و عریض کمرے میں آگیا۔ وہاں کی سجاوٹ اور دیواروں پر لگی ہوئی نیم عریاں تصویریں دیکھ کر مجھ میں آگیا کہ وہاں کس طرح رنگ رلیاں منائی جاتی ہوں گی؟ میں ایک کمری پر بیٹھ کر سمجھنے ہوئے انداز میں ہانپنے لگا۔

وہ مجھے بڑی توجہ سے دیکھ رہا تھا اور بڑے یقین سے سوچ رہا تھا۔ ”یہ تو قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے۔ اتنا کمزور ہے کہ ایک چٹکی میں ناک دبا دے ہی دم نکل جائے گا۔“

پھر اس نے کہا۔ ”مجھے تم ترس آ رہا ہے۔ کسی دم کے مہمان نگتے ہو۔ یہ اچھا کیا کہ میرے پاس آ گئے۔ تمہارے بعد میں ہی اس خزانے کو حفاظت سے رکھ سکتا ہوں اور تمہاری وصیت کے مطابق تمہاری اولاد کو بھی اس میں سے حصہ دے سکتا ہوں۔“

ہم دونوں کرسیوں پر ایک دوسرے کے روبرو بیٹھے ہوئے تھے۔ وہاں سے کچھ فاصلے پر صوفوں کے درمیان شراب اور خالی پیانے رکھے ہوئے تھے۔ میں نے کہا۔ ”یہاں جذبات کو بھڑکانے والی تصویریں بھی ہیں۔ شراب بھی ہے۔ مگر شباب کہاں ہے؟“

وہ بولا۔ ”میں شباب کے نہیں، کم سن چھوڑیوں کے دریا ہیں۔ وہ ابھی آج آجائیں گی۔ پہلے کام کی باتیں کی جائیں۔“

”پہلے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہم عقل و شعور رکھنے والے انسان ہیں۔ آپ بتائیں، ہم ایسے ہیں یا نہیں؟“

وہ ہاں کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”بیشک ہم عقل و شعور رکھتے ہیں۔“

”ہم بیکٹے ہیں تو ہمارا ضمیر ہمیں سمجھاتا ہے اور راست پر لاتا ہے۔ آپ بتائیں لانا ہے یا نہیں؟“

”ہاں جی لانا ہے۔ مگر ایسی باتیں کرنے کا مطلب کیا ہے؟“

”میں معلوم کرنے آیا ہوں کہ تمہارے اندر ضمیر جاگتا ہے یا نہیں؟ تمہارے گھر میں آٹھ برس، دس برس، بارہ برس کی معصوم بھینس اور بیٹیاں ہوں گی۔ کیا بچوں کی معصومیت کو بھینس کرتے وقت تمہیں اپنی بہنوں بیٹیوں کا خیال نہیں آتا؟“

وہ ناگوار سی بولا۔ ”تم کیا بکواس کر رہے ہو؟ ہم حکومت کرنے اور دوسروں کی ذات سے فائدہ اٹھانے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ تم بھی تو کم سن چھوڑیوں کے شیدائی اور شوقین ہو؟“

”میں لعنت بھیجتا ہوں ایسے شوق پر اور تم کو کتا ہوں تم جیسے لوگوں پر۔۔۔۔۔“

وہ ایک دم سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ غصے سے گرجتے ہوئے بولا۔ ”کتے کیونے تو مجھ پر تھوکے گا؟ میں ابھی تجھے جہنم میں پہنچا دوں گا۔“

وہ ایسے تھلا رہا تھا جیسے میں نے جیج اس پر تھوک دیا ہو۔ وہ فوراً ہی میرے سامنے آ کر مجھے ایک الٹا ہاتھ رسید کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اس کی گلائی پکڑ لی۔ پہلے اس نے بڑی آسانی اور آہستگی سے چھڑانا چاہا۔ پھر زور لگانے لگا۔ پتا چلا گلائی ٹھٹھنے میں آگئی ہے۔ ہڈیاں بری طرح دکھ رہی ہیں۔ بہت تکلیف ہو رہی تھی۔ اس نے جھٹکے دے کر خود کو چھڑانا چاہا تو تکلیف اور بڑھ گئی۔

اس نے دوسرے ہاتھ سے مجھے باز نہ جاتا تو میں نے اسے بھی پکڑ لیا۔ اس بار میری گرفت کچھ زیادہ سخت ہو گئی تھی۔ وہ تکلیف سے کراہنے لگا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ

ہڈیوں کے ڈھانچے میں اتنی جان ہے۔ لیکن دونوں کلائیوں کی تکلیف اسے تڑپا رہی تھی۔ یقین دلا رہی تھی کہ اس میں اتنی جان ہے کہ وہ جان بھی لے سکتا ہے۔

وہ بڑی عاجزی سے بولا۔ ”چھوڑ دو۔ مجھے چھوڑ دو۔“

میں نے کہا۔ ”ابھی تم نے گالیاں دی تھیں۔“

وہ بدستور کراہتے ہوئے بولا۔ ”میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”جو تم نے میرے لیے کہا وہ اپنے لیے کہو۔“

وہ انگڑائیں کر سکتا تھا۔ تکلیف کی شدت سے ڈھرا ہو رہا تھا۔ تڑپتے ہوئے بولا۔ ”میں کتا ہوں۔ میں مکینہ ہوں۔ خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔“

میں نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا پیچھے جا کر گر پڑا۔ فرش پر بیٹھ کر کبھی اس گلائی کو، کبھی اس کو سہلانے لگا۔ وہ ہاتھ ٹیک کر وہاں سے اٹھنا چاہتا تھا۔ پھر تکلیف کی شدت سے کراہنے لگا۔ ”اوہ گاڈ! کیا تم نے میری ہڈیاں توڑ دی ہیں؟“

میں نے اپنے عصا کو اپنی کرسی پر رکھا۔ پھر آگے بڑھ کر اس کے دونوں بازوؤں کو تھام کر اسے ایک جھٹکے سے اٹھاتے ہوئے کھڑا کر دیا۔

اس کمرے میں دو دروازے تھے۔ میں اسے کھینچتا ہوا دروازوں کے پاس آیا۔ پھر انہیں اندر سے بند کر دیا۔ کھڑکیاں پہلے سے بند تھیں۔ اسے صوفے پر دھکا دے کر بٹھاتے ہوئے پوچھا۔ ”اب بولو! تمہارے کیا ارادے تھے اور اب کیا کرو گے؟“

وہ اپنی ایک گلائی کو سہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں ایک ضروری کال کرنا چاہتا ہوں۔“

”اچھا تو اپنے کسی باپ کو مدد کے لیے بلانا چاہتے ہو؟ کوئی بات نہیں میں اجازت دے رہا ہوں۔ جسے کال کرنا چاہتے ہو کرو۔“

وہ تکلیف برداشت کر رہا تھا۔ گہری گہری سانس لے رہا تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے جیب میں ہاتھ ڈال کر موبائل فون نکالا۔ پھر نمبر ڈیج کرنے لگا۔ میں سامنے والے صوفے پر آرام سے بیٹھ گیا۔

اس نے فون کو کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ ”ہیلو! میں مصیبت میں ہوں۔ فوراً آ جاؤ۔ ورنہ مجھے مار ڈالے گا۔“

ادھر میں نے فون نکال کر نمبر ڈیج کیے۔ پھر اسے کان سے لگا کر کہا۔ ”ایک باپ کو اس کے بیٹے کی آواز سناؤ۔“

یہ کہہ کر میں نے اپنا فون بند کر دیا۔ چند سیکنڈ بعد ہی شوکت نے اپنے فون پر کالنگ فون کی۔ پھر اسکرین پر نمبر پڑھے۔ میں نے کہا۔ ”نمبر نہ پڑھو۔ بات کرو۔“

اس نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ پھر جین دبا کر فون کو کان سے لگایا تو دوسری طرف سے بیٹے کی آواز سنتے ہی چونک گیا۔ وہ بری طرح سہا ہوا کہہ رہا تھا۔ ”ڈیڈی! مجھے پتا نہیں۔ ورنہ یہ لوگ مجھے مار ڈالیں گے۔“

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ”برکت! میرے بیٹے! یہ تم بول رہے ہو؟ تم کہاں ہو؟“

اس نے کہا۔ ”پتا نہیں۔ یہ لوگ میری آنکھوں پر پٹی باندھ کر کہاں لے آئے ہیں؟ مجھ سے کہہ رہے ہیں، صرف آپ ہی مجھے پتا سکتے ہیں۔ جو آپ کے سامنے بیٹھا ہوا ہے۔ میری خاطر اس کے قدموں میں گر پڑیں۔“

فون بند ہو گیا۔ اگلوتے بیٹے کی محبت نے تڑپا دیا تھا۔ وہ ”ہیلو ہیلو۔۔۔۔۔“ کہہ کر چیخنے لگا۔ ادھر دروازے پر دستک سنائی دی۔ پھر طے نے دروازہ پینے ہوئے کہا۔ ”غازی! دروازہ کھولو۔ اگر شوکت صاحب کی شان میں گستاخی کرو گے انہیں کوئی نقصان پہنچاؤ گے تو اس کمرے سے باہر نکل نہیں پاؤ گے۔ یہاں سے تمہاری لاش ہی جائے گی۔“

وہ پریشان ہو کر کبھی مجھے اور کبھی دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے ہتے ہوئے کہا۔ ”ادھر بیٹے کی لاش اور ادھر تمہاری لاش اور تمہارا وہ جو کھٹکے والا غنڈا نہیں جانتا کہ اس کی لاش اٹھانے والا ابھی یہاں کوئی نہیں آئے گا۔“

وہ بری طرح پھنس گیا تھا۔ اسے اپنی جان ہی نہیں، بند کمرے کے باہر بیٹے کی بھی جان پتائی تھی۔

میں نے کہا۔ ”ابھی تم نے تاش کا ایک پتہ کھلا۔ اسے ایک غنڈے کو بلایا۔ میں نے بھی ایک پتہ کھلا۔ تمہیں بیٹے کی آواز سنا دی۔ یہ نہ سمجھو کہ کھیل اتنی جلدی ختم ہو جائے گا۔ تاش کے باون تپے ہوتے ہیں۔ ابھی دیکھو گے کہ میں کیسے کپے کھیلنے اور تڑپ چالیں چلنے والا ہوں۔۔۔۔۔؟“

وہ بڑا ہی شاطر سیاستدان تھا۔ اسے سیاسی ہیرا پھیری میں مہارت حاصل تھی۔ وہ کالے دھن کو سفید کرنے اور سیاہ اعمال کو سفید بنانے کا ہنر جانتا تھا۔ مگر اس وقت ساری چوکریاں بھول گیا تھا۔

خوبصورت اور معصوم بچیوں کی زندگیوں سے کھیتا آ رہا تھا۔ آج موت اس سے کھیلنے آگئی تھی اور اسے بچاؤ کا راستہ کھانسی نہیں دے رہا تھا۔ بلکہ باہر سے دروازہ پیٹ رہا تھا۔ اپنے سخاویوں کے ساتھ اندر آنے کے لیے پیٹا تھا۔ اس

نے پوچھا۔ ”جناب عالی! آپ خیریت سے ہیں ناں۔۔۔۔۔؟ آپ غازی کو بتادیں کہ وہ حرام موت مرے آیا ہے۔ اگر آپ کو ہاتھ لگے گا تو زندہ واپس آئیں گے گا۔“

میں مسکرا رہا تھا۔ شوکت جیج کو تاش کھا رہا تھا۔ اس نے جھنجھلا کر دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”خاموش ہو جاؤ۔ شور نہ مچاؤ۔“

”جناب عالی! ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ آپ کی پوزیشن کیا ہے؟ آپ اجازت دیں ہم دروازہ توڑ کر آ جائیں گے۔“

میں نے مسکرا کر کہا۔ ”تم اقتدار کی کرسی پر بیٹھ کر بڑے احکامات صادر کرتے ہو۔ چور دروازہ توڑنے کا بھی حکم دے دو۔“

اس نے تکلیف سے کراہتے ہوئے اپنی کلائیوں کو دیکھا۔ پھر کہا۔ ”مجھ سے یہ ہاتھ اٹھانا نہیں جا رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے ہڈیاں ٹوٹ گئی ہیں یا ترخ گئی ہیں۔ میرے لیے فوری طبی امداد ضروری ہے۔“

”موت آنے والی ہو تو زندگی کی طرف لے جانے والا کوئی نسخہ ضروری نہیں ہوتا۔ دوا میں بے اثر ہو جاتی ہیں۔ اسپتال کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے میں یہاں سے جانے کی بات نہیں کروں گا۔۔۔۔۔ مگر ہمارے درمیان سمجھوتہ ہونے تک میرا میلی ڈاکٹر تو یہاں آ سکتا ہے؟“

”آئے گا تو وہ بھی واپس نہیں جاسکے گا۔ بڑے ڈھینچ سیاستدان ہو۔ میں موت کو لازمی قرار دے رہا ہوں اور تم بڑے یقین سے سمجھوتہ کرنے کی بات کر رہے ہو۔“

وہ بولا۔ ”ہم آج سے پہلے اجنبی تھے۔ ہمارے درمیان نہ دوستی تھی نہ دشمنی۔ اس لیے جانی دشمن بن کر نہ بولو۔ میں تم سے التجا کرتا ہوں مجھ سے بھاری سے بھاری شرائط پر سمجھوتہ کرو۔ مجھ پر اعتماد کرو۔ ایک بار مجھے آزماؤ۔“

”آزماؤ تو رہا ہوں۔ تم کیا سمجھتے ہو یہاں تمہا ہوں؟ نہیں۔ تمہیں اس وقت معلوم ہوگا جب موت کی تاریکیوں سے اندھی گولیاں تمہارے غنڈوں کی طرف آئیں گی۔“

میں عصا کو تھام کر صوفے پر سے اٹھ گیا۔ ذرا ٹھٹھلے کے انداز میں ادھر سے ادھر جاتے ہوئے بولا۔ ”اگر تم پر اندھا اعتماد کر کے یہاں تنہا آتا تو تم مجھے کی چوہے دان میں ڈال دیتے۔ خزانہ حاصل کرنے تک مجھے زندہ رکھتے پھر مار ڈالتے۔“

میں نے پلٹ کر پوچھا۔ ”کیوں یہی کرنے والے

تھے ناں.....؟

وہ قاتلین پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی دونوں کلاں صوفے پر رکھی ہوئی تھیں۔ چہرے سے تکلیف کے آثار نمایاں تھے۔ وہ بولا۔ ”خدا کے لیے مجھے طبی امداد پہنچاؤ۔ تکلیف برداشت نہیں ہو رہی ہے۔“

”جب بھی بچوں پر ظلم کرتے تھے تو ان سے بھی تکلیف برداشت نہیں ہوتی تھی۔ تم ان کی طرح رفتہ رفتہ برداشت کرنا اور جینا سیکھ جاؤ گے۔ بشرطیکہ میں تمہیں جینے دوں۔“

”ایسی باتیں نہ کرو۔ بڑے سے بڑا مطالبہ کرو۔ میں ابھی کروڑوں روپے تمہارے چیک اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر اسکتا ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”اونٹ کے منہ میں زیرہ دینے کی بات کر رہے ہو۔ جو سونے کا بیو پاری ہے اور خزانہ چھپا کر رکھتا ہے۔ اس کے لیے کروڑوں روپے کیا اہمیت رکھتے ہیں؟“

”میں اس سے بھی زیادہ دے سکتا ہوں۔“

”جانتا ہوں تم نے کھل کھلا کر قوی خزانہ لوٹا ہے۔ ٹھیک ہے میں سمجھتا کروں گا۔ باپ بیٹے میں سے کسی ایک کو زندگی ملے گی۔“

وہ گڑگڑانے کے انداز میں بولا۔ ”وہ میرا ایک ہی بیٹا ہے۔“

”تو پھر جاؤ۔ اسے زندگی دو۔“

”زندگی سب کو عزیز ہوتی ہے۔ پلیز غازی! استدلال نہ بنو۔“

میں چلنے پھرنے کے لیے اس کے سامنے سے گزرتے ہوئے بولا۔ ”پریس اور ایٹلی جنس کے ریکارڈز میں کریٹ سائنسٹان ہو۔ قاتل بھی ہو۔ مگر شاطرانہ چالیں چل کر قانون سے گھمبیل کر محفوظ حاصل کر رہے ہو۔ میں بھی تمہیں وکیل دے سکتا ہوں۔“

وہ ذرا مطمئن ہو کر میرا منہ ٹکھنے لگا۔ میں نے کہا۔ ”تمہارے ملکی اور غیر ملکی لاکرز میں جتنی اہم دستاویزات ہیں۔ انہیں میرے حوالے کرو گے۔ کورٹ جیج زرا اپنے جرائم کی تفصیلات لکھ کر دستخط کرو گے اور انکو مجھے کے نشانات لگاؤ گے۔“

وہ پریشان ہو کر بولا۔ ”اس طرح تم مجھے زندہ چھوڑ کر ہریل مارے رہو گے؟“

”ہاں۔ ایسی زندگی جیو گے کہ اپنی ذات سے جب بھی کسی کو نقصان پہنچانا چاہو گے تو میں پلک بچھکتے ہی تمہاری موت بن جاؤں گا۔“

باہر سے بلے کی آواز سنائی دی۔ ”جناب عالی! بہت دیر سے خاموشی ہے۔ میرا فرض مجھے بولنے اور کچھ کرنے پر

مجبور کر رہا ہے۔“

وہ تکلیف سے بے حال ہو رہا تھا اور میں اسے موت کا چہرہ دکھا رہا تھا۔ اس نے ہنستا کر کہا۔ ”شٹ اپ۔ جہاں ہو وہاں خاموشی سے انتظار کرو۔“

پھر وہ مجھے دیکھتے ہوئے گڑگڑانے کے انداز میں بولا۔ ”جس طرح بھی سمجھتا ہوتا ہے کرو اور فوراً ہی مجھے اسپتال پہنچاؤ۔“

میں نے اس کے سامنے آکر عصا کو قاتلین پر مارتے ہوئے کہا۔ ”زیادہ تاہن نہ کرو۔ میں ایکٹنگ کرنے والوں کو خوب پہچانتا ہوں۔ بے شک تکلیف کچھ ناقابل برداشت ہوگی۔ مگر تمہارا رفتہ رفتہ برداشت کرنے لگو گے۔ تم کم سن بچیوں کو یاد کرتے رہو۔“

”میں تمہاری بات مان رہا ہوں۔ مگر تمام دستاویزات تمہارے حوالے کرنے کے لیے مجھے یہاں سے سویٹزر لینڈ کے بینکوں میں جانا ہوگا۔ تمہاری مطلوبہ چیزیں میں ہی لاکرز سے نکال سکتا ہوں۔“

”مجھے نہ سمجھاؤ۔ میں سب سمجھتا ہوں۔ تمہیں یہاں سے لے جایا جائے گا۔ تمہاری دھتھی ہوئی کلائیوں کو آرام پہنچایا جائے گا۔ کل میرے آدمیوں کے کمرائی میں یہاں کے لاکرز سے میری تمام مطلوبہ چیزیں نکال لائے گے۔ اس کے بعد میرا ہیرسٹرپ کے کائنات پر تمہارے جرائم کی تفصیل لکھواؤ گے۔ تم مزید مطالبات پورے کرنے کے لیے سویٹزر لینڈ بھی جاؤ گے۔“

وہ سر جھکا کر سوچنے لگا۔ اس کے چہرے سے اطمینان بھلک رہا تھا۔ اسے یہاں سے چیک جانے بھر ملک سے باہر جانے کی چھوٹ ملنے والی تھی۔ وہ مجھ سے نجات حاصل کرنے کے لیے شاطرانہ چالیں چل کر یا تو مجھے قانون کی گرفت میں لے سکتا تھا یا ہلاک کر اسکتا تھا یا ایک بار پھر قیدی بنانے کی کوشش کر سکتا تھا۔ اس کے سامنے راستے کھل رہے تھے۔

اس نے کہا۔ ”تم جو کہو گے وہ کرتا ہوں گا۔ یہ میرے تمہارے معاملات ہیں۔ میرے بیٹے کو ہار کر دو۔“

”سوری۔ میں اسے ضمانت کے طور پر اپنا سہمان بنا کر رکھوں گا۔ اس کی سلامتی کی خاطر کل تم چیک جا کر کوئی کمینہ پن نہیں دکھا سکو گے۔“

وہ چند لمحوں تک سوچتا رہا۔ پھر بولا۔ ”میں بیٹے سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

میں نے عاقب سے فون پر پوچھا۔ ”برکت کا کیا حال ہے؟“

سپیشل ڈائجٹ 104 ستمبر 2010

وہ بولا۔ ”میرا ہم نے اسے مار چھ نہیں کیا ہے۔ اس کے باوجود وہ بری طرح سہا ہوا ہے۔ بہت ہی بزدل ہے۔“

”اسے بہت احتیاط سے قیدی بنا کر رکھنا ہے۔ ابھی باپ بیٹے کی بات کرنا۔“

میں سے فون بند کر کے شوکت سے کہا۔ ”تمہارے بیٹے پر کسی طرح کا ظلم نہیں کیا گیا ہے۔ پھر بھی وہ سہا ہوا ہے۔ اسے سمجھاؤ جب تک تم سویٹزر لینڈ سے واپس نہیں آؤ گے وہ ہمارا قیدی بن کر رہے گا۔“

”پلیز۔ میرے بیٹے پر ایسا ظلم نہ کرو۔ میں تمہارے اشارے پر چلتا رہوں گا۔ اسے رہا کر دو۔“

”مجھ سے نادانی کی توقع نہ کرو۔ جو کہہ رہا ہوں۔ وہی کرتے رہو۔“

اس نے اپنے فون کو دیکھا۔ کال آرہی تھی۔ میں نے کہا۔ ”تمہارا بیٹا کرا رہا ہے۔“

اس نے فوراً ہی فون اٹینڈ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”بیٹے! تم خیریت سے ہو؟“

وہ بولا۔ ”آپ کیا پوچھ رہے ہیں ڈیڈی! کیا دشمنوں کی قیدی میں کوئی خیریت سے رہ سکتا ہے؟“

”کیا تم سے قیدیوں جیسا سلوک کیا جا رہا ہے؟“

”ایسی بات نہیں ہے مگر ایسا کیا جا سکتا ہے۔“

”تو فکر نہ کرو۔ میں یہاں معاملات طے کر چکا ہوں۔ وہاں تمہیں کسی طرح کا نقصان نہیں پہنچے گا۔“

”آپ معاملات طے کر چکے ہیں تو پھر مجھے رہائی کیوں نہیں مل رہی ہے؟“

”کچھ مجبوریاں ہیں۔ تمہیں وہاں دو چار دنوں تک قیدی بن کر رہنا ہوگا۔“

”میں آپ جیسے مشہور و معروف سیاستدان کا بیٹا ہوں۔ تو بین کے احساس سے مر جاؤں گا۔ آپ اپنے ذرائع اور اختیارات کیوں استعمال نہیں کر رہے ہیں؟“

”ہم دونوں بری طرح ٹکھے میں آگئے ہیں۔ میں اثر رسوخ استعمال نہیں کر سکتا ہوں گا۔“

”آپ مجھے بتائیں یہ ہم سے کون دشمنی کر رہا ہے اور مجھے یہاں کب تک رہنا ہوگا؟“

”تم میرے معاملات کو سمجھ نہیں پاؤ گے۔ بس یہ سمجھ لو کہ تمہیں نہ چاہئے کہ باوجود وہاں قیدی بن کر رہنا ہوگا۔ میں جلدی تمہیں رہائی دلاؤں گا۔“

میں نے اس سے فون لے کر برکت سے کہا۔ ”تم نے باپ کی باتیں سن لیں۔ اب وہاں آرام سے رہو۔ تمہیں میں

وقت کی روٹیاں ملتی رہیں گی۔“

میں فون بند کر کے اسے شوکت کے سامنے صوفے پر پھینک کر بیٹھنے لگا۔ وہ میرا منہ ٹکھنے لگا۔ میں نے پوچھا۔ ”جانتے ہو کیوں نہیں رہا ہوں؟“

اس نے انکار میں سر ہلایا۔ میں نے کہا۔ ”بیٹے کی کال آتے ہی تم نے ایک کروڑ اٹھالیا۔ کلائی کا درد کہاں گیا؟“

وہ چونک کر اپنی کلائیوں کو دیکھنے لگا۔ میں نے کہا۔ ”بڑے ڈراما باز ہو۔ اسی لیے سیاست میں ہو۔“

وہ تکلیف سے منہ بناتے ہوئے بولا۔ ”میں سچ کہتا ہوں۔ بہت تکلیف ہو رہی ہے مگر میں برداشت کر رہا ہوں۔“

”اگر میں کہہ دوں کہ آزاد ہو مگر بیروں سے چل کر جانے کی اجازت نہیں دوں گا۔ تب ضرور ہاتھوں کے بل ریختے ہوئے جاؤ گے۔“

”میرا مذاق نہ اڑاؤ۔ مجھ پر میری بات کرو۔ ڈاکٹر کو بلاؤ یا اسپتال لے چلو۔“

”میرے آدمی تمہیں مین پوائنٹ پر یہاں سے لے جائیں گے۔ اس سے پہلے بے حکم دو کدو اپنے ساتھیوں کے ساتھ تمام ہتھیار پھینک کر دونوں ہاتھ اٹھا کر باہر چلا جائے۔“

وہ جلد سے جلد طبی امداد چاہتا تھا۔ پھر وہاں سے باہر جانے کا موقع ملنے والا تھا۔ اس نے فوراً ہی بے فون پر حکم دیا کہ وہ ہتھیار پھینک کر اپنے حواریوں کے ساتھ وہاں سے دور چلا جائے۔ بعد میں اس سے فون پر رابطہ رہے گا۔

وہ حکم کا بندہ تھا۔ اس نے تھوڑی دیر بعد فون پر کہا۔ ”میں اپنے آدمیوں کے ساتھ عمارت سے باہر آ گیا ہوں۔ کیا آپ کو رہائی مل رہی ہے؟“

شوکت نے کہا۔ ”میری فکر نہ کرو۔ میں غازی کے ساتھ یہاں سے جاؤں گا۔ تم کسی طرح کی رکاوٹ پیدا نہ کرنا۔“

میں نے کہا۔ ”بلے سے کہو وہ ابھی اس کمرے میں تھا اور نہتا اسکا ہے۔“

شوکت نے خیرانی سے مجھے دیکھا۔ پھر فون پر کہا۔ ”غازی تمہیں میرے پاس تنہا آنے کی اجازت دے رہا ہے۔ کوئی ہتھیار اپنے ساتھ نہ رکھو خالی ہاتھ آ جاؤ۔“

وہ بولا۔ ”میرے من کی مراد پوری ہو رہی ہے۔ میں ابھی آ رہا ہوں۔“

میں نے اسے فون پر کہا۔ ”یہ دیکھو کہ بلے کے تمام ساتھی ہتھیار چھوڑ کر جا چکے ہیں یا نہیں؟ صرف یہاں بلے کو رہے دو۔ باقی لوگوں پر لوڑ فائر کرو۔ وہ دو جاگ جائیں گے۔ ایسے وقت دروازے پر دستک سنائی دی۔ بلے نے کہا۔

سپیشل ڈائجٹ 105 ستمبر 2010

”جناب عالی! میں آپ کے حکم کے مطابق خالی ہاتھ آیا ہوں۔“
میں نے کہا۔ ”انتظار کرو۔ ابھی دروازہ کھلے گا۔“
تھوڑی دیر بعد اعظم خانی نے فون پر کہا۔ ”سرادہ
سب ہتھیار چھینک کر غمراہ کے احاطے کے باہر چلے گئے
ہیں۔۔۔ بلا ایک بند کمرے کے دروازے کے پاس کھڑا
ہوا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”اسے چپک کرو۔ وہ ہتا ہے یا نہیں؟“
اس نے اچھی طرح چپک کرنے کے بعد کہا۔ ”یہ
بالکل ہتا ہے۔“

میں نے فون بند کیا پھر آگے بڑھ کر دروازے کو کھول
دیا۔ اعظم خانی سے کہا۔ ”انتظار کرو۔ میں تھوڑی دیر بعد
رابطہ کروں گا۔“

وہ چلا گیا۔ بلا کمرے میں آیا پھر تیزی سے چلتا ہوا
شوکت شاہنواز کے پاس پہنچ کر اس کے آگے گھٹنے ٹیک کر
بول۔ ”آپ خیریت سے ہیں ناں۔۔۔؟“

میں نے دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ وہ بلے کو
بتا رہا تھا کہ اس کی کلائیوں کی ہڈیاں ترخ گئی ہیں۔ اسے
فوری طبی امداد کی ضرورت ہے۔

بلا اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ غرانے کے انداز میں میرے
سامنے آ کر بولا۔ ”تم نے میرے آقا کے ساتھ کیا کیا ہے؟“
شوکت نے کہا۔ ”بلے! غصہ نہ دکھاؤ۔ غلطی سے دور
رہو۔ ابھی ہم اسپتال جا رہے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”اسپتال نہیں میری ایک خفیہ پناہ گاہ میں
جاؤ گے۔ وہاں تمہارا علاج ہوگا۔“

بلے نے کہا۔ ”میرے آقا جہاں جانا چاہتے ہیں
وہاں لے چلو۔“

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری خردماغی دیکھنے
کے لیے یہاں بلایا ہے۔ یہ یولو میں تمہاری بات نہ مانوں تو
کیا کرو گے؟“

شوکت نے کہا۔ ”بلے! تم کچھ نہیں کرو گے۔“
میں نے کہا۔ ”سوچ لو بلے! تم بھی نیچے ہو میں بھی
خالی ہاتھ ہوں۔ یہ عصا یہاں رکھ دیتا ہوں۔ اسے ہاتھ نہیں
لگاؤں گا۔“

وہ دونوں سوچ میں پڑ گئے۔ شوکت نے سوچا۔ ”میں
بوڑھا ہوں۔ عیاشی کے باعث کھوکھلا ہو گیا ہوں۔ اس لیے
غازی سے بات کھا گیا ہوں۔ بلا تو باڈی بلڈرز ہے۔ اپنی سلاخوں
کو دونوں ہاتھوں سے موڑ دیتا ہے۔ جانے اب تک کتنے بندے
مار چکا ہے۔ یہ تو غازی کی ہڈیاں تو زکر رکھ دے گا۔“

بلانے کہا۔ ”جناب عالی! اس نے آپ کو ہاتھ لگانے
کی جرأت کی ہے۔ دونوں ہاتھ توڑنے کی کوشش کی ہے۔
میں اس کی ہڈیوں کا سرمہ بنا دوں گا۔“

وہ بولا۔ ”عقل سے سوچو یہاں تم اسے مار ڈالو گے تو
باہر اس کے آدمی ہمیں جانے نہیں دیں گے۔“

میں نے کہا۔ ”تم عقل سے پیدل ہو گئے ہو۔ مجھے مار
ڈالنے کے بعد باہر جانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ کمرے
میں رہ کر قاتون کے محافضوں کو بلاؤ گے تو وہ تمہاری ایک کال
پر چلے آئیں گے۔ میرے آدمی بھی انہیں دیکھتے ہی بھاگ
جائیں گے۔“

دونوں نے بند دروازے کی طرف دیکھا۔ شوکت نے
کہا۔ ”تجربے تم ہمیں یہاں سے رہائی پانے کی تدبیر بتا
رہے ہو؟ تم باگل نہیں ہو پھر اپنی موت کو دعوت کیوں دے
رہے ہو؟ کیا نہیں جانتے کہ یہ کتنا خطرناک شہر ہے؟“

میں نے بلے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”جانتا ہوں۔ جب
پہلی بار مجھے اغوا کر کے اس کے ایک خفیہ اڈے میں پہنچایا گیا
تھا تب اس نے مجھ پر اور کمزور کے سامنے اپنی طاقت کا
مظاہرہ کیا تھا۔ اپنے دو باڈی گارڈز کو اپنی دونوں بٹلوں میں
دبوج کر انہیں بے کس اور اوردھوا کر دیا تھا۔“

بلانے دونوں ہاتھوں کے تسلسل سے
بول۔ ”میں اس ماہ پہلے کی بات یاد ہے۔ پھر بھی تم نے
مجھے یہاں بلایا ہے؟“

”ہاں۔ اس روز میری ایک ٹانگ میں گولی لگی تھی۔
آرٹیشن کے ذریعے گولی نکالی گئی تھی۔ تم نے اپنی سلاخوں
جسمی انگلی میرے کچے زخم میں چھپوادی تھی۔ میں تکلیف کی
شدت سے تڑپ تڑپ کر بیہوش ہو گیا تھا۔“

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”میں تو بہت کچھ یاد ہے۔“
”تم نے میرے ساتھ جیسا سلوک کیا ایسا کمزور اور
بزدل کرتے ہیں۔ میں نے یہی ثابت کرنے کے لیے بند
کمرے میں بلایا ہے کہ تم چوٹی سے بھی زیادہ کمزور ہو۔ میں
تمہیں مسل کر رکھ دوں گا۔“

میری بات ختم ہوتے ہی اس نے میرے منہ پر کرائے
کا ایک ہاتھ مارنا چاہا۔ میں نے اس ہاتھ کو پکڑنے ہی ایک
طرف جھٹکا دیا۔ وہ آگے کی طرف لڑکھڑاتا ہوا گیا۔ اپنا
توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ قاتلین پر اوندھے منہ گر پڑا۔ پھر
بڑی پھرتی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

اس نے سوچتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا۔ یہ کچھ
میں نہیں آیا کہ صرف ایک جھٹکا کھاکرائی دور جا کر کیسے گر پڑا

تھا؟ ابھی وہ سامنے کو تیار نہیں تھا کہ ہڈیوں کا ایک ڈھانچا
اسے اتنی دور پھینک سکتا ہے۔ پھر وہ آگے بڑھا۔ اس نے
پنچر لڑانے کے انداز میں ایک ہاتھ بڑھایا۔ میں نے پوچھا۔
”کیا حملہ نہیں کرو گے؟“

اس نے مجھے گھور کر دیکھا۔ پھر ایک قدم پیچھے ہٹ
گیا۔ جیسے ہار ماننے کے انداز میں پیچھے ہٹ رہا ہو۔ مگر اس
نے بڑی مکاری دکھائی۔ بڑی پھرتی سے محکم کر ایک کلک
مارنی چاہی۔ میں نے کلک مارنے والی ٹانگ پکڑ لی۔ اسے
زور کا جھٹکا دیا۔ وہ جیسے ہوا میں اڑتا ہوا ایک دیوار سے
جا کر ٹکراتا ہوا نیچے فرش پر گر پڑا۔

اس بار انہی چوٹیں نہیں کہ وہ فوراً ہی اٹھ نہ سکا۔ شوکت
شاہنواز کے چہرے کی رنگت اڑ گئی تھی۔ بلا دوبارہ ناکام چلے
کر کے پھرتی اور شہروری بھول گیا تھا۔ آہستہ آہستہ قاتلین پر
سے اٹھ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ”اٹھو۔ آؤ ابھی اور آؤ۔“
پہلے دوبارہ اٹھ کر کے آؤ کھینچتے تھے۔ میں کسی کے قابو میں نہیں
آتا تھا۔ اس بات کو قدرت کا کرشمہ ہے جسے تم دونوں سمجھ نہیں
پاؤ گے۔“

شوکت نے کہا۔ ”میں حیران ہوں تم یہاں دیکل جیر
پر آئے تھے۔ اب ایسا لگ رہا ہے جیسے تمہارے گوشت سے
خالی بدن میں ہڈیاں نکلنے لگی ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ میں اس
بڑھاپے میں فولاد جھار ہا ہوں۔ جبکہ جوانی آتی نہیں ہے۔
آنے سے پہلے میں ایک ذرا انگڑائی لے رہا ہوں۔“

بلے نے میری طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ”تم اس لیے
بیروں پر کھڑے ہو کہ میرے حملے ناکام ہو رہے ہیں۔ تم مار
کھانے سے پہلے ہی خود کو بچا لیتے ہو۔ مگر اب نہیں بچو گے۔
آؤ! پنچر لڑاؤ۔“

اس نے اتنا سخت اور کمر در ہاتھ میری طرف بڑھایا۔
میں نے اس کی انگلیوں میں انگلیاں ڈال دیں۔ اس نے
اپنے طور پر سختی سے گرفت میں لے لیا۔ یقیناً وہ اپنی گرفت
ہوئی مگر میں چپ چاپ کھڑا تھا۔ اس کی طرح زور نہیں لگا
رہا تھا۔ وہ پنچر لڑانے کا ماہر تھا۔ مگر اسے لگ رہا تھا جیسے انگلیوں
میں انگلیاں نہیں ڈالی ہیں اپنی سلاخوں میں پھنسا لی ہیں۔

وہ صرف قوت سے ہی نہیں تمہارے سر بھی کام لے
رہا تھا۔ کوئی ہنر تو کام آتا چاہے تمہارا ناکا کی اور تو کچن کا
احساس اسے جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر رہا تھا۔ وہ اپنے پورے
جسم کا بوجھ ڈال کر میری انگلیوں کو جھٹکنے دینے میں بھی ناکام
ہو رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ”صرف تم ہی پنچر لڑا رہے ہو۔ میں تو
سکون سے کھڑا ہوا ہوں۔ اب یہ دیکھو کہ اپنی انگلیاں میری
انگلیوں کی گرفت سے نکال سکے یا نہیں؟“

اس نے اپنے ہاتھ کو ایک جھٹکا دیا۔ پوری قوت سے
انگلیوں کو نکالنا چاہا۔ میری انگلیاں کیا تھیں ہڈیاں ہی تھیں۔
گوشت برائے نام تھا۔ ان پر کھال منڈی ہوئی تھی۔ وہ ایک
ہڈیوں کے ڈھانچے کو بلانے میں ناکام ہو رہا تھا۔

اسے لگ رہا تھا کہ وہ اپنی کھٹنے میں پھنس گیا ہے پھر یہ
کہ انگلیوں کی ہڈیاں بری طرح دکھنے لگی تھیں۔ وہ تکلیف
سے کراہتے ہوئے بولا۔ ”ہڈیوں کے ڈھانچے میں نہ جوانی
ہوتی ہے نہ توانائی۔ تم کیا بلایا ہو؟ چھوڑو میرا ہاتھ۔“

میں نے کہا۔ ”ایسا غور نہیں کہتی ہیں۔ ہائے اللہ! چھوڑو
میرا ہاتھ۔۔۔ کیا تمہاری جنس بدل گئی ہے؟“

میں نے اپنی گرفت مضبوط کی۔ اس کے حلق سے چیخ
نکل گئی۔ میں نے ایک ہلکا سا جھٹکا دیا تو کڑکڑاہٹ کی
آوازیں سنائی دیں۔ شوکت شاہنواز کے دیدے پھیل گئے۔
صاف سمجھ میں آ گیا کہ انگلیاں ٹوٹ گئی ہیں۔

وہ چیخ رہا تھا۔ تھلار رہا تھا۔ کھٹنے سے نکل نہیں رہا تھا۔
ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کو پکڑ کر تڑپ رہا تھا۔ فرش پر
دونوں پاؤں پٹپٹا ہوا ادھر سے ادھر جا رہا تھا۔

شوکت نے کہا۔ ”اسے معاف کر دو۔ جانے دو۔“
میں نے کہا۔ ”میں اب تک اسے موقع دے رہا تھا کہ
حملے کرے اور اپنی حسرتیں پوری کرے۔ اب میری باری ہے۔“

میں نے ایک الٹا ہاتھ اس کے منہ پر سیڑ کیا۔ دھات
کر قاتلین پر گرا پھر ذرا ہونے والے بکرے کی طرح تڑپنے
لگا۔ ایک ہی ہاتھ پڑنے پر منہ اور ناک سے لہو بہہ رہا تھا۔
یقیناً چہرے کی ہڈیوں پر کاری ضرب پڑی ہوئی۔ شوکت
حیرت زدہ اور خوفزدہ ہو کر مجھے دیکھ رہا تھا۔

بیچ تو یہ ہے کہ میں اپنی قوت کا مظاہرہ کرتے وقت خود
حیران ہو رہا تھا۔ میں نے باضی میں ہتھیاروں کے ذریعے
بڑے بڑے شہزادوں کو مات دی تھی۔ اب خالی ہاتھ لڑتے
وقت سمجھ رہا تھا کہ خدا کا ہر پھر میرا ہے۔

وہ ایک ہی الٹا ہاتھ پڑنے پر تڑپ تڑپ کر بے ہوش
سے ساکت ہو گیا تھا۔ میں نے شوکت شاہنواز سے کہا۔
”دیکھو میں جس سے سمجھتا نہیں کرتا اس کے ساتھ کیا کرتا
ہوں؟ عبرت حاصل کرو۔“

میں نے بلے کی تھوڑی کے نیچے حلق پر ایک پاؤں
رکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ تمہارا پالتو غنڈا نہ جانے کتنے بے

سپین ڈائجسٹ 2010

سپین ڈائجسٹ 2010

گناہوں کو موت کے گھاٹ اتارتا رہا ہے۔ تمہاری چھتر چھایا میں عدالتی سزاؤں سے بچتا رہا ہے مگر غلط ہے وہ غلط ہے اور ایسے لوگ اپنی سزا کو ضرور چھینچتے ہیں۔ سوچو سمجھو کیا تمہارے ساتھ بھی ایسا ہوگا؟

یہ کہتے ہوئے میں نے اس کے حلق پر ایک پاؤں کا دباؤ ڈالا وہ نیم بیڈی کی حالت میں ذرا دیر پڑ پڑایا پھر ہمیشہ کے لیے ساکت ہو گیا۔ دنیا کا برطانت دور ایک معینہ مدت تک موت کو چھچھاتا رہتا ہے۔ پھر وقت پورا ہوتے ہی خود پچھاڑیں لگا کر مر جاتا ہے۔

اس کا قصہ تمام ہوتے ہی میں نے اچانک کمزوری محسوس کی۔ اپنے پیروں پر کھڑا نہ رہا۔ وہاں سے پلٹ کر ڈھنگا ہوا ایک صوفے پر آکر گر پڑا۔ یوں ہانپتے لگا جیسے اب تک اپنی توانائی سے اپنی قوت برداشت سے زیادہ محنت اور مشقت کرتا رہا ہوں۔

یہ عجیب بات تھی۔ مگر مجھے اپنی اوقات معلوم ہو رہی تھی کہ میں جوان نہیں ہوں۔ ابھی بوڑھا ہی ہوں۔

جیسا کہ مجھے آگاہی ملی تھی اس کے مطابق میں ایک ایک دن کے حساب سے جوانی کی طرف جاتا رہوں گا تب بڑھا پا رہی ہوں گا اور مستقل توانائی حاصل ہوتی رہے گی اور تب اس طرح ہانپتے ہوئے کمزوری محسوس نہیں کروں گا۔ ابھی ایسے تجربات سے گزر رہا تھا جو سننے اور انوکھے تھے۔ جوانی جھلکیاں دکھا کر جاری تھی۔ یہ یقین ہو رہا تھا کہ دھیرے دھیرے ہی سخی خوشگوار تبدیلیوں کی طرف ریگنٹا جارہا ہوں۔

شوکت کو بلے کی موت کا صدمہ تھا۔ وہ مجھ سے بری طرح سہم گیا تھا۔ مجھے توجہ سے دیکھ رہا تھا۔ میں ان لحاظ میں بہت ہی بوڑھا اور کمزور دکھائی دے رہا تھا۔ وہ خود کو کھچا رہا تھا۔ "نہیں یہ نظروں کا دھوکا ہے۔ ابھی اس نے غیر معمولی قوت کا مظاہرہ کیا ہے۔ بلے جیسے باڈی بلڈز کو بڑی آسانی سے موت کے گھاٹ اتار چکا ہے۔ ابھی خوا خواہ ہانپ رہا ہے۔ کمزوری ظاہر کر رہا ہے۔ یہ یونہی ہم سب کو دھوکا دیتا ہے۔ یہاں وکیل چہرہ پر آتا تھا۔ بہت ہی ڈراما باز ہے۔

تھوڑی دیر بعد میری جھکن دور ہوئی کمزوری کا احساس ذرا کم ہوا تو میں نے فون پر پوچھا۔ "اعظم! کیا یہاں موجود ہو؟" "میں سر! میں دروازے کے پاس ہوں۔ بلے کے تمام آدمیوں کو یہاں سے ہٹا دیا گیا ہے۔ میں وہاں سے اٹھ گیا۔ عصا کو تھام کر آہستہ آہستہ چلا ہوا دروازے کے پاس آیا۔ اسے کھول کر دیکھا۔ وہ دو

ساقیوں کے ساتھ وہاں تھا۔ میں نے کہا۔ "شوکت شاہنواز کو اس کے بیٹے سے دور قیدی بنا کر رکھا جائے گا۔ وہاں میرا ٹیلی ڈاکٹر اس کا علاج کرے گا۔"

اعظم ثانی اور دوسرے جاں نثاروں نے اندر آ کر بلے کی لاش دیکھی پھر میری حیرانی سے مجھے دیکھا۔ ایک نے اسے چھو کر ٹول کر یقین کیا کہ وہ مر چکا ہے۔ اس نے یقین کرنے کے باوجود بے یقینی سے پوچھا۔ "سر! اسے آپ نے...؟" میں نے کہا۔ "ہاں۔ ایک چھوٹی سی ہاتھی کی موت کا سبب بن سکتی ہے۔ جب موت آتی ہے تو بڑے سے بڑا شہرور کمزور کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔"

ہماری دنیا میں بڑی عجیب و غریب باتیں ہوتی ہیں۔ ہم انہیں سنتے ہیں دیکھتے ہیں پھر اپنے کام میں لگ کر بھول جاتے ہیں۔ کوئی کہاں تک دیکھے اور یاد رکھے۔ دنیا عجیب خانہ ہے۔ لوگ دیکھتے ہیں اور یہ سوچ کر گزر جاتے ہیں کہ ہماری زمین پر جو ہو جائے وہ کم ہے۔

وہ شوکت کو وہاں سے لے جانے لگے۔ میں نے اعظم ثانی سے کہا۔ "تم میرا رضا قریشی کے ساتھ کل شوکت کو بینک لے جاؤ گے۔ وہاں سے اس کی اہم دستاویزات حاصل کی جائیں گی۔ پھر کورٹ پیپر پر اس سے اقبال جرم کرایا جائے گا۔ اب اسے لے جاؤ۔" شوکت جرم کی طرح سر جھکا کر وہاں سے جانے لگا۔ میں نے اس کے دونوں ہاتھوں کو ناکہ باندھا تھا اور بلے کی موت نے اسے اندر سے تو ذکر رکھ دیا تھا۔ اس کے باوجود وہاں سے جاتے وقت وہ کسی قدر مطمئن تھا۔ اس چار دیواری سے باہر جا کر امید تھی کہ وہ مجھ سے نجات پانے کے لیے کچھ کر سکے گا۔

میں وہاں سے رضا قریشی کے گھر آیا۔ وہ میری اچانک آمد پر حیران ہوا۔ خوش ہو کر بولا۔ "آپ نے یہاں تک آنے کی زحمت کی ہے۔ میرے ساتھ رات کا کھانا ضرور کھا لیں گے۔"

رات کے آٹھ بجے تھے۔ میں نے اس کے ساتھ کھانے کے دوران اپنے تمام حالات بتائے پھر کہا۔ "آپ ابھی وہاں جائیں گے جہاں شوکت شاہنواز کو قیدی بنا کر رکھا گیا ہے۔ اس سے بچنے کا فائدہ پر تمام جرائم کا اعتراف کرائیں گے۔ کل بینک سے جو اہم دستاویزات حاصل ہو گئی ان کے مطابق بھی اس سے کائنات لکھوا کر اسے پوری طرح قانونی جیلے میں جکڑ لیں گے۔"

"آپ اطمینان رکھیں۔ وہ قانونی جیلے سے کبھی نکل

نہیں پائے گا۔ ہمیشہ آپ کے اشاروں پر ناپتا رہے گا۔" کھانے کے بعد رضا قریشی اپنے فرائض ادا کرنے کے لیے شوکت کے پاس چلا گیا۔ ان باپ بیٹے کی کشمکش سے گھر والے پریشان ہو سکتے تھے۔ لہذا انہوں نے ہمارے حکم کے مطابق فون کے ذریعے اپنے گھر والوں سے رابطہ کیا۔ بیوی بچوں سے کہہ دیا کہ وہ ضروری کام سے پنڈی گئے ہیں۔ دو چار دنوں میں واپس آجائیں گے۔ گھر والے ان کی عدم موجودگی سے پریشان نہ ہوں۔

میں اپنی رہائش گاہ میں آ گیا۔ حجاب اور عمارانی میرے انتظار میں بھوکے پیٹھے تھیں۔ میں نے ناکہ شکنے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "سوری۔ قریشی صاحب نے اپنے ساتھ کھانے کو کہا تو میں انکار نہ کر سکا۔ کھانے میں ان کا ساتھ دینا ہی پڑا۔ تمہیں آدھی رات تک انتظار نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

میں نے حجاب کو دیکھا۔ وہ مجھے دیکھ رہی تھی۔ نظریں ملتے ہی جلدی سے ناکہ کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ "یہ بھی بھوکے پیٹھے۔ ملتے پھرتے کھاتی پیتی رہتی ہے۔ اب ایسا نہ بنائے بیٹی ہے جیسے پیچاری کو بھوکا پیاسا رکھا گیا ہے۔"

وہ ہاتھ بچا کر بولی۔ "چلتے پھرتے کھانا اور بات ہے۔ رات کی روٹی تو نہیں کھاتی ہے۔" پھر اس نے میری طرف کھمک کر کہا۔ "یہ دراصل آپ پر یہ ظاہر کرنا چاہتی ہیں کہ آپ کے انتظار میں صرف یہی بھوکہ رہ سکتی ہیں۔ میں نہیں رہ سکتی۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "بھئی میں مانتا ہوں تم میری خاطر بھوکہ رہ سکتی ہو۔"

پھر میں نے حجاب سے کہا۔ "تم سے کہہ کر گیا تھا کہ مجھے دیر ہو جائے گی۔ پھر بھی تم انتظار کرتی رہیں۔" اس کا ہاتھ ناکہ کے سر پر تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ وہ سر جھکا کر مسکراتے ہوئے بولی۔ "میں بار بار دروازے اور کھڑکی طرف جاری تھی۔ باہر دور تک دیکھ رہی تھی۔ آپ کی آہٹ پر کان لگے ہوئے تھے۔ میں کیا بتاؤں مجھے بہت اچھا لگ رہا تھا۔"

جودل میں اتر جاتے ہیں۔ روح میں سما جاتے ہیں۔ ان کے پیار کے اعزاز میں ایسی ہی بے چینی ہوتی ہے جیسا کہ حجاب کی اداؤں سے ظاہر ہو رہا تھا۔ اس نے اب تک کی زندگی میں ہوس پرستوں کو دیکھا تھا۔ پہلی بار بے لوث محبوب کا چہرہ مجھ میں دیکھ رہی تھی۔

میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ میری زندگی میں جانے کتنی حسینا کئی آئی تھیں۔ کسی نے مجھے متاثر نہیں کیا تھا۔ پہلی بار وہ اپنا اثر دکھا رہی تھی۔ شاید میں اسے بھی متاثر ہو رہا تھا کہ ایک نئی اور انوکھی زندگی کا پہلا قدم اٹھاتے ہی وہ میرے اندر آ کر بیٹھ گئی تھی۔

میرا ہاتھ اس کے ہاتھ پر تھا۔ ہم ایک دوسرے کو اپنے اندر گہرائیوں تک محسوس کر رہے تھے۔ غنائے آنکھیں منکھ کر دیوں کو اوپر کی طرف گھما کر کہا۔ "یہ میرا سر ہے۔ پرندوں کا گھونسلہ نہیں ہے۔ یہ دونوں کا جوڑا اب تک بیٹھا رہے گا؟"

ہم نے ایکدم سے حسیب کر اس کے سر پر سے ہاتھ ہٹا لیے۔ حجاب نے فوراً ہی پلٹ کر آجکل سر پر رکھ لیا۔ وہاں سے جاتے ہوئے بولی۔ "میں کھانا گرم کر کے لاتی ہوں۔" وہ چلی گئی۔ میں نے مسکراتے ہوئے ناکہ سے کہا۔ "تم بہت شریر ہو۔ وہ دیواری شرماتی ہوئی گئی ہے۔" اس نے بڑی محبت سے کہا۔ "باجی شرماتی ہوئی بہت اچھی لگتی ہیں ناں...؟"

میں نے بڑے جذبے سے کہا۔ "بہت اچھی... دیکھتے رہنے کو مہیا جاتا ہے۔"

"جب آپ نہیں ہوتے تو آپ کے بارے میں اتنا بولتی ہیں اتنا بولتی ہیں کہ میں سننے سننے تھک جاتی ہوں۔"

میں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔ "کیا بولتی ہیں؟" "اب آپ مجھے تھکا دیں گے۔ یہ بہتر نہ ہوگا کہ آپ دونوں ایک دوسرے کے سامنے بولنے رہیں اور سنتے رہیں؟" میں نے خلا میں نکتے ہوئے کہا۔ "جی تو جانتا ہے وہ ہر پل میرے ساتھ رہے۔ میں اس کے ساتھ مگر ٹھکر کر رہا ہوں۔ مگر میں مصروفیت کا قیدی ہوں۔ دنیا والوں نے مجھے اپنے اپنے طور پر بکڑ رکھا ہے۔"

واقعی مجھے شدت سے احساس ہونے لگا کہ زندگی میں بہت کچھ پانے کے باوجود اب تک پیار کی کچی مسرتوں سے محروم ہوں۔ میرا خاندان دور تک پھیلا ہوا تھا۔ بیٹے بھتیجی داماد بھتیجے پوتیاں نواسے نواسیاں سب ہی رشتے تھے مگر رشتوں کی کچی محبتیں نہیں تھیں۔

یہ میں بیان کرتا رہا ہوں کہ وہ سب کس طرح میری زندگی میں زہر گھولتے رہے تھے۔ میں حوصلے اور پامردی سے زہر ہلکی بھائیوں کا تو ذکر کرتا تھا اور حجاب مجھے بڑے پیار سے جوڑ رہی تھی۔ دل کی دنیا کو بسز و شاداب بناتے ہی تھی۔ میں خوش نصیب ہوں کہ خدا مجھ سے خوش ہے۔ آئندہ



درستگی

ثمر عباس

زندگی میں ہمیشہ سب کچھ اچھا نہیں ہوتا۔ اگرچہ انسان ہزار بار پلاننگ کرتے ہوئے کوئی بھی غلط کام درست سمجھ کر انجام دے اور نتیجہ اس کے برعکس نکلے تو انسانی ذہن ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس کے بھی ایک ہاتھ میں بلین ڈالرز تھے اور دوسرا ہاتھ ایسے خالی تھا جیسے کسی مفلوک الحال کا ہو۔

لاکھوں کا وقت گزرا کہ گھر کے چندیل پانے والے کا قصہ

کے پیچھے آیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ انجینی کون ہے اور اس طرح منہ اٹھائے اس کے گھر میں کیوں ٹھس آیا ہے۔ ویسے وہ اس سے خطرہ محسوس نہیں کر رہا تھا۔ اپنے اول جلول خیلے کے باوجود وہ خطرناک نہیں لگ رہا تھا۔ پھر چچی مار کرنے اطمینان محسوس کیا کہ کی کی اور بچے گھر نہیں تھے۔ کی کی ماں کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور وہ چند دن کے لیے اس کے گھر نہیں تھی۔ بچوں کے اسکول سرماٹی چھینوں کی وجہ سے بند تھے۔ اس لیے وہ بھی ماں کے ساتھ چلے گئے تھے۔

مار کرنے لپکا کر کہا۔ ”معاف کرنا میں نے تم کو پہچانا نہیں۔ کہیں تم غلط جگہ تو نہیں آ گئے ہو؟“

”کیا تم مار کرنے نہیں ہو؟“ اس آدمی نے سوال کیا۔ ”آئیو کے ایک قصبے راک میں کے رہنے والے؟“

”ہاں میں ہی مار کرنے ہوں اور میرا تعلق راک میں سے ہی ہے۔“

اس نے دروازہ کھولا تو سامنے ایک خراب خیلے والا شخص کھڑا تھا۔ اس نے ایک میلا کپڑا اور خست حال سوٹ پہن رکھا تھا جو اتنا پرانا تھا کہ اس کی سلاخی بھی جواب دینے لگی تھی۔ اس کے بال نصف سفید تھے اور ستے ہوئے چہرے پر جھریاں نمودار ہونے لگی تھیں۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں ایک ایک سوٹ کیس اٹھا رکھا تھا۔ دروازہ کھلنے پر اس نے مسکرا کر کہا۔

”ہیلو مار کرنے!“ یہ کہتے ہوئے وہ اندر آ گیا۔ مار کرنے کے زرد دانت دیکھ رہا تھا جنہیں شاید برسوں سے برش نصیب نہیں ہوا تھا۔ اس کے پاس سے ایسی بو آ رہی تھی جیسے اس نے ایک مینے سے غسل کی زحمت نہ کی ہو۔ وہ سیدھا مار کرنے کے کمر کے بجائے لیوینگ روم میں آیا۔ اس نے سوٹ کیسر کا تکیہ پر رکھے اور خود آتش دان کے سامنے آرام کر سی پڑا۔

اس نے آنکھیں دکھائیں پھر مسکرا کر کہا۔ ”بس اتنی سی تنہائی غنیمت ہے۔ ہاتھ چھوڑیں وہ آنے والی ہے۔“

”وہ ہماری داوی اماں نہیں ہے۔ ڈرنی کیوں ہو؟“

”آپ اسے نہیں جانتے۔ دیکھ لے گی تو ہمارا ریکارڈ لگائے گی۔ جب آپ نہیں رہیں گے تو ایک سے ایک فلمی گانا منگاتے ہوئے مجھے پھیڑتی رہے گی۔“

مجھے آہٹ سی سنائی دی۔ میں نے فوراً ہی اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ واش روم کا دروازہ کھول کر تنگنائی ہوئی آ رہی تھی۔

”سامجھی میرے من کے“

”میرے تن آگن کے“

”چاہے سانس یہ چھوٹے“

”ہاتھ سے ہاتھ نہ چھوٹے“

پھر اس نے مجھ سے کہا۔ ”ہائے جی ہو! آپ نے تو ہاتھ چھوڑ دیا ہے۔“

جواب نے جھینٹے ہوئے کہا۔ ”میں پہلے ہی سمجھ گئی تھی یہ پڑیل چپ کر دیکھ رہی ہوگی۔“

میں نے ہنستے ہوئے ندا کو کھینچ کر چوم لیا۔ پھر کہا۔

”میں ایسی ہی ہستی منگنائی ہوئی پیار بھری زندگی چاہتا ہوں اور اللہ تعالیٰ ہم سے راضی ہے۔ انشاء اللہ ہم بہت ہی خوبصورت زندگی گزارتے رہیں گے۔“

میری بات ختم ہوتے ہی وہ بالکل فون چج کر رہنے لگا۔

”خوابوں کی جنت سے واپس آ جاؤ۔“

”کسی اسکرین پر انجانے نمبر نہ تھے۔ میں نے مٹن دبا کر فون کوکان سے لگایا۔ پھر بولا۔ ”ہیلو۔ فرمائیے؟“

مراد کی آواز سنائی دی۔ ”ہائے بابا جانی! ہم یقین سے کہتے ہیں۔ آپ انگاروں پر لوٹ رہے ہوں گے۔“

میرا موڈ ایکدم سے خراب ہو گیا۔ حجاب اور ندا کے ساتھ ہنستے ہوئے وقت جیسے پتھر آکر لگا تھا۔ میں نے ناگواری سے کہا۔ ”پانچ منٹ کے بعد کال کرو۔“

میں نے جواب سے بغیر فون بند کر دیا۔ پھر دونوں بہنوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”جب تک حالات سازگار نہیں ہوں گے۔ سر نہیں یونہی خواہوں کی طرح آتی جاتی رہیں گی۔“

سوری۔ میں ابھی مصروف رہوں گا۔ تم دونوں آرام سے کھاؤ پھر سوجاؤ۔ صبح ملاقات ہوگی۔“

کون چاہتا ہے کہ سرتوں کو چھوڑ کر ماتمی ماحول میں جائے؟ کیا کیا جائے جانا ہی پڑتا ہے۔

تجسس و تخیل سے بیہودہ مزید

واقعات اگلے شمارے میں

ایک نئی ازدواجی اور سرتوں بھری گھر کی زندگی گزارنے کے لیے حجاب اور ندا آگئی تھیں۔ ندانے کہا۔ ”باجی کتنی ہیں میں آپ کو بچائی جان کہا کروں مگر میں نے انکار کر دیا ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”کیوں انکار کیا ہے؟“

”مجھے اچھا نہیں لگتا۔“

”پھر کیا اچھا لگتا ہے؟“

اس نے کہا۔ ”میں آپ کو بھی بھوکھنا چاہتی ہوں۔“

”جی ہو کیوں کہنا چاہتی ہو؟“

”اس لیے کہ آپ ابھی بھائی ہیں نہ بہنوں کی۔ نہ ادھر ہیں نہ ادھر ہیں۔ اس لیے جی جی بھی نہیں کہہ سکتی۔ جی بھوکھنا چاہتی ہوں۔“

”میری طرف سے اجازت ہے۔“

”باجی کل کر اجازت نہیں دیں گی۔ اوپر سے آنکھیں دکھائیں گی مگر دل میں لٹو چھوٹے رہیں گے۔“

میں نے اس کے سر پر ہلکی سی چپت مارتے ہوئے کہا۔

”چھوٹی ہو مگر عقل کی کوئی ہو۔ باجی کو اندر سے خوب پرکتی ہو۔“

حجاب دروازے سے کھانے کی فریال لاتے ہوئے بولی۔ ”میری طرف سے ایک ہاتھ اور ماریں۔ اس نے ضرور ایسی ویسی بات کی ہوگی نہ؟“

میں نے کہا۔ ”ایسی ویسی نہیں بڑی خاص بات کہی ہے۔ یہ آج سے مجھے ہی ہو کہے گی۔“

وہ ایکدم سے شرمائی۔ اس نے سر پر آٹھل رکھتے ہوئے بہن کو گھور کر دیکھا۔ ندانے کہا۔ ”دیکھیں جی ہو! یہ آنکھیں دکھائیں گی۔ اب ذرا ان کے دل کا حال پوچھیں؟ میں کھانے سے پہلے ہاتھ ضرور دھوتی ہوں۔“

وہ وہاں سے اٹھ کر دوڑتی ہوئی واش روم میں چلی گئی۔ حجاب نے میز پر ڈشیں رکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ بہت بولنے لگی ہے۔“

”اور جو بات بولتی ہے وہ دل گوشتی ہے۔ ہے ناں؟“

وہ زرب مسکرائے لگی۔ ڈشیں رکھنے کے لیے قریب آئی تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کے ہاتھ کی لکیریں کہتی تھیں کہ وہ بھی میری طرح بدترین حالات سے گزرتی آئی ہے۔ وہ حالات کی ماری تھی۔ میں رشتوں کے لہو کا مارا تھا۔ خدا نے ہمیں پیاد کی مٹی چھاؤں میں پہنچا دیا تھا۔

وہ واش روم کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”ہاتھ چھوڑیں۔“

”ہاتھ چھوڑوں گا تو تنہا رہ جاؤں گا۔“

”اطمینان رکھیں میں آپ کو تنہا چھوڑنے نہیں آئی ہوں۔“

”تو پھر تنہائی میں ملو۔“

”گند۔۔۔ جب میں تمہارے پاس ہی آیا ہوں۔“ اس نے کہا اور سوت کیسر کی طرف اشارہ کیا۔ ”ان میں تقریباً دو ملین ڈالر زامیت کا سوتا ہے۔“

مارکر نے ابھمن زدہ نظروں سے اسے دیکھا۔ ”اگر اس میں دو ملین ڈالر زامیت کا سوتا ہے تو اس سے میرا کیا تعلق بنتا ہے؟“

”تعلق ہے۔۔۔۔۔ ذرا آج سے چندہ سال پہلے کا وقت ذہن میں لاؤ جب تم نے کسی سے کہا تھا کہ تم محنت کر کے ملینیر بن سکتے ہو اور اس نے کہا تھا ایسا ہونا بہت مشکل ہے۔ ملینیر بننے کے لیے آدمی کو دوسرے راستے اپنانے پڑتے ہیں۔ کچھ یاد آیا؟“

مارکر کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا تھا۔ اس نے بے ساختہ کہا۔ ”فرینک۔۔۔۔۔ تم فرینک گارڈنر ہو؟“

وہ مسکرا دیا اور کہا۔ ”ہاں میں فرینک ہوں اور میں نے اپنا چٹچ پورا کر دیا ہے۔ میں نے ایک کے بجائے دو ملین ڈالر کمائے ہیں اب تم ہمارے دو ملین ڈالر میں تم نے کیا کیا ہے؟“

مارکر ششدر رہ گیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا اس کے پاس کوئی جواب نہ ہو۔

☆☆☆

راک میں امریکا کی مثال وسطی ریاست آئیڈا کا ایک معمولی سا قصبہ تھا۔ ایک زمانے میں اس کی وجہ شہرت یہاں پانی جانے والی سونے کی چند کانیں تھیں۔ امریکا میں زیادہ تر سونا ٹیکساس، کیلیفورنیا اور ایریزونا کی ریاستوں میں پایا جاتا ہے۔ مثال میں سونے کی گئی جتنی کانیں ہیں جن میں سے کچھ راک میں ہیں۔ انیسویں صدی کے وسط تک ان کانوں سے تقریباً سارا سونا نکال لیا گیا تھا۔ اس کے بعد حکومت کی طرف سے ان کانوں کو بند کر دیا گیا تھا تاکہ سونے کے شوقیہ کان کن ان میں محسوس کر اپنی جان خطرے میں نہ ڈالیں۔ حکومت نے کان میں آمد و رفت کے تمام راستے بند کر دیے تھے۔ اس کے باوجود لوگ چوری چھپے کانوں میں محسوس کر سونا نکالنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس میں خطرہ بہت زیادہ ہوتا تھا کیونکہ ایک تو یہ لوگ بغیر کسی حفاظتی انتظام کے چلے جاتے تھے اور دوسرے کانوں کی حالت خستہ ہو چکی تھی اور اس میں اکثر سرگرمی خدوش تھیں۔

کانوں میں چوری جیسے جانے والے چند افراد حادثات میں مارے بھی گئے۔ یہ دوسری جنگ عظیم کا زمانہ تھا۔ مقامی حکومت نے اس بار کانوں کے راستے بند کرنے کے ساتھ وہاں پولیس کا پتہ بھی لگا دیا اور اگر کوئی پھر کانوں میں گھسنے کی کوشش کرتا تو اسے گرفتار کر لیا جاتا تھا۔ اس کے بعد لوگوں نے

کانوں میں گھسنا بند کر دیا تھا اور پھر اس بات کو نصف صدی سے بھی زیادہ وقت گزر گیا۔ اس لیے سب بھول بھال گئے تھے۔

مارکر اور فرینک راک میں میں ہی پیدا ہوئے تھے۔ یہ آج سے کوئی پچاس برس پرانی بات تھی۔ اس وقت راک میں ترقی کر رہا تھا۔ ایک ہالی وے اس کے پاس سے گزرنے لگی تھی اور پھر نزدیک ہی ایک انڈسٹریل کمپلیکس بن گیا تھا، جہاں قصبے کے لوگوں کو مناسب روزگار ملنے لگا تھا۔ ورنہ اس سے پہلے اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کے لیے راک میں کوئی روزگار نہیں تھا۔ جب صنعتیں لگیں تو راک میں کی آبادی بھی بڑھنے لگی تھی۔ ورنہ اس سے پہلے یہ معمولی سا قصبہ تھا۔

مارکر اور فرینک کی پیدائش میں صرف چند گھنٹے کا وقفہ تھا۔ اتفاق سے ان کے گھر ایک ہی گلی میں تھے اور ان کے گھر والوں میں بھی اچھے تعلقات تھے۔ ان کے باپ ایک ہی کارخانے میں کام کرتے تھے جو آپس میں دوست بھی تھے۔ ان کی ماؤں کا ایک دوسرے کے گھر آنا جانا تھا۔ کبھی کبھی وہ بچک منانے بھی ایک ساتھ چلے جاتے تھے۔ جنگل میں فرینک کے باپ کا ایک سین تھا جس کے پاس ہی جھیل تھی جہاں سے وہ مچھلیاں پکڑتے تھے اور کبھی کبھی انہیں خرگوش کا شکار مل جاتا تھا۔

ایسے میں مارکر اور فرینک کا بھی آپس میں دوست بن جانا فطری بات تھی اگر وہ دوست نہ بننے تو یہ جب کی بات ہوتی۔ دونوں ہمیشہ آپس میں کھیلتے۔۔۔۔۔ اور جب اسکول میں داخل ہونے کا وقت آیا تو ایک ہی اسکول میں داخل ہوئے تھے۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی دوستی بڑھتی گئی۔ اس دوران میں راک میں بھی ترقی کر رہا تھا اور جب انہوں نے ہائی اسکول پاس کیا تو راک میں ایک اچھا پڑا قصبہ بن گیا تھا۔

مارکر اکثر وکس میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتا تھا جبکہ فرینک کے ذہن میں واضح نہیں تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ مارکر پاس ہی ایک فنی کانج میں داخل ہو گیا تو فرینک نے ایک عمومی تعلیم کے کانج میں داخلہ لے لیا۔ جب تک اس نے گریجویشن کیا مارکر نے فی ٹیک مکمل کر لیا۔ اب اس کا ارادہ مزید پڑھنے کا تھا لیکن مارکر کے باپ نے اس کی مزید تعلیم کا بوجھ اٹھانے سے معذرت کر لی تھی۔ کیونکہ وہ ریٹائرمنٹ کے پاس تھا اور چاہتا تھا کہ اپنے بڑے بچے کے لیے کچھ رقم جمع کر لے۔ اس لیے مارکر نے ملازمت کا فیصلہ کیا اور اس نے راک میں انڈسٹریل کمپلیکس میں ایک کارخانے میں ملازمت حاصل کر لی۔ اگرچہ اس کی تنخواہ کم تھی۔ صرف دو سو پچاس ڈالر ہفتہ وار اور وہ اس میں صرف اپنا گزارا کر سکتا تھا لیکن امکان تھا کہ تنخواہ بڑھ جائے گی اور وہ بچت کر کے مزید

تعلیم کا خواب پورا کر سکے گا۔

کانج میں پڑھنے کے دوران میں وہ ہاسٹل میں رہا کرتا تھا کیونکہ کانج میں سے کوئی سوسیل کے فاصلے پر تھا لہذا روز آنا جانا ممکن نہیں تھا۔ اس لیے وہ صرف ہفتہ واری چھٹی پر آتا تھا۔ اس وجہ سے ان دنوں اس کا فرینک سے ملنا جانا بھی کم ہو گیا تھا۔ اس لیے اسے نہیں معلوم تھا کہ فرینک ان دنوں کس چکر میں ہے۔ جب اس نے راک میں میں ہی ملازمت کر لی اور مستقل طور پر رہیں آ گیا تو وہ پہلی بار تفصیل سے فرینک سے ملا اور تب اسے اندازہ ہوا کہ وہ کس چکر میں پڑ گیا ہے۔ وہ فرینک کے گھر گیا تو اس کا کمراسو نے کی کان کنی سے متعلق کئی یوں اور سامان سے بھرا ہوا تھا۔ مارکر یہ سب دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔

”فرینک یہ سب کیا ہے؟“

”بوجھ دیکھ رہے ہو۔“ اس نے جواب دیا۔

”لیکن کیوں؟“

”کیونکہ میں سونے کی کان کنی کرنا چاہتا ہوں۔“

”سونے کی کان کنی۔۔۔۔۔ لیکن یہ تو بہت خطرناک کام ہے۔“ مارکر نے بے ساختہ کہا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ فرینک کا مقصد کیا ہے۔ وہ واک میں ان کی ترسوک کانوں میں محسوس کرنا حاصل کرنا چاہتا تھا جو کشت و زحہ سو سال سے بند پڑی تھیں اور ان کے اندر کی حالت یقیناً بہت خراب ہو چکی تھی۔ ان میں سے کسی کان میں داخل ہونا اپنی جان داؤ پر لگانے کے مترادف تھا۔ مارکر نے یہ بات کہی تو فرینک نے اطمینان سے کہا۔

”ہاں میں اپنی زندگی کا جو اکیلوں گا اور اگر میں کامیاب۔۔۔ رہا تو میں ملینیر بن جاؤں گا۔“

”ملینیر بننا اتنا آسان نہیں ہے۔“ مارکر نے نفی میں سر ہلایا۔

”میں نے جو سوچا ہے اس میں آسان ہے۔“

”تم کانوں میں جا کر سونا نکالنا چاہتے ہو، کیا تمہیں ان کانوں کے بارے میں نہیں معلوم وہ کتنی خطرناک ہیں؟“

”مجھے معلوم ہے۔“

”تجتنے لوگ ان کانوں میں جانے کے بعد اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔“

”یہ بھی معلوم ہے۔“ فرینک کا لہجہ پرسکون رہا تھا۔

”پھر بھی تم یہ حماقت کرنے جا رہے ہو؟“

فرینک نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”ہاں کیونکہ اگر میں زندہ رہا تو میں ملینیر بن جاؤں گا۔ میں اتنا سونا حاصل

قارین متوجہ ہوں

قارین حکیمہ ہی ہتھکنڈہ آہستہ و احاد پیشہ نبی کی آپ کسے دینی مصیقت میں اٹھانے اور تہلیل کے لیے مبالغہ کی جاتی تھیں ان کا احتیاط آپ پیشہ ہیں۔ لہذا احسن صلیکات پر بات اور احادیث درج میں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بتاتے ہیں۔

کر لوں گا۔ جب کہ تم مزید تعلیم حاصل کر لو اور اچھی نوکری حاصل کر لو جس میں تمہیں بہترین تنخواہ بھی ملے تب بھی تم ملینیر نہیں بن سکتے۔“

”میں نے بھی سوچا بھی نہیں ہے۔ میرا مقصد تو اپنا کیریئر بنانا ہے۔“

”تو میں بھی اپنا کیریئر بنانے جا رہا ہوں۔“

”تم اپنی زندگی داؤ پر لگا رہے ہو۔“

”زندگی تو سب کی داؤ پر لگی ہوتی ہے۔ تم کارخانے میں کام کرتے ہو۔ وہاں تم کسی حادثے کا شکار ہو سکتے ہو، سڑک پر کوئی حادثہ تمہیں دنیا سے رخصت کر سکتا ہے۔ حد یہ کہ تم گھر میں بیٹھے بیٹھے موت کا شکار ہو سکتے ہو۔“

”وہ ناگہانی موت ہوگی لیکن اس طرح خود چل کر موت کے منہ میں جانا کہاں کی عقل مندی ہے۔“

”عقل مندی اس میں ہے کہ جو چیز میں آنے والے دس پندرہ سال محنت کر کے حاصل نہیں کر سکتا ہوں وہ میں یہاں سے یقینی طور پر حاصل کر لوں گا۔“

”یہ ممکن نہیں ہے۔ ان کانوں میں اتنا سونا کہاں ہے؟“

”سونا ہے۔ بس اسے نکالنے کے لیے محنت و محنت کی اور صبر کی ضرورت ہے۔ میں نے پلان بنالیا ہے کہ مجھے کس طرح کام کرنا ہے۔“

”کس طرح کام کرنا ہے؟“ مارکر نے غیر ارادی طور پر پوچھا۔ اس کا ذہن الجھ گیا تھا۔ اسے فرینک جیسے ذہین آدمی سے اس بات کی توقع نہیں تھی۔

”میں نے پایا ہے جنگل والا کانج مانگ لیا ہے۔ میں ہفتے میں دو دن برٹش کے کینے میں کام کروں گا، کیونکہ ویک اینڈز پر یہاں بہت رش ہوتا ہے اور اسے زیادہ آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ دو دن کام کر کے میں اتنا کمالوں گا کہ میرا ہفتے بھر آسانی سے گزارہ ہو جائے گا۔“

”باقی پانچ دن تم کیا کرو گے؟“

”باقی پانچ دن میں سونا تلاش کروں گا۔“

”کان میں محسوس کر؟“

”نہیں۔“ فریک نے کہا اور مارکر کو ایک کاغذ دکھایا۔
 ”میں نے حکومت سے کانوں کے درمیان ایک ایکڑ زمین پر
 کام کرنے کا لائسنس حاصل کر لیا ہے۔“
 ”کام کرنے کا؟“ مارکر نے حیرت سے کہا۔ ”یعنی تم
 نے کان کنی کا لائسنس حاصل کیا ہے؟“
 ”لائسنس کام کرنے کا ہے، کان کنی کا نہیں ہے۔“
 فریک نے منہ ہٹایا۔ ”کان کنی کا لائسنس ایسے نہیں ملتا ہے۔“
 ”جب تم کیا کرو گے؟“

”میں اس زمین پر کھدائی کروں گا اور گڑھا بنا کر مٹی
 نکالوں گا اور پھر اسے پھیل کے پانی سے صاف کر کے اس
 سے سونا نکال لوں گا۔ اس میں وقت اور محنت تو بہت چاہیے
 لیکن مجھے کانوں میں کھسکا نہیں پڑے گا اور میں آسانی سے
 کام کر سکوں گا۔“
 ”سونا کیسے نکالو گے؟“

”میں نے اس سال گرمیوں کی چٹیلوں میں ٹیکساس
 کی سونے کی ایک کان میں کام کیا ہے اور مجھے تجربہ ہو گیا
 ہے۔“ فریک نے جواب دیا۔ ”اس کے علاوہ میں نے کچھ
 اوزار اور مشینیں بھی جمع کر لی ہیں جو اس سلسلے میں کام آتی
 ہیں۔ ان سے مجھے محنت نہیں کرنا پڑے گی اور میں کم وقت میں
 زیادہ کام کر سکوں گا۔“

مارکر سوچ رہا تھا۔ ”اس کام میں سالوں لگ جائیں گے۔“
 ”تقریباً پندرہ سال۔“ فریک نے اطمینان سے کہا
 ”جیسے پندرہ سال نہیں پندرہ دن یا پندرہ ہفتے کہہ رہا ہوں۔“
 ”پندرہ سال....“ مارکر دنگ رہ گیا تھا۔ ”تمہیں پتا
 ہے تم کیا کہہ رہے ہو؟“

”ہاں ایک عام آدمی کو ملینیر بننے میں اتنا وقت تو لگ
 جاتا ہے۔ وہ بھی اگر اپنا کام کر رہا ہو۔ اگر نوکری کرے گا تو
 ریٹائرمنٹ تک ملینیر نہیں بن سکتا۔“

”پھر بھی پندرہ سال ایک طویل عرصہ ہوتا ہے۔ تم
 ساری دنیا سے کٹ کر بس اسی کام میں لگے رہو گے۔“

”نہیں ہفتے میں دو دن میں اسی دنیا میں گزاروں گا۔“
 فریک نے جواب دیا۔ ”یہ دونوں مجھے تنہا ہونے سے بچائیں گے۔“
 مارکر کو اب احساس ہو رہا تھا کہ فریک نے جو کیا تھا
 بہت سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ اس نے شاید فطرت کو بھی کم کر لیا اپنے
 لیے۔ مارکر حیران تھا۔ بیس سال کی عمر میں اس نے کتنی مہارت
 سے یہ سب طے کر لیا تھا۔ شاید اس لیے کہ اس نے اسے اپنا
 مقصد بنایا تھا اور جب انسان کسی کام کو اپنا مقصد بناتا تو وہ
 سب کچھ کر لیتا ہے۔ مارکر کو اس وقت لگا تھا کہ فریک کا مایاب

ہو جانے کا لیکن اسے یہ سب بہت عجیب سا لگ رہا تھا کہ ایک
 شخص شخص دولت کے حصول کو اپنا مقصد بنالے اور اس کے لیے
 ساری دنیا کو چھوڑ کر بس اسی میں لگ جائے۔ وہ بھی ایک دو تین
 برس کے لیے نہیں پورے پندرہ برس کے لیے۔

مارکر نے ہنسیا کر کہا۔ ”یاد رہے بہت طویل عرصہ نہیں ہے
 جب میں اپنی جوانی کے دن لڑکیوں کے ساتھ تفریق کا ہوں
 اور نائٹ کلبس میں گزروں گا۔ جب ہم سب دوست مل کر
 پارٹیاں کریں گے اور ٹیکس منانے جائیں گے تو تم سب سے
 الگ ایک ویرانے میں ہو گے۔“

”ہاں لیکن اس دوران میں مجھے وہ مل جائے گا جو تم
 سب تفریحات کر کے بھی حاصل نہیں کر سکو گے۔“ فریک
 نے جواب دیا۔ ”جب تم یہ ساری تفریحات کر کے تھک جاؤ
 گے اور زندگی کی جدوجہد شروع کرو گے تو تمہیں معلوم ہوگا
 کہ بہترین وقت جو کمانے میں استعمال ہو سکتا تھا تم نے
 تفریحات میں ضائع کر دیا اور اب تم مجھے ہونے نیم اور
 ذہن کے ساتھ زندگی کی دوڑ میں شامل ہو گے۔ جب کہ میں
 کمانے کے بعد تازہ دم ہو کر اس طرف آؤں گا۔“

مارکر نے شانے اچکائے۔ ”یہ تمہاری سوچ ہے جو
 عام سوچ سے الگ ہے۔ ورنہ میں نے کسی کو پچھتاتے نہیں
 دیکھا ہے۔ دوسرے ہمیں کمانے کی کوشش کرنی چاہیے لیکن
 سب چھوڑ کر صرف اسی کا ہونا بھی ٹھیک نہیں ہے۔“

مارکر اور فریک ایک دوسرے سے جھگڑتے رہے
 لیکن ایک دوسرے کو قائل نہیں کر سکے۔ فریک اپنا ذہن بنا چکا
 تھا اور اب وہ اپنے فیصلے پر اٹل تھا۔ مارکر نے مایوسی سے
 کہا۔ ”مجھے نہیں لگ رہا کہ تمہارا منصوبہ کامیاب ہوگا۔“

فریک بولا۔ ”شرط لگاتے ہو.... آج سے پندرہ
 سال بعد ہم میں سے کون ملینیر بن جائے گا۔“

”اس میں شرط لگانے والی بات ہی نہیں ہے۔“ مارکر
 نے کہا۔ ”کیونکہ تم میں سے کوئی شرط نہیں لگا رہا ہوں۔“

”لیکن تم یہ تو کہہ رہے ہو کہ میں ملینیر نہیں بن سکتا۔“
 اس پر تو شرط لگاتے ہو؟“

مارکر کے خیال میں یہ بات فریک کے منصوبے کی
 طرح فضول اور احمقانہ تھی۔ اسے یقین تھا وہ پندرہ سال میں
 جبکہ مارکر واپس آ جائے گا اور اس وقت اسے افسوس ہوگا کہ
 اس نے پندرہ سال بھی کیوں ضائع کیے اور اگر وہ اس سے
 جلدی آ گیا تو یہ اس کی خوش قسمتی ہوگی۔ اس نے کہا۔ ”ٹھیک
 ہے اگر تم ملینیر بن گئے تو تم جو کچھ میں مان لوں گا۔“

”اور اگر میں ملینیر نہیں بن سکا تو تم کہو گے میں وہاں لوں گا۔“

فریک اسے دو دن بعد اس زمین پر لے گیا جو اس
 نے حکومت سے حاصل کی تھی۔ یہ اس کے لیکن سے بہ مشکل
 ایک فرلانگ کے فاصلے پر تھی۔ لیکن کے پاس ہی پھیل
 تھی۔ فریک نے مٹی سے سونا نکالنے والی مشین چھی لے لی تھی
 لیکن فی الحال وہ اسے یہاں نہیں لایا تھا۔ اس کے پاس ایک
 چھوٹا ٹریکٹر اور اس کے ساتھ مٹی لانے والی ٹرالی بھی
 تھی۔ اس میں ایک ہائیڈروک جیک بھی لگا تھا۔ جو گڑھے
 سے مٹی کھینچنے کے کام آتا۔ مارکر نے فریک سے کہا۔ ”یہ کام
 ایک آدمی کے بس کا نہیں ہے۔“

”نہیں ایک آدمی کام کر سکتا ہے لیکن اس میں وقت بہت
 لگے گا۔ کیا پندرہ سال اس مقصد کے لیے کافی نہیں ہیں؟“

مارکر نے سوچا اور سر ہلایا۔ ”ہاں پندرہ سال بہت ہیں
 لیکن کیا ایک شخص اپنی زندگی کا اتنا طویل عرصہ کسی ایک ہی
 کام کے لیے مخصوص کر سکتا ہے؟“

”لوگ کرتے ہیں۔ کیا لوگ دس دس سال کے لیے
 انٹارکٹیکا جا کر نہیں رہتے ہیں۔ خلائی اسٹیشن میں خلا باز تین
 تین سال گزارتے ہیں اور بھی بے شمار کام ہیں جو انسان کوئی
 سال تک دوسروں سے کٹ کر کرتا ہے۔“

”یہ سارے کام بڑے مقاصد کے تحت کیے جاتے ہیں ان
 میں ذاتی مفاد سے زیادہ انسانیت کی فلاح نظر ہوتی ہے۔“
 ”نہیں بڑا ذریعہ یہ بھی ہوا کام ہے۔“

مارکر اگرچہ اسے روکنے کا ارادہ ترک کر چکا تھا لیکن
 پھر بھی اس کے منہ سے بے اختیار ایسی باتیں نکل جاتی
 تھیں۔ پھر فریک نے کام شروع کر دیا۔ اس دوران میں اس
 نے لیمن میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ کوئی ایک مہینے بعد مارکر
 اس سے ملنے گیا۔ جب وہ وہاں پہنچا تو فریک گڑھے کی
 کھدائی میں مصروف تھا۔ ایک مہینے میں اس نے کوئی بیس فٹ
 گہرا اور تیس فٹ قطر کا گڑھا کھود لیا تھا جو چاروں طرف سے
 بتدریج ڈھلان کی صورت میں تھا۔ گڑھے کے اندر آنے
 جانے کے لیے فریک نے سی کی دو سیڑھیاں لگا رکھی
 تھیں۔ اوپر ٹریکٹر خزانے کے کھڑا تھا اور فریک نکالی جانے
 والی مٹی اس میں بھر کر کہیں دور پھینک آتا تھا۔ یہ بہت زیادہ
 مشقت والا کام تھا جیسے کوئی چوٹی دھیرے دھیرے کسی پہاڑ کو
 کھوکھا کر رہی ہو۔ اس میں واقعی برسوں کا عرصہ درکار تھا۔

مارکر کو دیکھ کر فریک گڑھے سے نکل آیا۔ وہ مٹی میں
 لت پت ہو رہا تھا۔ اس نے گڑھے کی طرف اشارہ کیا اور فر
 سے بولا۔ ”دیکھو صرف ایک مہینے میں، میں نے اتنا بڑا گڑھا
 کھود لیا ہے۔“

”سونے کی کان کنی کا یہ کون سا طریقہ ہے؟“
 ”یہ طریقہ جنوبی امریکا میں استعمال کیا جاتا ہے کیونکہ
 وہاں پر زمین مٹی والی ہے اور بارشیں بہت ہوتی ہیں۔ اس
 لیے سرنگیں بنانے کی صورت میں ان کے پیٹھ جانے کا خطرہ
 ہوتا ہے اس لیے وہاں گڑھے کھود کر اس سے مٹی نکالی جاتی
 ہے اور اس مٹی سے سونا برآمد کیا جاتا ہے۔“
 مارکر نے سر ہلایا۔ ”اور یہ سونے والی مٹی کتنی گہرائی
 میں ہے؟“

”کوئی تیس فٹ کی گہرائی میں۔“ اس نے کہا۔ ”جب
 میں تیس فٹ تک گڑھا کھودوں گا تو سونے والی مٹی نکلنے لگے
 گی اور جیسے جیسے گڑھے کی تہ گہری ہوگی میں زیادہ مقدار میں
 مٹی نکال سکوں گا۔“

”مٹی سے کس تناسب سے سونا نکلے گا؟“
 ”ایک سو گرام مٹی سے تقریباً ایک گرام سونا نکل
 آئے گا۔ یعنی ایک ٹن مٹی سے دس گرام سونا۔“

”ایک ٹن مٹی تم کتنے دن میں صاف کر لو گے؟“
 ”نیر اخیال ہے میں ایک دن میں ایک ٹن مٹی صاف

یمنی احمد

کی شاعری کا مجموعہ

صحرا ہو کہ ساون

شائع ہو گیا ہے

قیمت: 250 روپے

خوبصورت کام، دلکش کاغذ اور دیدہ زیب ترتیب
 پر مشتمل اندرون صفحات دو گرا اور سرورق نور گھر

رابطے کے لیے رجوع کریں

دیکم بک پورٹ اردو بازار کراچی

فون نمبر: 0306-2939936
 ای میل: y_sehrahoksawan@yahoo.com

اسرارِ سبیل

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

نورِ نوسے لندی کو تل تک

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زر سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 600 روپے

امریکا، کینیڈا، برطانیہ اور نیوزی لینڈ کے لیے 5500 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 4500 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد
رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے
ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر
رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیادوں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

رقم ڈیماٹ ڈرافٹ، منی آرڈر یا ویسٹرن یونین کے
ذریعے بھیجی جاسکتی ہے۔ مقامی حضرات دفتر میں نقد
ادائیگی کر کے رسید حاصل کر سکتے ہیں

رابطہ دفتر عباس

(فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیئر 3، کینڈیشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 35895313 ٹیکس: 35802551

کہ ابھی مارکر گھنٹوں کے بل اس کے سامنے کھڑا ہو کر تسلیم
کر لے گا کہ وہ غلطی پر تھا اور فریک نے ٹھیک کیا تھا۔ آج وہ
دو ملین ڈالرز مالیت کے سونے کا مالک تھا۔ وہ سوچا جو اس نے
اپنے پندرہ سال لگا کر جمع کیا تھا۔

”شاید تمہیں یقین نہیں آ رہا ہے۔“ فریک نے اسے
خاموش دیکھ کر کہا اور اٹھ کر دونوں سوٹ کیمرہ کھول دیے
تھے۔ ان میں اوپر تک سونے کی اینٹیں رکھی تھیں۔ ”یہ پورے
پچاس کلوگرام سونا ہے۔“

”تم نے اسے پندرہ سالوں میں جمع کیا ہے؟“ مارکر
نے پوچھا۔

”تقریباً۔“ اس نے جواب دیا۔ ”تم جانتے ہو میں
اکیلا آوی تھا۔ سردی کے تین مہینے کا ویسے ہی نہیں ہو سکتا تھا۔
گڑھا برف سے بھر جاتا تھا۔ پھر وقفہ وقفہ سے ہونے والی
بارشیں بھی کام میں خلل ڈالتی تھیں۔ ایک بار بارش ہو جاتی تو
پانی ٹکائے میں کئی دن لگ جاتے تھے۔ پوچھ لو کہ میں نے
آٹھ ملین سال میں صرف چھ مہینے کام کیا اور اتنا سونا جمع کر
لیا۔“ فریک کے لہجے میں خراہ گیا تھا۔ ”تم اسے پندرہ کے
 بجائے ساڑھے سات سال کی محنت کا ثمر بھی کہہ سکتے ہو۔“

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ تم اس وقت
پچیس برس کے ہو اور مجھے میں چالیس کے لگتے ہو۔“
”مجھے تسلیم ہے۔ اس محنت نے مجھے تھوڑا کیا ہے۔ مجھے
جسمانی طور پر نقصان ہوا ہے لیکن مجھے اپنے آنے والے کل
کی کوئی فکر نہیں ہے۔ اس رقم کو کہیں بھی انویسٹ کر کے میں
آرام سے باقی زندگی بچھ کے بغیر گزار سکتا ہوں۔“
”زندگی بچھ کے بغیر گزارا کرنے کا نام نہیں ہے۔“
مارکر نے آہستہ سے کہا۔

فریک نے فاحشانہ انداز میں اسے دیکھا۔ ”اب تم
مان گئے ہو گے کہ میں نے ٹھیک کیا تھا؟“
”اس کے برعکس مجھے پہلے سے زیادہ افسوس ہو رہا
ہے کہ تم نے یہ سب کیا۔ تم نے اپنے اوپر بھرپور سوار کرنے اور
اپنی ذاتی قابلیت بڑھانے کے بجائے محض سونا جمع کرنے پر
اپنا سارا وقت اور جوانی لگا دی۔“

فریک کا منہ بن گیا تھا۔ ”چلو تم نے اسے نہیں کیا... یہ
بتاؤ کہ تم نے کیا کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس گھر سے لگ رہا
ہے کہ تم نے تعلیم بھی حاصل کی ہے اور کوئی اچھی نوکری بھی کر
رہے ہو لیکن کیا تمہارے پاس ایک ملین تو چھوڑو ایک لاکھ
ڈالرز بھی ہیں۔“

”نہیں اگر میرا بینک اکاؤنٹ دیکھو تو اس میں شاید

نے ایک سال اور کام کیا اور جب پہلی بار امید سے ہوئی تو اس
نے مارکر کے اصرار پر نوکری چھوڑ دی۔ پہلے سام ہوا اس کے
بعد جونی ہوئی اور سب سے آخر میں میٹس دنیا میں آیا تھا۔

مارکر کی تنخواہ اچھی ہوئی تو اس نے سب سے پہلے
قسطوں پر مکان لے لیا۔ یہ مکان ماریٹا کی خواہش کے عین
مطابق تھا۔ اس میں ہر سہولت موجود تھی۔ رہی سہی کسر ماریٹا
نے اسے اپنی خواہش کے مطابق سجا کر پوری کر لی۔ اوپر سے
تین بچوں کی پیدائش سے مارکر کو مالی لحاظ سے کچھ پریشانی
تو ہوئی تھی لیکن اس نے ماریٹا کے اصرار کے باوجود اسے
نوکری کی اجازت دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ
ماریٹا کے نوکری کرنے سے انہیں رقم کی فکر تو نہیں رہے گی لیکن
دوسری بہت ساری پریشانیاں لاحق ہو جائیں گی۔ اس لیے
بہتر ہے وہ چھوڑی سی مالی پریشانی برداشت کر لیں۔ ان دنوں
مارکر اپنے کام سے متعلق کچھ کوس بھی کر رہا تھا جن کی فیس
ادا کرنے کی وجہ سے اس کے گھر کا بجٹ ذرا آؤٹ ہو گیا تھا۔

لیکن یہ پریشانی عارضی ثابت ہوئی تھی۔ ایک سال میں
مارکر نے یہ کورس مکمل کر لیے اسے اپنی میں انجینئر بنا دیا گیا اور
اس کی تنخواہ ڈیڑھ گنا ہو گئی تھی۔ اب اسے کوئی مالی مسئلہ نہیں رہا
تھا۔ ان دنوں میٹس ذرا بڑا ہو گیا تھا اور اسے دیکھ بھال کی بہت
زیادہ ضرورت نہیں تھی اس لیے پورے دو سال بعد مارکر بیوی
بچوں کو لے کر کہیں تقریباً چار بجے کے لیے نکل گیا۔ اس کی
ملازمت نیویارک سے ذرا دور تھی۔ اتفاق سے اس کا پلاٹ
اس کے گھر سے چند منٹ کی ذرا دور تھا۔ اس لیے اسے جواب
پر آنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی تھی۔

راک مین سے ٹھٹھے کے بعد اسے دو بار ہی وہاں
جانے کا اتفاق ہوا ایک بار اپنے باپ کی تدفین پر اور دوسری
بار ہائی اسکول کی سالانہ تقریب میں گیا تھا۔ دونوں بار اسے
وہاں چند دن سے زیادہ رہنے کا موقع نہیں ملا تھا اور اس کے
ذہن میں خیال بھی نہیں آیا کہ وہ فریک کے بارے میں معلوم
کرے یا اس جگہ جا کر اسے دیکھے جہاں وہ آخری بار اس سے
ملاقات۔ اصل میں فریک اس کے ذہن سے ہی محو ہو گیا تھا۔

☆☆☆

اب چاکا ہی فریک سامنے آیا تو اسے وہ سب یاد
آ گیا تھا اور اسے تعجب بھی ہوا کہ وہ اپنی زندگی کی ان اہم
ترین یادداشتوں کو کس طرح فراموش کر بیٹھا تھا۔ شاید اسی کا
نام زندگی ہے۔ گزرا کل مکتا ہی اہم کیوں نہ ہو آنے والوں کا
اس سے زیادہ اہم ہو جاتا ہے۔ فریک اس کے سامنے
فاحشانہ انداز میں بیٹھا اسے یوں دیکھ رہا تھا جیسے اسے توقع ہو

کر لوں گا۔“ فریک نے یقین سے کہا۔

مارکر کو یقین نہیں آیا تھا کہ وہ ایک دن میں اتنی مٹی
چھان کر اس سے سونا نکال سکے گا۔ بہر حال یہ مرحلہ ابھی دور
تھا۔ فریک گڑھا اس طرح کھود رہا تھا کہ اس کی دیواریں
ڈھلائی رہیں اور ان کی تہ میں گرنے کا امکان باقی نہ
رہے۔ مارکر کچھ دیر اس کے ساتھ رہا پھر واپس آ گیا۔ اس
کے بعد وہ دو تین بار اور فریک سے ملنے گیا۔ وہ مستقل مزاجی
سے اپنے کام میں لگا ہوا تھا۔ پھر مارکر کو ایک اور اچھی
ملازمت مل گئی اور اسے اس کے لیے رچ موٹ جانا پڑا جو اس
کے قبضے سے کوئی تیرہ سو کلو میٹر کے فاصلے پر مشرق میں بحر
اوقیانوس کے ساحل کے ساتھ تھا۔ مارکر کو وہاں ایک
ایلیکٹرونکس کے کارخانے میں اچھی پوسٹ ملی تھی۔ ایک سال
بعد اس کی تنخواہ اچھی ہو گئی تھی اور اس نے دو سال کی ملازمت
میں بچت کر کے اتنا جمع کر لیا کہ ملازمت چھوڑ کر نیویارک
میں ایک اچھے کالج میں ایم ٹیک میں داخلہ لے لیا تھا۔ صبح
سے شام تک وہ کالج اور پھر لیب میں مصروف رہتا تھا اور
رات کو ایک بار میں پارٹ ٹائم کام کرتا تھا کیونکہ اس کے
پاس اتنی رقم نہیں تھی کہ تعلیمی فیس ادا کرنے کے ساتھ اپنا
گھر گزارا کر سکے۔ اپنے لیے اسے رقم کی ضرورت تھی۔ اس
لیے اس نے یہ ملازمت کر لی تھی۔ اگرچہ اس وجہ سے اسے
سونے کا موقع کم ملتا تھا کیونکہ بارے اس کی چھٹی بارہ بجے
ہوتی تھی اور گھر آ کر سوتے سوتے اسے ایک بج جاتا تھا۔ صبح
سات بجے اٹھ کر وہ پھر سے ایک مصروف دن کے لیے تیار ہو
جاتا تھا۔ پانچ بجے کالج سے آنے کے بعد وہ تین گھنٹے میں
اپنے کام نہ ٹالیتا تھا۔ کھانا بنا کر کھاتا اور آٹھ بجے بار میں اپنی
ڈیوٹی پہنچ جاتا تھا۔

دو سال بعد اس نے ڈگری حاصل کر لی تھی۔ شروع
میں اسے ایک سال مشکل ہوئی پھر اسے ایک اچھی کمپنی میں
ملازمت مل گئی جو مختلف ایلیکٹرونکس کے سامان کے لیے
ایلیکٹرونکس سرکٹ تیار کرتی تھی۔ مارکر نے سپروائزر سے جاب
شروع کی اور تین سال بعد وہ گروپ لیڈر بن گیا تھا۔ جن
دنوں اس نے یہ ملازمت اختیار کی تھی اسی سال اس کی ملاقات
باریٹا سے ہوئی جو ایک فیشن شاپ میں کام کرتی تھی اس نے
فیشن ڈیزائننگ کا کورس کیا ہوا تھا لیکن ماریٹا کی اصل دلچسپی
ایک محبت کرنے والے شوہر اور ایک اچھے گھر سے تھی جسے وہ سچا
سنوار سکتی۔ جب مارکر اسے اس کی ملاقات ہوئی تو اس نے
فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ جیسے ہی مارکر نے اسے
شادی کی پیش کش اس نے بھی قبول کر لی۔ شادی کے بعد اس

پچاس ہزار ڈالر زخمی نہ ملیں۔
 ”تم نے کوئی اسٹاک لیا ہے، کہیں اور رقم لگائی ہے؟“
 ”نہیں اند میں نے کوئی اسٹاک لیا ہے اور نہ ہی کہیں
 کوئی رقم لگائی ہے۔ میرے پاس اس مکان، ایک گاڑی اور
 نوکری کے سوا کچھ نہیں ہے۔“ مارکر نے اعتراض کیا۔
 ”میرے پاس دو ملین ڈالر کا سونا ہے۔“

مارکر نے اس کی طرف دیکھا۔ ”فریک مجھے اعتراض
 ہے تم اس معاملے میں مجھ سے آگے نکل گئے ہو لیکن اصل میں
 تم نے کچھ نہیں کیا ہے۔“

”تو کیا تم نے کیا ہے؟“ فریک کا لہجہ طنزیہ ہو گیا
 تھا۔ ”تم نے آج سے پندرہ سال پہلے کہا تھا کہ اگر میں ملینیر بن
 گیا تو تم میری ایک بات مانو گے۔ یہ شرط یاد ہے یا بھول گئے؟“
 ”مجھے وہ شرط یاد ہے۔“ مارکر نے آہستہ سے
 کہا۔ ”لیکن کیا تم واقعی ملینیر بن گئے ہو؟“
 ”یہ سونا دیکھ کر بھی تمہیں شک ہو رہا ہے؟“ فریک

نے طنز کیا۔
 ”نہیں اس لحاظ سے مجھے شک نہیں ہے لیکن فریک تم

نے ان پندرہ برسوں میں جو حاصل نہیں کیا ہے کیا تم آنے
 والے برسوں میں حاصل کر لو گے۔ کیا تم جوانی کا وہ جوش و
 ولولہ دوبارہ پالو گے جو اس وقت کو زندگی میں ایک بار ملتا ہے۔ کیا
 تم کسی لڑکی سے ویسی محبت کر سکو گے جیسی ایک نوجوان کرتا
 ہے۔ کیا تم کسی سے محبت کی شادی کر سکو گے۔ ان پندرہ
 برسوں میں تم اولاد حاصل کر سکو گے۔ تم اس دوران میں
 انجوائے منٹ کر سکتے تھے کیا اس وقت کو دوبارہ اپنے قابو میں
 لا سکو گے۔ تم مجھ سے پوچھتے ہو کہ میں نے کیا حاصل کیا ہے۔
 آؤ میں تمہیں دکھاتا ہوں کہ میں نے کیا حاصل کیا
 ہے۔ میرے پاس ایک ایک لمحے کی تصویریں محفوظ ہیں۔“

مارکر اٹھ کر اندر گیا۔ وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں
 ایک بڑی اور وزنی المیہ تھی۔ وہ اس نے فریک کے سامنے میز
 پر رکھ دی اور خود اس کے پاس قائلن پر بیٹھ گیا۔ اس نے پہلا
 صفحہ کھولا تو جیسے نوجوانی کا مارکر سامنے آ گیا۔ اس میں ہائی
 اسکول کی اساتذہ کے ساتھ گروپ فوٹو تھا جس میں مارکر کے
 ساتھ فریک بھی تھا۔ فریک خود گود کچھ کر حیران رہ گیا۔ کیونکہ
 باپ کے مرنے اور ماں کے اولد ماؤس میں جانے کے بعد
 اس نے مکان سامان سمیت فروخت کر دیا تھا اور اس میں سے
 کوئی چیز نہیں لی تھی اسے بس رقم درکار تھی کیونکہ سونے کی کان
 کٹی جاری رکھنے کے لیے اسے رقم کی ضرورت تھی۔ حاصل
 ہونے والے سونے میں سے اس نے ایک گرام بھی فروخت

نہیں کیا تھا۔ ہر مہینے وہ جا کر حاصل شدہ سونا ایک بینک لاکر
 میں رکھوا آتا تھا کیونکہ اسے خطرہ تھا کہ اس دیرانے میں کوئی
 اس سے جمع شدہ سونا چھین نہ لے اور اس کے ساتھ دو بار
 واردات بھی ہوئی تھی۔ پہلی بار میں دو مسلح نوجوان اس سے
 تقریباً چار اؤس سونا چھین کر لے گئے تھے۔ اس کے بعد وہ
 محتاط ہو گیا تھا اور جیسے ہی اس کے پاس ایک اؤس سونا جمع ہوتا
 تھا وہ اسے بینک لاکر میں رکھ دیتا تھا۔ دوسری بار اس کے ساتھ
 واردات بینک جاتے ہوئے ہوئی تھی۔

پھر فریک نے کمن لے لی اور اس کے بعد کسی نے
 اسے لوٹنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ وہ جان بوجھ کر کمن کی
 نمائش کرتا تھا اور اسے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ مارکر کے
 ساتھ اپنی تصویر دیکھ کر اسے احساس ہوا کہ اس کے پاس
 یادوں کا ایسا کوئی خزانہ نہیں تھا۔ مارکر کی جوانی اور اسکول کے
 زمانے کی کچھ اور تصاویر بھی تھیں جن میں کسی میں وہ فٹ بال
 کھیل رہا ہے اور کہیں دوستوں کے ساتھ چٹک منارہا ہے۔

”یہ دیکھو جب میں بی ٹیک کے دوران میں کانچ کے
 دوستوں کے ساتھ ناکرا آتش روکھنے گیا تھا۔“ مارکر نے ایک
 تصویر پر انگلی رکھی۔ ”کیا تمہارے پاس ایسی کوئی تصویر ہے؟“
 فریک کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ مارکر نے

صفحہ پلٹا اب کانچ کی تقریب اساتذہ کی تصویریں تھیں۔ ان میں
 مارکر کاؤن چیمپ اور ڈفری لے کر ہے لیکن اب فریک اس
 کے ساتھ نہیں تھا۔ مارکر کا گروپ بدل گیا تھا۔ پھر مارکر مل
 میں کام کر رہا ہے۔ اس وقت کی تصویریں بھی اس المیہ کا حصہ
 تھیں جب وہ ریج موٹو چلا گیا تھا۔

”میں نے اعلیٰ تعلیم کے لیے بڑی محنت سے رقم جمع کی
 تھی۔“ مارکر نے اسے بتایا۔ ”پھر میں نے ایم ٹیک میں
 داخلہ لیا آج میں اپنے شعبے کا ماسٹر ہوں۔ میں نے کورس کیے
 تو مجھے کوالیفائیڈ انجینئر کا درجہ مل گیا۔ کیا یہ اعزاز میرے لیے
 کم ہے۔ میری خواہ ڈیڑھ لاکھ ڈالر سالانہ ہے۔“

اس نے صفحہ پلٹا اور اب اس کے ساتھ تصویروں میں
 حسین و دلکش ماریٹا بھی تھی۔ ”یہ میری بیوی ہے۔۔۔ آج سے
 نو سال پہلے میری ماریٹا سے ملاقات ہوئی تھی۔ ہم نے محسوس
 کیا کہ ہم ایک دوسرے کے لیے بنے ہیں۔ اس لیے ہم نے
 شادی کا فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ یہ دیکھو ہماری شادی
 کی تصویریں۔۔۔ یہ ہمہی مون منانے کیو اور اس کے آس
 پاس کے بڑاڑ پر گئے تھے۔ یہ میری زندگی کے حسین اور
 ناقابل فراموش دن ہیں۔ کیا تمہارے پاس گزشتہ پندرہ
 سالوں میں ایسا کوئی دن ہے۔“

پندرہ سال کی تھیں لیکن میں نے دو مہینے پہلے ہی ساری رقم ادا
 کر دی ہے۔ اس دوران میں اس گھر کو خرید خوب صورت
 بنایا ہے۔ جب میں نے اسے خریدا تو اس کی مالیت ساڑھے
 چار لاکھ ڈالر تھی لیکن اب اس کی مالیت ایک اعشاریہ دو ملین
 ڈالر ہے۔ اس میں اوپر نیچے چار بیڈرومز ہیں۔ ایک یونیٹ
 روم اور ایک لاؤنج ہے، ایک میرا اسٹڈی روم ہے۔ کار
 پارک ہے جس میں بیک وقت میری دونوں گاڑیاں آ جاتی
 ہیں۔ سامنے کالان تم نے دیکھ لیا ہے اتنا ہی بڑا اس میں بیک
 یارڈ ہے جہاں کبھی کبھی ہم بن ہاتھ لیٹے ہیں اور گرمائی راتوں
 میں باریکی کرتے ہیں۔“

مارکر نے اپنی کاروں کی تصاویر دکھائیں۔ ”یہ نئی
 مشوہی دین ہے۔ یہ میں نے مارنے کے لیے لی ہے۔ وہ اسی
 میں اپنی ماں کے گھر تھی ہے۔ جب ہمیں کہیں دور دراز جانا ہو
 تو ہم اسے ہی استعمال کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک بائچ
 سال پرانی ہنڈا کار ہے لیکن اس کی حالت جیسا کہ تم دیکھ
 رہے ہو بالکل نئی جیسی ہے۔ میٹھ اور جولی کو ابھی تیرہ نہیں آتا
 ہے وہ تیرا کی سیکہ جا ہیں تو ہیں بیک یارڈ میں ایک چھوٹا
 سونگ پول بنواؤں گا۔“

المیہ کا آخری حصہ مارکر کی کیریئر کی کہانی سن رہا تھا۔ اس
 نے دوران ملازمت جو جو کامیابیاں حاصل کیں اور جو
 اعزازات حاصل کیے ان سب موقعوں کی تصاویر المیہ میں
 موجود تھیں۔ مارکر کے شاعرانہ دفتر کی تصویر بھی۔ جہاں بیٹھ کر وہ
 اپنے کشن کی نگرانی کرتا تھا۔ دفتر میں ایک شیشے کی چھوٹی سی
 الماری تھی جس میں مارکر کو ملنے والے سرٹیفکیٹس اور شیلڈز زخمی
 تھیں۔ میز پر ایک جدید ترین کمپیوٹر رکھا تھا۔ دفتر کی ہر چیز آئینے
 کی طرح چمک رہی تھی اور ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی ایگزیکٹو کا دفتر
 ہو۔ یقیناً مارکر اپنی فرم میں بہت اہمیت کا حامل تھا۔

مارکر نے المیہ بند کی۔ ”لیکن میں نے بھی ان چیزوں
 کو رقم کے پیمانے میں نہیں تو لا۔ میرے اثاثے میرے بیوی
 بچے ہیں۔ میرا ایک بچہ میرا ملین ملین ہے۔“

فریک نے سونے کی اینٹوں کی طرف دیکھا۔ ”کیا
 میں اس دولت سے یہ سب حاصل نہیں کر سکتا؟“

”مجھے کہتے ہوئے افسوس ہے کہ شاید اب ایسا نہ ہو۔
 محبت کرنے والی بیوی تمہیں کسی دکان پر نہیں ملے گی۔ اس دنیا
 میں بچوں کا کوئی اسٹور نہیں ہے۔ تم گھر لے سکتے ہو لیکن اسے
 شوق سے سجانے والی خوشی دولت سے نہیں ملتی ہے۔ سب
 سے اہم چیز تم نے خود کو آئینے میں نہیں دیکھا ہے۔“
 مارکر اسے بازو سے پکڑ کر ایک آئینے کے سامنے

فریک خاموش تھا اور کم صم سے انداز میں مارکر کا المیہ
 دیکھ رہا تھا۔ اب مارکر کے بچے بھی اس المیہ میں شامل ہو گئے
 تھے۔ مارکر نے سام کی تصویر پر ہاتھ پھیرا۔ ”یہ آج سے
 سات سال پہلے پیدا ہوا تھا۔“ اس کے لہجے میں شفقت
 پوری آئی تھی۔ ”ابھی دوسرے درجے میں ہے لیکن اس کی
 ذہانت ہمیں حیران کر دیتی ہے۔ وہ ابھی سے سوچ چکا ہے کہ
 اسے آئی کی کا ماہر بننا ہے۔ وہ بڑے ہو کر ایسی کانون فلم بنانا
 چاہتا ہے جسے ایک ملٹر پر کمپیوٹر پر تحقیق کیا گیا ہو۔ جو بات
 آج کے گرافکس کے ماہرین سوچ رہے ہیں وہ سام نے پہلے
 ہی سوچ لیا ہے اور مجھے یقین ہے وہ اس میں کامیاب بھی ہو
 گا۔ ممکن ہے اُنے والے وقت میں ایک مکمل کمپیوٹر انڈسٹری
 بنانے کا سہرا میرے بیٹے کے سر جائے۔“

فریک نے پہلی بار پکھ کیا۔ ”ہاں یہ صورت سے ذہین
 لگ رہا ہے۔ ممکن ہے یہ ایسا کر گزرے۔“

”یہ میری بیٹی جولی ہے۔ اس دنیا میں مجھے کسی سے
 سب سے زیادہ پیار ہے تو وہ میری بیٹی ہے۔ یہ بائچ سال کی
 ہے۔ میرے بغیر نہیں رہتی ہے روزانہ رات سونے سے پہلے
 جب تک مجھے کال نہیں کرتی ہے۔ اسے نیند نہیں آتی ہے۔“

اس بار مارکر نے فریک سے پوچھنے سے گریز کیا تھا
 کہ کیا اس کے پاس اولاد جیسی چیز ہے۔ اسے یہ سوال کرتا
 شاید اچھا نہیں لگا تھا۔ پھر اس نے میٹھ کی تصویر کی
 دکھائی۔ ”یہ میرا سب سے چھوٹا بیٹا ہے ابھی صرف چار سال
 کا ہے لیکن ذہانت میں اپنے بھائی سے کم نہیں ہے۔ ابھی سے
 اسکول جانے کے لیے بے تاب ہے لیکن ہم اسے اگلے سال
 اسکول میں داخل کر رہے ہیں۔“

مارکر اسے بتا رہا تھا کہ گزشتہ نو سالوں میں وہ کہاں
 کہاں سیر و تفریح کے لیے گئے تھے۔ ان سب موقعوں کی
 تصاویر اس کے پاس موجود تھیں۔ ”صرف دو سال ایسے
 گزرے جب ذرا حالات سخت ہونے کی وجہ سے ہم کہیں جا
 نہیں سکے تھے۔ میرا مطلب ہے کہ چھٹیوں میں کہیں دور نہیں
 جاسکے تھے۔ ورنہ میں نے ایک دو بار چٹک منانے لازمی طور
 پر آس پاس جاتے ہیں۔“

فریک ان سب تصویروں کو دیکھ رہا تھا۔ ہر اہم موقع
 اور چٹک کی تصویریں اس المیہ میں موجود تھیں۔ مارکر نے گزشتہ
 پندرہ سالوں میں جو کیا تھا اور جو حاصل کیا تھا۔ المیہ اس کی
 مکمل کہانی سن رہی تھی۔ المیہ کا ایک حصہ مارکر کے گھر اور اس
 کی چیزوں کے بارے میں تھا۔ مارکر نے اس حصے پر آ کر
 کہا۔ ”نو سال پہلے میں نے یہ گھر قسطوں پر لیا تھا قسطیں تو

لایا۔ ”خود کو دیکھو اور مجھے دیکھو۔“

فریک نے آئینے میں خود کو دیکھا تو جیسے ڈر گیا۔ اس کے سامنے ایک جوانی میں بوڑھا اور خستہ حال ہو جانے والا شخص کھڑا تھا وہ اپنی عمر سے دس برس بڑا لگ رہا تھا۔ اس کے خندو خال بگڑے تھے اور اس کی جوانی ابڑ گئی تھی۔ اس کے بال سامنے سے اڑ چکے تھے اور جو باقی تھے وہ سفید ہو چکے تھے۔ اس کے چہرے پر مشقت کی داغ بیل لکیریں پڑی ہوئی تھیں۔

اس کے برعکس مارکر کا گھس آئینے میں کسی نو جوان کا سا لگ رہا تھا۔ تروتازہ چہرہ جس پر چمک اور جوانی تھی۔ ہموار اور سلوٹوں سے پاک، اس کے بھرپور گھنے بال بہ مشکل کناروں سے سفید ہوئے تھے اور یہ بھی اچھے لگ رہے تھے۔ اس کا جسم مضبوط اور کسا ہوا تھا۔ ہاتھ صاف ستھرے تھے جس پر سادہ لباس بھی اچھا لگ رہا تھا۔ وہ اپنی اصل عمر سے دس سال کم لگ رہا تھا۔ مارکر نے اہم کا وہ صفحہ اس کے سامنے کر دیا جس پر ان کے اسکول کا نوٹیشن کی تصویر تھی۔

”اسے دیکھو۔“ مارکر نے کہا۔ ”جب ہم نے زندگی کا سفر شروع کیا تھا تو ایک جیسے تھے۔ آج ہم دونوں میں کتنا فرق آچکا ہے۔“

فریک کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اسے احساس ہو گیا تھا کہ اس نے غلط فیصلہ کیا تھا۔ اس نے دولت تو حاصل کر لی تھی لیکن اس کے بدلے بہت کچھ کھو دیا تھا۔ وہ واپس لیونگ روم میں آگیا۔ مارکر اس کے اور اپنے لیے براہی لٹال لایا۔ اس نے فریک کو گھاسا تھمایا اور بولا۔ ”اب کیا کہتے ہو ہم میں سے کون خسارے میں رہا؟“

”وہ ایک الگ بات ہے۔“ فریک نے چسکی لی۔

”لیکن شرط میں نے جیت لی ہے۔“

”یہ غلط ہے... شرط بھی میں نے ہی جیتی ہے۔ ایک اعشاریہ دو ملین ڈالر کا تو صرف یہ گھر ہے۔ اس کے علاوہ میری گزشتہ بارہ سال کی آمدنی کا حساب کیا جائے تو میں نے اب تک دو ملین ڈالر سے زیادہ کمائے ہیں اور زندگی سے پوری طرح لطف بھی اٹھایا ہے۔ تم نے صرف دو ملین ڈالر کمائے ہیں۔“

”ہاں اس کے باوجود شرط یہی تھی کہ میں ملینیر بنوں گا نہیں۔“

”اس لحاظ سے تم شرط جیت گئے ہو اور اس بات کے حق وار ہو کہ میں تمہاری ایک بات مانوں۔“ مارکر نے کسی قدر غرور سے کہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ فریک نہ جانے کیا بات کہے۔

فریک نے دونوں سوٹ کیمز کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ تم لے لو اور اپنی زندگی مجھے دے دو۔“

مارکر نے سکون کا سانس لیا۔ وہ جو چیز مانگ رہا تھا مارکر اسے دے ہی نہیں سکتا تھا۔ فریک جذباتی ہو گیا تھا۔ مارکر نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ”میرے دوست تم نے اپنی زندگی کا ایک بڑا وقت گنوا دیا ہے لیکن اب بھی تمہارے پاس بہت سارا وقت ہے۔ خوش قسمتی سے تمہارے پاس دولت بھی ہے۔ یہ گزرے وقت کو تو نہیں لوٹا سکتی لیکن آنے والے وقت میں تمہیں اتنے زیادہ مسائل کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ تم فیصلہ کر سکتے ہو کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔ تم اپنی شخصیت کو بہتر کر سکتے ہو۔ یقیناً تمہیں کوئی زندگی محبت کرنے والی بھی ملے گی۔ تم گھر لے سکتے ہو۔ اس رقم سے کوئی کام کر سکتے ہو۔ اس طرح تم گزرے وقت کی کسی حد تک تلافی کر سکتے ہو۔“

مارکر اسے سمجھاتا رہا اور بات فریک کی سمجھ میں آگئی۔ وہ مارکر کے پاس سے رخصت ہوا تو اس میں ایک جوش دو لولہ آگیا تھا۔ مارکر نے سکون کا سانس لیا۔

چھ مہینے بعد فریک ایک بار پھر اس سے ملنے آیا تھا اور اس بار اس کی شخصیت بالکل مختلف تھی۔ وہ صحت مند اور تروتازہ لگ رہا تھا۔ اس نے سوٹ بھی اچھا پہن رکھا تھا اور اس کے ساتھ ایک نو جوان عورت بھی تھی۔ فریک نے اس کا تعارف کرایا۔ ”سوز فریک... ارسل۔“

اس وقت مارکر بھی گھر میں ہی اور انہوں نے گرم جوشی سے فریک اور ارسل کا استقبال کیا تھا۔ فریک نے سونا فروخت کر کے اس سے حاصل شدہ رقم سے ایک چھوٹا سا گھر لے لیا تھا۔ ساتھ ہی وہ ایک گولڈ پریس مینٹی میں جاب حاصل کرنے میں کامیاب رہا تھا۔ یہاں اس کا سونا صاف کرنے کا برسوں پرانا تجربہ کام آیا تھا۔ ارسل سے اس کی ملاقات دو مہینے پہلے ہوئی تھی اور جب اس نے محسوس کیا کہ وہ اس سے محبت کرنے لگا ہے تو اس نے ارسل کو پروپوز کرنے میں دریغ نہیں کی تھی۔ اب اس کا ایک گھر تھا اور ارسل نے انہیں شرماتے ہوئے بتایا کہ وہ امید ہے۔

مارکر فریک کو جتنی جتنی مہینے لایا جہاں اس نے سونےنگ بول کے لیے کھدائی شروع کر دی تھی۔ یہ کام وہ خود کر رہا تھا اور تھوڑا تھوڑا روزہ رکھ کر اس کی مٹی میں دور چھینک آتا تھا۔ اس نے فریک سے کہا۔ ”تم نے دیکھا۔ کسی قدر تاخیر سے سکی لیکن تمہارے پاس بھی وہ سب آگیا جو دوسروں کے پاس ہے۔“

”ہاں... میں نے اب اپنی غلطی درست کر لی ہے۔“

فریک نے سر ہلایا۔ ”ڈرا دیر سے سہی۔“



کٹ و کش کی چوری

لجھمہ موری

چور کی چوری ہو یا اس کی پیرا پھیری ہو... یہ ہر کسی کے بس کا کام نہیں ہوتا... بڑے پاپڑے پڑتے ہیں مگر... وہ کیا کرے جو پاپڑے پاپڑے کی تکنیک سے ہی بیگنا نہ ہو... ایسے میں عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ کوئی ایسا قدم ہی نہ اٹھایا جائے جس میں سر کے بال قدموں میں گرے نظر آئیں وہ بھی بذریعہ جوتا۔

مختلف پینترے بدلتے ہوئے کے کا دلچسپ حال

لکا اس وقت ڈینس میں واقع اپنے عظیم الشان بنگلے کے بیڈروم میں کھڑا ہر جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ تیار ہو کر اس نے لمبی چوڑی دیوار گیر ڈریسنگ ٹیبل کے پہلو وار آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔

بے شک تھری پیس سوٹ میں وہ خوب بیچ رہا تھا اور کافی حد تک راجہ مود معلوم ہو رہا تھا جسے نئے نئے حال ہی میں ایک فلم میں جیمز بانڈ عرف زیر و زبر دیوی کے روپ میں دیکھا تھا۔ نئے کو اپنی شخصیت میں راجہ مود کی بہت زیادہ شہادت نظر آرہی تھی۔ بس تھوڑا بہت ہی فرق تھا۔ مثلاً راجہ مود کا قد چھ فٹ سے لگتا ہوا تھا اور نئے کا پانچ فٹ سے لگتا ہوا لیکن بھر حال لگتا ہوا تھا۔

راجہ مود کا جسم کسرتی اور کندھے چوڑے تھے جبکہ نئے کی ناک چوڑی تھی۔ راجہ مود کی رنگت سرخ و سپید اور آنکھیں

نہی تھیں جبکہ نئے کے چہرے کے بجائے اس کی ٹائی سرخ اور سفید تھی اور نیلا ہٹ اس کی آنکھوں کے بجائے چہرے پر چھیلی ہوئی نظر آتی تھی، گہری سیاہی ہاتل نیلا ہٹ۔ راجرمور کے دانت موتیوں کی طرح چمکتے تھے۔ نئے کے دانت بھی موتیوں کی طرح چمکتے تھے لیکن ان موتیوں کی طرح جنہیں حال ہی میں بچہ سے نکالا گیا ہو۔

بہر حال نئے کے خیال میں شخصیتوں کا یہ فرق کچھ اتنا زیادہ نمایاں نہیں تھا۔ آئینے میں اپنے تنقیدی جائزے سے مطمئن ہو کر اس نے ٹائی کی نائٹ درست کی۔ اپنے بگلی ہولسٹر میں دیو لور کی موجودگی کا اطمینان کیا پھر اپنے اوپر گلوں کا چمڑا کاٹا اور بیڈروم سے نکل آیا۔

گور یا جس سے وہ پچھلے دنوں بڑی دھوم سے شادی کر چکا تھا، ایک رملین پھرتی تلے سوئنگ پول کے کنارے بیٹھی تھی۔ نئے نے سوئنگ پول خاص طور پر آرکلیٹ سے فرمائش کر کے گور یاہی کے لیے پتھلے کے ذرائع میں شامل کرایا تھا لیکن کراچی میں چونکہ پانی کی نایاب لائن پھرتے کاروبار بہت زیادہ تھا اور اس کے بغیر خود پانی کی تسلی بخش قلت رہتی تھی یعنی قلت کے معاملے میں شہر خود گھیل تھا اس لیے نئے کو سوئنگ پول کے ساتھ ایک چھوٹا سا نموب ویل بھی لگوانا پڑا تھا۔ گور یا نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور نئے کے دل میں گدگدی سی ہونے لگی۔ تاہم نئے نے صبر اور بے نیازی اختیار کر کے رکھنے میں ہی مصکھت تھی۔ جب سے اس کے پاس دولت آئی تھی اسے یہ تجربہ حاصل ہو گیا تھا کہ انسان کو اپنی بیوی سے زیادہ فری نہیں ہونا چاہیے۔ دوسری لڑکیاں آخر کس لیے ہیں؟

”نئے ڈارلنگ!“ گور یا مترنم آواز میں بولی۔ ”جب تم سو رہے تھے تو سیدھے علی احمد لہو والا کا فون آیا تھا۔ وہ پوچھ رہے تھے کہ تم نے ان کا کیس لینے کے بارے میں کوئی فیصلہ کیا یا نہیں؟“

”تم نہیں بتا دینا کہ میں اپنی سکریری سے اپنی مصروفیات کا شیڈول معلوم کرنے کے بعد انہیں بتا سکوں گا۔“ نئے نے بے پروائی سے کہا۔

وہ ڈرائیوے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ باوردی ہٹلر اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔ جانے کیوں وہ مٹی خیر انداز میں مسکرائے جا رہا تھا۔

”اتنا مت مسکراؤ بیٹھے!“ نئے نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”کیوں ایسا نہ ہو کہ تم نے مجھ سے ایڈوائس لے کر جو یہ سیکنڈ ہینڈ بیسی گواٹی ہے نکل کر فرش پر گر پڑے۔ ہائی دا

وے۔ بات کیا ہے جو اتنی ہانچیں کھل رہی ہیں؟“ ”سر!“ ہٹلر نے قدرے شرماتے ہوئے کہا۔ ”آپ کو شاید یاد نہیں کہ رات آپ نے وعدہ کیا تھا کہ صبح آپ مجھے انعام سے نوازیں گے۔“

”کیا کارنامہ انجام دیا تھا تم نے؟“ نئے نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔ ”ذرا اس کی تفصیل تو بتاؤ۔“ ہٹلر سر کھباتے ہوئے بولا۔

”میں تو محض ایک ہٹلر ہوں۔ کارنامہ انجام دینا تو آپ جیسے صاحب لوگوں کا کام ہے۔ آپ نے بس ویسے ہی انعام دینے کا وعدہ کیا تھا۔“

”مجھے کبھی تم بالکل صحیح بات کہتے ہو۔“ نئے نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ ”کارنامے تو صرف مجھ جیسی شخصیت ہی انجام دیتی ہیں۔“ اس نے جیب سے پرس نکالا اور اس میں سے ہزار کا ایک نوٹ نکال کر ہٹلر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”یہ لو۔۔۔ اور جا کر پیش کرو۔ نو سو روپے مجھے واپس لادینا۔“

ملازموں کے ساتھ نئے آج کل اسی طرح فیاضی کا برتاؤ کرتا تھا کیونکہ اس کے حالات اب بہت ہی اچھے ہو چکے تھے۔ بے وقت ہتھیں چوری کرانے والوں کا اس کے ہاں اسی طرح کا تانتا بندھا رہتا تھا جس طرح غیر ملکی ڈگریاں رکھنے والے ڈاکٹروں کے ہاں مریضوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔

اس میں کچھ بیٹھ چال کو بھی دخل تھا۔ نئے کی شہرت اتنی زیادہ پھیل چکی تھی کہ کچھ لوگ محض شوقیہ طور پر ہی اس کے توسط سے کوئی بے وقت چیز چوری کرانے آجاتے تھے۔

حالانکہ اس میں ان کی کوئی غرض پوشیدہ نہیں ہوتی تھی۔ بعض فیشن ایبل خواتین کی غرض محض اتنی ہوتی تھی کہ اس بھانے وہ کچھ دیر کے لیے نئے کی قربت ہی حاصل کر سکیں لیکن ان میں سے بیشتر کے ساتھ نئے رکھائی سے ہی پیش آتا تھا۔ کسی کسی سے ہی مسکرا کر بات کرتا تھا۔

نک ویلٹ سے اب وہ کہیں آگے نکل چکا تھا تاہم ملکی مصیبت برہم کھاتے ہوئے اس نے اپنی فیس نک کے برابر ہی رکھی تھی یعنی وہ میں ہزار ڈالر کے مساوی رقم پاکستانی کرنسی میں لیتا تھا۔ اسی لیے اسے روزانہ اٹھ کر اخبار میں سب سے پہلے ڈالر کا بھاد دیکھنا پڑتا تھا۔

دھیسے سروں میں سیٹی بجاتا ہوا نئے ڈرائیوے میں کھڑی ہوئی اپنی سرخ رنگ کی گاڑی کی طرف بڑھا۔ باوردی ڈرائیوے نے موہانہ انداز میں اس کے لیے گاڑی کا

دروازہ کھولا اور جب نئے بیٹھ چکا تو ڈرائیوے نے اسٹیرنگ وچیل سنچال کر چابی انگشتیں میں لگا کر گھمائی۔ اسی لمحے ایک خوفناک دھماکا ہوا۔ اور پھر نئے کی آنکھ کھلی گئی۔

اس نے دیکھا کہ وہ اپنی جگہ جا رہی ہے آدھا نیچے لٹکا ہوا تھا اور اس کی آنکھ دھماکے سے ہی کھلی تھی لیکن یہ دھماکا کسی کار میں پھٹنے والے ڈائنامٹ کا نہیں بلکہ کمرے کے دروازے پر پڑنے والی لالٹ کا تھا اور بات محض ایک دھماکے تک محدود نہیں تھی بلکہ مسلسل دھماکے ہو رہے تھے یعنی دھماکا دھماکا دروازے پر لٹا نہیں پڑ رہی تھیں۔

پھر مالک مکان یا یوں کہنا چاہیے کہ مالک کمرے کی آواز سنائی دی۔ وہ ہاتھیں ہونے چلا رہا تھا۔ ”اٹھا اگر یہ کمر میرا اپنا نہ ہوتا تو اب تک میں اس کا دروازہ توڑ چکا ہوتا۔“ پھر وہ اس سے بھی بلند آواز میں چلا یا۔ ”اے اونا بھاری نئے! تو زندہ بھی ہے یا موت کی نیند سو گیا ہے؟ دروازہ اتنا دھماکا دھماکا دھماکا پڑا تو شاید مردے بھی جاگ اٹھتے۔“

”یہ مردہ بھی جاگ چکا ہے جناب!“ نئے نے ہانک لگائی۔ ”ذرا صبر کیجیے میں لباس تبدیل کر کے ابھی حاضر ہوا۔“ لباس تبدیل کرنے کا تو نئے نے محض تنگفا کہا تھا۔ حقیقت میں تو اسے لباس تبدیل نہیں کرنا تھا بلکہ پہننا ہی اب تھا کیونکہ وہ صرف مسٹر کی چادر دھوئی کے طور پر باندھ کر سویا ہوا تھا۔

کپڑے پہننے وقت اس کی بیٹی کھانکھت بج رہی تھی اور وہ خوف سے تھر تھرا کپ رہا تھا۔ دروازے پر مالک مکان کی لالٹ زنی سے اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ آج اس کا پیانا ممبر لبریز ہو چکا ہے۔ درندہ اپنے کمروں کی حفاظت کے سلسلے میں اس کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ اس کی موجودگی میں نئے نے غلطی سے دروازہ دروازے سے بند کر دیا تھا تو وہ فوراً لپٹ کر بولا۔ ”دروازہ ذرا احتیاط سے بند کیا کیجیے جناب! بیٹی لکڑی کا دروازہ ہے۔ اگر کوئی خراش وغیرہ آگئی تو آپ حرمت کے اخراجات کے بھی تحمل نہیں ہو سکیں گے۔“ خالص ہندوستانی سا گوان ہے۔ بہادر شاہ ظفر کی حکومت کا تختہ الٹنے کے بعد ہی چند ہی تختے پہنچے جنہیں اباجان ہندوستان سے ساتھ لیتے آئے تھے اور انہیں بچاتے بچاتے کئی جگہ ان کا اپنا جڑن تختہ ہوتے ہوئے بچا تھا۔ یہاں آکر انہوں نے بڑے چاؤ سے جب یہ مکان بنوایا تو وہ تختے یہ دروازے بنوانے میں استعمال کر لیے تھے۔

اس کمرے میں آنے کے بعد اس لحاظ سے بھی نئے کی جان سخت مصیبت میں تھی کہ مالک مکان کی موجودگی میں وہ

خوش خبری

ایک ٹرس پڑواں بچے لے کر آئی اور پروفیسر سے مخاطب ہو کر کہنے لگی۔ ”پروفیسر صاحب! آپ کے بچے کتنے پیارے ہیں۔“

پروفیسر صاحب نے اُفتی پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”سسر! میری بیوی سے اس کا ذکر مت کرنا، میں اسے یہ خوشخبری خود سنانا چاہتا ہوں۔“

محمد فائز۔۔۔۔۔ اردو بازار کراچی

جس چیز کو بھی ہاتھ لگا تھا اس کے بارے میں اسے ایک پتھر سننا پڑتا تھا۔ فرس، درود یوار، کھڑکیوں کے پٹ اور چوٹیں، نٹ بولٹ، ٹونیاں اور سوچ غریبہ جہیز تو تاریخی تھی۔ ہر ایک کا اپنا ایک پس منظر تھا، ایک تاریخ تھی جو نئے کو کئی کئی بار سنائی پڑی تھی۔ بعض اوقات تو اسے شبہ ہونے لگتا تھا کہ وہ کسی مکان کے کمرے میں نہیں بلکہ عجائب گھر میں رہ رہا ہے۔ عجائب گھر بھی وہ جو کئی دہائیوں کی ہنسی کے ساتھ ہو چکا تھا۔

دراصل نئے کی شامت نے آواز دی تھی کہ اس نے اپنے پہلے کیس یعنی چنے کی چوری میں کامیاب ہونے اور باغ بزارہ روپے وصول پانے کے بعد تھوک کے حساب سے کامیابیوں کے خواب دیکھنے شروع کر دیے تھے۔ ان خوابوں کی تعبیر حاصل کرنے کے لیے اسے چند اقدامات بے حد ضروری محسوس ہوئے تھے۔

سب سے پہلے تو اس کے خیال میں انڈیپنڈنٹ رہائش اختیار کرنا ضروری تھا۔ اس کی اتنا یک لخت ہی کچھ زیادہ ہی بیدار ہو گئی تھی اور کسی کے زیر احسان رہنا اسے ناقابل برداشت محسوس ہونے لگا تھا۔ چنانچہ اس کی درخواست پر بھاد کے دفتر کے چپرائی نے اپنا اثر رسوخ استعمال کرتے ہوئے اسے اپنے علاقے میں بغیر ایڈوائس کے صرف آٹھ سو روپے ماہوار پر ایک کمرہ لے دیا تھا۔

چپرائی کے خیال میں یہ نئے کی خوش قسمتی تھی کہ اسے آٹھ سو روپے ماہوار پر کمرہ کرایے پر مل گیا تھا۔ ورنہ آج کل کے زمانے میں تو آٹھ سو روپے ماہوار پر کسی کمرے کی دیوار بھی مٹی مشکل تھی کہ انسان اس کے سامنے میں ہی بیٹھ لیا کرے۔

نئے کو صرف ایک ماہ کا کرایہ پچھلی ادا کرنا پڑا تھا۔ یہ پہلا اور آخری کرایہ تھا جو اس نے ادا کیا تھا۔ اس نے بعد سے اب تک چھ ماہ گزرنے کے بعد اسے کرایہ ادا کرنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ کیونکہ چنے کی چوری کے بعد سے نئے کے پاس کوئی کیس ہی نہیں آیا تھا۔

سے میرے حالات کافی عرصے سے دگرگوں چلے آ رہے ہیں ورنہ میں آپ کو کبھی شکایت کا موقع نہ دیتا اور ہر ماہ باقاعدگی سے کرایہ ادا کرتا رہتا۔ دوسری صورت میں نے یہ سوچی تھی کہ اگر میں اس کمرے میں رہنے کا تحمل نہیں ہو سکتا تو اسے چھوڑ دوں۔۔۔۔۔

”واجبات ادا کیے بغیر؟“ رازی صاحب نے اس کی بات کاٹ کر تھکیں نکالتے ہوئے پوچھا۔

”یہ کیسے ہو سکتا تھا؟“ نکلے کے بھروسہ میں کہا۔ ”میری رگوں میں شریف باپ کا خون اور نصیب رائے کی جانے دوڑ رہی ہے۔ میں آپ کو دھوکا دے کر بھلا کیسے جاسکتا تھا؟ حقیقت تو یہ ہے کہ میں واجبات ادا کرنے کے بعد بھی اس کمرے کو نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ مجھے آپ سے اور اس کمرے سے اس قدر انس ہو گیا ہے کہ میں اسے چھوڑنے اور آپ سے ترک تعلق کرنے کا تصور ہی نہیں کر سکتا۔ میں اس کمرے کی محبت میں اتنا آگے چلا گیا ہوں کہ مجھے واپسی کے لیے رکشامنا مشکل ہو گیا ہے۔ بہر حال۔۔۔۔۔ آپ واجبات کی فکر مت کیجیے۔ آج شام تک میں آپ کا حساب بے باقی کر دوں گا۔ پانی پانی چکا دوں گا۔“

یہ کہہ کر وہ اسی طرح ہٹکے سے واپس مڑا جس طرح فلموں کے جذباتی مناظر میں ہیروئن کی ماں ڈائلاگ بول کر مڑتی ہے۔ اس نے مالک مکان کو مزید کچھ کہنے کا موقع دینے بغیر اندر آ کر کنڈی چڑھائی اور سانس درست کرنے لگا۔ گوکہ اس کے خیال میں سانس درست کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا، اصل ضرورت تو حالات درست کرنے کی تھی جو بہت ہی سنگین ہو چکے تھے۔ چند لمحوں تک نگار نے ان کی بے مہر پر غور کرتا رہا۔ کیسا زمانہ آن لگا تھا، دنیا کیسی بے درد ہو چکی تھی۔ صرف چھ ماہ کا کرایہ ادا نہ کرنے پر مالک مکان قفل کی دھمکیاں دینے لگے تھے۔ یار دوست چار چھ مرتبہ سے زیادہ احوال نہیں دیتے تھے۔ آہ رکی دنیا! لوگ جانتے ہیں کہ سچے دوست اور سچی محبوبائیں دنیا سے ناپید ہوتی جا رہی ہیں۔

ایک ٹھنڈی آندھ لہر کر کے ان کے ایک عزم تو کے ساتھ باہر جانے کی تیاری شروع کر دی۔ زیادہ دیر متغوم رہنا یا غور و فکر میں مبتلا رہنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔

تیار ہو کر اس نے پچی بھجی ریز گاری جمع کی اور کمرے سے نکل آیا۔ قریبی بس اسٹاپ سے اس نے بس پکڑی اور جان پہچان کر رکھ کر اس میں سوار ہو گیا۔ راستے بھر وہ کنڈیکٹر کو اس طرح ٹھوکتا رہا گویا اس نے گت لے لیا ہے۔ اس لیے کنڈیکٹر کو خاص طور پر اسے مخاطب کرنے کی جرات ہی نہیں

ہوئی۔ اسے مطلوبہ اسٹاپ سے دو اسٹاپ پہلے ہی نکلے بس سے نکلنے کی جلدی شروع کر دی اور بالآخر اپنے اسٹاپ سے دو اسٹاپ آگے پہنچنے کے بعد وہ بس سے اترنے میں کامیاب ہوئی گیا۔

وہ تو قسمت یہ رہا کہ جب وہ دروازے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تو کسی نے اس کی سرپرہات رسید کر دی ورنہ شاید وہ مزید ایک اسٹاپ تک دروازے پر ہی چھنسا رہتا۔ باہر آ کر اس نے اپنا سرسری سامان کیا کہ جسم کا کوئی حصہ بس ہی میں تو نہیں رہ گیا۔ مطمئن ہو کر وہ واپس اس اسٹاپ کی طرف چل دیا جہاں درحقیقت اسے اترنا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ اپنے دوست سجاد کے دفتر میں داخل ہوا تو اسے دیکھ کر ریسپشن پر بیٹھی ہوئی مگر باکھل انجی۔ بہت دنوں بعد ایسا اتفاق ہوا تھا کہ مگر یا اسے دیکھ کر کھل اٹھی تھی ورنہ کافی عرصے سے یہ عالم تھا کہ مگر یا اسے دیکھ کر سہمی جاتی تھی۔ غالباً اسے اندیشہ تھا کہ نکالیں اس سے مزید ادھار نہ مانگ لے۔ پچھلے دنوں میں نکلے کو ادھار دیتے دیتے اس کی اقتصادی حالت کسی پسماندہ ملک کی اقتصادی حالت سے مشابہ ہو چکی تھی۔

”اچھا ہوا تم آگے۔“ وہ منمنائی۔ اسے تقریباً مستقل طور پر یہی زکام رہتا تھا جس کی وجہ سے اس کی آواز لپکی ہی نکلتی تھی۔ ایک زوردار دھڑکنک کے ہٹکے سے نکلنے کے بعد وہ مزید بولی۔ ”میں ابھی چرای کو تہہارے ہاں بھیجے ہی تھی۔“

”بی بی جی! میں نے آپ سے کتنی مرتبہ درخواست کی ہے کہ مجھے چرای نہیں کا صدمہ کھا کر۔“

”گو یا بی بی! کتنے سے یوں کہوں۔ میں ابھی تمہارے ہاں قاصد کو بھیجے گی؟“ اس نے کہا۔ ”میں ابھی تمہارے ایک خاتون ہوں؟ میرے منہ سے یہ جملہ کس قدر معیوب لگے گا۔ لوگ جانے اس کے کیا کیا معنی اخذ کریں گے۔“

مگر یا نے برہمی سے چرای کو ٹھوکارا اور وہ سر ہٹانے لگا لیکن جلد ہی اسے احساس ہوا کہ وہ سر نہیں ہٹا کر پر موم جو دو ٹوپی کو کھجا رہا ہے۔ کھسیا نا ہو کر اس نے ہاتھ ہٹالیا۔

”جلدی ہٹاؤ بات کیا ہے۔ آج تم اتنی خوش کیوں ہو؟“ نکلے نے بتائی سے پوچھا۔

”خوش تو اصل میں تمہیں ہونا چاہیے لیکن چونکہ تمہاری ہی خوشی میں میری خوشی ہے اس لیے میں بھی خوش ہو رہی ہوں۔“ مگر یا قدرے شرمانے کی کوشش کرتے ہوئے منمنائی۔ پھر وہ سجاد کے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے

بولی۔ ”جلدی سے اندر چلے جاؤ۔ خوشی کی ایک خبر اندر تمہاری منتظر ہے۔“

”واہ خدا یا!“ نکلے نے چھت کی طرف دیکھ کر دل میں کہا۔ ”خوشی کی خبر یہاں میری منتظر تھی اور میں بد بخت گھر بیٹھا مالک مکان کی پینکڑا رسن رہا تھا۔ بہت اچھے وقت پر تو نے مجھ غریب کی سنی ہے۔“

خدا کا شکر ادا کر کے اور مستقبل کے بارے میں دو تین دعائیں مانگ کر نکلا، سجاد کے کمرے میں داخل ہوا۔ سجاد کے سامنے ایک صاحب بیٹھے ہوئے تھے جو خاصے بھاری بھر کم تھے۔ اگر کسی آواز میں نکالنے پر قادر ہوتی تو اس وقت یقیناً ان صاحب کے بوجھ سے بری طرح کراہ رہی ہوتی۔ ان کی عمر پچاس کچھن کے قریب معلوم ہوتی تھی۔ عینک لگائے ہوئے تھے اور اس عینک کا وزن بھی کھو ڈیزہ کھو سے کم معلوم نہیں ہوتا تھا۔

نکلے کو دیکھتے ہی سجاد بے تابلی سے اٹھ کھڑا ہوا اور میز کے عقب سے نکل کر آگے آ کر اس نے نکلے کو سینے سے لگالیا اور محبت بھرے لہجے میں کہا۔ ”یار نکلے! آج تو تمہیں دیکھ کر یوں خوش ہو رہی ہے جیسے ڈاک میں میرا کوئی کٹشہ پارسل مل گیا ہو۔ میں ابھی مگر یا سے کہہ ہی رہا تھا کہ نکلے کی تلاش میں آدمی دوڑاؤ جس پر اس کا مقول لڑی ہے جواب دیا کہ کوئی تو ہمارے دفتر میں کوئی نہیں ہے۔ آپ کہیں تو چرای کو بھیج دوں۔“

”خیر۔۔۔۔۔ چھوڑو ان باقوں کو۔۔۔۔۔ ان سے ملو۔“ اس نے بھاری بھر کم شخصیت کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ میرے بچپن کے استاد۔۔۔۔۔ ان منان ہیں۔۔۔۔۔ آج کل تو خیر سے پروفیسر ہیں، میرے زمانے میں صرف فچر ہوا کرتے تھے۔ انجی کی مہربانوں کا نتیجہ تھا کہ میں نے ٹھوڑے ڈویژن میں میٹرک کر لیا ورنہ آج شاید میں جاہل کا جاہل ہی ہوتا۔ میں نے انہیں تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔ تمہارے وہ کارنامے بھی سنا دے ہیں جو ابھی تمہیں انجام دینے ہیں۔ انہیں تمہاری خدمات کی سخت ضرورت ہے۔“

پھر وہ پروفیسر۔۔۔۔۔ ان منان صاحب کی طرف مڑ کر بولا۔ ”پروفیسر صاحب! یہ ہے میرا دوست نکلا۔ دیکھیں ٹیک ویلٹ۔ ٹیک ویلٹ کو آپ جانتے ہوں گے۔ آپ تو باقاعدگی سے سپنس پڑھتے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ عنقریب اس عظیم شخص کی وجہ سے دیس کا نام اونچا ہوگا۔ یہ آپ کا مسئلہ جنگی بجائے ہی حل کر دے گا بلکہ بعض اوقات تو یہ مسئلہ حل کر دیتا ہے جنگی بعد میں بجائی پڑتی ہے۔“

پروفیسر منان جن کے پورے نام میں اور ان کی کچھ زیادہ ہی ریل پیل تھی، نکلے سے ہاتھ ملاتے ہوئے اس کا

سرتاپا جائزہ لیتے ہوئے بولے۔ ”آپ کو کیا کسی نے گھڑی میں باندھ دیا تھا؟“

نکلے اپنے کیلے ملے ہوئے ٹھنک آلودہ کپڑوں کا جائزہ لے کر قدرے شرمنندگی سے بولا۔ ”دوہرا صل۔۔۔۔۔ آج میری گاڑی خراب ہوئی تھی۔۔۔۔۔ اور کوئی رکشا کیسی وغیرہ بھی نہیں مل رہی تھی اس لیے بس میں آنا پڑا۔ اس لیے یہ حالت ہوئی۔“

”اوہ۔۔۔۔۔ بہت افسوس ہوا سن کر۔“ پروفیسر صاحب نے گویا تعزیت کی۔

وہ جیوں بیٹھ چکے تو سجاد نے کافی منگوائی۔ پروفیسر صاحب کافی مقدار میں کافی پی چکے تو بائیں شروع ہوئیں۔

پروفیسر صاحب اصل موضوع پر آتے ہوئے بولے۔ ”دراصل میں ایک کدو کش چوری کرنا چاہتا ہوں۔“

”کدو کش؟“ نکلے نے حیرت سے کہا۔ ”وہ کیا ہوتا ہے؟“

”کمال ہے۔۔۔۔۔“ پروفیسر صاحب نکلے سے بھی زیادہ حیران ہوتے ہوئے بولے۔ ”آپ کو یہ بھی نہیں معلوم کہ کدو کش کیا ہوتا ہے؟“

”میرے خیال میں غالباً یہ حیرت کش قسم کی کوئی چیز ہوگی۔“ نکلے نے حصار انداز میں اظہار خیال کیا۔

”ارے بھئی۔۔۔۔۔ نکلے! تم بھول گئے کیا؟“ سجاد نے کھٹک کر نکلے کو اپنی طرف متوجہ کر کے آٹھ مارتے ہوئے کہا۔ ”کدو کش تو ہر شخص نے عمر کے کسی نہ کسی حصے میں ضرور دیکھا ہوتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں اس کی بڑی اہمیت ہے۔ چار ٹانگوں والا ایک بچہ سا ہوتا ہے جس کی سب خار پٹت کی طرف ہوتی ہے۔ اس پر کدو، گاجر، مولیٰ کو رگڑ کر باریک کیا جاتا ہے۔“

”اچھا۔۔۔۔۔ اچھا۔۔۔۔۔ میں سمجھ گیا۔ یاد آگیا مجھے۔“ نکلا جلدی سے بولا۔ ”میرے ذہن سے اتر گیا تھا ورنہ بچپن میں، میں نے ہزاروں مرتبہ کدو کش گھر میں دیکھا تھا ورنہ نام بھی سنا تھا۔ اب آپ مطمئن ہو کر قصیدات بتائیے۔“

”قصہ دراصل یہ ہے جناب نکلا صاحب!“ پروفیسر صاحب نے طویل سانس لے کر کہا۔ ”کہ جوانی میں ہم بہت ہی کنگھے ہوا کرتے تھے اور ایک صاحب کے ہاں کوٹھری نما ایک کرا کرانے پر لے کر رہتے تھے۔ عبدالملک ہمارے مالک مکان کا نام تھا۔ انہوں نے ہم سے ہمیشہ ہی بہت برا سلوک کیا۔ بھئی نکلے! ہمارا عرب بچپن کے قریب ہے اور ہم نے اس پوری عمر میں عبدالملک صاحب جیسا کبھی آدمی نہیں دیکھا۔ ان کی کجی کا عالم یہ ہے کہ خیر ہوا میں اگر ان

کے ہاتھ سے ردی کاغذ کا ایک ٹکڑا چھوٹ کر اڑ جائے تو وہ اسے پکڑنے کے لیے پرانی نمائش سے دائر تک چلے جاتے ہیں۔ یہی اس شخص نے ہمیں بہت ہی دفنی ایذا پہنچائی۔۔۔۔۔

”واٹھا۔“ نکا ان کی بات کاٹ کر کہے بغیر نہ رہ سکا۔ ”تو آپ بھی مالک مکان کے ستائے ہوئے ہیں۔ کیا عجیب اتفاق ہے۔ ہمارا معاملہ تو وہ ہے کہ۔۔۔۔۔ آئندہ لیل کے کریں آہ و زاریاں۔“

”خبردار۔“ پروفیسر صاحب اچانک ہی لال چلے ہو کر ہوئے۔ ”تمہیں یہ جرات کیسے ہوئی کہ عندلیب کے ساتھ مل کر آہ و زاریاں کرو۔“

”جی۔۔۔۔۔“ نکے کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔

سجاد نے جلدی سے دھن درمقولات کرتے ہوئے نکے کو مخاطب کیا۔ ”دراصل پروفیسر صاحب کی چھوٹی صاحبزادی کا نام عندلیب ہے۔“ پھر اس نے پروفیسر صاحب کو سمجھایا۔ ”قبلہ انکے نے تو مصرع پڑھا تھا۔ غالباً یہی ایک مصرع تو اسے یاد ہے۔“

”اچھا۔۔۔۔۔ اچھا۔۔۔۔۔“ پروفیسر صاحب ٹھٹھکے پڑ گئے۔ پھر سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولے۔ ”ہم کافی عرصہ مجبوری کے تحت عبدالمالک صاحب کے کرایہ دار رہے۔ پھر رفتہ رفتہ ہمارے حالات بدل گئے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے آج مکان بھی ذاتی ہے اور ہر طرح سے آسودگی و خوشحالی حاصل ہے اور مالک کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ عبدالمالک صاحب وہیں کے وہیں رہے، اسی تنگ و تاریک مکان میں رہ رہے ہیں۔ اصولاً تو ہم نے انہیں معاف کر دیا ہے، ان کے حال پر چھوڑ دیا ہے لیکن بیٹے دنوں کی ان کی وہ حرکتیں یاد آتی ہیں جن کی وجہ سے ہمیں بڑی افیت پہنچی تھی تو بس دل کو نہ جانے کیا ہونے لگا ہے۔ ابھی اب تم سے کیا چھانا۔۔۔۔۔ ہم کوئی بہت ہی زیادہ اعلیٰ ظرف انسان تو ہیں نہیں کہ اپنے ساتھ ہونے والی ہرزادی کو بھول جائیں۔ بلکہ ہمارا خیال ہے کہ اعلیٰ ظرف تو کوئی بھی نہیں ہوتا۔ چنانچہ ہمارے دل میں اکثر عبدالمالک صاحب سے کوئی پکا چمکاتم کا انتقام لینے کی خواہش کروٹیں لیتی رہتی ہے۔ ہم عبدالمالک صاحب کو کھوڑی سی زک پہنچانا چاہتے ہیں۔“

”بہت خوب۔“ نکا گویا ان کی بات اچھی طرح سمجھ کر سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”تو اس کا طریقہ آپ نے یہ سوچا ہے کہ ان کا کدو کش چوری کر دیا جائے؟“

”جی ہاں۔“ پروفیسر صاحب نے اثبات میں سر ہلایا۔

”ویسے تو خیر عبدالمالک صاحب کی کوئی بھی بے وقت سے

بے وقت چیز چوری ہو جائے انہیں یکساں صدمہ ہوگا لیکن میرا خیال ہے کہ اس کدو کش کے چوری ہونے کا انہیں نسبتاً زیادہ صدمہ ہوگا، گو کہ اس کدو کش کی حالت یہ ہے کہ اس پر رنگ اور سیاہی کی اس قدر گہری تھیں، جم پکلی ہیں کہ یہ پتا چلانا مشکل ہے کہ وہ کس دھات کا بنا ہوا ہے۔ اس کی ایک ٹانگ ٹوٹی ہوئی ہے تین ٹانگوں سے ہی کام چلایا جاتا ہے۔ اس کے باوجود عبدالمالک صاحب اسے سینے سے لگائے ہوئے ہیں گو کہ استعمال بھی نہیں کرتے۔ یہ تو ہم نہیں اس وقت کی بات بتا رہے ہیں جب آخری بار ہم نے اس کدو کش کو دیکھا تھا۔ اب تو اس سے بھی زیادہ بری حالت ہوگی۔ بہر حال ہم نے یہ پتا کر لیا ہے کہ وہ اب بھی حفاظت سے کدو کش کو ای جگہ رکھتے ہیں جہاں پہلے رکھتے تھے۔ ان کے نزدیک اصل میں یہ کدو کش ایک طرح کی تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔“

”وہ کس طرح؟“ نکے نے دلچسپی سے پوچھا۔

”دراصل ایک بار اپنی ساس کی فرمائش پر طوعا و کرہا عبدالمالک صاحب نے ایک پاؤ کدو کا طوعہ تیار کیا تھا۔ اس مقصد کے لیے کدو کشی اسی انتخاب کدو کش پر کی گئی تھی۔ پروفیسر صاحب کی ساس نو پاؤ از رنگ کا شکار ہو کر اللہ میاں کو پیاری ہوئی تھیں۔ تب سے یہ کدو کش عبدالمالک صاحب کو زیادہ عزیز ہو گیا ہے۔“

”میں سمجھ گیا۔“ نکے نے نہایت مدبرانہ انداز میں گردن ہلائی۔ ”آپ کا کام ہو جائے گا۔“

”مجھے بر خوردار سجاد نے تمہاری فیس بتا دی ہے بر خوردار نکے! ابھی بہت زیادہ فیس رہی ہے تم نے۔ میں اپنی تمام تر خوشحالی کے باوجود اس فیس کا تحمل نہیں ہو سکتا۔۔۔۔۔ بہر حال تمہیں میرے شاگرد کا دوست ہونے کے ناتے کچھ رعایت تو کرنی ہی پڑے گی۔ میں تو صرف دس ہزار روپے دے سکتا ہوں۔ سجاد نے مجھے بتایا ہے کہ تم پندرہ ہزار سے کم ہرگز نہیں لیتے۔“ پروفیسر صاحب پرس نکالنے لگے۔

فرط حسرت سے نکا کرسی سے گرتے گرتے بھا۔ پہلے تو بے اختیار وہ کہنے لگا تھا۔ جی میں اتنی رقم کا کیا کروں گا؟ لیکن بروقت اپنے من پر ہاتھ رکھ کر اس نے اپنے آپ کو اس بکواس سے باز رکھا اور دل ہی دل میں حساب لگایا تو اسے تقریباً اتنی ہی رقم کی ضرورت تھی۔ مالک مکان کو کرایہ دینا تھا۔ کچھ گویا، کچھ سجاد اور کچھ محلے کے دکاندار کا اس پر ادھار چڑھا ہوا تھا۔ اللہ واقعی مسبب الاسباب ہے کہ اس نے نہایت غیر متوقع طور پر بندوبست کر دیا تھا۔ نکا تو مالک مکان کے سامنے بڑا بانک آیا تھا کہ آج شام وہ ہر حال میں اس کا

حساب بے باقی کر دے گا حالانکہ اسے خود نہیں معلوم تھا کہ وہ کس طرح بے باقی کرے گا۔ لیکن نکلی چھتری والے کو شاید اس پر ترس آگیا تھا اور اس نے آج نکے کے لیے ایسے حالات پیدا کر دیے تھے کہ وہ اپنا وعدہ وفا کر سکے۔

پروفیسر صاحب نے سوسو کے نوٹ گن کر نکے کے ہاتھ میں تحفے تو نکے نے انہیں یوں دبوچ لیا جیسے وہ نوٹ نہیں پرندے ہوں اور اسے اندیشہ ہو کہ موقع پاتے ہی وہ اڑ جائیں گے۔

”رقم تو یہ کم ہے۔۔۔۔۔“ نکے نے ہمت کر کے کہا۔ دل میں ڈر بھی رہا تھا کہ اس ریمارک پر پروفیسر صاحب ناراض ہو کر کدو کش چوری کرانے کا ارادہ ہی منوی نہ کر دیں اور رقم واپس نہ لیں۔ لیکن بہر حال آپ سجاد کے استاد ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ میرے بھی استاد ہی ہوئے۔ اس لیے اسی فیس میں آپ کا کام کرنا پڑے گا۔ اب آپ ذرا مجھے مکان کا محل وقوع سمجھا دیں۔“

”محل وقوع ہی نہیں مکان کا پورا نقشہ بھی بتا کر دوں گا۔“ پروفیسر صاحب پھل کاغذ میز پر اپنی طرف کھسکاتے ہوئے بولے۔ ”اور یہ بھی بتا دوں کہ آج عبدالمالک صاحب ایک قرضی حراز پر قوالی سننے جائیں گے اور رات کو در سے واپس آئیں گے۔ ان کا معمول ہے کہ جھڑت کو قوالی سننے ضرور جاتے ہیں حالانکہ ہر مرتبہ رات کو در سے گھر آنے پر انہیں مسز عبدالمالک سے بہت بری طرح جھاڑیں کھانی پڑتی ہیں۔ مسز عبدالمالک کو کہ اپنے شوہر کی طرح عمر رسیدہ ہیں۔ لیکن میں بے حد محکم نیم اور پست و چالاک۔ مسز عبدالمالک ان کے سامنے ایسے ہی لگتے ہیں جیسے کسی چنگیل بھینس کے سامنے کوئی غزوہ بکرا۔ بس ان خاتون سے تم ذرا راج کر رہنا۔ امید ہے تمہیں کوئی خاص دشواری پیش نہیں آئے گی۔“

”دشواریوں کی کسے پروا ہے جناب!“ نکے نے سینہ پھیلاتے ہوئے کہا۔ ”دشواریوں سے ٹکرانا ہی تو اپنا کام ہے۔ اسی چیز کی تو فیس لیتا ہوں میں۔“

”بہت خوب۔ بہت خوب۔ تم جیسے بلند ہمت نوجوانوں کی میں ہمیشہ بڑی قدر کرتا ہوں؟“ پروفیسر صاحب نے نکے کے کندھے پر ہتھیں دی پھر کاغذ پھیل سنہال کر اسے مکان کا محل وقوع اور پھر اس کی ساخت سمجھانے لگے۔

نکا سب کچھ سمجھ چکا تو پروفیسر صاحب جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور جاتے جاتے نکے سے مخاطب ہوئے۔ ”مجھے آج ہر حال میں یہ کام کرگزرتا ورنہ نہ مناسب موقع کے لیے تمہیں آئندہ جمعرات کا انتظار کرنا پڑے گا۔ ویسے تو خیر

تمہاری مرضی ہے۔ جب چاہو قسمت آزمائی کر سکتے ہو لیکن میں نہیں چاہتا کہ تم زیادہ خطرہ مول لو کیونکہ تمہیں کچھ ہونے کی صورت میں ہم پر بھی آج آسکتی ہے اور ہمیں اپنی عزت بہت پیاری ہے۔“

”آپ مطمئن رہیے۔“ نکے نے بڑے خلوص سے کہا۔ ”آپ کی عزت میری بھی عزت ہے کیونکہ میرے پاس اپنی تو کوئی عزت ہے نہیں۔۔۔۔۔ اودھ۔۔۔۔۔ معاف کیجیے۔۔۔۔۔ مجھے کے آخر میں خواہ تو از زبان پچھل گئی۔ میرا مطلب ہے میں بھی آپ ہی کی طرح عزت دار آدمی ہوں۔“

پروفیسر صاحب کے جانے کے بعد میں ممکن تھا کہ نکا خوشی کے مارے قالمین پر قلا بازیاں کھانے لگا مگر سجاد نے اسے بازو سے پکڑ کر اس کام سے باز رکھا۔ اسی دوران گویا بھی اندر آگئی اور نکے کی طرف دیکھ کر بولی۔ ”تمہارے پچھ پچھراتے ہوئے تھے، بدلتی ہوئی رنگت اور کانپتے ہوئے ہاتھ بتا رہے ہیں کہ معاملہ طے ہو گیا ہے اور فیس تمہیں مل گئی ہے۔“

”تمہیں لگ پڑی ہوگی کہ میں تمہارا قرض ادا کرتا ہوں یا نہیں۔ ہے یا؟“ نکا فوراً بولا۔

”لغت ہے تمہاری ذہنیت پر۔“ گویا برا مناتے ہوئے بولی۔ ”تمہیں کسی کے خلوص کا اندازہ ہی نہیں ہے۔ مجھے تو یہی خوشی تھی کہ تم کسی دھندے سے تو لگے۔ اپنے قرض کے متعلق تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔“ وہ منہ پھیر کر واپس کمرے سے باہر کوچل دی۔ وہ ناراض ہو چکی تھی۔

نکے نے بڑی مشکل سے اسے منایا۔ زیادہ مشکل سجاد کی موجودگی کی وجہ سے پیش آئی۔ صل کی خوشی میں انہوں نے قرضی دکان سے لڈو منگوا کر کھائے، چائے پی۔ نکے نے ان دونوں کا پچاس پچاس فیصد قرض ادا کیا۔ اگلا گیس ملنے ہی باقی پچاس فیصد بھی ادا کرنے کا وعدہ کیا اور سجاد کے دفتر سے نکل کھڑا ہوا۔

واپسی میں اس نے بوہری بازار سے نقلی ڈاڑھی منجھ خرید کر ایک لفافے میں ڈالی اور پھر ایک ہوٹل سے نہاری کھا کر گھر واپس چلا گیا۔ اپنے کمرے میں ٹھننے سے پہلے اس نے اوپر جا کر دستک دے کر رازی صاحب کو باہر بلایا۔ رازی صاحب اس کی اس جرأت پر بے حد حیران نظر آ رہے تھے کہ اس سے پہلے تو وہ نکے کو ڈھونڈتے پھرتے تھے اور وہ ان کے ہاتھ نہیں آتا تھا جبکہ آج وہ خود انہیں بلانے چلا آیا تھا۔

نکے نے نوٹ ان کے چہرے کے قریب لہراتے ہوئے کہا۔ ”اگر آپ برائے نامیں تو میں۔ نوٹ آپ کے من پر مار دوں۔ لیکن کیجیے بالکل چوٹ نہیں لگے گی۔“

”کیا مطلب؟“ رازی صاحب حیران ہو کر بولے۔

”وہ..... دراصل رقم کے معاملے میں ایک محاورہ بولا جاتا ہے تا منہ پر مارنا۔ تو میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ جیسے ہی پیسے آئے میں آپ کے منہ پر ماروں گا۔ براہ کرم آج مجھے اپنی حسرت پوری کر لیتے ہیں۔“ نکلے متوجہ نہ کیجئے میں۔

”کوئی بات نہیں برخواستہ اور ضرور مار لو منہ پر۔ نوٹ تو چیز ہی ایسی ہے کہ منہ پر بھی مارا جائے تو برا نہیں لگتا۔ تم سے رقم مل رہی ہے اس خوشی کے موقع پر تو میں ایک بار نہیں دو بار تمہیں نوٹ منہ پر مارنے کی اجازت دے سکتا ہوں۔ میری کون سی شکل بگڑ جائے گی۔“ رازی صاحب بولے۔

”جی ہاں..... اس میں بگڑنے کی گنجائش ہی نہیں ہے۔“ نکلے نے ذریعہ کہا اور نوٹ ان کے منہ پر دے مارے۔ نوٹ فرش پر پھرنے لگا۔ رازی صاحب نے جلدی سے سمیٹ لیے۔ ان کی باجھیں کھلی جاری تھیں۔ لیکن پھر ایک لخت ہی وہ فکر مندے ہو گئے۔

”سیدھے کھڑے ہو کر نکلے کو گھورتے ہوئے بولے۔

”یہ تمہارے پاس ایک لخت ہی رقم کہاں سے آگئی؟ کوئی بینک وغیرہ تو نہیں لوٹ لیا؟ شہر میں اس قسم کی وارداتیں ہوتی ہیں۔“

”میں آپ کو شکل سے ڈاؤن لگتا ہوں؟“ نکلے نے برا مناتے ہوئے کہا۔ ”میں ایک معزز آدمی ہوں۔“

”چلو خیر..... آج تو میں تمہاری رائے سے متفق ہو جاتا ہوں۔“ رازی صاحب نے کہا۔

”نکلے اپنے کمرے میں آیا اور ڈاڑھی مونچھ کا لفظ احتیاط سے کارنس پر رکھ کر سونے کے لیے لیٹ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ ان کی اہم کے سلسلے میں اسے آج رات جاگنا پڑے گا۔ اس کی کوشش یہی تھی کہ سوتے میں بھی اس کا ہاتھ جیب پر رہے۔ رات گئے وہ اپنے کمرے سے نکلا۔ روشنیوں کے شہر پر آج کل چونکہ کے اکی اکیس سی زیادہ مہربان ہے اس لیے سرشام ہی اندر چرا چھا جاتا تھا یوں نکلے کو کچھ اطمینان تھا کہ اس کے کام میں کافی آسانی رہے گی۔ عبدالمالک صاحب کا مکان جس علاقے میں واقع تھا وہ اس علاقے سے تقریباً بیسی ہی تھا جہاں نگار ہوتا تھا۔

مطلوبہ مکان کے سامنے پہنچ کر اسے اچھی طرح پہچان کر اور مطمئن ہو کر نکال گئی گلی کے راستے اس کے عقب میں جا پہنچا۔ چاروں طرف سناٹا اور سکوت چھایا ہوا تھا۔ نکلے نے بغل میں دے ہوئے لفافے سے نقدی ڈاڑھی مونچھ نکال کر لگائیں تاکہ اگر واردات کے بجائے وقت کوئی دیکھ لے تو اس کی صحیح شناخت متعین نہ ہو سکے۔ آئینہ دیکھے بغیر

ہی اپنے میک اپ سے مطمئن ہو کر نکلے نے مکان کی عجمی دیوار پھاندی اور اندر پہنچ گیا۔ مکان کا نقشہ اس کے ذہن میں تھا۔ اسے معلوم تھا کہ عجمی دروازے میں ہاتھ ڈال کر کس طرح کھڑی کھولی جاسکتی ہے۔ اس کام میں اسے ذرا بھی دشواری پیش نہ آئی اور دروازہ کھول کر اس نے تارکی میں لیٹ کر قدم رکھا مگر یہ قدم اسے کافی مہنگا پڑا کیونکہ قدم رکھتے ہی اس کی آنکھوں کے سامنے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ کوئی خاصی وزنی چیز ٹھک سے اس کے سر پر پڑی تھی اور ساتھ ہی اندر جیسے میں ایک کرخت نسوانی آواز گونجی۔

”مجھے معلوم تھا عبدالمالک صاحب! کہ آپ اسی راستے سے واپس آئیں گے۔ میں پوچھتی ہوں آخر آپ کو اپنی رات گئے تک باہر رہنے کی ضرورت کیا ہے؟ بڑھے ہوئے عمر آوارگی نہیں گئی..... میں اب ان بہانوں سے بے وقوف نہیں بنوں گی کہ آپ قوالی سننے جاتے ہیں۔ قوالی تو اب آپ کو میں سنایا کروں گی اور طلبہ آپ کی کھوپڑی پر بجا کرے گا۔ میں آپ کی یہ ہر جمعرات کو دیر سے گھر آنے کی عادت چھڑا کر ہوں گی۔“ نکلا نکلا کر دیوار سے جا لگا تھا اور سینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اندر جیسے میں آنکھیں پٹ پٹا رہا تھا۔ دوسرے ہی لمحے

نکلے کا سا ہوا اور لیٹن میں روشنی پھیل گئی۔ نکلے نے چندھائی ہوئی آنکھوں سے دیکھا کہ ایک بوڑھی مگر تھیں اور چہرے کے سخت کھینچنے والی عورت سوچ بچار کے قریب کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں بیلن تھا۔ یقیناً وہ مسز عبدالمالک تھیں اور ان کے ہاتھ میں موجود بیلن ہی وہ آلہ تھا جس نے نکلے کے سامنے چودہ طبق روشن کیے تھے۔

”ارے.....! بڑھاپا اسے دیکھ کر کچھ حیران ہی ہو کر پوئی۔“ تم تو کوئی اور ہو.....“ وہ نکلے کے قریب آئیں۔

”کون ہو تم؟“

”جی..... وہ..... میں چور ہوں۔“ بولکھا ہٹ میں نکلے کے منہ سے نکل گیا۔ بیلن کی طرف دیکھتے ہوئے وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔

”چور؟ اور اس گھر میں چوری کرنے آئے ہو؟“ مسز عبدالمالک نے عسرت زدہ درود دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور ایک لمحے کے لیے یہ محسوس ہوا کہ وہ بے تحاشا قہقہے لگانے لگیں گی لیکن دوسرے ہی لمحے وہ بخیرہ ہوتے ہوئے بولیں۔ ”اگر چوری ہی کرنے آتا تھا تو یہ نقدی ڈاڑھی مونچھ لگا کر آنے کی کیا ضرورت تھی؟“ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر نکلے کی ڈاڑھی مونچھ نوچ لی۔ نکلا پکھڑا ہوا تھا۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے کسی نے سر بازار اس کی ٹیس اتار لی ہو۔

”آپ کیسے معلوم ہوا کہ یہ ڈاڑھی مونچھ نقدی ہے؟“ نکلے نے بظنون میں ہاتھ دیتے ہوئے پوچھا۔

”میں نے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے۔“ بڑی بی نے اپنے سر کی طرف اشارہ کیا۔ ”مجھے تو تمہاری آنکھوں جیسی صورت دیکھ کر ترس بھی آ رہا ہے اور یہی بھی تم اس گھر میں چوری کرنے آئے ہو، جہاں چوری کرنے کے قابل تو کیا کباڑی کو دینے کے قابل بھی کوئی چیز نہیں ہے۔ یہاں کی سب سے قیمتی چیز میں ہی ہوں مجھے چاہئے کہ ہوتو چروالو۔“

”میرا خیال ہے میں اس کام میں کم از کم چالیس برس لیٹ ہو گیا ہوں اس لیے اسے اب رہنے ہی دیں۔“ نکلے نے مودبانہ لہجے میں کہا۔

بڑی بی نے بیلن کو جنبش دی مگر پھر شاید نکلے کو خوفزدہ ہوتے دیکھ کر انہیں ترس آ گیا اور وہ قدرے نرم لہجے میں بولیں۔ ”عائنائی وی سیریل“ بیلن نے ”حا“ کی آخری قسط دیکھ کر تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے اور تم نے بھی آصف رضا میر کی طرح قسمت آزمائی کی ٹھانی ہے؟“

”جی نہیں۔ اللہ کا بڑا احسان ہے کہ میرے پاس فی وی نہیں ہے۔“ نکلے نے جرأت کر کے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ویسے بانی دادے..... کیا ہوا تھا اس قسط میں؟“

”اس میں ٹیلی اور بشری انصاری نے چور یعنی آصف رضا میر کے ساتھ تقریباً وہی سلوک کیا تھا جو ایک بزرگ خاتون نے اپنے گھر میں آنے والے چور کے ساتھ کیا تھا۔“ بڑی بی نے بتایا۔

”لیکن میں چونکہ خدا کی ایک گناہ گاری بندی ہوں اس لیے میں تمہارے ساتھ ذرا مختلف سلوک کروں گی۔“

بڑی بی نے نکلے کا گریبان پکڑ کر ایک زوردار ہتھکا دیا اور بیلن لہراتے ہوئے کہا۔

”نکلے! دو جو کچھ تمہاری جیب میں ہے۔“

”کیا مطلب؟“ نکلا پکھڑا ہوا تھا۔

”مطلب یہ کہ اب تم پچیس ہی گئے ہو تو کچھ دیے بغیر جان توڑا ہی چھوٹے گی۔ میں تو اکثر دعا کرتی تھی کہ اس گھر میں کوئی کمزور قسم کا چور داخل ہو تو اس سے کچھ چھین چھان کر چند دن اچھے کھانے کھانے لگا ہی بندوبست کیا جائے۔ عبدالمالک تو روزانہ پکانے کے لیے چند رائٹا لٹاتے ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے بڑی بی نے خود ہی اس کی جیب میں ہاتھ ڈال دیا۔ قسمت یہ تھا کہ نکلے والی باقی ٹیس نیچے کے نیچے رکھ آیا تھا۔ اس کی جیب میں وہی تقریباً ساٹھ ستر روپے تھے جو آج سو کا ایک نوٹ خزانے کے بعد بچے تھے۔

”بس یہی ہے کل رقم تمہارے پاس؟“ مسز عبدالمالک نے تھارت سے کہا۔ ”بہت ہی مظلوم الحال چور معلوم ہوتے ہو۔ خیر..... چلو معاف کیا۔ ایک دن تو اچھا کھانا تک ہی جائے گا۔“ پھر انہوں نے نکلے کو دروازے کی طرف دھکیلے ہوئے کہا۔ ”چلو اب بھاگ جاؤ۔“

نکلے کا مشن دھرے کا دھرا رہ گیا تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ پردیس فرم۔ ان منان صاحب کو کیا منہ دکھائے گا۔ دفعتاً ایک ترکیب اس کے ذہن میں آئی۔ وہ بڑی بی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر گڑ گڑاتے ہوئے بولا۔ ”میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا کہ آپ نے میری جان بخش دی لیکن ایک چھوٹی سی مہربانی بھی پراور کیجئے۔“

”وہ کیا؟“ بڑی بی نے نیچے لہجے میں پوچھا۔

”دراصل میں چوروں کے ایک چھوٹے سے گروہ کا کارکن ہوں۔ اگر میں نے واپس جا کر ٹھیک رپورٹ دی کہ میرے ساتھ کیا ہوا تو ہمیشہ کے لیے میرا منہ کالا ہو جائے گا۔ گروہ والے مجھے نااہل قرار دے دیں گے۔ میرا مستقبل تارک ہو جائے گا۔ کیریئر تباہ ہو جائے گا۔ آپ مجھے کوئی چھوٹی موٹی چیز ہی دے دیں تاکہ میں بطور ثبوت گروہ کے سامنے پیش کر سکوں کہ میں واردات میں کامیاب تو رہا مگر ہاتھ غلط جگہ پڑا تھا۔ وہاں کوئی قیمتی شے تھی ہی نہیں۔ پلیز.....“ نکلا گڑ گڑایا۔

”کیا دے دوں میں تمہیں؟ یہاں سے کون سی چیز لے جاتے تم اچھے لگو گے؟“ بڑی بی نے ٹاک چڑھا کر ادھر ادھر دیکھا۔

نکلے نے سب سے اونچی کارنس پر ایک کونے میں رکھے ہوئے تین ٹانگوں والے کدو کوش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ کدو کوش ہی دے دیجئے۔ یہ بھلا آپ کے کس کام کا.....“

”ہاں۔ اسے تم بے شک لے جاؤ۔“ بڑی بی نے بلا تامل کہا۔ ”میں نے تو اسے کئی مرتبہ بیچنے کا ارادہ کیا مگر عبدالمالک گڑ گڑا نے لگے۔ اور پڑھو اور اتار لو اسے۔“

نکلے پر شادی مرگ کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ چولے کی سلیب پر پڑھ کر اس نے اتنی بے تابی سے کدو کوش کی طرف ہاتھ بڑھایا کہ اندھ سے منہ کرتے گرتے پڑا۔ سنبھل کر اس نے قدرے صبر و سکون سے کدو کوش اتارا، اسے سینے سے لگایا اور جس راستے سے آیا تھا، اسی سے واپس سڑک پر آ کر بگشت دوڑ پڑا۔



ایڈووکیٹ مرزا امجد بیگ

بہیدوں بھری اس دنیا میں جانے کیا کچھ چھپا ہے..... لوگ چہروں پر نقاب ڈالے اپنی فن کاریاں آزما رہے ہیں۔ ایسے میں جب سیر کو سوا سیر ذکر آجائے تو ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں جن کے بارے میں انسان عام حالات میں گمان تک نہیں کر سکتا۔ اس نے بھی ایک چھوٹی سی نیکی کر ڈالی تھی، جس کا خمیازہ اسے جیل جاکر بھگتنا پڑا..... ایسے میں بیگ صاحب کی ہنرکاری نے وہ دائروں آزمائے کہ دیکھنے والے دیکھتے رہ گئے۔

سکین حالات کے ممکن واقعات اور بیگ صاحب کی ممکن باتیں

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی چہرے کو دیکھ کر ہم چونک جاتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس کو ہم نے پہلے بھی نہیں دیکھا ہے۔ کہاں..... یہ یاد نہیں آتا لہذا ذہن ابھرنے کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے۔

میں بھی اس وقت کچھ ایسی ہی کیفیت سے دوچار تھا۔ میں ایک عدالت سے نکل کر دوسری عدالت کی طرف جا رہا تھا کہ ایک اس پر میری نگاہ پڑ گئی۔ وہ مجھے دیکھ کر کھٹک گیا تھا۔ جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ یا تو مجھے پہچان چکا ہے یا پھر پہچاننے کی کوشش کر رہا ہے۔ بہر حال بلحالی تک دو دو کے بعد وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو گیا اور سرسراتے ہوئے لہجے میں بولا۔

”بیگ صاحب.....!“

اس لمحے مجھے بھی یاد آ گیا کہ میں نے اس شخص کو پہلے کہاں دیکھا تھا۔ اس کی آواز سنتے ہی اس کا نام بھی میرے ذہن میں تازہ ہو گیا اور اس کی یاد کے جواب میں، میں نے پوچھا۔

”فیصل..... تم یہاں؟“

”تم یہاں“ کے الفاظ میں نے ایک خاص پھویشن کے پیش نظر استعمال کیے تھے۔ کیونکہ فیصل اس وقت دو پولیس والوں کی کھڑکی میں تھا جو اسے جیل کی گاڑی کی طرف لے جا رہے تھے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کسی سنگین جرم کے سلسلے میں، جیل میں بند تھا اور اسے پیش پر عدالت میں لایا گیا تھا اور اب واپس جیل لے جایا جا رہا تھا۔ میرے استفسار کے جواب میں فیصل نے دھکی لہجے میں بتایا۔

”بیگ صاحب! میں پچھلے چھ ماہ سے جیل میں بند ہوں۔ مجھ پر قتل کا الزام ہے۔ یہ نیکی عدالت میں چل رہا ہے۔

لیکن ابھی تک کسی قسم کی کوئی پیش رفت دیکھنے میں نہیں آئی۔ مجھے جو وکیل میسر ہے وہ بہت ہی ڈھیلا ثابت ہو رہا ہے۔ لگتا ہے، وہ مخالف پارٹی سے جا ملتا ہے اور.....“

”او بس بھئی، لاٹ صاحب کی اولاد.....!“ جس پولیس والے کے ہاتھ میں جھکڑی کا دوسرا سرا تھا، اس نے ایک جھکڑا دیتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔ ”ہمارے پاس اتنا فی الوقت نہیں ہے جو تمہیں ان مشغول کہاٹوں کا سامنا دیں۔ چلو..... میٹرو میں!“

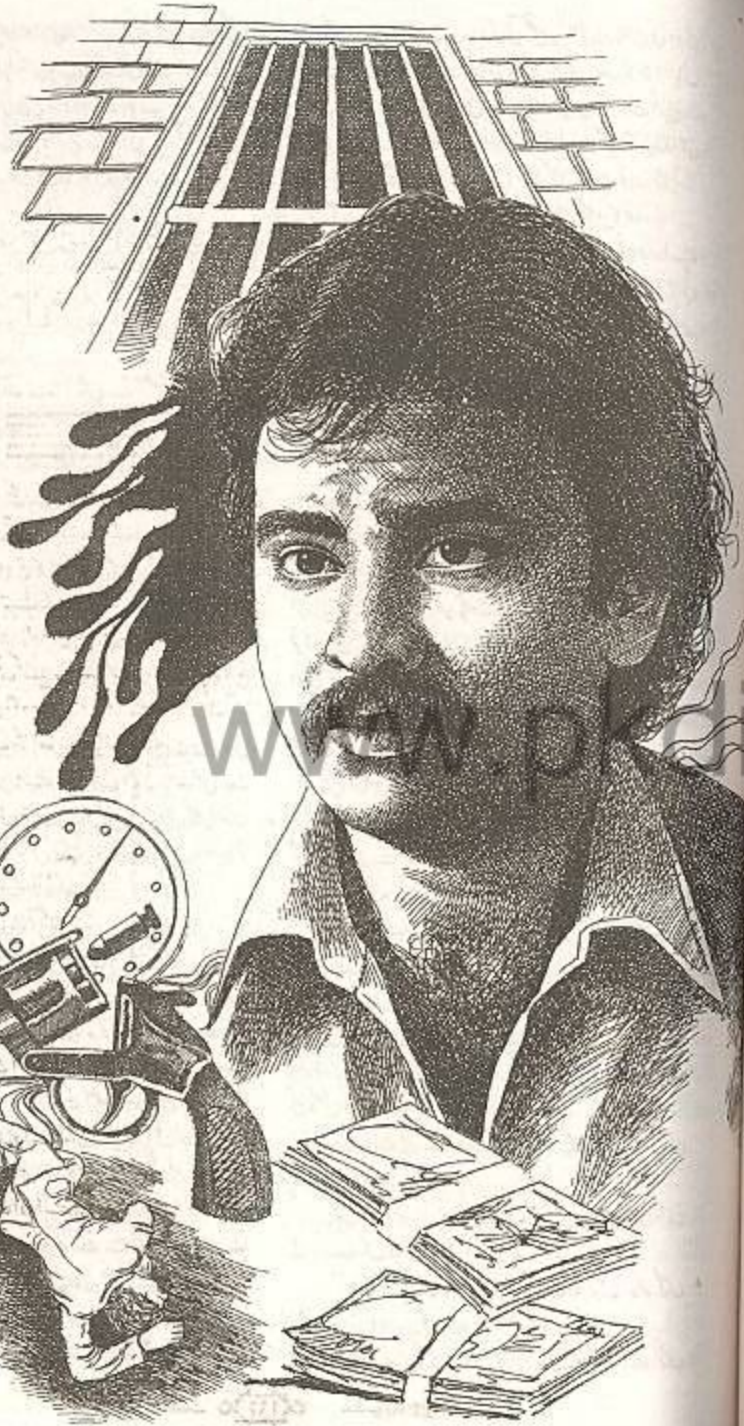
”ایک منٹ.....!“ میں نے پولیس والے کی طرف دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”مجھے ملزم سے ایک دو سوال کرنے دو، پھر تم اسے جہاں دل چاہے، لے جانا۔“ پولیس والے نے سر سے پاؤں تک مٹھ کر مجھے دیکھا۔ میں نے اسے اور اس کی نظر کو نظر انداز کرتے ہوئے فیصل سے پوچھا۔

”تم نے وکیل خود کیا ہے یا وہ وکیل سرکار نے تمہیں مہیا کیا ہے؟“

”وکیل تو پرائیویٹ ہے جناب!“ اس نے جواب دیا۔ ”میری بیوی نے باقاعدہ فیس دے کر میرے لیے اسے کھڑا کیا ہے لیکن اس عرصے کے دوران میں یہ ثابت ہوا ہے کہ میرا وکیل ایک بے خبر اور لالچی انسان ہے۔ مجھے شک ہے کہ وہ مخالف پارٹی کے ہاتھوں کا ٹھکڑا بنا ہوا ہے جب ہی چھ ماہ گزار جانے کے باوجود نیکی جوں کا توں ایک ہی جگہ کھڑا ہے۔“

”ہوں.....!“ میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔ ”اس دنیا میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔“

”بیگ صاحب.....!“ وہ امید بھری نظر سے مجھے



دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اچھا ہوا، یہاں آپ سے ملاقات ہوگئی۔ میں چاہتا ہوں، آپ میرا کس اپنے ہاتھ میں لے لیں۔“
میں نے رسد واضح پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ ”دوسری عدالت میں میرے کسی کی آواز پڑنے والی ہے، تم اپنی بیوی کو میرے آفس بھیجنا۔ میں دیکھتا ہوں، تمہارے لیے کیا کیا جاسکتا ہے۔“
”بہت بہت شکریہ بیک صاحب!“ وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولا۔

میں نے پوچھا۔ ”اگلی پیشی کب ہے؟“
”پندرہ دن بعد۔“
”پھر تو کافی وقت ہے!“ میں نے مطمئن انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔
”آج فرزانہ مجھ سے ملنے آئے گی۔“ فیصل نے بتایا۔
”میں اسے آپ سے ملنے کے لیے کہہ دوں گا۔ وہ کل آپ کے دفتر پہنچ جائے گی۔“
فرزانہ فیصل کی بیوی کا نام تھا۔ میں نے دائیں بائیں نگاہ دوڑانے کے بعد کہا۔ ”کیا فرزانہ آج پیشی پر عدالت نہیں آئی؟“

”نہیں جناب۔“ اس نے لٹھی میں سر ہلایا۔ ”وہ آج کہیں اور مصروف ہے۔“
میں نے فرزانہ کی ”مصروفیت“ کے حوالے سے کوئی سوال نہیں کیا۔ اس طرح خواہناؤہ بحث کا ایک نیا درکھل جاتا اور ایسے کسی کام کے لیے میرے پاس وقت بالکل نہیں تھا۔
دونوں پولیس والوں نے فیصل کو نیل وین کی جانب دھکیلا تو میں متعلقہ عدالت کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

فیصل میری پہلی ملاقات گلشن کی ایک اپارٹمنٹس بلڈنگ میں ہوئی تھی۔ وہ متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والا ایک شریف انصاف انسان تھا۔ دراصل، مذکورہ اپارٹمنٹس بلڈنگ میں میرا جانا ایک خاص مقصد سے تھا۔ وہاں میرا ایک دوست رہتا تھا۔ صدر نامی وہ دوست بہت اچھا میوزیشن تھا لیکن پتا نہیں اچانک قربت کس بات پر اس سے ناراض ہوئی تھی۔
صدر پر قہقہہ کا ایسا خطرناک حملہ ہوا کہ وہ زندگی بھر کے لیے اپنے بستر تک محدود ہو کر رہ گیا۔ وہیں کیپڑ کرنا تو دور کی بات، وہ اپنی مرضی سے حرکت کرنے کے بھی قابل نہیں رہا تھا۔ میں بیٹھے دس دن میں صدر کی دل جوئی کے لیے اس کے قہقہے پر چلا جاتا تھا اور گھنٹا، دو گھنٹا بیٹھ کر واپس آ جاتا تھا۔ فیصل، صدر کے سامنے والے قہقہے میں رہتا تھا اور اکثر اس

سے بھی میری ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ فیصل اور اس کی بیوی فرزانہ بہت اچھے لوگ تھے اور اپنے بڑی صبر کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ صدر اور اس کی بیوی شائستہ ان کی بہت تعریف کرتے تھے۔ کچھ عرصہ قبل صدر کا انتقال ہو گیا تھا لہذا اس اپارٹمنٹ بلڈنگ میں اب میرا جانا نہیں ہوتا تھا۔ شائستہ گراچی سے لاہور شفٹ ہو گئی تھی جہاں اس کا میکا تھا۔
اگلے روز میں عدالتی سمیٹوں سے فارغ ہو کر اپنے دفتر پہنچا تو فرزانہ کو وہاں موجود پایا۔ اس وقت وزیر زلائی میں زیادہ رش نہیں تھا لہذا میں نے فرزانہ کو فوراً اپنے جیمیر میں بلا لیا۔ رکی ٹیک سلیک کے بعد میں نے کہا۔
”جی فرزانہ! مجھے تفصیل سے بتائیں، آپ کا شو ہر کس مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہے؟“

فرزانہ کی عمر لگ بھگ تیس سال رہی ہوگی۔ وہ دہلی تیلی اور اسمارٹ عورت تھی۔ ان کی شادی کو میری معلومات کے مطابق آٹھ سال ہو گئے تھے۔ اس جوڑے کی صرف ایک اولاد تھی۔ سات سالہ عظمیٰ جو کلاس ٹو کی اسٹوڈنٹ تھی۔ فرزانہ، اپنی بیٹی عظمیٰ کو گھر چھوڑ کر مجھ سے ملنے آئی تھی۔ آج کل فرزانہ کی بیٹی بہن شائستہ اس کے گھر میں رہنے کے لیے آئی ہوئی تھی جو فرزانہ کی غیر موجودگی میں عظمیٰ کا خیال رکھتی تھی۔
میرے سوال کے جواب میں فرزانہ پانچ چھ منٹ تک مختلف زاویوں سے مجھے یہ بتانے کی کوشش کرتی رہی کہ فیصل کا وکیل کتنا بدینیت اور بدحرام ہے۔ ابھی تک اس نے کوئی قابل ذکر یا ناقابل ذکر کارکردگی نہیں دکھائی اور۔۔۔ یہ کہ وہ فیصل کی وجہ سے سخت پریشان ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔۔۔
مجھے مجبوراً مدخلت کرنا پڑی کیونکہ اس کی فراہم کردہ معلومات میرے لیے کسی بھی کام کی نہیں تھیں۔ میں نے قطع کلائی کرتے ہوئے گھبرانداز میں کہا۔

”فرزانہ صاحب! آپ کے شو ہر کس اب میرے ہاتھ میں آنے والا ہے۔ اس لیے یہ قصہ تو بھول ہی جائیں کہ پہلے والے وکیل نے کیا کیا ہے۔ تمہیں، آج سے اس وکیل کی پھٹی ہوئی۔“
وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ مجھے دیکھنے لگی تاہم زبان سے کچھ نہ بولی۔
میں نے کہا۔ ”فرزانہ بی بی۔۔۔ آپ مجھے اس کیس کے بارے میں بتاؤ۔۔۔؟“
”جی۔۔۔ کیس کے بارے میں تو میں کچھ نہیں جانتی۔۔۔! وہ بے بسی سے مجھے دیکھنے لگی۔
میں نے ابھمن زدہ انداز میں کہا۔ ”کچھ نہیں

جانتی۔۔۔ کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ۔۔۔“ وہ متذبذب لہجے میں بولی۔ ”حالات و واقعات اس طرح آپس میں گڈمڈ ہو گئے ہیں کہ سمجھ میں نہیں آ رہا، کہاں سے شروع کروں اور۔۔۔ کیا بتاؤں، کیا نہیں بتاؤں۔۔۔؟“
اچانک کوئی افتادہ سر پر آن پڑے تو انسان بری طرح ہلکا کر رہ جاتا ہے۔ فرزانہ بے چاری کا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا۔ میں اس کی پرانیلم کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا لیکن میری یہ مجبوری تھی کہ جب تک مجھے اس کیس کے حوالے سے مناسب بنیادی معلومات حاصل نہ ہو جائیں، میں ہاتھ پاؤں ہلانے اور ذہن کے گھوڑے دوڑانے کی پوزیشن میں نہیں آ سکتا تھا۔ لہذا فرزانہ کی مدد کے خیال سے میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”فرزانہ صاحب! مجھے آپ کی پریشانی کا بخوبی احساس ہے۔ ٹھہریں، اس سلسلے میں، میں آپ کے لیے آسانی پیدا کر دیتا ہوں۔۔۔“
میں نے لحاظی توقف کر کے ایک گہری سانس خارج کی تو فرزانہ امید بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے اس سے پوچھا۔
”آپ کے شو پر فیصل پر کس کے قتل کا الزام ہے؟“
”اس بندے کا نام عدنان تھا۔“ اس نے جواب دیا۔
”کیا آپ مقتول کو جانتی ہیں؟“ میں نے استفسار کیا۔
”صرف نام کی حد تک۔“ اس نے بتایا۔ ”اور وہ بھی میں نے فیصل ہی کی زبان سے سنا تھا۔ کیونکہ فیصل اس شخص کی وجہ سے بہت پریشان تھا۔“

”فیصل، مقتول کی وجہ سے کیوں پریشان تھا؟“ میں نے جلدی سے پوچھا۔ یہ ایک اچھا زاویہ سامنے آیا تھا۔
فرزانہ نے برا سامنہ بناتے ہوئے بتایا۔ ”عدنان جب سے اس دفتر میں آیا تھا، اس نے فیصل کے خلاف سازشیں شروع کر دی تھیں۔ ہر روز کوئی نیا ایسا ٹکڑا کھڑا ہوتا اور فیصل کے لیے ٹکڑوں کا سامان ہو جاتا۔۔۔“

”ایک منٹ۔۔۔! میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے بتایا ہے کہ جب سے عدنان۔۔۔ فیصل کے دفتر میں آیا تھا، بد مزگی پیدا ہونا شروع ہوئی تھی۔ اس کا مطلب ہے، مقتول کو اس آفس میں آئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا؟“
یہ بات مجھے پہلے سے معلوم تھی کہ فیصل کا شعبہ مارکیٹنگ تھا اور وہ ایک آفس بنانے والی فرم کے لیے کام کرتا تھا۔ مذکورہ فرم ایک مشہور ”مبیر آئل“ بناتی تھی جو اندرون

شکریہ

☆ خاتون خانہ نے قدرے غصے کے ساتھ ٹی اور نوجوان ملازمہ سے کہا۔

”میں جب بھی کچن میں آتی ہوں، تمہیں کوئی کام کرتے نہیں دیکھا۔ تم بس بیٹھی فنی رسالے پڑھتی رہتی ہو۔“

”نیکم صاحب! ایک تو آپ جو تیاں ایسی بہنتی ہیں، جن کی آواز ہی نہیں آتی۔۔۔؟“ ملازمہ نے الٹا شکوہ کر ڈالا۔

مرسلہ راجا نواب۔۔۔ ملتان

ملک کے علاوہ بیرون ملک بھی فروخت کے لیے ایکسپورٹ کیا جاتا تھا۔ فرزانہ نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔
”جی بیک صاحب! جب یہ اند ہٹا کہ واقعہ پیش آیا، مقتول کو وہ دفتر جوائن کے صرف چار ماہ ہوئے تھے۔ فیصل اور عدنان کے سچے چچا چچا چل رہی تھی، اسی کی بنا پر فیصل کو عدنان کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا۔“
”تو عدنان کیسے آگیا تھا؟“ میں نے رف پڈ پر قلم مجھے ہونے پوچھا۔

”مستر اپریل کی شام کو۔“ فرزانہ نے جواب دیا۔
”اور فیصل کو کب گرفتار کیا گیا؟“ میں نے سوال کیا۔
”اتھارہ اپریل کی صبح۔“
”مگر۔۔۔؟“

”نہیں!“ اس نے قطعی انداز میں سر کٹتی میں جھٹکا اور کہا۔ ”اگلے روز یعنی اتھارہ اپریل کو جب فیصل حسب معمول دفتر پہنچا تو وہاں پولیس موجود تھی۔ انہیں فیصل کی آمد کا ہی انتظار تھا۔ اگر اس روز فیصل بروقت اپنے آفس آتے پھرتا تو پولیس اسے گرفتار کرنے گھر کا رخ کرتی کیونکہ اس وقت تک پولیس نے یہ طے کر لیا تھا کہ عدنان کے قتل میں فیصل کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔“

”اور پولیس نے یقیناً مقتول اور ملزم کی باہمی چپقلش کی روشنی میں یہ بات طے کی تھی؟“ فرزانہ سانس درست کرنے کے لیے سچی تو میں نے ایک امکا کی سوال کیا۔

”جی ہاں۔۔۔! اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔
”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“
”اب آپ مجھے اس ”چپقلش“ کے بارے میں کچھ بتائیں؟“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

وہ چند لمحات تک خاموش رہ کر ذہن میں بکھرے ہوئے مختلف خیالات اور سوچوں کو ایک مقام پر جمع کرنے کی کوشش کرتی رہی پھر بتانے لگی۔

”بیک صاحب! آپ کو یہ تو پتا ہی ہے کہ فیصل اپنی فرم کے لیے مارکیٹنگ کیا کرتا تھا اور فرم کا مالک اس کی کارکردگی سے بے انتہا خوش بھی تھا لیکن یہ بہت عداوت پتا نہیں، کہاں سے آن نکلا تھا۔ عدنان کا تعلق بھی مارکیٹنگ ہی کے شعبے سے تھا۔ میں نہیں جانتی، وہ کس کے ریفرنس سے فرم میں ملازم ہوا تھا بہر حال عدنان کو فیصل کے ساتھ ہی تھکی کر دیا گیا تھا لیکن چند دنوں بعد ہی اس نے پر پرزے لگانا شروع کر دیے۔“ وہ لمبے بھر کے لیے سانس لینے کو رکھی پھر

اضافہ کرتے ہوئے بولی۔
”عدنان نے بڑے غیر محسوس انداز میں فرم کے مالک کے کان بھرنا شروع کر دیے۔ مثلاً یہ کہ فیصل جس کیشن پر کام کر رہا ہے وہ اس سے آدھے پر بھی کام کرنے کو تیار ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے فرم کے مالک کو یہ یقین بھی دلایا کہ اگر مارکیٹنگ کا شعبہ مکمل طور پر اس کے حوالے کر دیا جائے تو وہ بڑی کم بختی سے بڑھا کر دکھا دے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔“

”اور اس نوعیت کی پرکشش باتیں ہر باس کو اچھی لگتی ہیں!“ میں نے لقمہ دیا۔

”آپ بالکل سچ کہہ رہے ہیں بیک صاحب!“ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

میں نے کہا۔ ”عدنان کی پڑھائی ہوئی پٹی کے بعد فرم کے باس کا رویہ فیصل کے ساتھ خاصا بدل گیا ہوگا؟“

”خاصا نہیں بلکہ مکمل طور پر۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ ”عدنان کی پھیلائی ہوئی سازش بڑی تیزی کے ساتھ کامیابی سے ہمکنار ہوئی اور باس کو فیصل کے کام میں بہت زیادہ کیزے نظر آنے لگے۔ وہ بات، بے بات فیصل کو اپنے کمرے میں بلا کر نوٹس کے بلکہ بعض اوقات تو فیصل کے ساتھ باس کا رویہ بڑا تحقیر آمیز ہو جاتا تھا۔ اس صورت حال نے فیصل کا ذہنی سکون ختم کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ چڑچڑا اور بد مزاج ہو گیا۔ وہ مجھ پر غصہ ہوتا اور عکلی بر بھی ہوا اوقات پرک پڑتا تھا۔ مجھے اس کے دفتری حالات کا چونکنا تھا لہذا اس کی جگہ دہار کو برداشت کر لینے لگی لیکن ایسے مواقع پر عکلی بہت زیادہ پریشان اور خوفزدہ ہو جاتی تھی۔“

وہ اپنی بات مکمل کر چکی تو میں نے لکیر لکیر میں کہا۔
”ان دفتری کشیدہ حالات میں عدنان کا فعل ہو جاتا ہے اور

فیصل کو اس کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا جاتا ہے۔ یہی بات ہے نا۔۔۔۔۔؟“

”بالکل یہی بات ہے جناب!“ وہ تائیدی انداز میں سر جھٹک دیتے ہوئے بولی۔ ”مہم انجی ایک پریشانی سے نکلے نہیں تھے کہ یہ دوسری افادہ سر پر آن پڑی ہے۔“

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”کیا فیصل اور عدنان کی باہمی چپقلش اور عدنان کے قتل کے الزام میں فیصل کی گرفتاری سے پہلے بھی آپ لوگوں کے ساتھ کوئی پرالہم رہی ہے۔۔۔۔۔؟“

”جی ہاں۔۔۔ وہ ایک الگ مصیبت تھی۔۔۔۔۔“ فرزانہ نے جواب دیا۔

”اس مصیبت کو الگ نہیں رہنے دیں بلکہ میرے ساتھ شیئر کریں۔“ میں نے خصوصی دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ لوگ اس معاملے سے پہلے کس قسم کی پریشانی میں مبتلا تھے۔ ہو سکتا ہے، ان دونوں معاملات کے ڈانڈے آگے جا کر نہیں آپس میں مل جائیں!“

”مجھے تو ایسا نظر نہیں آ رہا، بہر حال آپ کو وہ قصہ سنائی ہوں۔۔۔۔۔“ وہ بددلی سے بولی۔

”خی ضرور۔۔۔۔۔“ میں جتنی کوشش ہو گیا۔
وہ بتانے لگی۔ ”بیک صاحب! کچھ عرصہ پہلے فیصل نے انسانی ہمدردی کے کاتے ایک بھروسہ اور کسے کھٹکی کی کچھ اخلاقی مدد کر دی تھی۔ یہ کچھ بعد میں فیصل کو بہت مہنگی پڑی۔“

”ذرا تفصیل سے بتائیں گی؟“ وہ خاموش ہوئی تو میں نے سرسراہٹ ہوئی آواز میں پوچھا۔

”مجھے اس بارے میں زیادہ تو معلوم نہیں لیکن اتنا جانتی ہوں کہ فیصل نے جس ضرورت مند فیملی کی اخلاقی مدد کی تھی ان کی ایک لڑکی بعد میں کسی پولیس کس میں ملوث پائی گئی تھی اور اسی وجہ سے بعض خطرناک جرائم پیشہ لوگ فیصل کو طرح طرح کی خوفناک دھمکیاں دیتے رہے تھے لیکن کچھ عرصے کے بعد یہ معاملہ دب دیا گیا اور ہم نے بھی سکون کی سانس لی۔“ ایک لمبے کوک کر فرزانہ نے واقعات سکون کی سانس لی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولی۔

”اور اب یہ مصیبت اٹھ کھڑی ہوئی ہے!“
”میں فیصل کی اس انسانی ہمدردی کے بارے میں مزید جانتا چاہتا ہوں جو اس نے کسی مصیبت زدہ فیملی کے ساتھ کی تھی؟“ میں نے فرزانہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ وہ فیملی انڈیا کے علاقے میں رہتی تھی۔“ فرزانہ نے جواب میں بتانا شروع

کیا۔ ”وہ عبدالغفور نامی کوئی بوڑھا شخص تھا۔ اس کی جوان بیٹی نورین کو بعض برسے لوگ تنگ کرتے تھے۔ فیصل کا ایک دوست پولیس میں ہے۔ عبدالغفور نے فیصل سے مدد کی درخواست کی۔ فیصل نے اپنے پولیس والے دوست کے تعاون سے جو ہو سکا تھا وہ احسان عبدالغفور پر کر دیا۔ کچھ عرصے کے بعد نورین نامی وہی لڑکی، یہاں ہمارے ہی علاقے میں کسی جرائم پیشہ شخص کے ساتھ ایک معاملے میں ملوث پائی گئی۔ اس مرحلے پر فیصل نے پولیس کی بھرپور مدد کی تھی جس کے نتیجے میں مذکورہ جرائم پیشہ شخص رینگے ہاتھوں گرفتار ہو گیا۔ اس کی گرفتاری کے بعد، اس کے ساتھی فیصل کو انٹی سیوریج دھمکیاں دیتے رہے تاہم اس سلسلے میں انہوں نے کسی عملی کمپنی کا مظاہرہ نہیں کیا اور ہم بھی مطمئن ہو گئے۔“ اس نے تھوڑا توقف کر کے بڑی گہری نظر سے مجھے دیکھا پھر بولی۔

”میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں جانتی۔ فیصل آپ کو اس بارے میں تفصیل سے بتا سکتا ہے۔“

”ٹھیک ہے، میں کل کسی وقت جیل جا کر فیصل سے بھی ملاقات کروں گا۔“ میں نے نسلی آئینہ انداز میں کہا۔ ”تمام حالات محل کر سامنے آئیں گے تو پھر ہی فیصل کی مدد کی کوئی صورت پائے گی۔“

”بیک صاحب! آپ فیصل کو اس مصیبت سے نکال میں لے سکتے؟“ وہ بڑی امید بھری نظر سے مجھ سے دیکھتے ہوئے بولی۔

”ہاں ہاں، کیونکہ نہیں۔“ میں نے حوصلہ دینے والے انداز میں کہا۔ ”میں فیصل کو ذاتی طور پر جانتا ہوں۔ وہ ایک شریف اور امن پسند شخص ہے۔ اس کے سینے میں انسانیت بھرا ایک ہمدرد اور حساس دل ہے۔ آپ لوگوں نے جس جڈے اور جاں فشانی سے میرے مطلوب دوست صفر کا خیال رکھا وہ بھی میرے سامنے ہے۔ اگر فیصل نے عدنان کو قتل نہیں کیا تو اس کا مطلب ہے، وہ بے گناہ ہے۔۔۔۔۔ اور اگر وہ بے گناہ ہے تو اسے اس کس سے باعزت بری ہونا چاہیے۔ بس، اتنی ہی بات ہے!“

”بہت بہت شکریہ بیک صاحب!“ وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولی۔ ”آپ نے تو میری بہت بھنجا دی ہے۔“ پھر وہ اپنا پرس کھولتے ہوئے گویا ہوئی۔ ”میں رقم ساتھ لے کر آئی ہوں۔ آپ اپنی فیس تو مجھ سے لے لی۔“

”فیس میں آپ سے لے لوں گا۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”پہلے میں ایک تفصیلی ملاقات فیصل سے کروں۔“

”فیصل سے آپ ضرور ملاقات کریں لیکن فیس آپ کو

ابھی لینا پڑے گی۔“ وہ اصراری لہجے میں بولی۔ ”اور اس کی ایک خاص وجہ ہے!“

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔
”کون سی وجہ؟“

”میں فیصل کو اس کیس میں بے گناہ سمجھتی ہوں اور آپ بھی میرے ہم خیال ہیں۔“ وہ نیچے تلے الفاظ میں وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”جب وہ بے قصور ہے تو ہر صورت میں اس کا کیس آپ کو لینا ہے۔ جب کیس آپ کو لینا ہے تو پھر فیس بھی آپ کو لینا ہوگی۔ ابھی لی یا بعد میں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تو پھر کیوں نہ ابھی لیں۔۔۔۔۔!“

فرزانہ نے دینے پر اصرار کیا تو میں انکار نہ کر سکا تاہم اس سلسلے میں، میں نے اس کے ساتھ خصوصی رعایت کر دی تھی۔ وہ میری اس مہربانی پر بڑی مطمئن اور پرسکون ہو کر میرے دفتر سے رخصت ہو گئی۔

آئندہ روز جیل جا کر میں نے فیصل سے ایک بھرپور ملاقات کی اور بہت سی نئی باتیں میرے علم میں آئیں۔ خصوصاً اس لڑکی کے حوالے سے، فرزانہ نے جس کا نام نورین بتایا تھا۔ یہ بڑی سنسنی خیز اور انکشاف انگیز معلومات تھیں۔ آگے بڑھتے سے پہلے میں اس کیس کا دلچسپ پس منظر آپ کو بتاتا ہوں جس میں سنسنی خیزی کے علاوہ بہت سا سامان جبرت بھی ہے۔ ایک بات کی وضاحت کرتا چلوں کہ میں جو کچھ آپ کی خدمت میں پیش کرنے جا رہا ہوں اس میں سے بہت سی باتیں مجھے بعد میں بتائی تھیں تاہم واقعات کے تسلسل اور ترتیب کے پیش نظر انہیں یکجا کر کے تحریر کر رہا ہوں تاکہ آگے چل کر عدالتی کارروائی کے دوران میں، کسی مرحلے پر آپ کا ذہن الجھن کا شکار نہ ہو۔!

☆☆☆

فیصل کے بارے میں آپ کو بنیادی معلومات حاصل ہو چکی ہیں۔ اس تمام تر کھینچنے کی ابتدا اسی کی ذات سے ہوتی ہے۔ ایک روز وہ اپنے آفس سے نکل رہا تھا کہ عبدالغفور سے اس کی ملاقات ہو گئی۔ مارکیٹنگ سے وابستہ افراد عموماً آؤٹ ڈور ہی رہتے ہیں۔ اپنے معمول کے مطابق، وہ لوگ صبح آفس آکر حاضری لگاتے ہیں، مالکان کو اپنی شکل دکھاتے ہیں اور پھر فیلڈ میں نکل جاتے ہیں۔ آفس کلوز ہونے سے تھوڑی دیر پہلے ان کی واپسی ہوتی ہے پھر وہ گھٹنا، دو گھنٹا دفتر میں بیٹھ کر اپنا حساب کتاب کرتے ہیں اور بالآخر اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو جاتے ہیں۔ فیصل کی

روئین بھی کچھ اسی نوعیت کی تھی۔ ایک بات کی وضاحت کرتا چلوں کہ مارکیٹنگ کے حوالے سے میں نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ کوئی فارمولہ نہیں لیکن دیکھنے میں یہی آیا ہے۔ بہر حال، فیصل کی عبدالغفور سے ملاقات ہو گئی۔

اس وقت دن کے گیارہ، ساڑھے گیارہ بجے ہوں تھے۔ فیصل دفتر سے نکل کر ایک کلائنٹ کی طرف جا رہا تھا۔ فیصل جس فرم کے لیے کام کرتا تھا اس کا سیٹ اب کورنگی انڈسٹریل ایریا میں تھا۔ وہ فرم کے دفتری حصے سے نکل کر جیسے ہی بائیک پر سوار ہوا، ایک بارش بزرگ صورت شخص اس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ اس کی عمر ساٹھ سے تینواڑھی تھی۔ سر اور ڈاڑھی کے بال سفید ہو چکے تھے۔ مناسب قد اور دبلا پتلا جسم، رنگت گندمی تاہم وہ اس عمر میں بھی خاصا ہوشیار اور مستعد نظر آتا تھا۔ اس نے سفید شلوار سٹریٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ فیصل کی جیسے ہی اس پر نگہ پڑی، وہ بڑی محبت سے بولا۔

”السلام علیکم بیٹا۔“

فیصل نے عبدالغفور کے سلام کا جواب دیا پھر سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”فیصل بیٹا۔ مجھے تم سے ایک بہت ضروری کام ہے۔“ عبدالغفور نے لاجت بھرے انداز میں کہا۔

فیصل نے چونک کر اسے دیکھا اور پوچھا۔ ”آپ کون ہیں اور میرا نام کس طرح جانتے ہیں؟“

”میں عبدالغفور ہوں۔“ عمر رسیدہ شخص نے اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا۔ ”بیٹا! تمہارے بارے میں میرے ایک جاننے والے نے بتایا تھا اور یہ بھی یقین دلایا تھا کہ تم میری مشکل کا کوئی نہ کوئی حل ضرور نکال دو گے۔“

”آپ اس، اپنے جاننے والے کا نام بتائیں گے؟“ فیصل نے ابھی زندہ لیجے میں سوال کیا۔

عبدالغفور اپنی پیشانی مسلتے ہوئے کچھ سوچنے لگا۔ فیصل کو یہ اندازہ قائم کرنے میں ذرا مشکل پیش نہ آئی کہ وہ مذکورہ بندے کا نام یا ذکر کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن باوجود سوچنے کے بھی جب عبدالغفور کو اپنی کوشش میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی تو اس کی آنکھوں میں بے بسی جھلکے گی۔ اس بے بسی میں ہلکی سی شرمندگی بھی شامل تھی۔

فیصل نے اس کی مجبوری کو پیش نظر رکھتے ہوئے نرمی سے کہا۔ ”انکل غفور! آپ جھوڑیں اس بندے کو۔۔۔ یہ بتائیں، میں آپ کے کس کام آسکتا ہوں؟“

”اللہ تمہارا بھلا کرے بیٹا۔“ وہ ہنسنے ہوئے انداز میں بولا پھر جو یہ پیش کرنے والے لیجے میں کہا۔ ”کیوں نہ ہم

کہیں بیٹھ کر آرام سے بات کریں۔!“

بے ساختہ فیصل کی نگاہ ایک طرف اٹھ گئی۔ سامنے ہی چائے کا ایک ہوٹل تھا۔ فیصل کے پاس اتنا وقت تھا کہ وہ اس بے بس اور پریشان شخص کے ساتھ بیٹھ کر چائے کا ایک کپ ہی پی لے۔ فیصل بنیادی طور پر ایک ہمدرد اور حساس انسان تھا۔

میں نے اسے دوسروں کی مدد کرنے والا، دوسروں کا احساس کرنے والا پایا تھا۔ عبدالغفور کو پریشان حال دیکھ کر اس کے لیے فیصل کے دل میں ایک نرم گوشہ ہو گیا تھا لہذا اس نے عبدالغفور کی طرف دیکھتے ہوئے متدل انداز میں کہا۔

”آؤ انکل۔ اس ہوٹل میں بیٹھ کر چائے پیجیے۔“

عبدالغفور نے اثبات میں گردن ہلائی اور فیصل کے ساتھ ہولیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ مذکورہ ہوٹل میں آنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ ناشتے کا وقت گزر چکا تھا اور بیچ کا وقت ابھی شروع نہیں ہوا تھا اس لیے ہوٹل میں رش نام کی کوئی شے نہیں تھی لہذا وہ دونوں وہاں بیٹھ کر بڑے اطمینان سے بات کر سکتے تھے۔ جلد ہی ویٹر نے ان کے سامنے دو

چائے کپ لا کر رکھ دیے۔

فیصل نے چائے کی ایک چسکی لینے کے بعد عبدالغفور سے پوچھا۔ ”جی انکل! اب بتاؤ آپ کی کیا پرالیم ہے اور میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟“

”میں دوا اور لاڈھی میں رہتا ہوں۔“ عبدالغفور نے شکستہ انداز میں بتانا شروع کیا۔ ”میری دوا ولادیں ہیں۔ بڑی بیٹی نورین اور چھوٹا بیٹا کامران۔!“

اتنا بتانے کے بعد عبدالغفور خاموش ہوا تو فیصل نے کہا۔ ”جی۔ آگے بتائیں، پھر کیا ہوا؟“

”آگے یہ بیٹا۔“ عبدالغفور نے زخمی لیجے میں کہا۔ ”میں نورین کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔“

”کیوں۔ نورین کو کیا ہوا ہے؟“ بے ساختہ فیصل کے منہ سے نکلا۔

”وہ میرے قابو میں نہیں رہی۔“ عبدالغفور نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”بڑی ضدی اور خود سر ہو گئی ہے۔“

فیصل کی سمجھ میں نہ آیا کہ عبدالغفور اسے اپنی بیٹی کے بارے میں کیا بتانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ حذبذب انداز میں اس نے پوچھا۔ ”آپ کی بیٹی نورین کی عمر کیا ہے؟“

”وہ چوبیس سال کی ہو گئی ہے اور پچیسویں میں گئی ہے۔“ عبدالغفور نے اسے بتایا۔

اس کے جواب نے فیصل کی حیرت دو چند کر دی، اس نے سوال کیا۔ ”آپ نے نورین کی شادی کر دی ہے؟“

”شادی تو اس کی ابھی نہیں ہوئی۔“ وہ دھکی لیجے میں بولا۔ ”میری یہ خواہش ہے کہ جلد از جلد کہیں اس کی شادی ہو جائے لیکن۔!“

”لیکن کیا؟“ اس کے ادھورے جملے کے جواب میں فیصل نے اضطرابی انداز میں سوال کیا۔

عبدالغفور نے جواب دیا۔ ”نورین شادی کے لیے تیار نہیں ہوتی۔ میں نے دو تین ایسے اور متعلق لڑکوں کے رشتے اس کے سامنے رکھے مگر اس نے صاف انکار کر دیا۔“

”کیا آپ نے نورین سے اس انکاری وجہ دریافت نہیں کی؟“

”پوچھا ہے میں نے بیٹا۔ بہت کرید کرید کر پوچھا ہے۔“

”پھر۔۔۔؟“ فیصل نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔

”وہ کہتی ہے، ابھی شادی نہیں کروں گی۔“

”ہو سکتا ہے، اس کی نظر میں کوئی خاص لڑکا ہو؟“

فیصل نے ایک قوی امکان کی جانب اشارہ کیا۔

”میں نے اس حوالے سے بھی نورین سے بات کی ہے۔“ عبدالغفور نے بتایا پھر بیٹی میں گردن جھکتے ہوئے بولا۔

”وہ پاگل تو سرے سے شادی ہی نہیں کرنا چاہتی۔!“

اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ ”مگر آپ کی بیٹی کسی بھی وجہ سے شادی کرنے کو تیار نہیں تو میں بھلا اس سلسلے میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔؟“

”فیصل بیٹا! کیا تمہاری شادی ہو گئی؟“

یہ سوال اتنا اچانک اور غیر متوقع تھا کہ فیصل چند لمحات کے لیے تو ہلکا کر رہ گیا تاہم جلد ہی سنبھالا لیتے ہوئے اس نے مضبوط لیجے میں جواب دیا۔

”اللہ حمد! میں شادی شدہ ہوں اور میری ایک بیٹی بھی ہے۔“

”اوہ۔!“ عبدالغفور ایک تسکینی ہوئی سانس لے کر رہ گیا۔

فیصل نے واضح طور پر محسوس کیا کہ اسے فیصل کے شادی شدہ ہونے سے شدید دھچکا لگا تھا۔ اس ”دھچکے“ نے فیصل پر اس کی ”سیت اور خواہش“ کا حال بھی کھول دیا تھا۔

فیصل کو یقین تھا کہ اگر وہ کوارا ہوتا تو عبدالغفور یہ خبر سن کر خوشی سے کھل اٹھتا۔ بہر حال۔۔۔ عبدالغفور کی مایوسی اور دل شکستگی کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔

”انکل! میں ابھی تک سمجھ نہیں سکا ہوں کہ آپ مجھ

سے کیا چاہتے ہیں؟“

”میں چاہتا ہوں بیٹا۔!“ وہ ایک افسردہ سی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ”کہ تم۔۔۔ کہ تم نورین کو سمجھاؤ۔!“

”میں اسے کیا سمجھا سکتا ہوں انکل۔“ فیصل نے بے پروائی سے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ”اس کی اپنی زندگی ہے۔۔۔ وہ اگر شادی نہیں کرنا چاہتی تو یہ اس کا ذاتی معاملہ ہے۔“

”وہ شادی نہ کرے لیکن۔۔۔“ عبدالغفور جملہ نامکمل چھوڑ کر ابھی زندہ نظر سے فیصل کو دیکھنے لگا۔

”لیکن کیا انکل۔۔۔؟“ فیصل پوچھتے بتا نہ رہ سکا۔

عبدالغفور کے چہرے پر ایک نامعلوم سا کرب نمودار ہوا پھر وہ بے حد مایوسی انداز میں بولا۔ ”بیٹا۔۔۔ میں نورین کو برا دواؤں خراب ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔“

عبدالغفور کی حالیہ کیفیت کے پیش نظر فیصل کا دل اس کے لیے ہمدردی کے جذبات سے بھر گیا۔ اس نے بڑے پر خلوص انداز میں پوچھا۔ ”انکل! یہ نورین کی جانی بربادی اور خرابی کا کیا قصہ ہے؟“

”بتاتا ہوں۔۔۔ میں تمہیں بتاتا ہوں فیصل بیٹا۔“ وہ چاروں جانب دیکھنے کے بعد قدرے دھیمے لیجے میں بولا۔

”میں کوئی ایک تہی ہو جو میری مشکل کو آسان کر سکتے ہو۔“

فیصل پوری سنجیدگی کے ساتھ عبدالغفور کی طرف متوجہ ہو گیا۔

بولنے سے پہلے ایک مرتبہ پھر عبدالغفور نے اپنے۔۔۔۔۔

ارد گرد کے ماحول پر ایک خطاط نگاہ ڈالی حالانکہ اتنی زیادہ احتیاط کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اس ہوٹل میں برائے نام گامک موجود تھے۔۔۔ اور جو تھے بھی، ان کا دھیان تھاری جانب نہیں تھا۔ عبدالغفور کی احتیاطی رویے اندازاً دو تہا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کے بارے میں کوئی سنسنی خیز انکشاف کرنے والا ہے۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے لاز و لارائے انداز میں بتانا شروع کیا۔

”نورین ادھر ہی انڈسٹریل ایریا میں بسکٹ بنانے والی ایک فیکٹری میں کام کرتی ہے۔۔۔ بلکہ کام کرتی تھی۔ وہ پیکنگ ڈسپارٹمنٹ میں تھی۔ اسے اس فیکٹری میں کام کرتے ہوئے لگ بھگ ایک سال ہوا تھا کہ۔۔۔“

وہ سانس لینے کے متوقف ہوا تو فیصل خاموش نظر سے اسے دیکھتا چلا گیا۔ عبدالغفور نے فیصل کو بکٹ بنانے والی مذکورہ فیکٹری کا نام بھی بتایا تھا لیکن یہ وجہ یہاں پر اس فیکٹری

کا نام درج نہیں کیا جاسکتا۔ ویسے بھی زیر نظر کہانی..... بلکہ کس سے بلا واسطہ یا بالواسطہ اس فیکٹری کا کوئی تعلق نہیں۔

عبدالغفور نے فیصل کو بتایا، ”ابتداء میں نورین وقت پر گھر سے نکلتی تھی اور مقررہ وقت پر ہی وہ واپس بھی آ جایا کرتی تھی۔ میں اس کے کام اور آمد و رفت سے مطمئن تھا۔ پھر رفتہ رفتہ اس کے معمولات میں تبدیلی آ گئی۔ وہ گھر سے تو اپنے وقت پر ہی نکلتی تھی لیکن اس کی واپسی میں تاخیر ہونے لگی اور یہ ”تاخیر“ بھی دیر سے دیر سے آگے بڑھتے ہوئے رات کے آٹھ، نو اور دس تک پہنچ گئی درندہ انداز میں وہ مغرب کی اذان سے پہلے گھر میں ہوتی تھی.....“ وہ ایک مرتبہ پھر سانس درست کرنے کے لیے تھما۔ فیصل نے اس بار بھی اسے ٹوکنے کی کوشش نہیں کی۔

وہ دوبارہ بلکہ سہ بارہ گویا ہوا۔ ”میں نے نورین کے یہ تصور دیکھے تو مجھے گہری تشویش نے آن گھیرا۔ میں نے اس کی، در بدر سے گھر آنے کی وجہ جاننا چاہی تو وہ اور دائم وغیرہ کا بہانہ کرتے لگی۔ مجھے اس کی بات کا یقین نہ آیا تو میں نے اس کے علم میں لائے بغیر، ایک روز فیکٹری جا کر اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ میری اس کوشش کے نتیجے میں بہت سے انکشافات ہوئے۔ اور دائم والی کہانی تو سرے سے جھوٹی نکلی۔ علاوہ ازیں چند افراد نے مجھے دھکے جیسے الفاظ میں یہ بھی بتایا کہ نورین کا چال چلن ٹھیک نہیں۔ فیکٹری سے چھٹی کے بعد وہ کسی نہ کسی مرد کے ساتھ جاتی ہے۔ کبھی موٹر سائیکل پر اور کبھی کسی گاڑی وغیرہ میں۔ جب نورین سے اس کے چند قریبی ساتھیوں نے ان افراد کے بارے میں استفسار کیا جو چھٹی کے وقت فیکٹری سے اسے یک کیا کرتے تھے تو اس نے ”کزن، انکل..... وغیرہ“ کا بہانہ کر کے بات کو گھما دیا۔ پیٹنگ ڈیاپارٹمنٹ کے ہیڈ نے تو مجھے یہ بھی بتایا کہ نورین ہفتے میں ایک دو چھپاں بھی کرنے لگی ہے۔ میں نے نہ سہاری تحقیق اس وقت کی تھی جب نورین فیکٹری میں موجود نہیں تھی۔ بہر حال، وہاں سے حاصل ہونے والی اذیت ناک معلومات نے میرے دماغ کا فیوز اڑا دیا اور اس روز میں نے گھر آ کر نورین سے سخت جھگڑا کیا.....“

عبدالغفور چند لمحات کے لیے تھما تو فیصل اس کے رد کو محسوس کر کے خود بھی ریجیدہ ہو گیا لیکن اب بھی اس کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ ان حالات میں وہ عبدالغفور یا اس کی بیٹی نورین کی کیا مدد کر سکتا ہے۔ ابھی تک تو وہ یہ بھی نہیں جان پایا تھا کہ کس شخص نے عبدالغفور کو اس کے پاس بھیجا تھا اور کیا سوچ کر بھیجا تھا۔ بہر حال، فیصل کی نگاہ میں اس ریفرنس کی

اب کوئی اہمیت نہیں رہی تھی کیونکہ وہ عبدالغفور کی دکھ بھری کہانی کی گرفت میں آ چکا تھا۔ عبدالغفور کے خاموش ہونے پر اس نے پوچھ لیا۔

”ہاں انکل..... اس جھگڑے سے کوئی مثبت نتیجہ بھی برآمد ہوا.....؟“

”نتیجہ تو برآمد ہوا.....“ عبدالغفور نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ”لیکن اسے مثبت نہیں کہا جاسکتا!“

”کیا مطلب؟“ فیصل نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

”میرے ایک کھٹے کے چٹنے چلانے کے بعد جو نتیجہ برآمد ہوا اسے ایک جیلے میں بیان کیا جاسکتا ہے۔ نورین نے بڑے واضح اور دونوک الفاظ میں یہ فیصلہ سنایا تھا..... میں کچھ بھی غلط نہیں کر رہی ہوں اور جو بھی کر رہی ہوں اس گھر کی خوش حالی کے لیے کر رہی ہوں..... بس!“

”کیا اس موقع پر نورین کی ماں نے اسے کچھ نہیں سمجھایا؟“ فیصل نے پوچھا۔

”ہاں.....!“ عبدالغفور کے ہونٹوں پر بڑی کزوی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ”اگر شاہین گھر چھوڑ کر نہ چلی جاتی تو شاید آج میرے گھر میں امن و سکون کا دماغ ہوتا.....!“

”کیا شاہین، نورین کی ماں..... گھر چھوڑ کر نہیں چلی گئی ہے؟“ فیصل نے ہمدردی بھرے لہجے میں پوچھا۔

”چلی گئی ہے نہیں، چلی گئی تھی!“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے طرز سے لہجے میں بولا۔ ”لگ بھگ دس سال پہلے وہ ہمیں چھوڑ کر اپنے کسی آشنا کے ساتھ فرار ہوئی تھی۔ اس وقت نورین تیرہ چودہ سال کی ہوگی اور میرا بیٹا صرف دو سوادو سال کا تھا۔ اس ظالم عورت کو اس معصوم کا بھی خیال نہ آیا اور وہ اپنے ہتھے بستے گھر پر لات مار کر اپنی دنیا بسانے چل نکلی۔ میں تو کہتا ہوں، نورین میں دودھ کا اثر آیا ہے۔ میں شاہین کے چھٹنوں سے اچھی طرح واقف ہوں اسی لیے میں نے بھی صاف الفاظ میں نورین سے کہہ دیا ہے کہ اگر اس نے اپنی روش نہ بدلی تو اس کے فرار سے پہلے ہی میں اسے گھر سے نکال دوں گا حالانکہ میں جانتا ہوں کہ ایسا کرنا بہت خطرناک ہوگا۔ جب نورین کو گھر سے مکمل آزادی مل جائے گی تو پتا نہیں، پھر وہ کون کون سا گل کھائے گی اسی لیے.....“ وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”اسی لیے فیصل بیٹا..... میں جانتا ہوں کہ تم نورین

کو سمجھاؤ۔ مجھے یقین ہے، تمہاری بات اس کی سمجھ میں آ جائے گی۔“

”پتا نہیں، آپ کو کس بنا پر ایسا یقین ہے۔“ ابھن زدہ لہجے میں فیصل نے کہا۔ ”بہر حال..... آپ مجھے اپنے گھر کا ایڈریس نوٹ کر دو، وہ کسی کی وقت شام میں.....“

”کسی وقت نہیں بیٹا، ابھی!“ وہ فیصل کی بات کا منہ ہونے اصرار ہی لہجے میں بولا۔ ”تم ابھی میرے ساتھ چلو..... اس وقت نورین گھر میں ہے۔“

”کیا وہ آج فیکٹری نہیں گئی؟“

”نہیں!“ عبدالغفور نے ٹکی میں گردن ہلائی اور بتایا۔

”وہ کچھ عرصہ پہلے تک جاتی رہی ہے اور اب اس نے کئی دنوں سے فیکٹری جانا چھوڑ دیا ہے۔ بڑی دیر تک سوئی رہتی ہے اور دوپہر کے کھانے کے بعد گھر سے نکل جاتی ہے۔ کہاں..... یہ میں نہیں جانتا..... اور اس سے پوچھتا ہوں تو کوئی نہ کوئی الٹا جواب دیتی ہے۔ میں بڑی مصیبت میں ہوں بیٹا.....“ بولتے بولتے اس کی آواز رندہ گئی۔ اپنی آنکھوں میں آنے والی نمی کو صاف کرنے کے بعد اس نے منت ریز لہجے میں کہا۔

”دیکھو فیصل بیٹا! میں بڑی آس لے کر تمہارے پاس آیا ہوں۔ میری امید تو تھی کہ تم میرے ساتھ چلو گے تو تمہارا کچھ نہیں کہنے کا یقین ہو سکتا ہے تمہاری اس کوشش سے نورین کی زندگی سنور جائے۔ یہ ایک پوزر ہے، مجبور اور بے بس باب کی التجا ہے۔ اللہ تمہیں اس نیکی کا اجر عظیم دے گا.....“

”وہ تو ٹھیک ہے انکل لیکن.....“ فیصل نے ہچکچاہٹ بھرے لہجے میں کہا۔ ”میں اس وقت کمپنی کے کام سے نکلا ہوں اور شام تک مصروفیت ہی مصروفیت ہے۔“

”کمپنی کا کام تو تم روزانہ ہی کرتے ہو..... کرتے ہو کہ نہیں؟“

”بالکل کرتا ہوں۔“ فیصل نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”کام نہیں کروں گا تو گھر کیسے چلے گا!“

”اللہ تمہارا بھلا کرے اور تمہارے گھر کو ہمیشہ اچھی طرح چلاتا رہے۔“ عبدالغفور نے دعا بے انداز میں کہا۔ ”بس، ایک آدھ کھٹے کی بات ہے۔ میں تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔“

عبدالغفور کی مجبوری اور منت خوشامد کو دیکھ کر فیصل کا دل پگھل گیا۔ اس نے ایک لٹھ سوچا پھر عبدالغفور کو اپنی بائیک پر سوار کر کے لاٹریج کی جانب روانہ ہو گیا۔ ویسے بھی لاٹریج

کا علاقہ وہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا اور یہ مختصر سا فاصلہ طے کرتے ہوئے بھی وہ عجیب سی کشش میں جکڑا رہا تھا۔ وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر عبدالغفور کی مدد کرنے کے لیے تو نکل کھڑا ہوا تھا لیکن دماغ مسلسل اسے ڈرا رہا تھا۔ اس کے ذہن میں کچھ اس قسم کی سوچیں ابھری تھیں۔

”تم عبدالغفور سے آج پہلی مرتبہ ملے ہو۔ تم اسے جانتے ہو اور نہ ہی وہ تم سے واقف ہے۔ اس نے تم سے رابطے کا اگر کوئی ریفرنس بھی استعمال کیا ہے تو اس شخص کے بارے میں تمہارے پاس کوئی معلومات نہیں ہیں۔ ان حالات میں عبدالغفور کی ذات بے انتہا مشکوک ہو جاتی ہے اور..... اس نے اپنی بیٹی کے حوالے سے جو کچھ بھی نہیں بتایا ہے، تم اس کی تصدیق کس طرح کرو گے؟ ہو سکتا ہے، یہ بڑھا کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت تمہیں کسی مصیبت میں پھنسانے کا ارادہ رکھتا ہو اور تم..... بغیر کسی تحقیق اور تصدیق کے، کسی گدھے کے مانند اس کے ساتھ چل پڑے ہو۔ اللہ تمہارے حال پر رحم کرے..... اگر چہ ایسے آثار تو دور دور تک نظر نہیں آ رہے.....!“

فیصل اپنے دماغ کی ان تلخ لیکن مبنی بر حقیقت باتوں کو رد نہیں کر سکتا تھا۔ وہ جو کچھ بھی سوچ رہا تھا وہ کل کا قضا تھا۔

واقعاً اس صورت حال میں اسے چپ چاپ عبدالغفور کے ساتھ نہیں چلے جانا چاہیے تھا۔ وہ اپنی اسی بے خبری کے باعث کسی بہت بڑے وبال میں بھی آ سکتا تھا.....!

چند لمحات تک وہ اپنی متفاد اور ذرا آنے خیالات میں گھرا رہا پھر اس کا جذبہ ہمدردی، اس کے دماغ کی دھمکی بھری سوچوں پر غالب آ گیا اور اس نے ان تمام تر خیالات کو اس عزم کی ٹھوکرے سے رد کر دیا۔ ”جب اولگی میں سر دے دیا تو پھر موصول سے کیا ڈرنا.....!“

تھوڑی ہی دیر کے بعد، عبدالغفور کی راجھائی اور ہدایت پر مختلف آڑی میز کی اور تنگ کپڑوں میں سڑنے کے بعد وہ دونوں اپنے مطلوبہ مقام پر پہنچ گئے یعنی عبدالغفور کے گھر، فیصل نے اپنی بائیک باہر لگی ہی میں کھڑی کی اور عبدالغفور کی تھلید میں اس کے گھر کے اندر پہنچ گیا۔

عبدالغفور نے فیصل کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور خود گھر کے اندرونی حصے میں چلا گیا۔ فیصل بغور ڈرائنگ روم کا جائزہ لینے لگا۔ ڈرائنگ روم کی سجاوٹ اور سیٹنگ سے لگتا تھا، وہ کسی آسودہ حال فیملی کا گھر ہے۔ اس کا مطلب تھا، اس گھر میں آمدنی کے نام پر اچھی خاصی رقم آ رہی تھی۔ ابھی تک فیصل کو یہ معلوم نہیں تھا کہ بڑے میاں یعنی عبدالغفور کیا کرتے ہیں

اور اس کے چھوٹے بیٹے کا مران کے کیا مشاغل ہیں۔ اگر اس گھر کے معاش کی گاڑی صرف نورین ہی چلا رہی تھی تو پھر اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ان دنوں خوب کماری تھی، یہ الفاظ دیکر خوب جی بھر کے تباہ و برباد ہو رہی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد عبدالغفور واپس آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں دو کولڈ ڈرنکس بھی نظر آ رہی تھیں۔ وہ فیصل کے سامنے دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا پھر ایک کولڈ ڈرنک فیصل کی طرف بڑھاتے ہوئے محبت بھرے لہجے میں بولا۔

”لو پیو بیٹا۔۔۔۔۔ آج تو اچھی خاصی گرمی ہے!“ دوسری کولڈ ڈرنک اس نے خود اپنے لیے اٹھا لی تھی۔ فیصل نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ”آپ غالباً اندر نورین کو بلانے گئے تھے؟“

”ہاں۔۔۔۔۔!“ عبدالغفور نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”میں نے اسے جگا دیا ہے۔ وہ تھوڑی دیر میں فریٹش ہو کر آ رہی ہے۔“

فیصل نے ایک اطمینان بھری سانس لی پھر کولڈ ڈرنک کا سپ لینے کے بعد عبدالغفور سے سوال کیا۔ ”آپ کا بیٹا کہیں نظر نہیں آ رہا۔ غالباً وہ اسکول گیا ہوگا!“

”اسکول۔۔۔۔۔!“ عبدالغفور نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”کامران کو پڑھنے لکھنے سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“

”اس کا مطلب ہے، آپ نے اسے کسی کام وغیرہ پر لگا دیا ہوگا؟“

”میں نے کوشش تو کی تھی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔“ وہ بدولی سے بولا۔ ”کامران کی پڑھائی کی جانب سے مایوس ہونے کے بعد میں نے چاہا تو یہی تھا کہ وہ کوئی ہنر وغیرہ ہی سیکھ لے تاکہ کل کو کسی کی فضا میں نہ رہے لیکن اس نے میری تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا۔“ وہ لمبے بھر کے لیے رکا پھر طنزیہ انداز میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”جب جینے بچھے انسان کی ضرورت پوری ہوتی رہے تو پھر کس کم بخت کا کام کرنے کو جی چاہے گا!“

”ضرورت پوری ہوتی رہے کیا مطلب؟“ فیصل نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ عبدالغفور کے گھر کیلئے معاملات میں ہمدردی کے علاوہ اس کی دلچسپی بھی قائم ہوئی تھی۔

”وہ ہے نا، حاکم ملانی کی کچھ گتلی ہمارے گھر میں۔ میرا مطلب ہے، نورین!“ اس نے جیسے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ”کامران کو جس شے کے لیے جتنی رقم کی ضرورت ہوتی ہے وہ نورین سے لے لیتا ہے۔ اس کا کام ہو جاتا ہے ان حالات میں اس کی جوتی کام کرتی ہے۔ سارا سارا دن آوارہ

گردی کرتا رہتا ہے۔۔۔۔۔ اس وقت بھی وہ آوارگی ہی کے کسی مشن پر ہوگا!“

فیصل نے فوری خیال کے تحت ایک نہایت ہی اہم سوال کیا۔ ”انکل! ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ آپ نے ہوں میں مجھے بتایا تھا کہ نورین سال بھر سے نوکری پر لگی تھی۔ میں یہ جانتا جا رہا ہوں کہ اس سے پہلے آپ کا گھر کس طرح چلتا تھا۔ اس گھر کے اخراجات کون اٹھاتا تھا؟“

”میں اٹھاتا تھا۔۔۔۔۔ اور کون اٹھاتا تھا!“ وہ فخریہ انداز میں سینہ تان کر بولا۔

”کیا آپ کوئی کاروبار وغیرہ کرتے تھے یا کہیں ملازمت تھی آپ کی؟“

”ملازمت تو نہیں، البتہ تم اسے کاروبار کہہ سکتے ہو۔“

عبدالغفور نے پرسوج انداز میں جواب دیا۔

فیصل نے پوچھا۔ ”آپ کس نوعیت کا کاروبار کرتے تھے؟“

”میرا برون کا کام تھا۔“ عبدالغفور نے بتایا۔ ”میں ایلیوٹیم کے برتن سائیکل پر لاؤ کر، کچلی بچا کر دیتا تھا۔ جب تک جسم میں جان تھی، میں نے انتھک محنت کی ہے اور اپنی اسی محنت سے ان بچوں کو پال پوس کر بڑا کیا ہے۔ میں تو اب بھی ہاتھ پاؤں ڈال کر آرام نہیں کرتا جانتا تھا لیکن پچھلے سال نورین نے مجھ سے کہا کہ وہ اب کمانے کے لیے گھر سے باہر قدم نکالے گی۔ میں نے جب اس سے پوچھا کہ وہ کیا کرنے کا ارادہ رکھتی ہے تو اس نے بتایا کہ وہ فی الحال ایک بسکٹ بنانے والی فیکٹری میں پیکنگ کا کام کرے گی۔ آگے اللہ مالک ہے۔ نورین نے مجھے یہ بھی بتایا کہ اس کی ایک دوست نے اس کے لیے نوکری کا بندوبست بھی کر لیا ہے۔ میں نے بسکٹ فیکٹری اور کام کے حوالے سے چند سوالات کیے تو نورین نے تسلی بخش جواب دے کر مجھے مطمئن کر دیا۔ اگلے دن سے وہ فیکٹری جانے لگی تھی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ ایک دن۔۔۔۔۔ ایک دن۔۔۔۔۔“ بولتے بولتے اس کی آواز بھرا گئی۔ چند لمحات کی خاموشی کے بعد وہ اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”میں نے تو محنت اور رزق حلال کی کمائی سے اپنے بچوں کی پرورش کی تھی۔ چاہیں، یہ نادان کن راہوں پر چل پڑے ہیں۔ کامران کو آوارہ گردی سے فرست نہیں اور نورین نے تو حد ہی کر دی ہے۔ کاش! میں اس کا کوئی علاج کر سکتا۔۔۔۔۔ کاش! تمہاری بات اس کی سمجھ میں آ جائے۔۔۔۔۔ کاش! وہ ضدی لڑکی تباہ و برباد ہونے سے محفوظ رہے۔۔۔۔۔ کاش، اے کاش!“

وہ ٹھکست خوردہ انداز میں خاموش ہوا تو فیصل کو اس

کی حالت پر ترس آنے لگا۔ اس کی نظر میں عبدالغفور ایک بے بس، مجبور اور قابل رحم باپ تھا اور اس کے ساتھ ساتھ اس نے فیصل سے بہت ساری امیدیں وابستہ کر لی تھیں۔ فیصل کی عقل میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ عبدالغفور کی توقعات پر پورا کیسے اترے گا۔ عبدالغفور اسے اپنے امراہ جس کو سمجھانے کی غرض سے لے کر آیا تھا وہ ابھی تک ڈرائنگ روم میں طلوع نہیں ہوئی تھی۔۔۔۔۔!

اس نے اپنی رست واپس پر ایک گھیر نگاہ ڈالی پھر عبدالغفور سے پوچھا۔ ”نورین پتا نہیں، کہاں رہ گئی مجھے یقینی کے کام سے بھی لگتا ہے۔!“

”غصہ، میں اسے دیکھ کر آتا ہوں۔“ عبدالغفور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

لیکن اس سے پہلے کہ وہ ڈرائنگ روم سے قدم باہر نکلا، ایک طرح دار لڑکی اندر داخل ہوئی۔ وہ ٹھنک کر رک گیا پھر فیصل کی طرف دیکھتے ہوئے جلدی سے بولا۔

”لو۔۔۔۔۔ نورین آگئی۔۔۔۔۔!“

”السلام علیکم۔۔۔۔۔!“ نورین نے فیصل کی طرف دیکھتے ہوئے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر وہ بڑی شان سے فیصل کے سامنے اس صوفے پر بیٹھ گئی جہاں سے ابھی ابھی عبدالغفور اٹھا تھا۔

”نورین نے“ سلام“ چونکہ فیصل کو کیا تھا لہذا اس نے نورین کی مسکراہٹ کا جواب دینا ضروری سمجھا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ”و علیکم السلام۔۔۔۔۔!“

”تم لوگ باتیں کرو۔۔۔۔۔“ عبدالغفور نے پر معنی انداز میں فیصل کی جانب دیکھتے ہوئے کہا پھر روئے سخن نورین کی سمت موڑتے ہوئے بولا۔ ”جب تک میں تمہارے لیے ناشتا لے کر آتا ہوں۔“

اپنی بات مکمل کرنے کے بعد وہ ڈرائنگ روم سے نکل گیا۔ فیصل کو اس کی حالت پر بے حد افسوس ہوا۔ کہیں سے محسوس ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ نورین کا باپ ہو۔ عبدالغفور کے مصلحت آمیز جیہما ندروپے سے تو یہی تاثر ابھرتا تھا کہ وہ اس گھر کا کوئی ملازم وغیرہ ہے۔

بڑھاپا ایک بہت بڑی مجبوری ہے۔ جب اس مجبوری کے ساتھ کوئی معذوری بھی شامل ہو جائے تو انسان کی زندگی ڈوبے غلاب سے دو چار ہو جاتی ہے۔ نہ جینا اپنے بس میں رہتا ہے اور نہ ہی موت پر اختیار ہوتا ہے۔ کچھ اسی قسم کی کیفیت عبدالغفور کی بھی تھی۔ اس نے تھوڑی دیر پہلے نورین کو گھر سے نکالنے کے حوالے سے بات کی تھی اور پھر خود ہی یہ

بھی کہا تھا کہ وہ محض اس لیے اسے گھر سے بے دخل نہیں کرتا جانتا کہ اس عمل کے بعد نورین کے سامنے تباہی و بربادی کی نئی نئی شاہراہیں کھل جائیں گی لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی۔ حقائق یہ تھے کہ نورین اس گھر کی معاشی گاڑی کا انجن تھی، پٹرول تھی، اس کے بغیر یہ گاڑی چلنا تو درکنار ایک قدم اپنی جگہ سے اوجھڑا نہیں ہوسکتی تھی جب ہی عبدالغفور، ”کاخاندوں“ میں اس گھر کا سربراہ ہونے کے باوجود بھی محکموں، مجبوروں اور نورین جیسی زندگی گزار رہا تھا۔ دولت بہت بڑی اور تلخ حقیقت ہے۔ یہ سچ ہے کہ دولت کے ترازو میں پلڑوں کا جھکاؤ اور اٹھانڈا ہی انسان کو امیر اور غریب یہ الفاظ دیکر حاکم اور محکوم بناتا ہے۔

”کہاں کھو گئے مسر فیصل۔۔۔۔۔؟“

نورین کی چپک بھری آواز نے فیصل کو چونکا دیا، وہ گڑ بڑائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”مم۔۔۔۔۔ میں یہیں تو ہوں۔۔۔۔۔ تمہارے سامنے۔۔۔۔۔!“

”میرے سامنے بیٹھے والا صرف مجھے دیکھتا ہے، صرف مجھ سے باتیں کرتا ہے۔“ وہ فیصل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بڑے اعتماد سے بولی۔ ”تمہاری طرح کم صم نہیں بیٹھتا۔“

درحقیقت فیصل، نورین کے رعب حسن میں آ گیا تھا۔ بلاشبہ نورین ایک پرجش اور دل آویز لڑکی تھی۔ اس کے چہرے کے نقوش میں ایک خاص قسم کا ٹیکھا بن پایا جاتا تھا۔ ایک بار اس کو دیکھنے کے بعد اس کے سراپا سے نگاہ چھٹانا آسان کام نہیں تھا۔ گندمی رنگت پر اس کا زرخیز بدن اور بھی قیامت ڈھاتا تھا۔ ان تمام تر خوبیوں کے ساتھ اس کا غیر مجزل اعتماد جو رنگ دکھارہا تھا اسے الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔۔۔۔۔!

فیصل نے قدرے بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں کم صم نہیں ہوں بلکہ پوری توجہ سے تمہیں ہی دیکھ رہا ہوں۔ شاید میرے نام کے بارے میں عبدالغفور نے تمہیں بتایا ہے۔۔۔۔۔!“

نورین نے کوئی جواب دینے کے بجائے الٹا سوال کر ڈالا۔ ”کیا ہم اس سے پہلے بھی ملے ہیں؟“

”میرا خیال ہے۔۔۔۔۔ نہیں۔“ فیصل نے نفی میں گردن ہلائی۔

”کسی اور حوالے سے ہماری جان پہچان رہی ہو۔۔۔۔۔؟“

”بالکل نہیں۔“ فیصل نے اس بار بھی قطعی لہجے میں

”تو پھر.....“ وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ”شاید اور غالباً وغیرہ نہیں بلکہ یقیناً ابویں نے مجھے تمہارے نام کے بارے میں بتایا ہے اور کام میں خود ہی جاتی ہوں!“

”کام تم خود ہی جانتی ہو..... کیا مطلب؟“ فیصل نے الجھن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

نورین کی بے باکی اور کھلا ڈالا پن فیصل کو قدرے نروس کر رہا تھا۔ پہلے بھی ایسی بول لڑکی سے اس کا واسطہ نہیں پڑا تھا۔ یہ اس کے لیے ایک نیا، انوکھا اور سنسنی خیز تجربہ تھا۔ اس کے استفسار کے جواب میں نورین نے ایک مرتبہ پھر سوال داغ دیا، انداز مضطرب اڑانے والا تھا۔ اس نے فیصل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”مسٹر فیصل! ابویں کہاں سے پکڑ کر لائے ہیں؟“

”پکڑ“ کا لفظ اس نے کچھ ایسی اداسے ادا کیا تھا کہ فیصل کو بڑے واضح طور پر اپنی حقیر کا احساس ہوا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کوئی انسان نہ ہو بلکہ گائے بکری ہو جسے قربانی کی غرض سے عبدالغفور مینڈی میوٹیاں سے پکڑ کر اپنے گھر لے آیا ہو۔ اس نے اپنی فحش کا اظہار کرنے میں ڈراویر نہ لگائی اور جھنجھلاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔

”یہ کیا بولاس ہے.....؟“

”آئی ایم ریلی ویری سوری۔“ موقع محل کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے نورین جلدی سے بولی۔ ”میرا کوئی ایسا ویسا مطلب نہیں تھا۔ دراصل ابویں.....“

”ایسا ویسا مطلب نہیں تھا تو پھر.....“ فیصل قطع کلائی کرتے ہوئے بولا۔ ”پھر تم نے کیا سوچ کر وہ بات کی۔“

”مسٹر فیصل! میں نے اپنے الفاظ کے لیے سوری کہہ دیا ہے نا۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ”آپ پوری بات سنو گے تو سارا غصہ جاتا رہے گا۔ دراصل ابویں.....“

”ہاں..... کیا دراصل ابویں.....؟“ ایک مرتبہ پھر فیصل نے اسے ٹوک دیا۔ ”اب کچھ بات بھی چکو.....!“

”میں وہی تو بتاتے جا رہی ہوں۔“ فیصل کی برہمی کے جواب میں نورین نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”دراصل ابویں آئے روز کسی نہ کسی کو پکڑ کر لے آتے ہیں اور وہ بھی ایک ہی مقصد کے لیے.....!“

فیصل کے کان کھڑے ہو گئے۔ نورین کے اظہار میں ایک خاص نوعیت کا اسرار اور سنسنی پائی جاتی تھی۔ اس کا حسن اور جو بن ان عناصر میں اور بھی سنگینی بھر دیتا تھا۔ اس کے

ڈرامائی جواب پر فیصل نے سوال کیا۔

”کس مقصد کے لیے.....؟“

”مجھے سمجھانے کے لیے!“ وہ برا سامند بناتے ہوئے بولی۔ ”اور یہی وہ ”کام“ ہے جو میں خود ہی جانتی ہوں اور..... تمہیں بھی بتانا چاہ رہی تھی کہ تم ایک دم بھڑک اٹھے.....“ وہ لمبے بھر کے لیے توقف ہوئی پھر اضافہ کرتے ہوئے دوستانہ انداز میں پوچھا۔

”اب تو نا راض نہیں ہونا.....؟“

فیصل کو نورین کا اس طرح پوچھنا بہت اچھا لگا۔ اب وہ اسے کہیں سے بھی بدگیز دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اس کے چہرے کے تنے ہوئے ٹھوڑا بالکل ریلیکس ہو گئے۔ وہ خوش دلی سے بولا۔

”نہیں، تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں واقعی تم سے خفا نہیں ہوں اور امید کرتا ہوں، تم میری بات کو پوری توجہ سے سنو گی؟“

”ہاں..... سنوں گی۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔

”اگر وہ بات مجھے سمجھانے سے متعلق نہ ہوئی تو.....!“

وہ بہت چالاک اور چال بازی۔ ایک جھپکتے میں اس نے پیسے فیصل کا ذہن بڑھ لیا تھا۔ اس کی تیزی اور طراری اگرچہ فیصل کو پسند آئی، تاہم اس نے نورین کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”نورین..... تم خود ہی کہیں نہیں سمجھ جاتی ہو.....؟“

”مثلاً..... میں کیا سمجھوں؟“ وہ تجھڑاسا آگے کو جھپکتے ہوئے مستعبر ہوئی۔

اس کے جھکاؤ کا زاویہ اور سوال کا انداز انتہائی خطرناک تھا۔ فیصل کو اپنے پورے وجود میں ایک کرنٹ سا دوڑتا محسوس ہوا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا بدن پیدائیا لگنے لگا۔ وہ بنیادی طور پر ایک شریف اور بے حد شرمیلا شخص تھا۔ نورین کی بے باکی نے اسے شرم سے ”پانی پانی“ ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے دو چار گہری سانسیں لیٹے کے بعد خود کو سنبھالا اور قدرے مستحکم لہجے میں بولا۔

”دیکھو نورین! تمہارا باپ ایک شریف اور عزت دار انسان ہے.....!“

”اس لیے مجھے ابویں عزت اور شرافت کا لحاظ کرتے ہوئے اس کی بات مان لینا چاہیے۔“ وہ فیصل کی بات کا نٹے ہوئے بولی۔ ”جو بھی آتا ہے، وہ نصیحت کا آغاز نہیں سے کرتا ہے، میرے کان پک گئے ہیں اس قسم کی باتیں سن کر.....!“

فیصل نے اس کی برہمی اور جھنجھلاہٹ کا ذرا برا نہ منایا اور معتدل انداز میں بولا۔ ”سب لوگ تمہیں اس طریقے سے اس لیے سمجھاتے ہیں کہ تم جو کچھ کر رہی ہو وہ تمہیں زیب نہیں دیتا۔ تمہارے باپ کی گردن جھک جاتی ہے..... مجھے عبدالغفور نے تمہارے بارے میں بڑی تفصیل سے بتایا ہے۔“

”میں کیا غلط کر رہی ہوں۔“ وہ چمک کر بولی۔ ”دوستی کرنے میں کون سی برائی ہے.....؟“

”کسی بھی شریف لڑکی کے با محرم مردوں سے دوستی کرنے کو ہمارا معاشرہ اچھی نظر سے نہیں دیکھتا۔“ فیصل نے اپنا فرض پورا کرنے کا مکمل جاری رکھا۔ ”تم مانو یا مانو مگر یہ حقیقت ہے کہ تمہاری مصروفیات سے عبدالغفور کو مل ہی جس ذاتی اذیت سے گزرنا پڑتا ہے تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی ہو.....؟“

”یہ ابویں غیرت پھیلے کچھ عرصے سے کوئی زیادہ ہی بیدار ہو گئی ہے۔“ وہ مڑھڑے انداز میں بولی۔

”پھیلے کچھ عرصے سے..... کیا مطلب؟“ فیصل نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں، میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ ”پہلے وہ بالکل پرسکون اور خوش تھے لیکن میں دیکھ رہی ہوں کہ شرم میں چارہا سے انہیں میری کچھ نزادہ ہی لگ رہی ہے۔“ وہ کہہ رہی تھی۔

فیصل کے ذہن میں عبدالغفور کی وہ بات تازہ ہو گئی جو اس نے قینری کی جاکر نورین کے بارے میں تحقیق کرنے کے حوالے سے بتائی تھی۔ اسی تناظر میں اس نے نورین سے کہا۔

”ہو سکتا ہے، عبدالغفور کو اس سے پہلے تمہاری سرگرمیوں کا علم نہ ہو.....؟“

”سب بے کاری باتیں ہیں.....!“ وہ بے پروائی سے کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔

”کمال ہے.....!“ فیصل نے حیرت بھری نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”تم اتنے اہم اور سنگین معاملے کو بے کار کی باتیں کہہ رہی ہو؟“

”فرض کرو، تم ایک شادی شدہ شخص ہو اور تمہاری ایک جوان بیٹی ہے.....!“

”میں اس معاملے کو فرض نہیں کر سکتا۔“ نورین نے بات شروع کی ہی تھی کہ فیصل بیچ میں بول اٹھا۔ ”کیونکہ میں شادی شدہ ہوں اور میری ایک بیٹی بھی ہے۔“ یہ الگ بات کہ وہ ابھی محض سات سال کی ہے۔

”لیکن تم شادی شدہ نظر تو نہیں آتے؟“ نورین نے

بے یقینی سے اس کی جانب دیکھا۔

وہ بے ساختہ بولا۔ ”اس میں میرا کوئی تصور نہیں!“

نورین بھی بے اختیار ہنس پڑی۔

فیصل کے سامنے ہرگز رتے لمبے کے ساتھ نورین کا ایک نیا شیدا بھرد رہا تھا۔ وہ دونوں اس وقت جتنے حساس اور نازک موضوع پر بات کر رہے تھے اس میں کوئی لڑکی اتنی بہادری اور بے باکی سے گفتگو نہیں کر سکتی جس فن کا مظاہرہ نورین کر رہی تھی۔ وہ نورین کے اس انداز اور رویے پر جتنی بھی حیرت محسوس کرتا وہ کم تھی۔ یہ اس کی زندگی کا بڑا یادگار اور سنسنی خیز تجربہ تھا۔

نورین نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”فرض کرو، تمہاری بیٹی جوان ہے..... اتنا تو فرض کر سکتے ہو نا؟“

”ہاں، کر سکتا ہوں..... آگے بولو۔“ فیصل نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”تمہاری بیٹی کسی فیکٹری میں کام کرتی ہے اور اسے صرف بارہ سو روپے تنخواہ ملتی ہے۔“ نورین نے سلسلہ گفتگو کو دراز کرتے ہوئے کہا۔ ”گھر کے اخراجات اسی کو پوری کرنا ہوتے ہیں اور تم دیکھتے ہو کہ وہ اپنی تنخواہ سے دو گنا خرچ کر رہی ہے۔ اس وقت تمہیں چاہیے تاکہ بیٹی سے پوچھو کہ یہ اوپر کی رقم کہاں سے آ رہی ہے؟“

”بالکل، یہ تو میرا فرض بنتا ہے۔“ فیصل نے جلدی سے کہا۔

”کاش ابویں اپنے فرض کو یاد رکھتے۔“ وہ دھکی لیجے میں بولی۔ ”وہ تو میری زیادہ کمائی پر خوش ہوتے رہے۔ اس طرح میرا حوصلہ بڑھتا چلا گیا اور اب.....“ وہ سانس لینے کے لیے ٹھہری پھر بڑے ڈرامائی انداز میں اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

”اور اب..... جبکہ میں اس راہ پر بہت آگے نکل چکی ہوں تو ابویں غیرت کر دے کہ جاگ اٹھی ہے۔ اسے میری حرکتوں میں بے شرمی اور بے غیرتی نظر آنے لگی ہے لیکن وقت گزرنے کے بعد وہ اپنی کانٹوں کی راستہ کھلائیں رہتا۔ انسان کو اپنی جتنی ہوئی راہ پر آگے ہی آگے بڑھنا پڑتا ہے، چاہے اس راہ کا نام تباہی و بربادی ہو یا حصول خیر و برکت!“

نورین نے ابھی حالات کی جو صورت فیصل کے سامنے پیش کی تھی وہ عبدالغفور کی بیان کردہ کہانی سے قطعاً ٹکا نہیں کھاتی تھی لیکن وقت کے زیاں کے پیش نظر فیصل نے کسی نئی بحث کا دروازہ کھولنے کے بجائے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”نورین! انسان کو کبھی بھی خیال میں اللہ کی رحمت سے باپس نہیں ہونا چاہیے کیونکہ مایوسی بہت بڑا گناہ ہے!“
”تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“ وہ آنکھیں سکیڑ کر فیصل کو دیکھنے لگی۔

”میرے خیال میں تمہاری واپسی کے لیے ایک دروازہ کھلا ہوا ہے۔“ فیصل نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ”اور وہ راستہ ہمیشہ کھلا رہے گا۔ تمہاری زندگی کی آخری سانس تک۔“
”ایسا کون سا راستہ ہے بھی؟“ نورین نے متذبذب انداز میں پوچھا۔

وہ بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے معنی خیز لہجے میں بولا۔ ”بتا دوں۔۔۔۔۔؟“
”ہاں، بتا دو، اتنا سسپنس کیوں پیدا کر رہے ہو۔“ وہ بے تاب سی بولی۔ ”شبابش، جلدی کرو۔“

”میرا تمہارے لیے یہ مشورہ ہے کہ جتنا جلدی ممکن ہو۔۔۔۔۔ تم شادی کر لو!“
”شادی۔۔۔۔۔!“ اس کے لبوں پر طنز یہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ”مستر فیصل! یہ ممکن نہیں ہے۔“

”کیوں ممکن نہیں ہے۔“ وہ خندی لہجے میں مستغفر ہوا۔ ”تمہارے دوستوں میں سے کوئی تو ایسا ہوگا مجھے تم زندگی کا ساتھی بنا لو؟“
”یا تو تم حد درجہ بے وقوف ہو یا پھر مجھے الو سمجھتے ہو؟“

نورین نے مشکوک نظر سے اس کی طرف دیکھا۔
”ایسی کوئی بات نہیں!“ فیصل نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”ہاں۔۔۔۔۔ ایسی ہی بات ہے۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ ”وہ سب دوستی کے خواہاں ہیں، شادی کرنے کو کوئی تیار نہیں ہوتا۔“

”پھر پھر اگر تم کو کوشش کرو تو کوئی نہ کوئی مل ہی جائے گا۔“ فیصل اپنی ضد پر قائم رہا۔ ”وہ کیا کہتے ہیں۔۔۔۔۔ نیت صاف، منزل آسان!“
”وہ کیا کہتے ہیں۔۔۔۔۔ یہ کیا کہتے ہیں۔۔۔۔۔ سب کہنے ہی کی باتیں ہیں مسٹر فیصل۔“ وہ بددلی سے بولی۔ ”حقیقی زندگی سے ایسے خوبصورت جملوں کا کوئی حلق نہیں ہے۔ بہر حال، تم اتنا اصرار کر رہے ہو تو کوشش کرنے میں کوئی حرج بھی نہیں۔ ارے ہاں، مل گیا۔!“

نورین نے بڑے سستی خیز سر ملے پر بات نامکمل چھوڑی تو فیصل نے بے ساختہ پوچھا۔ ”کون مل گیا؟“
”بھئی! تم نے مشورہ دیا ہے کہ اگر میں کوشش کروں تو

شادی کے لیے کوئی نہ کوئی مل ہی جائے گا۔“ وہ بڑے پراسرار انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”میں نے سنجیدگی سے تھوڑی کوشش کی تو ایک ایسا شخص میری نگاہ میں آ گیا جس سے میں شادی کر سکتی ہوں۔“

”کون ہے وہ؟“ فیصل نے سرسرا تے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔
”تم۔۔۔۔۔!“ نورین نے گویا ایک دھماکا کر دیا۔
”یہ کیا مذاق ہے۔۔۔۔۔؟“ وہ بولکھلاہٹ آمیز انداز میں بولا۔ ”تم۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔!“

نورین نے کہا۔ ”اسے مذاق نہ سمجھو فیصل، میں بالکل سنجیدہ ہوں۔“
”میں تو شادی شدہ ہوں۔“ وہ زروں انداز میں بولا۔
”تم سے کیسے شادی کر سکتا ہوں۔۔۔۔۔؟“

”میرے دوستوں کے ساتھ بھی کچھ ایسی ہی نوعیت کی پرالہم ہے۔“ وہ بڑا گہرا طنز کرتے ہوئے بولی۔ ”وہ بھی سب اتفاق سے شادی شدہ ہیں اور سید شادی کا نام نہ کر ان کی جان جاتی ہے۔۔۔۔۔ بالکل تمہاری طرح!“

اس سے پہلے کہ فیصل، نورین کی اس چوٹ کا کوئی معقول اور مدلل جواب دیتا، عبدالغفور ناٹھے کی ٹرے لے کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ وہ دونوں خاموش ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ عبدالغفور ناٹھے کی ٹرے کو نورین کے سامنے پھیل پر رکھتے ہوئے معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔

”مجھے کچھ دیر ہوگئی شاید۔۔۔۔۔!“
”شاید نہیں یقیناً اب۔“ نورین نے غفلتی آمیز لہجے میں کہا۔ ”اور آپ ایسا جان بوجھ کر کرتے ہیں جب بھی آپ مجھے سمجھانے کی غرض سے کسی کو پکڑ کر لاتے ہیں تو ایسا ہی کرتے ہیں۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہی ہوں نا؟“

”نہیں، تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ عبدالغفور نے خجالت بھرے انداز میں کہا۔ ”اور یہ بھی سچ ہے کہ تم نے نہ سمجھنے کی قسم کھا رکھی ہے۔“

”نورین بی بی نے آج یہ قسم توڑ دی ہے انکل۔“ فیصل نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔
”کیا مطلب فیصل بیٹا!“ عبدالغفور نے حیرت بھری نظر سے اسے دیکھا۔ ”اور یہ تم اٹھ کر کھڑے کیوں ہو گئے۔ میں نے تم دونوں کے لیے ناشتا بنایا ہے۔!“

نورین بھی فیصل کے اچانک کھڑے ہوجانے پر ابھمن زدہ انداز میں اسے دیکھنے لگی تھی۔ فیصل نے نورین کو نظر انداز کرتے ہوئے عبدالغفور سے کہا۔

”ناٹھے کی تعلق کوئی گھنٹا نہیں ہے اور میں اٹھ کھڑا اس لیے ہوا ہوں کہ میرے خیال میں، اب مجھے چلنا چاہیے۔ آپ مجھے جس کام کے لیے پکڑ کر یہاں لائے تھے وہ میں نے کر دیا ہے۔ نورین کی طرف سے آپ کو زیادہ فخر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ آپ کو تنگ نہیں کرے گی اور جلد ہی کوئی بہت بڑی خوشخبری سنائے گی۔“ پھر اس نے نورین کی جانب مڑتے ہوئے تصدیق طلب انداز میں پوچھا۔

”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا۔۔۔۔۔؟“
یہ انوکھی چال فیصل نے ایک فوجی اور اچھوتے خیال کے تحت چلی تھی۔ اسے اچانک محسوس ہوا تھا کہ وہ دونوں باپ بیٹی نفسیاتی مریض ہیں۔ اس بات سے قطع نظر کہ ان میں کون غلط ہے اور کون سچ، اسے ان کے معاملات میں نہیں الجھنا چاہیے۔ وہ جائیں اور ان کا کام۔ بلاشبہ، اس نوعیت کے خیالات اس کے ذہن ہی کی کرشمہ کاری تھی جو اسے کسی بڑی مصیبت سے بچانا چاہتا تھا۔ نورین نے اس کے استفسار کے جواب میں متذبذب انداز میں کہا۔

”مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آیا، تم کیا اوٹ پناہ بول رہے ہو۔۔۔۔۔؟“
عبدالغفور نے تصدیق انداز میں پوچھا۔ ”تو تمہارا یہ مطلب ہے کہ تم نے نورین کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے؟“

”اچھی طرح سمجھ چکی ہوں اور اسے اچھی طرح سمجھا بھی دیا ہے۔“ فیصل نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”اب آپ لوگ مجھے اجازت دیں تو بڑی مہربانی ہوگی!“

نورین نے جموٹے منہ بھی اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ عبدالغفور نے بھی ایسا کوئی اصرار نہیں کیا اور سادہ سے لہجے میں بولا۔

”آؤ بیٹا۔۔۔۔۔ میں جہیں رخصت کر دوں۔“
فیصل نے ایک سکون بخش گہری سانس لی اور نورین کو الوداع کہہ کر عبدالغفور کے ساتھ ہولیا۔

جب فیصل اپنی بایک پر سوار ہو کر وہاں سے رخصت ہونے لگا تو عبدالغفور نے امید بھری نظر سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”تو بیٹا۔۔۔۔۔ میں مطمئن رہوں نا؟“
”ہاں ہاں، بالکل۔“ آپ فکر نہ کریں۔“ فیصل نے جان چھڑانے والے انداز میں تسلی دی۔ ”نورین کی وجہ سے اب آپ کو کبھی کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔“

”اللہ تمہارا بھلا کرے بیٹا۔“ عبدالغفور نے دعا یہ کہنا۔ ”آپ مجھے معاف کر دیں۔۔۔۔۔ اللہ حافظ!“

انداز میں کہا۔ ”یہ تو بہت ہی اچھا ہوا کہ تم دونوں نے ایک دوسرے کو سمجھ لیا۔ اب تم لوگوں کی آئندہ زندگی بڑی خوشگوار گزرے گی۔ میں نے ناشتا لانے میں جان بوجھ کر دیر کی تھی تاکہ تم لوگوں کو اچھی طرح باتیں کرنے کا موقع مل سکے، میں تو۔۔۔۔۔“

”ایک منٹ انکل۔۔۔۔۔!“ فیصل نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روک دیا اور بے حد الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ”یہ آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں۔۔۔۔۔ ہماری آئندہ کی خوشگوار زندگی۔۔۔۔۔ کیا مطلب ہے آپ کا؟“

”بڑی سیدھی اور آسان سی بات ہے بیٹا۔“ عبدالغفور نے شفقت بھرے انداز میں کہا۔ ”تم نورین سے شادی کرنے کے لیے تیار ہو گئے ہونا اور۔۔۔۔۔ اس نے بھی تمہیں پسند کر لیا ہے۔۔۔۔۔!“

”ایسی کوئی بات نہیں چاہی!“ فیصل نے جھنجھاکر کہا۔ ”آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں شادی شدہ ہوں اس لیے دوسری شادی کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔“

”میں ڈرائنگ روم میں داخل ہونے سے پہلے تھوڑی دیر کے لیے دروازے سے باہر ایک طرف رک گیا تھا اور میں نے وہاں کھڑے کھڑے، تم دونوں کے درمیان ہونے والی بات چیت کا ایک حصہ سن لیا ہے۔“ عبدالغفور نے ٹھہرے ہوئے انداز میں وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”نورین نے تمہارے ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ۔۔۔۔۔ اس نے شادی کے لیے اپنے ذہن میں جس فیصل کو محفوظ کر رکھا ہے وہ تمہی ہو۔ میں تو خوش ہو گیا تھا کہ۔۔۔۔۔“

”وہ نورین کے ذہن کا فتور تھا۔“ فیصل نے قدرے تیز آواز میں کہا۔ ”اور میں نے اپنے جواب سے اس کی تسلی بھی کر دی ہے۔ آپ کو خواہو یا نہ خواہو، ہونے کی ضرورت نہیں۔۔۔۔۔!“

اب فیصل کو واضح طور پر محسوس ہونے لگا تھا کہ وہ باپ بیٹی ایک ٹھہرے پارٹی ہیں لہذا اسے جلد از جلد جان چھڑا کر یہاں سے نکل جانا چاہیے۔

فیصل کے جواب نے عبدالغفور کے چہرے اور آنکھوں میں گہری مایوسی بھردی، وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”بیٹا! تم نے تو مجھے حوصلہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ تم دونوں نے ایک دوسرے کو بڑی اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔“

”وہ میری زبان کی لغزش اور آپ کی سماعت کا دھوکا تھا چاہی!“ فیصل نے اپنی بایک اشارت کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ مجھے معاف کر دیں۔۔۔۔۔ اللہ حافظ!“

پھر وہ عبدالغفور کی کوئی بھی بات سنے بغیر وہاں سے رخصت ہو گیا۔

چند روز بعد اس کی اپنے ایک دوست اشتیاق سے ملاقات ہوئی۔ اشتیاق پولیس ڈیپارٹمنٹ میں اسے ایس آئی کے عہدے پر کام کر رہا تھا۔ فیصل نے نورین اور عبدالغفور کے بارے میں اشتیاق کو پوری تفصیل سے بتا دیا۔ اشتیاق نے بڑی توجہ سے اس کی بات سنی اور آخر میں کہا۔

”فیصل! تم مجھے چاہا غفور کے گھر کا ایڈریس بتاؤ، یہ دو نمبر لوگ ہیں۔“

”دو نمبر لوگ ہیں تو تمہیں ان سے کیا کام؟“

”ہمیں دو نمبر لوگوں سے زیادہ کام پڑتا ہے۔ یار۔“

اشتیاق نے معنی خیز انداز میں کہا پھر آکھ دیا کہ بولا۔ ”سجھا کرو تاہم۔“

”تو۔“ کیا تم بھی نورین کے دوستوں کی صف میں شامل ہونا چاہتے ہو۔“

”فیصل نے متاملانہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔“

”لا حول ولا قوۃ۔“ اشتیاق نے برا سامنہ بتاتے ہوئے کہا۔ ”مجھ میں لاکھ برائیاں ہوں لیکن تم جانتے ہو کہ میں اس لاکھ کا بندہ نہیں ہوں۔“

”پھر۔۔۔ کیا تم ان باپ بیٹی کو گرفتار کر کے حوالات میں بند کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟“ فیصل کی انجمن بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

”ایسی بھی کوئی بات نہیں یار۔“ اشتیاق کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ”لیکن اس سے ملتی جلتی بات ضرور ہے۔“

”کیا مطلب؟“ فیصل سوالیہ نظر سے اسے دیکھنے لگا۔

اشتیاق وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”میں نورین یا عبدالغفور کو گرفتار نہیں کروں گا لیکن نورین کا چار لاکھ کر میں ایک جھگڑوئے شخص کو رینگے ہاتھوں گرفتار کرنے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔“

”میں کچھ بھی نہیں سمجھ سکا!“ فیصل نے متذبذب انداز میں کہا۔

اشتیاق بتانے لگا۔ ”عامر ملک نامی ایک شاطر آدمی، وحید اللہ نام کے ایک سیدھے سادے شخص کے دو لاکھ روپے کھائے بیٹھا ہے۔ وحید اللہ کے پاس اس رقم کے لیکن دین کا کوئی ثبوت نہیں ہے اور عامر ملک خوبصورت بہانوں سے اسے ہٹا چکا آ رہا ہے۔ میں نے وحید اللہ کا کیس ”پرائیویٹ“ اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ اگر میں عامر ملک سے اس کی رقم ٹھکانے میں

کامیاب ہو جاؤں تو وہ آدمی رقم مجھے ”نذرانے“ میں دیدے گا۔ مجھے یقین ہے کہ میں نورین کی مدد سے عامر ملک کو یہ آسانی فریب کر سکتا ہوں۔“

”تم پولیس والوں کا بھی کوئی اصول قاعدہ نہیں ہے۔“ فیصل نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”جو کام تمہارے فرائض کا حصہ ہے، اسے تم ”پرائیویٹ“ کر کے اپنی جیب گرم کرتے رہتے ہو۔“

”یار! لوگوں کو بھی تو ذرا عقل نہیں ہے۔“ اشتیاق نے مضبوط انداز میں کہا۔ ”وحید اللہ کو چاہے تھا کہ دو لاکھ کالین دین کرتے ہوئے کوئی کھٹت بڑھت کر لیتا۔ اگر آج اس کے ہاتھ میں کوئی ثبوت ہوتا تو پولیس کو عامر ملک کے خلاف کارروائی کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آتی۔ تم خواہوا اور بے بنیاد تو اسے نہیں دبا سکتے۔ اور ویسے بھی۔۔۔ ایک لمحے کا توقف کر کے اس نے گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”ویسے بھی وحید اللہ کے دو لاکھ تو ڈوبے ہی ہوئے ہیں۔ میری کوشش سے اگر اسے ایک لاکھ مل جائیں گے تو اس بے چارے کی تو عید ہی ہو جائے گی۔“

”تم لوگ جو بھی کرنا چاہو کر سکتے ہو۔“ فیصل نے جوت کی۔ ”کوئی نہیں روکنے والا نہیں۔“

”فکر نہ کرو یار۔“ وہ ذریعہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”میں نورین کے ساتھ کسی قسم کی نا انصافی نہیں کروں گا۔ اس مشن کی تکمیل پر میں پانچ دس ہزار اس کے ہاتھ پر بھی ضرور رکھ دوں گا۔“

”تمہارا جوتی چاہے کرو، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔“ فیصل اشتیاق کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔ ”میں تو بس یہ چاہتا ہوں کہ ان باپ بیٹی کو کسی نئی مصیبت میں نہیں ڈال دینا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ دو نمبر سے تین یا چار نمبر بن جائیں۔“

”تم سب کچھ مجھ پر چھوڑ کر بے فکر ہو جاؤ۔“ اشتیاق نے بڑے اعتماد سے کہا۔

اور فیصل واقعی بے فکر ہو گیا۔

اس واقعے کے چند روز بعد اشتیاق نے فیصل کو فون کیا اور کہا۔ ”یار! تم کشن کے علاقے میں رہتے ہو، مجھے ایک اپارٹمنٹ بلڈنگ کے بارے میں کچھ معلومات درکار ہیں۔“

”اپارٹمنٹ بلڈنگ کا نام بتاؤ۔“ فیصل نے کہا۔

جواب میں اشتیاق نے جس بلڈنگ کا نام لیا اسے سن کر فیصل کا دماغ صدمہ گیا۔ بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

”مذاق کرنے کا یہ کون سا طریقہ ہے؟“

”کیا مطلب۔۔۔ تم میری بات کو مذاق سمجھ رہے ہو!“

”اس سے بڑا اور بے ہودہ مذاق اور کیا ہوگا کہ تم مجھ سے اس بلڈنگ کے بارے میں پوچھ رہے ہو جہاں میں رہتا ہوں اور تم مجھ سے ملنے کی سہولت میرے گھر بھی آچکے ہو۔۔۔۔۔!“ فیصل نے شامی لہجے میں کہا۔ ”کیا تمہارا حافظہ بالکل ہی جواب دے گیا ہے؟“

”لا حول ولا قوۃ۔“ اشتیاق نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ ”اے یار، بالکل دھیان میں نہیں رہا تھا۔“

”جب ایک لاکھ کے خواب دیکھو گے تو دھیان کہاں کام کرے گا!“ فیصل نے مذاق کے رنگ میں کہا۔

”تمہارا تیر بالکل نشانے پر لگا ہے یار۔“

”تیر۔۔۔ میں نے کون سا تیر چلایا ہے؟“ فیصل کے لہجے سے حیرت مترشح تھی۔

”یہی جو تم نے ایک لاکھ کے خواب والی بات کی ہے۔“ اشتیاق وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”بس آج رات یہ ایک لاکھ میری جیب میں آ جائیں گے۔“

”کیسے آ جائیں گے؟“ فیصل نے پوچھا۔ ”کیا تم نے عامر ملک کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے؟“

آج سے پچیس سال پہلے ایک لاکھ روپے کی بڑی اہمیت ہوا کرتی تھی۔ اشتیاق نے فیصل کے جواب میں بتایا۔ ”آج رات وہ میرا میری گرفت میں آجائے گا اور وہ بھی رینگے ہاتھوں، اس کی گرفتاری کے لیے تم مجھ سے تعاون کرو گے۔“

”میں۔۔۔ بھلا وہ کیسے؟“ فیصل نے انجمن زدہ انداز میں پوچھا۔

”وہ اس طرح کہ عامر ملک آج کی رات نورین کے ساتھ تمہاری بلڈنگ کے ایک فلیٹ میں موجود ہوگا۔“ اشتیاق گہری سنجیدگی سے اسے بتانے لگا۔ ”میں نے جس فلیٹ کا ذکر کیا ہے وہ پچیس کئی ماہ سے بند ہے۔ عامر ملک کی فلیٹ کے مالک سے گہری جان بچکان ہے۔ وہ کبھی بھی مالک سے جانی لے کر رات گزارنے وہاں آ جاتا ہے۔ رات گزارنے کا مطلب سمجھتے ہو نا؟“

”اچھی طرح سمجھتا ہوں تم آگے بتاؤ۔“ فیصل نے کہا۔

”یہ بات فیصل کے علم میں تھی کہ ان کی اپارٹمنٹ بلڈنگ کے چند فلیٹس میں مشکوک نوعیت کی نقل و حرکت دیکھنے میں آئی تھی۔ اشتیاق نے عامر ملک اور نورین کے حوالے سے جس فلیٹ کا ذکر کیا تھا اس کا شمار بھی مشہور فلیٹس ہی میں ہوتا

تھا۔ لہذا اس کا تشریف میں جتا ہوجانا لازم تھا۔ اشتیاق بظہرے ہوئے لہجے میں اسے تفصیل سے آگاہ کرنے لگا۔

”میری پلاننگ کے عین مطابق نورین نے عامر ملک کو اپنے شیشے میں اتار لیا ہے۔ آج کی رات وہ عامر ملک کے ساتھ تمہاری بلڈنگ کے اس فلیٹ کے اندر گل چھڑے اڑائے گی جس کا میں نے ذکر کیا ہے اور میں ان دونوں کو رینگے ہاتھوں پکڑ لوں گا اور وہ بھی بلڈنگ کے تین چار کمروں کی موجودگی میں تاکہ عامر ملک کے فرار کے سارے راستے مسدود ہو جائیں اور میں یہ آسانی اس کے ساتھ کم مکا کر سکوں۔“ وہ لمبے بھر کے لیے متوقف ہوا پھر ایک گہری سانس خارج کرنے کے بعد دوبارہ گویا ہوا۔

”اس کام کے لیے مجھے تمہارا تعاون درکار ہے۔ جب نورین کی اطلاع پر میں وہاں پہنچوں تو تم تین چار افراد کو اس کارروائی میں حصہ لینے کے لیے تیار کر لینا۔ ان میں اگر بلڈنگ کی کبھی کا کوئی ممبر شامل ہو تو یہ اور بھی اچھی بات ہے۔ اس طرح میرا کیس زیادہ مضبوط ہو جائے گا۔ میں لوگوں کے سامنے ان دونوں کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے جاؤں گا پھر ذرا دھماکا کر میں اپنا مقصد حاصل کروں گا۔ کیا تم اس سلسلے میں میری مدد کرو گے؟“

”تمہاری مدد کرنے میں تو کوئی قناعت نہیں۔“ فیصل نے کہا۔ ”لیکن کیا نورین اس کام کے لیے تیار ہوگئی ہے؟“

”میں نے اسے آدمی بات بتائی ہے۔“ اشتیاق نے چالاک سے کہا۔ ”اس لیے وہ فوراً تیار ہوگئی ہے۔“

”آدمی بات۔۔۔ کیا مطلب؟“ فیصل نے سوال کیا۔

”میں نے اسے رینگے ہاتھوں، نازیاں حالت میں گرفتاری کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔“ اشتیاق نے بتایا۔

”حالانکہ وہ اسی لاکھ کی لڑکی ہے لیکن اگر میں اسے اپنے پروگرام کے بارے میں سب کچھ بتا دیتا تو وہ اس مشن کے لیے تیار نہ ہوتی۔“

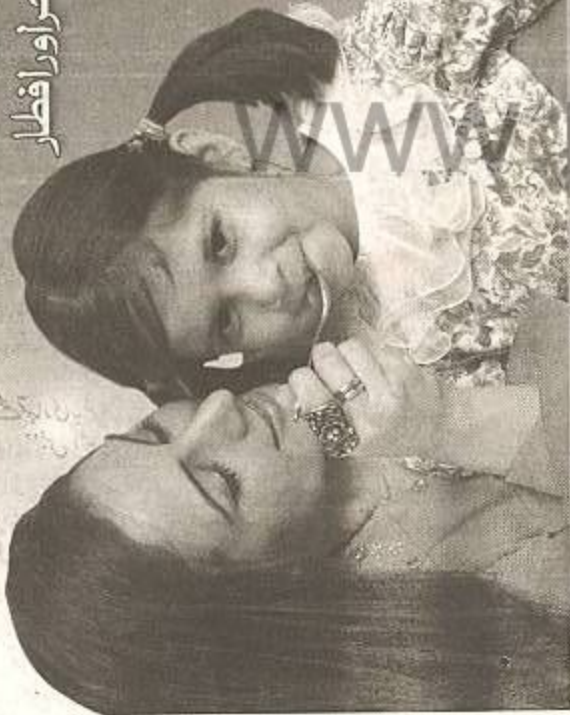
”پھر تم نے اسے کیا بتایا ہے؟“

”یہی کہ جیسے ہی عامر ملک اسے اپنے ساتھ لے کر اس فلیٹ کی طرف روانہ ہوگا، وہ مجھے اطلاع دے گی اور میں ان کے تعاقب میں لگ جاؤں گا۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”پھر جب وہ دونوں فلیٹ کے اندر بند ہو جائیں گے تو میں فوراً چھاپا مارنے وہاں پہنچ جاؤں گا۔۔۔۔۔ اللہ اللہ، خیر سلا۔“

”اور عامر ملک اتنا ہی بے وقوف انسان ہے کہ اس نے نورین کو مذکورہ فلیٹ کے بارے میں سب کچھ بتا دیا

ایک پمچ شاہی مضان میں کہوں ہوں تو انانی بحال

سحرا و افطار



قدرتی اجزاء اور جڑی بوٹیوں سے تیار شدہ

گھر کے ہر فرد کیلئے



طبی
دواخانہ (پرائیویٹ) لمیٹڈ

ہر مل بیکھ نالک

ہے، فیصل نے ایک اعتراض اٹھایا۔
”فیصل! جہیں بالکل بھی اندازہ نہیں کہ یہ تمہاری نورین کتنی زبردست ہے۔“ اشتیاق نے متنی خیر انداز میں کہا۔ ”اس نے عامر ملک کے دل و دماغ کو اپنی مٹھی میں دبوچ رکھا ہے اور جہاں تک عامر ملک کی عقل مندی اور بے وقوفی کا تعلق ہے۔“ وہ تھوڑی دیر کے لیے رکا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔
”وہ تم رات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا!“
”وہ تو میں دیکھی لوں گا لیکن تم سے میری ایک چھوٹی سی گزارش ہے۔“
”ایک نہیں، دس گزارشات کرو۔۔۔۔۔ بلکہ دس حکم کرو میرے بارے!“ اشتیاق نے بڑے دلولے سے کہا۔
”تم آئندہ بھی تمہاری نورین کے الفاظ استعمال نہیں کرو گے۔“ فیصل نے حد درجہ سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ”ایک آوارہ لڑکی کے ساتھ اپنا تعلق بڑے دیکھ کر مجھے اچھا نہیں لگتا۔۔۔۔۔“
”ؤن۔۔۔۔۔!“ اشتیاق نے قطعی لہجے میں کہا۔ ”میں آئندہ اس بات کا خاص طور پر خیال رکھوں گا۔“
”ایک بات اور بار۔۔۔۔۔ فیصل نے دو ٹوک انداز میں کہا۔
”ہاں، بولو۔۔۔۔۔!“
”میں تمہارے کہنے اور ضرورت کے مطابق اس بلڈنگ کے تین چار کینٹینوں کو، بشمول ایک آدھ کینٹی ممبر، اس مشن کے لیے تیار کر لوں گا لیکن ان افراد میں، میں ہرگز ہرگز شامل نہیں ہوں گا۔“ فیصل نے بڑے واضح انداز میں کہا۔
”کیونکہ نورین مجھے شکل و صورت سے بڑی اچھی طرح پہچانتی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ وہ مجھے اس کارروائی میں شریک سمجھے!“
”مجھے تمہاری یہ شرط بھی منظور ہے!“ اشتیاق نے حتیٰ لہجے میں کہا۔ ”بس اتنا بندوبست کر دینا کہ میرا کام نکل آئے۔۔۔۔۔“
پھر ایک دو مٹھی باتوں کے بعد ان کے بیچ ٹیلی فونک سلسلہ موقوف ہو گیا۔
اس رات فیصل والی بلڈنگ کے ایک قلیٹ میں جو کچھ پیش آیا وہ اس واقعے کے تمام کرداروں کے لیے خلافت تو فیق تھا۔ نورین یہ سوچ کر عامر ملک کے ساتھ وہاں آگئی تھی کہ اسے پورا بھر وساتھا کہ اشتیاق ان کے تعاقب میں ہے۔ وہ جیسے ہی قلیٹ میں بند ہوئی گئی، پولیس اپنی کارروائی ڈال دے گی، دوسری جانب عامر ملک کے ذہن میں کچھ اور ہی

چل رہا تھا۔ وہ نورین کو ”بیڈ ٹائم اسٹوری“ سنانے کے لیے وہاں نہیں لے کر آیا تھا۔ بات چیت تو آجس کریم پارلز اور ریٹورنیشن میں بہت ہو چکی تھیں۔ وہ آج کی رات اپنے خصوصی جذبات کی تسکین چاہتا تھا۔ تیسری جانب اشتیاق کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ ان دونوں کو جھجھکار میں پڑھے۔ وہ نہ تو اس کنارے پر کھڑے ہوں اور نہ ہی تیر کر دوسرے کنارے پر پہنچ سکے ہوں۔ وہ منہ زور جذبات اور بے لگام خواہشات کی چڑختی ہوئی ندی میں ڈبکیاں کھا رہے ہوں تو وہ انہیں رینگے ہاتھوں اپنی گرفت میں لے لے۔ لیکن اگلے چند منٹ میں جو واقعات پیش آئے انہوں نے سب کو چونکا کر بلکہ بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔

عامر ملک اپنے ”فن“ میں کچھ زیادہ ہی ماہر ثابت ہوا۔ اس نے ”چائے بنانے“ کے ٹائم میں ”کھانا تیار“ کر لیا۔ اشتیاق کو اس کی جانب سے ایسی تیزی اور طراری کی امید نہیں تھی۔ دوسری طرف نورین بھی عامر ملک کے ماہرانہ ”ہتکنڈوں“ کے آگے زیادہ دیر مزاحمت پیش نہ کر سکی اور فوراً سے پیشتر اس کی معمول بن گئی۔ نورین اور اشتیاق کو عامر ملک کی پھر تیوں کا اندازہ نہیں تھا۔ اس لیے وہ مار کھائے۔ جب پھر اشتیاق نے اپنے ”مقطاۃ اعزاز“ کے مطابق وہاں ریڈ کیا تو اندر چلوں کے نیچے اور اوپر سے بہت سارا مانی پڑ گیا تھا۔ اس صورت حال نے سب سے زیادہ نورین کو بوکھلا

دیا۔ دروازے پر ہونے والی دھڑ دھڑاہٹ اور کینٹینوں کے شور شراب نے اس کی مت ماردی۔ اس نے غیر ارادی طور پر، اپنی مٹھی میں ایک ایسا کھین قدم اٹھایا جس نے اشتیاق کے منصوبے کی ایسی گم تھیں کر دی۔ اس نے بے ساختہ اپنے لباس کو جگہ جگہ سے پھاڑ ڈالا اور جیسے ہی پولیس، بلڈنگ کے کینٹینوں کی معیت میں قلیٹ کے اندر داخل ہوئی، وہ جلدی سے ایک بیڈیٹ کو اپنے بدن پر لپیٹ کر مظلوم بن گئی پھر آنسوؤں سے رو جتے ہوئے اس نے نصف درجن افراد کے سامنے بیان دیا کہ وہ شخص (عامر ملک) دوستی کی آڑ میں بہلا پھسلا کر اسے اپنے ساتھ اس قلیٹ پر لے آیا تھا پھر ڈرا دھکا کر اسے بے آبرو کر ڈالا۔ خود کو بچانے کی کوشش میں اس کا لباس تار تار ہو گیا۔ وغیرہ وغیرہ۔

اگر دو نامحرم افراد ایک قلیٹ میں بند پائے جاتے تو دوسری بات تھی۔ اشتیاق انہیں نازیبا اور شرم ناک حرکات کے الزام میں گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے جاتا اور بعد ازاں وہ ڈرا دھکا کر عامر ملک سے کچھ مکا کر لیتا۔ اس عمل میں اشتیاق کے علاوہ وحید اللہ کا بھی بھلا ہو جاتا کیونکہ یہ بات تو

ظاہر تھی کہ عامر ملک کسی بھی صورت میں جیل جانا پسند نہ کرتا لیکن وہاں نورین کی ایک بے ساختہ اور خطرناکی حرکت نے جو چوہنیشن پیدا کر دی تھی اور وہ بھی نصف درجن معزز گواہوں کے سامنے، اس کا تقاضا یہ تھا کہ اشتیاق باقاعدہ قانونی کارروائی کو مکمل میں لائے۔ اب وہ اپنی مانی اور جوتوں کی پوزیشن میں نہیں رہا تھا کیونکہ انہی معزز گواہوں میں ایک شخص اخباری رپورٹر بھی تھا۔

جب اس نوعیت کا قانونی کارروائی کو بروئے کار لایا گیا تو کچھ عرصے بعد نورین کو مظلوم قرار دیتے ہوئے چھوڑ دیا گیا۔ عامر ملک اپنے کیے کی پاداش میں سزا پا کر جیل کی سلاخوں کے پیچھے چلا گیا اور وحید اللہ کے ساتھ ساتھ اسے ایس آئی اشتیاق بھی ہاتھ ملتا رہ گیا تھا۔ اس مشن میں، ان کے حصے میں کچھ بھی نہیں آیا تھا۔

کچھ ہی عرصے بعد یہ بات کھل گئی کہ پولیس کارروائی میں سب سے اہم کردار فیصل نے ادا کیا تھا لہذا عامر ملک سے متعلق چند جرائم پیشہ لوگ نہایت ہی خفیہ انداز میں فیصل کو خطرناک نتائج کی دھمکیاں دینے لگے۔ فیصل ان حالات سے پریشان تو ہوا اور اس نے اس بارے میں اشتیاق کو بھی بتایا لیکن پھر دھمکیوں کا یہ سلسلہ خود ہی رک گیا۔ فیصل نے سکھ کی سانس لی۔

دو ماہ گزرے تھے کہ فیصل اور اس کی فیملی کا سکھ چین غارت ہو کر رہ گیا۔ اسے عدنان علی کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا تھا اور اب وہ پچھلے چھ ماہ سے جیل میں بند تھا۔ یہ بھی فیصل کی چتا جسے میں نے کچھ زیادہ ہی مفصل انداز میں آپ کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ یہ ایک خلاف معمول بات ہے، بہر حال.....!

☆☆☆

تیسرا کہ ابتدائی بتایا جا چکا ہے کہ اس کیس کو عدالت میں لگے سات ماہ کا عرصہ گزر چکا تھا۔ پچھلے چھ ماہ سے فیصل جیوڈیشل ریماڈر جیل میں بند تھا۔ اس کے سابق وکیل نے اب تک کیس بگاڑنے کے سوا کچھ نہیں کیا تھا اور اب یہ کیس میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے فیصل سے ایک بھر ملاقات کرنے کے بعد اس کیس کا بھی اچھی طرح مطالعہ کر لیا تھا اور فیصل کے حق میں مجھے اس کیس میں اچھی خاصی جان نظر آتی تھی۔ اگر میں تھوڑی بہت ”خصوصی“ بھاگ دوڑ کر کے چند اہم معلومات حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو اس کیس کو بہ آسانی وینڈل کیا جاسکتا تھا۔ یہ بھاگ دوڑ اول آخر مجھے ہی گرتا تھی کیونکہ یہ کام اس کی بیوی فرزانہ کے بس کا نہیں تھا۔

بہر حال، آئندہ پیشی سے پہلے میں نے اپنے اس مقدمہ میں براہ حسن طریق کامیابی حاصل کر لی۔

آگے سے بچنے سے پہلے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے بارے میں بتانا چاہوں۔ اس رپورٹ کے مطابق، مقتول عدنان علی کی موت سترہ اپریل کی رات سات اور نو بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ مقتول کو سائلنسر لگے ریوالتور سے قاتلنگ کر کے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ مذکورہ ریوالتور سے چلائی گئی دو گولیاں چشم زدن میں مقتول کے سینے میں گھسیں اور اسے زندگی کی قید سے آزاد کر دیا۔ مقتول کو آفس کے اندر اسی کے کمرے میں قتل کیا گیا تھا۔ اگلے روز صبح اس کی لاش دریافت ہوئی اور پھر جیسے ہی فیصل دفتر پہنچا، اسے عدنان علی کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا تھا۔

ابھی تک اس کیس کے حوالے سے کوئی قابل ذکر عدالتی کارروائی نہیں ہوئی تھی لہذا مجھے اپنے انداز میں اس کیس کو لے کر چلنا پڑا۔ میں عدالتی کارروائی کے حوالے سے زیادہ تفصیلات میں نہیں جاؤں گا، بس انتہائی اہم گواہوں پر ہونے والی جرح کا احوال آپ کی خدمت میں پیش کروں گا۔ کیس کی ابتدا میں وکیل استغاثہ ملزم فیصل پر بھرپور جرح کر چکا تھا۔ میں نے چند ایک ضروری سوالات کے لیے اسے سچ کر لیا۔ سچ سے اجازت حاصل کرنے کے بعد میں ایکویڈ ہاؤس کے قریب چلا گیا اور ملزم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

”اب تو تمہیں دنیا کی حقیقت کا پتا چل گیا ہوگا؟“
”بہت اچھی طرح۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔
”اب کسی کے ساتھ نیکی باہمدردی کرو گے؟“
”جی تو نہیں چاہتا لیکن کچھ کہہ نہیں سکتا۔“ اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”انسان اپنی فطرت سے مجبور ہو جاتا ہے۔“

”بالکل درست کہا تم نے۔“ میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ ”یہ شک انسان اپنی فطرت کے تابع ہے۔ اگر کوئی بندہ بشر کم ظرف، احسان فراموش اور دھوکے باز ثابت ہو جائے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس تجربے کے بعد انسان دوسروں کے ساتھ ہمدردی ہی کرنا چھوڑ دے۔ بہر حال.....“ میں نے تھوڑا تو وقت کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”تم روزانہ کہتے ہو آفس پہنچتے تھے؟“
انکوائری آفیسر اور وکیل استغاثہ میری ابتدائی جرح پر خامسے متذبذب دکھائی دے رہے تھے تاہم میرے مندرجہ

بالا سوال کے بعد ان کے چہروں پر اطمینان نظر آنے لگا تھا۔ میرے سوال اور اس کیس کے ملزم نے جواب دیا۔
”کم و بیش گیارہ بجے.....!“

”اور تمہاری چھٹی کتنے بجے ہوئی تھی؟“ میں نے اگلا سوال کیا۔

”اس کا کوئی تاثر فکس نہیں تھا۔“ ملزم نے گہری سنجیدگی سے بتایا۔ ”بھی شام چھ بجے، کبھی ساڑھے چار اور کبھی سات بجے۔“

”کیا تم یہ تمام وقت آفس ہی میں گزارتے تھے؟“
”نہیں۔“ اس نے بڑے قطعی انداز میں سر کو ہنسی جنبش دی پھر کہا ”میرا کام مارکیٹنگ سے متعلق ہے۔ میں صبح آفس آ کر پندرہ بیس منٹ وہاں گزارتا تھا پھر ساڑھے گیارہ بجے بائیک پلازہ فیلڈ میں نکل جاتا تھا۔ وہاں سے میری واپسی لگ بھگ شام پانچ بجے ہو کر تھی پھر میری کلوننگ وغیرہ کے لیے گھنٹا، آدھا گھنٹا مزید آفس میں بیٹھتا تھا۔ اس کے بعد اپنے گھر چلا جاتا تھا۔“

”ابھی اچھی بات ہے۔“ میں نے سادہ سے لہجے میں کہا۔ ”ذرا اچھی طرح سوچ کر بتاؤ، وقوعہ کے روز تم گھر جانے کے لیے دفتر سے کتنے بجے نکلے تھے؟“

”چھ..... یا زیادہ سے زیادہ ساڑھے بجے۔“ ملزم نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔
”جب تم دفتر سے رخصت ہوئے تو کیا مقتول اس وقت آفس میں موجود تھا؟“

”جی ہاں، موجود تھا۔“
”موجود تھا.....“ میں نے تصدیق طلب نظر سے ملزم کی طرف دیکھا۔ ”یعنی زندہ تھا؟“

”بالکل زندہ تھا جناب.....“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ”میں اسے اس کے کمرے میں زندہ سلامت چھوڑ کر گیا تھا۔“

”یعنی گھر کے لیے روانہ ہونے سے پہلے تم مقتول کے ساتھ اس کے کمرے میں موجود تھے۔“ میں نے مصدقہ حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”جی ہاں، مقتول کا کمرہ کہہ سکتے ہیں۔“ وہ شاک کی لہجے میں بولا۔ ”حالانکہ کچھ عرصہ پہلے تک وہ میرا کمرہ ادا کرتا تھا.....!“

”یہ کیا ماجرا ہے..... ذرا تفصیل سے بتاؤ.....؟“
”آجیکیشن پور آؤ!“ وکیل استغاثہ نے صدائے مداخلت بلند کی۔

”جج نے حیرت بھری نظر وکیل استغاثہ پر ڈالی۔ اس کی نظر میں اس استغاثہ کی جھلک تھی.....“ کیا آجیکیشن ہے وکیل صاحب؟“

”جناب عالی!“ وکیل استغاثہ نے احتجاجی انداز میں کہنا شروع کیا۔ ”وکیل صفائی غیر متعلقہ سوالات میں الجھ کر معزز عدالت کا قیمتی وقت برباد کر رہے ہیں جبکہ اس کیس کے سلسلے میں پہلے ہی بہت تاخیر ہو چکی ہے۔“

”ایگزیکٹو پور آؤ!“ میں نے اپنی فائلوں پر ہاتھ مارتے ہوئے بے آواز بلند کہا۔ ”میں اپنے فاضل دوست کی بات سے کلی طور پر اتفاق کرتا ہوں.....!“

وکیل استغاثہ نے بے یقینی سے آنکھیں پھاڑ کر مجھے دیکھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ میں کیونکر اس کی بات سے اتفاق کر سکتا ہوں۔ جج نے دھجی لیتے ہوئے مجھ سے کہا۔
”بیک صاحب! ذرا وضاحت کریں، آپ کو وکیل استغاثہ سے کس نوعیت کا اتفاق ہے؟“

میں نے کھانک کر گھاسا صاف کیا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ”جناب عالی! اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ اب تک اس کیس کے حوالے سے عدالت کا بہت سا قیمتی وقت برباد ہو چکا ہے اور کارروائی کا وہ حال ہے کہ..... زینس جنید، نہ جنید گھر..... کیس ایک ایج آف کیس برکالین اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔“ میں نے لگاتار تو قوت کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”میں اس لیے قصور وار نہیں ہوں کہ آج میں پہلی مرتبہ اس کیس کی وکالت کر رہا ہوں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر وقت کی بربادی کا ذمے دار میں نہیں تو پھر کون ذمے دار ہے.....؟ اس سوال کا بہت ہی آسان جواب ہے، یعنی وہ وکلا جو آج سے پہلے اس کیس کی کارروائی کا حصہ تھے..... مطلب یہ کہ..... میرے فاضل دوست۔“ میں نے وکیل استغاثہ کی جانب اشارہ کیا پھر مزید کہا۔ ”اور وہ وکیل صفائی جو مجھ سے پہلے اس کیس کو ڈیفنڈ کر رہا تھا۔ اب یہ دونوں افراد آپس میں فیصلہ کر لیں کہ وقت کی تباہ و بربادی میں ان دونوں کا کتنا کتنا حصہ ہے!“

وکیل استغاثہ نے معاندانہ نظر سے گھور کر مجھے دیکھا تاہم زبان سے کچھ نہ بولا۔
جج نے ٹٹولنے والی نظر سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔ ”تو اس کا مطلب ہے، آپ نے ملزم سے جو سوال کیا ہے، وہ غیر متعلق نہیں؟“

”قطعی نہیں!“ میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”وہ سوال اس کیس سے انتہائی متعلق ہے اور..... اس کے پوچھنے سے معزز عدالت کا ایک لمحہ بھی ضائع نہیں ہوگا!“

”بیک صاحب..... پلیز، پراسیڈنٹ!“ جج نے گہری تنبیہ کی۔

وکیل استغاثہ کے سینے پر گویا سانپ لوٹ گیا۔ میں نے اس پر زیادہ توجہ نہیں دی اور ایک یوز ڈا باکس میں کھڑے ملزم سے استفسار کیا۔

”تم کمروں کے حوالے سے کوئی افسوس ناک کہانی سنانے والے تھے؟“

”یہ ماجرہ بہت ہی مختصر ہے جناب!“ وہ ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ”کچھ عرصہ پہلے تک نظامی صاحب نے جو کمر اچھے دے رکھا تھا وہ عدالت کی آمد کے چند روز بعد ہی اسے دے دیا گیا تھا اور.....“

”ایک منٹ.....!“ میں نے قطع کالی کرتے ہوئے کہا۔ ”نظامی صاحب..... مطلب؟“

”اسد نظامی صاحب!“ وہ فوراً میرا سوال کی تہ میں اترتے ہوئے بولا۔ ”نظامی صاحب ہماری فرم کے مالک ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔

”اب آگے بتاؤ..... پھر کیا ہوا تھا.....؟“

”ہو کیا تھا جناب۔“ وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”پتا نہیں، نظامی صاحب کو عدالت میں کون کون سی خوبیاں نظر آئی تھیں کہ انہوں نے مجھے گویا نظر انداز ہی کر دیا تھا۔ سرد اور تجربے کی بنا پر، اصولی طور پر مجھے سینئر اور عدالت کو جوئیئر سمجھا جانا چاہیے تھا اور اسی لحاظ سے ہمارے ساتھ سلوک بھی ہونا چاہیے تھا لیکن ہوا اس کے برعکس.....“

وہ لمبے بھر کے لیے تھا، ایک نظر حاضرین عدالت پر ڈالی پھر اپنی بات نکالنے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”میرا اکرام عدالت کے حوالے کر دیا گیا۔ کام کی کمانڈ بھی اسی کو سونپی دی گئی۔ وہ آرام سے دفتر میں بیٹھ کر حکم چلاتا تھا اور میں پورا دن دھوپ گرمی میں، شہر کی سڑکیں پاتا پھرتا تھا اور شام میں واپسی پر اسے حساب بھی دینا ہوتا تھا۔ میں چھوٹی سے چھوٹی بات کے لیے بھی منتول کو جواب دہ تھا۔ وقوعہ کے روز بھی.....“ وہ ایک مرتبہ پھر متوقف ہوا، ایک گہری سانس لی اور اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”وقوعہ کے روز بھی میں کم از کم ایک گھنٹے تک منتول کے سامنے کرسی پر بیٹھا، اس کے مختلف اٹنے سیدھے سوالات کے جوابات دیتا رہا اور پھر اٹھ کر اپنے گھر چلا گیا تھا۔ اگلے

روز جب میں دفتر پہنچا تو مجھے عدالت کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا حالانکہ گزشتہ روز میں اسے زندہ سلامت دفتر میں بیٹھا چھوڑ کر گیا تھا..... یہ پہلے کبھی نہ تھا!“

”بڑی دکھ بھری اور افسوس ناک کہانی ہے۔“ میں نے تبصرہ کرنے والے انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ”ذرا سوچ کر بتاؤ..... وقوعہ کے روز جب تم اپنے دفتر سے رخصت ہوئے تو اس وقت منتول کے علاوہ دفتر میں اور کون کون موجود تھا؟“

”میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا جناب۔“ وہ معذوری کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔ ”منتول کی بیخ اور ترش تحقیر آمیز باتوں نے میرا دماغ اس قدر گرم کر دیا تھا کہ میں نے کسی بات پر دھیان نہیں دیا۔ میں کمرے سے نکلا، کچنی سے باہر آیا اور اپنے گھر کی جانب روانہ ہو گیا.....“

”ایک آخری سوال.....!“ میں نے ڈرامائی انداز میں کہا۔ ”اس کیس میں عدالت علی کے قتل کے ساتھ ہی پچاس ہزار روپے کی کہانی بھی جڑی ہوئی ہے۔ استغاثہ کے مطابق تم منتول سے شدید ترین نفرت کرتے تھے۔ اس نے چند ہی روز میں تمہارا مقام اور تمہارا کام چھین لیا تھا لہذا تم نے موقع ملنے ہی اپنے حریف کو قتل کر دیا اور پچاس ہزار روپے کی رقم لے کر چائے وقوعہ سے فرار ہو گئے..... یہ پچاس ہزار کی کہانی ہے؟“

”کہانی جس اتنی ہی ہے کہ نہ تو میں نے عدالت علی کو قتل کیا ہے اور نہ ہی پچاس ہزار روپے لوٹے ہیں۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ”یہ سراسر مجھ پر الزام ہے، بلکہ بہتان ہے۔ ہاں، یہ سچ ہے کہ اس وقت عدالت کے پاس پچاس ہزار کی رقم موجود تھی اور یہ رقم اسے میں نے ہی لا کر دی تھی۔“

”تم نے لا کر دی تھی!“ میں نے مصنوعی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”کہاں سے؟“

”کہاں سے؟“ وہ لاکر دی تھی اور کس مقصد کے لیے.....؟“

”ان دنوں مارکیٹنگ کے علاوہ اگلی (کلیکشن اینڈ ریکوری) کا کام بھی میرے ذمے تھا۔“ ملزم نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ”کچھ لوگ چیک دیتے تھے اور بعض پارٹیاں کیش بے منٹ دیا کرتی تھیں۔ یہ رقم اسی سلسلے میں میں مختلف کلکیشن سے جمع کر کے لایا تھا۔“

آج کل کی طرح، چالیس سال پہلے بے منٹ کا سسٹم کلی طور پر چیک پر ”انحصار“ نہیں کرتا تھا۔ اکثر لوگ کیش بے منٹ کو ترجیح دیتے تھے۔ میں نے مزید دو چار سوالات کے بعد اپنی جرح ختم کر دی۔

اس کے بعد استغاثہ کا گواہ صابر حسین گواہی کے لیے

دفن باکس میں آکر کھڑا ہوا۔ صابر حسین مذکورہ فرم میں چرائی کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ اس نے جج پوئلے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا مختصر سیانہ ریکارڈ کرادیا۔ وکیل استغاثہ لگ بھگ پندرہ منٹ تک تھا پھر اسے گواہ سے مختلف سوالات کرتا رہا جس کا لب لباب یہ تھا کہ ملزم، منتول کو سخت ناپسند کرتا تھا اور وہ اکثر منتول کے خلاف باتیں کرتا رہتا تھا۔ وکیل استغاثہ، منتول کے لیے ملزم کی نفرت اور پتا بندیدگی کو محض اس لیے رجسٹر کرانے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ قتل اور لوٹ کے کیس کو مضبوط سے مضبوط تر بنایا جاسکے۔ جب وکیل استغاثہ نے گواہ کو فارغ کیا تو میں جج سے اجازت لینے کے بعد وٹس باکس کے قریب پہنچ گیا۔

صابر حسین کی عمر بیستیس کے قریب رہی ہوگی۔ وہ میانہ قد اور دبلا تھا۔ رنگت گندمی، بال ہتھکڑیا لے اور شکل و صورت عام سی، میں نے کھار کھا صاف کیا پھر گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کیا یہ سچ ہے کہ صبح دفتر آپ ہی کھولتے ہو؟“

”جی ہاں..... یہ سچ ہے۔“ اس نے اثبات میں جواب دیا۔

”یعنی دفتر میں تم ہی سب سے پہلے داخل ہوتے ہو؟“ میں نے ذرا یہ تبدیل کرتے ہوئے پوچھا۔

”جی ہاں!“ اس نے ایک مرتبہ پھر اثبات میں گردن ہلائی اور بتایا۔ ”میں اور جاوید تقریباً آگے پیچھے ایک ساتھ ہی دفتر پہنچتے ہیں۔ میں دفتر کھولتا ہوں اور تم دونوں اندر داخل ہو جاتے ہیں۔ دفتر کی چابیاں چونکہ میرے پاس ہوتی ہیں لہذا جاوید اگر مجھ سے پہلے بھی آجائے تو وہ میرا انتظار کرتا ہے۔“

”جاوید کون؟“ وہ لمحے بھر کے لیے رکا تو میں نے پوچھا۔

اس نے بتایا۔ ”جاوید ہمارا سوپر ہے۔ وہ دفتر کی صفائی وغیرہ کرتا ہے۔“

”کیا یہ سچ ہے کہ انھارہ اپریل کی صبح منتول کی لاش سوپر ہی نے دریافت کی تھی؟“ میں نے سوال کیا۔

”جی ہاں، یہ حقیقت ہے۔“ گواہ نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ”اس روز ہم لگ بھگ ساڑھے آٹھ بجے صبح دفتر میں داخل ہوئے تھے۔ میں اپنے کام میں اور جاوید اپنے کام میں مصروف ہو گیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد اس نے آکر مجھے بتایا کہ ادھر کمرے میں عدالت صاحب (عدالت علی) کی لاش پڑی ہوئی ہے۔“

”پھر..... پھر تم نے کیا کیا.....؟“ میں نے تیز لہجے میں استفسار کیا۔

”میں جاوید کے ساتھ فوراً اس کمرے میں پہنچا تھا۔“ گواہ نے بتایا۔ ”جاوید نے غلط نہیں کہا تھا، کمرے میں واقعی عدالت صاحب کی لاش موجود تھی۔ وہ اپنی کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے اور گردن ایک جانب لڑکھی ہوئی تھی۔ میرا مطلب ہے..... وہ کھلی ہوئی تھی۔ ان کی شرت سینے کے مقام سے خون میں تر نظر آ رہی تھی۔ صاف پتہ چل رہا تھا کہ انہیں سینے میں گولی مار کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا اور بعد میں ثابت بھی ہوئی ہو.....“ وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا پھر ایک جھرجھری کے لے کر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”ایک نہیں دو گولیاں..... پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے پتا چلا تھا کہ عدالت صاحب کو دو گولیاں مار کر ختم کیا گیا تھا۔“

”اور تمہارا خیال ہے کہ یہ کام میرے موکل نے کیا تھا؟“ میں نے کھور کراس کی طرف دیکھا۔

”نہیں.....“ وہ گڑبڑا کر بولا۔ ”میں نے تو ایسا کوئی خیال ظاہر نہیں کیا۔“

”تو تمہارا یہ مطلب ہے کہ میرے موکل نے عدالت علی کو قتل نہیں کیا؟“ میں نے اسے چکر دینے کی کوشش کی۔

وہ جلدی سے بولا۔ ”میں یہ بات بھی وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔“

”تم نے وکیل استغاثہ کی جرح کے جواب میں ملزم کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے، اس کا مقصد کیا تھا؟“ میں نے کرید کا مکمل جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔ ”تم اس سے کیا ثابت کرنا چاہتے تھے.....؟“

”میں تو کچھ بھی ثابت نہیں کرنا چاہتا تھا جناب.....“ وہ جان چھرانے والے انداز میں بولا۔ ”وکیل استغاثہ نے مجھ سے جو سوال پوچھے، میں نے تو صرف ان کے جواب دیے تھے۔ اس بات میں تو کوئی شک نہیں کہ ملزم فیصل، عدالت علی سے شدید نفرت کرنے لگا تھا اور اٹھتے بیٹھتے اس کو برا بھلا کہنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا۔“

”اوکے.....!“ میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ”منتول کی لاش دیکھنے کے بعد تم نے کیا کیا تھا؟“

”میں نے فوراً ربانی صاحب کو فون کر کے صورت حال سے آگاہ کیا تھا۔“ استغاثہ کے گواہ نے جواب دیا۔

”ربانی صاحب..... تمہارا مطلب ہے، غلام

ربانی..... اس فرم کے جنرل منیجر.....؟ میں نے سوالیہ نظر سے گواہ کی طرف دیکھا۔
 ”جی ہاں۔“ صابر حسین نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”میں انہی کا ذکر کر رہا ہوں۔“
 ”اس کے بعد کیا ہوا تھا؟“

”تھوڑی ہی دیر کے بعد ربانی صاحب وہاں پہنچ گئے تھے۔“ گواہ نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”انہوں نے کمرے میں جا کر عدنان صاحب کی لاش کا جائزہ لیا اور پھر پولیس کو فون کر کے بلایا۔ پولیس آئی، اس نے موقع کی کارروائی کی اور اس سے پہلے کہ وہ مڑم کی گرفتاری کے لیے اس کے گھر کا رخ کرتے، یہ خود ہی دفتر پہنچ گیا۔“ بات کے اختتام پر استفسار کے گواہ نے دوسری طرف اکیورڈ ہاس میں کھڑے مڑم کی جانب اشارہ کر دیا۔

”گواہ..... تم نے با بعد میں منیجر صاحب نے مقتول کے درختے سے رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی؟“ میں نے جیسے ہوئے انداز میں پوچھا۔ ”ان بے چاروں کو عدنان علی کی المناک موت کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں دی گئی تھی۔!“

”وہ جی..... پریشانی اور افراتفری میں، میں اور منیجر صاحب تو یہ کام کرنا بھول گئے تھے۔“ وہ عداوت آسمان لہجے میں بولا۔ ”لیکن پولیس نے موقع کی کارروائی کے دوران ہی میں عدنان صاحب کے کھڑ فون کر کے انہیں اس اندوہناک واقعے کے بارے میں بتا دیا تھا۔“

”صابر حسین!“ میں نے ان کا ایک سوالات کا زو یہ تبدیل کرتے ہوئے پوچھا۔ ”تمہارے دفتری اوقات کار کیا ہیں؟“
 ”جناب! میں صبح تقریباً ساڑھے آٹھ بجے دفتر پہنچ جاتا ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”پھر رات کو سات بجے میری چھٹی ہوتی ہے۔“

”کافی لمبا نام ہے۔“ میں نے ہمدردانہ انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ”کیا وقوعہ کے روز بھی تم نے سات بجے ہی چھٹی کی تھی؟“
 ”نہیں جناب۔ اس روز میں جلدی چلا گیا تھا۔“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

”کتنا جلدی؟“ میں نے ٹٹولا۔
 ”کوئی ساڑھے پانچ..... یا پونے چھ بجے جناب۔“
 ”اس جلدی کا کوئی خاص سبب تھا؟“
 ”جی ہاں۔“ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ”مجھے اپنی بیوی کو لے کر لڈی ڈاکٹر کے پاس جانا تھا اور اس کے

لیے میں نے منیجر صاحب سے باقاعدہ اجازت لے لی تھی۔“
 ”وقعہ کے روز جب تم دفتر سے نکلے تو اس وقت دفتر میں اور کون کون موجود تھا؟“ میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔
 ”سب ہی موجود تھے۔“ وہ معتدل انداز میں بولا۔
 ”صرف پاس جا چکے تھے۔ وہ عموماً پانچ بجے دفتر سے اٹھ جاتے ہیں۔“

میں نے پوچھا۔ ”عام دنوں میں تم سات بجے چھٹی کرتے ہو۔ کیا دفتر کو بند بھی تم ہی کرتے ہو یا.....؟“
 ”دفتر کو بند کرنا میرے فرائض میں شامل ہے۔ جب سب لوگ چلے جاتے ہیں تو میں دفتر کو لاک کر دیتا ہوں۔“
 ”کیا انفرادی طور پر دفتر کے ہر ہر کمرے کو لاک کیا جاتا ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

اس نے جواب دیا۔ ”نہیں جناب! ہر ایک کمرے کو لاک کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ بس، مین دروازے کو اچھی طرح لاک کر دیا جاتا ہے اور جب بھی.....“ وہ سانس لینے کے لیے تھما پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”اگر..... مجھے جلدی جانا ہوتا ہے تو پھر صبح سے آخر میں جانے والا شخص دفتر کو لاک کرتا ہے۔ وقوعہ کے روز بھی یہی ہوا ہوگا۔ لیکن اگلے روز میں نے دروازہ کھولا تو عدنان صاحب کے قتل کا انکشاف ہوا۔“
 ”دش آل یور آئر۔“ میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے اور جج نہیں پوچھا۔“

عدالت کا وقت ختم ہونے میں چند منٹ باقی تھے۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ کسی اور گواہ کو شہادت کے لیے پیش کیا جاتا ابتدا جج نے آئندہ پیش کی تاریخ دے کر عدالت برخواست کرنے کا اعلان کر دیا۔

☆☆☆

آئندہ پیشی پر استفسار کی جانب سے دو گواہ پیش کیے گئے لیکن ان کے بیان اور بعد ازاں ان پر ہونے والی جرح میں ایسی کوئی خاص بات نہیں جسے آپ کی خدمت میں پیش کیا جائے۔ ان کے بعد کمپنی کے مالک یعنی پاس اسد نظامی کی گواہی تھی لیکن اس سے پہلے کہ اسد نظامی وٹس باکس میں آکر کھڑا ہوتا، میں نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”یور آئر! میں گواہ کے بیان سے پہلے اس کمپنی کے تفتیشی افسر سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔“

کسی بھی ذریعہ سماعت کمپنی میں انکواری آفیسر یعنی تفتیشی افسر کی حیثیت استفسار کے گواہ ایسی ہوتی ہے اور ہر پیشی پر اسے عدالت میں حاضر رہنا پڑتا ہے۔ جج کے

اشارے پر آئی او وٹس باکس میں آکر کھڑا ہو گیا۔ میں مذکورہ کمرے کے پاس پہنچا اور اپنی مختصر سی جرح کا آغاز کر دیا۔ انکواری آفیسر (آئی او) عہدے کے اعتبار سے سب انسپکٹر تھا۔ ”آئی او صاحب!“ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے سوال کیا۔ ”آپ کو اس واقعے کی اطلاع کب اور کس نے دی تھی؟“

”ہمارے پاس مقتول کی فرم سے فون آیا تھا۔“ اس نے جواب دیا۔ ”منیجر غلام ربانی نے تقریباً دس بجے صبح، اٹھارہ اپریل کو کھانے فون کر کے ہمیں اس واقعے کی اطلاع دی تھی۔“

”اور آپ جانے وقوعہ پر کتنے بجے پہنچے تھے؟“
 ”میں کوئی ساڑھے دس بجے۔“

”مقتول کی حالت کو دیکھ کر آپ کو فوراً اندازہ ہو گیا ہوگا کہ وہ اب اس دنیا میں باقی نہیں رہا۔“ میں نے پوچھا۔ ”جی ہاں۔ بالکل۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”مجھے پہلی نظر ہی میں یقین ہو گیا تھا کہ اسے موت کو گھٹے لگائے کی کھینچ گڑبچ ہے اور بعد ازاں اس پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے بھی یہی ثابت ہوا ہے۔“

”ہوں۔“ میں نے ججی خیر انداز میں ہنکارا پھر اور چیتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”موقع پر موجود لوگوں کے بیانات سے آپ نے اندازہ قائم کیا کہ مقتول کے قتل میں مڑم کا ہاتھ ہو سکتا ہے البتہ مڑم ہیے ہی دفتر میں داخل ہوا، آپ نے اسے گرفتار کر لیا۔“

”مڑم اور مقتول کے درمیان جاری سرد اور گرم جنگ کے حوالے سے حاصل ہونے والی مستفی خیر معلومات نے اس گرفتاری میں نہایت ہی اہم رول ادا کیا تھا لیکن.....“ وہ سانس لینے کے لیے رکا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔ ”لیکن ایسا نہیں ہے کہ ہم نے اس سلسلے میں اپنے طور پر تحقیق نہ کی ہو۔“

”مثلاً.....!“ میں نے گہری نظر سے اسے دیکھا اور پوچھا۔ ”اس سلسلے میں آپ نے کیا تحقیق فرمائی تھی؟“
 وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”ہم نے اس کمرے میں متعدد مقامات سے فنگر پرنٹس اٹھائے تھے جس سے یہ ثابت ہوا کہ مڑم اس کمرے میں گیا تھا اور.....“

”یہ کوئی خاص بات نہیں۔“ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”مقتول اور مڑم کا تعلق چونکہ ایک ہی شیعہ سے تھا لہذا مڑم کو اس کمرے میں جانا ہی پڑتا تھا۔“
 ”آپ ٹھیک کہتے ہیں لیکن.....“ وہ متاملانہ انداز میں

بولی۔ ”مقتول کی میز اور میز کی درازوں کے چنڈر پر بھی مڑم کے فنگر پرنٹس ملے تھے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مڑم نے مقتول کی میز کی درازیں کھولنے کی کوشش کی تھی۔ بلکہ درازیں کھولی تھیں۔“ وہ لمبے بھر کے لیے متوقف ہوا پھر انکشاف انگیز انداز میں بولا۔

”مقتول کی دراز میں سے پچاس ہزار روپے بھی گئے ہیں۔ اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔!“
 ”حقیقت چھوٹی ہو یا بڑی اسے دانستہ نظر انداز کرنا جرم کے زمرے میں آتا ہے۔“ میں نے قلفیانہ انداز میں کہا۔ ”لیکن پچاس ہزار روپے کے غیاب سے بھی بڑی اور اہم ایک حقیقت کو آپ مسلسل نظر انداز کرتے چلے آ رہے ہیں۔!“

”کون سی حقیقت؟“ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔
 میں نے ڈرامائی انداز میں جواب دیا۔ ”عدنان علی کا قتل!“

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں وکیل صاحب۔!“ وہ ابھمن زدہ نظر سے مجھے ٹھٹھکے لگا۔ ”میں نے قتل کی اس واردات کو کب اور کہاں نظر انداز کیا ہے؟“
 ”ہر جگہ۔ اور ہر وقت۔!“ میں نے ذومعنی انداز میں کہا۔

”آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی وکیل صاحب۔!“ اس کی حیرت اور ابھمن میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔

”میں سمجھتا ہوں۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”کیا یہ سچ ہے کہ مقتول کو سائیکلنگ گے ریو اور سے قتل کیا گیا تھا۔ مذکورہ ریو اور کی دو جان لیوا گولیاں مقتول کے سینے میں اتریں اور وہ قید حیات سے آزاد ہو گیا۔“

”جی ہاں، یہ سچ ہے۔“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”پوسٹ مارٹم کی رپورٹ اس امر کی تصدیق کرتی ہے۔“
 ”پوسٹ مارٹم کی تصدیق کو چھوڑیں، اپنی تحقیق اور تفتیش پر دھیان دیں آئی او صاحب۔“ میں نے روکے پھینکے انداز میں کہا۔ ”جائے وقوعہ پر بہت سے مقامات سے آپ نے مڑم کے فنگر پرنٹس اٹھائے لیکن آئی او قتل پر مڑم کی انگلیوں کے نشانات کا کہیں کوئی ذکر نہیں اور ذکر بھی کیسے ہو.....“ میں نے لمحائی توقف کر کے ایک خطرہ نگاہ اس کے اوپر ڈالی پھر چیتے ہوئے انداز میں کہا۔

”آئی او قتل باز یاب ہوتا تو اس پر کسی کے فنگر پرنٹس ڈھونڈے جاتے تا.....!“

”ہاں، یہ حقیقت ہے کہ ہم آؤ قبل کو تلاش کرنے میں ناکام رہے ہیں۔“ وہ شرمندہ صورت بناتے ہوئے بولا۔ ”گلتا ہے، ملزم نے اس ریلواریو کو کسی کسٹرو وغیرہ میں پھینک دیا تھا۔“

”آؤ قبل کو بازیاب کرنے میں ناکام رہے ہیں۔“ میں نے خودکامی کے انداز میں دہرایا پھر پوچھا۔ ”اور پچاس ہزار کی رقم کے بارے میں کیا کہتے ہیں آئی او صاحب۔ کیا ملزم نے وہ رقم بھی آؤ قبل کے ساتھ ہی کسٹرو میں پھینک دی تھی یا نذر آتش کر کے اس کے شعلوں پر اپنا انڈر ویر سکھاتا رہا تھا۔ استغاثہ کی رپورٹ میں مذکورہ رقم کی برآمدگی کا کوئی ذکر نہیں ہے؟“

”رقم بھی برآمد نہیں کرائی جاسکی۔!“ وہ عداوت آمیز نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ ”حالانکہ ہم نے کوشش تو بہت کی تھی۔“

”آئی او صاحب۔!“ میں نے بے یقینی سے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور شک مجھے لہجے میں پوچھا۔ ”آپ کا تعلق پولیس ڈیپارٹمنٹ ہی سے ہے نا۔۔۔؟“

”کیا مطلب۔۔۔!“ وہ کسی طاقت ور اسپرنگ کے مانند اچھلا پھر اپنی وردی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”آپ کو نظر نہیں آ رہا۔ میں ہوں وقار حسین۔ سب انسپکٹر!“

”ہاں ہاں، مجھے آپ کی پولیس یونیفارم تو نظر آ رہی ہے۔“ میں نے اس کے ذمہ پر تمک کا چھڑکاؤ کرتے ہوئے کہا۔ ”اور آپ کے نام کا بلا (بج) بھی دکھائی دے رہا ہے لیکن میں نے پولیس ڈیپارٹمنٹ کی جو پھرتیاں سنی اور دیکھی ہوئی ہیں وہ آپ میں کبیں نظر نہیں آ رہیں۔!“

”مثلاً۔۔۔ کون سی پھرتیاں۔۔۔؟“ وہ براسامہ بنا کر مستفسر ہوا۔

”میںی کہ آپ کے زیر تفتیش تو پتھر بھی بولے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔“ میں نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔ ”آپ لوگ اگر کسی شیر ببر کو بھی پکڑ کر تفتیشی کرے میں لے جائیں اور اس سے اپنے مخصوص انداز میں پوچھ پچھ کریں تو وہ بھی بالآخر آپ کی زبان بولنے لگتا ہے۔ جرم کا اقبال کرنا تو آپ لوگوں کے لیے جیسے چنگیوں کا کام ہے لیکن میرا موکل ایک ہتھے تک دریا نہ پر آپ کی کسٹری میں رہا ہے اور آپ اس سے نہ تو پچاس ہزار روپے برآمد کروا سکتے ہیں اور نہ ہی آؤ قبل کا کوئی سراغ ملا ہے۔ یہ حیران کن بات نہیں ہے؟“

”حیران کن بات بالکل نہیں۔“ وہ بڑی ڈھٹائی سے بولا۔ ”بعض معاملات میں ایسا ہو جاتا ہے اور جہاں تک آپ کے خیالات کا تعلق ہے۔“ اس نے لمبائی تو قوت کر کے

ایک پوجل سانس لی پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”آپ نے پولیس ڈیپارٹمنٹ کے تفتیشی عمل کے بارے میں جن درجہ خیالات کا اظہار کیا ہے، میں اس کی نفی کرتا ہوں، ہمارے ہاں ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ ہم بھی انسان ہیں۔“

”بے شک۔۔۔ آپ بھی انسان ہیں لیکن آپ لوگوں کے غیر انسانی رویوں کی کہانیاں اور قصے اسے مقبول عام ہیں کہ آپ کی پیش کردہ صفائی ایک تفریحی مذاق محسوس ہو رہی ہے، بہر حال۔۔۔“ میں نے دوبارہ موضوع کی طرف آتے ہوئے کہا۔ ”آئی او صاحب! آپ نے مقتول کے دروازے رابطہ کرنے میں اچھی خاصی تاخیر سے کام لیا تھا۔ اس کی کوئی خاص وجہ تھی؟“

”جی ہاں، خاص وجہ تھی۔“ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ”مقتول کا تعلق چونکہ کراچی سے نہیں تھا لہذا اسی لیے اس کے گھر والوں سے رابطہ کرنے میں دیر ہوئی۔“

پھر خود ہی اس نے وضاحت بھی کر دی۔ ”مقتول، میر پور خاص کا رہنے والا تھا۔ اس کی پوری مٹلی میر پور خاص میں آباد ہے۔ کراچی میں وہ بالکل اکیلا تھا اور کسی کرایے کے کوارٹر میں رہتا تھا۔ میں نے اس کے گھر کا نمبر حاصل کیا پھر فون کر کے انہیں اس اندہ ہتاک واقعے کی اطلاع دی تھی۔“

میں نے دو چار مزید سوالات کرنے کے بعد جرح موقوف کر دی۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد فرم کے مالک اسد نظامی کو عدالت کے اندر بلایا گیا۔ اسد نظامی کی عمر لگ بھگ ساٹھ سال تھی۔ وہ اپنی وضع قطع اور صورت شکل ہی سے ایک باس نظر آتا تھا۔ نظامی نے حلفہ بیان دیکھاؤ کر دیا تو ویل استغاثہ جرح کے لیے ٹیس باکس کے پاس چلا گیا۔ وہ گواہ سے اپنی مرضی اور ضرورت کے سوالات کرتا رہا جس سے یہ تاثر قائم کرنا مقصود تھا کہ مقتول اور ملزم کے درمیان بڑی خطرناک نوعیت کی چپقلش چل رہی تھی اور اس کا سبب ملزم کا حسد تھا۔ وہ مقتول کی بے پناہ صلاحیتوں سے جلنے لگا تھا۔

وغیرہ وغیرہ!

میں اپنی باری پر، بیج سے اجازت حاصل کرنے کے بعد ونٹس باکس کے نزدیک چلا گیا اور وہاں موجود استغاثہ کے گواہ مسز اسد نظامی سے بڑے خوشگوار لہجے میں سوال کیا۔

بدستور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

”آپ اس برٹس میں کب سے ہیں؟“

”ماشاء اللہ! یہ تیسری سال ہے۔“ اس نے فخریہ انداز میں بتایا۔ ”والد صاحب نے یہ برٹس کھڑا کیا تھا، میں نے اسے پھولنے پھلنے میں مدد دی اور اب میری اولاد اسے سنبھالنے کے لیے بالکل تیار ہے۔“

”کیا آپ کے بیٹے وغیرہ بھی برٹس میں آپ کا ہاتھ بٹاتے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”فی الحال نہیں۔“ اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ”میری تین بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ بیٹا سب سے بڑا ہے اور آج کل امریکا میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ یہ اس کی اسٹڈی کا آخری سال ہے۔ آئندہ سال وہ بھی آپ کو میرے ساتھ اس برٹس میں نظر آئے گا۔“

”ماشاء اللہ۔!“ میں نے تفریحی نظر سے اسے دیکھا اور فوراً اپنے مطلب کی طرف آ گیا۔ میں نے پوچھا۔ ”ملزم کو آپ کی فرم میں کام کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہوا تھا؟“

”کم و بیش چار سال۔“ اس نے جواب دیا۔

”اس دوران میں آپ نے ملزم کو کیسا دیکھا یا سنا؟“

”وہ ایک ہفتی ملازم تھا۔“

”بس، یوں سمجھ لیں کہ اس نے گویا شکایت کے انبار کھڑے کر دیے تھے۔ کام پر سے اس کی توجہ بالکل ہٹ گئی تھی۔ یہ بڑی بھیا تک غلطیاں کرنے لگا تھا اور اس کا سبب غالباً یہ تھا کہ اسے عدنان کا فرم میں آنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ یہ مقتول سے اور اس کی صلاحیتوں سے جیسٹس ہو گیا تھا۔ یوں سمجھیں کہ اسے مقتول سے شدید ترین نفرت ہو گئی تھی۔“

”ایک بات کی وضاحت چاہوں گا نظامی صاحب؟“

میں نے گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”جی فرمائیں؟“ وہ سوالیہ انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے نہایت ہی مختصر لہجے میں فرمایا۔ ”جب آپ کو ملزم کے کام سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ آپ اس کے کردار اور رویے سے بھی پوری طرح مطمئن تھے تو پھر مارکیٹنگ ڈیپارٹمنٹ میں مقتول کو رکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا آپ کو اس بات کا احساس ہے کہ یہ آپ کی ایک سنگین غلطی تھی؟“

”ہرگز نہیں!“ وہ بڑے وثوق سے بولا۔ ”میں ہمیشہ دس قدم آگے سوچنے کا عادی ہوں۔ میں نے مقتول کی تفریری کا فیصلہ اپنی فرم کے بچتر اور روشن مستقبل کی خاطر کیا تھا۔“

”معزز عدالت آپ کی دورانہ بندی کے فلسفے کو سمجھنا چاہتی ہے نظامی صاحب؟“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

اس نے کھٹک کر گھٹا صاف کیا پھر بڑے مدبرانہ انداز میں بتانے لگا۔ ”اکثر لوگوں کو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ میں نے کیا دیکھ کر مقتول کو اپنی فرم میں رکھ لیا تھا۔ اسے کراچی میں آئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ اس دوران میں اس نے دو چار چھوٹی موٹی جگہوں پر کام کیا تھا۔ میں نے آج تک کسی کو اس سوال کا جواب نہیں دیا لیکن اب ضرورتوں کا کہ میں نے اس میں کون سا جوہر چھپا دیکھا تھا۔“

وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا تو میں نے کوئی نیا سوال کر کے اسے ”ڈسٹرب“ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ میں غیر محسوس انداز میں، اپنے سوالات کی اگلی پکڑا کر اسد نظامی کو ایک خاص مقام تک لے آیا تھا جہاں مجھے اس سے ایک انتہائی خطرناک سوال کرنا تھا۔ میں پوری طرح مطمئن تھا کیونکہ میری یہ کوشش راگال نہیں گئی تھی۔ اسد نظامی دھیرے دھیرے میرے مطلوبہ مقام تک پہنچ گیا تھا۔ وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”مقتول میں جوہر نہیں بلکہ جواہر چھپے ہوئے تھے۔ میں اس کی صلاحیتوں سے متاثر ہو گیا تھا۔ جب ہی میں نے اسے چار سال سے کام کرنے والے ملزم پر فوقیت دی۔ یہ

ٹھیک ہے کہ طرم ایک ایماندار اور متقی شخص تھا لیکن مقتول میں
کئی گن گنا زیادہ کام کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ وہ مارکیننگ
کے علاوہ اکاؤنٹس کے رموز سے بھی واقف تھا اور اس
میں انتظامی انداز کی صلاحیت بھی۔ درجہ اتم موجود تھی۔ میں
اپنے بہت سارے کام اس کے سپرد کر کے بے فکر ہو جاتا تھا
اور..... وکیل صاحب! سیدی اور جی بات ہے کہ ہر انسان
اپنا فائدہ دیکھتا ہے۔ میں نے بھی مستقبل کے حوالے سے
بہت کچھ سوچ کر مقتول کو اپنی فرم میں اکاؤنٹنٹ کیا تھا۔
”بالکل بجا فرمایا آپ نے۔“ میں نے تائیدی انداز
میں کہا۔ ”ہر انسان..... خصوصاً کاروباری انسان کو سب
سے پہلے اپنا ہی فائدہ سوچنے کا حق ہے، یہ الگ بات کہ آپ
کا سوچا ہوا پورا نہیں ہو سکا اور آپ دونوں سے ہاتھ دھو
بیٹھے..... مقتول اور طرم، دونوں سے!“
”یہ سب زندگی کا حصہ ہے.....!“ وہ بے پروائی سے
کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔
میں نے پوچھا۔ ”نظامی صاحب! آپ نے مقتول کی
بہت سی صلاحیتوں کا تذکرہ کیا ہے۔ میں جانتا چاہوں گا کہ کیا
اس میں ایک اچھا جرنل فیجر بننے کی بھی اہلیت موجود تھی؟“
”بالکل موجود تھی۔“ وہ پوری قطعیت سے بولا۔ ”اور
یہ میرے پروگرام میں بھی شامل تھا۔“
”یعنی آگے چل کر آپ مقتول کو اپنی فرم کا منیجر بنانے
کا ارادہ رکھتے تھے؟“
”جی..... میرے بیٹے کی، امریکا سے واپسی کے
بعد.....!“
”مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی!“
☆☆☆☆

منظر اسی عدالت کا تھا اور گواہوں والے کٹہرے میں
استغاثہ کا آخری گواہ یعنی فرم کا جی ایم غلام ربانی کھڑا تھا۔
غلام ربانی کی عمر بیسٹھ تیس اور پیاس کے درمیان رہی ہوگی۔
وہ ایک موٹا تازہ اور صحت مند شخص تھا۔ قد کاٹھ، ذیل ڈول
اور ضد و خال میں وہ بڑی حد تک فلی ادا کا رخا سلیم موٹا سے
مٹا چلا تھا۔ اس وقت گواہ کے چہرے پر گہری شبیدگی نظر
آ رہی تھی۔ وہ جیسے ہی مختصر سا حلفیہ بیان دے کر فارغ ہوا،
وکیل استغاثہ اس سے لپٹ گیا۔ مقصد یہی ثابت کرنا تھا کہ
طرم کو مقتول سے اس درجہ نفرت تھی کہ وہ دل کا غبار اور ذہن
کا بخار لگانے کے لیے اسے موت کے گھاٹ اتار سکتا تھا۔
اس سلسلے میں اس نے طرم اور مقتول کے بیچ ہونے والی مختلف

باتوں کو بھی کوڑ کیا جن سے مقتول کے لیے طرم کی برائی اور
فصحاہر ہوتا تھا۔
اپنی باری پر میں نے استغاثہ کے گواہ کو بالکل مختلف
انداز میں لیا۔ میں نے اب تک جو ورک کیا تھا اس کے
استعمال کا وقت آگیا تھا۔ میں نے اب تک ہونے والی
عدالتی کارروائی کے نتیجے میں، پہلے سے سوچ رکھا تھا کہ غلام
ربانی کو کس طرح اپنی جرح کی چٹنی میں پیسا ہے۔ میں نے
ہلکے پھلکے اور دوستانہ انداز میں سوالات کا سلسلہ آغاز کیا۔
”ربانی صاحب! آپ اردو کے محاوروں پر یقین
رکھتے ہیں؟“
اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور بولا۔ ”کیوں نہیں۔
محاورے چاہے کبھی زبان کے ہوں، برسوں کے تجربے کے
نچوڑ سے تشکیل پاتے ہیں، یہ ایک محسوس حقیقت ہوتے ہیں۔“
”ویری گڈ!“ میں نے سانس کی نظر سے اسے دیکھا پھر
پوچھا۔ ”ایک پتھ، دو کالج..... کا مطلب تو آپ کو پتا ہی
ہوگا؟“
”جی ہاں.....“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔
”مطلب یہ کہ..... ایک تیر، دو شکار!“
”کام ایک، فائدہ دہرا.....!“ میں نے سوالیہ نظر
سے اسے دیکھا۔ ”کیوں؟“
”جی..... آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ وہ غصہ سے
ہوئے لہجے میں بولا۔
”شکر یہ ربانی صاحب!“ میں نے معنی خیز انداز میں
کہا۔ ”آپ نے میرا کام بہت آسان کر دیا ہے۔“
”کون سا کام؟“ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔
میں نے اس کی حیرانی کو نظر انداز کرتے ہوئے اگلا
سوال کیا۔ ”نظامی صاحب کی فرم میں کام کرتے ہوئے آپ
کو کتنا عرصہ ہوا ہے؟“
”پانچ سال!“ اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔
ان نکات میں، میں نے گواہ پر اپنے سوالات کے تین
کیمرے لگا رکھے تھے اور ان تینوں کے ٹریک ایک دوسرے
سے بالکل مختلف تھے۔ میں اسے سوچنے کا موقع نہ دینے کی
خاطریہ چال چل رہا تھا۔ بعد ازاں میں اپنی جرح کے اختتام
پر..... اس شوٹ کو ایڈٹ کر کے اپنے کام کی باتیں نکال لیتا۔
استغاثہ کا گواہ منتظر نگاہ سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔
”ربانی صاحب! کیا آپ بٹنی (بی سی) وغیرہ ڈالنے
کا شوق رکھتے ہیں؟“
”نہیں..... بالکل بھی نہیں۔“ وہ نفی میں گردن ہلاتے

ہوئے بولا۔ ”یہ خود کو دھوکا دینے کا ایک خوبصورت انداز
ہے۔ اس سے اچھے، انسان اپنی رقم کسی اسکیم میں انویسٹ
کر دے تاکہ کچھ منافع تو بڑھ کر ملے۔ اگر کچھ بھی سمجھ میں نہ
آ رہا ہو تو انسان پرائز بانڈ ہی لے کر رکھ لے۔ کبھی نہ کبھی
قسمت کھلنے کے امکانات تو ہوتے ہیں۔“
”کیا آپ پرائز بانڈ وغیرہ لے کر رکھتے ہیں؟“
”جی ہاں۔“
”کبھی آپ کا بانڈ لگا بھی ہے؟“
”کبھی کبھار چھوٹا مونا لگ جاتا ہے۔“ اس نے بتایا۔
”میں اتنا خوش قسمت نہیں ہوں کہ پہلا، دوسرا یا تیسرا انعام
لگے۔“
”یہ بھی آپ کی خوش قسمتی ہی ہے ربانی صاحب کہ کبھی
کبھار چھوٹا مونا تو لگ ہی جاتا ہے۔“ میں نے دوستانہ انداز
میں کہا۔ ”ورنہ بعض لوگ تو سالوں لیے بیٹھے رہتے ہیں اور کبھی
چھوٹی لسٹ میں بھی ان کے پرائز بانڈ کا نمبر نظر نہیں آتا۔“
”یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ وہ تائیدی
انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔
میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔
”آج تک آپ کا بڑے سے بڑا بانڈ کس مالیت کا لگا ہے؟“
”بھئی..... کبھی دس ہزار..... کبھی پندرہ ہزار.....!“
”آپ کو طرم سے کتنی خواہش ہوتی ہے؟“ میں نے جرح کا
زاویہ تبدیل کرتے ہوئے پوچھا۔
”آٹھ ہزار روپے!“ اس نے جواب دیا۔
”گھر اپنا ہے یا کرایے کا؟“
”فی الحال تو میں ایک چھوٹے سے گھر میں رہ رہا ہوں
جو کہ میری ذاتی ملکیت ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”لیکن مستقبل
قرب میں، میں کسی بنگلے میں شفٹ ہونے کا ارادہ رکھتا
ہوں۔“
”کیا کوئی لازمی وغیرہ لگنے کی امید ہے؟“ میں نے
معنی خیز نظر سے اسے دیکھا۔
”نہیں جناب! میں نے تھکا تھکا جوڑ کچھ رقم جمع کی
ہے اسی سے بنگھا خریدوں گا۔“ اس نے جواب دیا۔ ”پرانا کھر
فروخت کروں گا تو اس سے بھی کچھ رقم مل جائے گی اور اس
دوران میں اگر کوئی پرائز بانڈ مل جاتا ہے تو مزہ آ جائے گا۔“
”آپ کا آخری بانڈ کب لگا تھا؟“
”چند لمحات تک سوچنے کے بعد اس نے جواب دیا۔
”فردی میں۔“
”کس مالیت کا؟“

”دس ہزار روپے کا۔“
”یعنی فردی سے لے کر آج تک آپ کا کوئی بانڈ
نہیں لگا؟“
”جی نہیں!“
”اس دوران میں آپ نے کوئی قیمتی شے بھی فروخت
نہیں کی؟“
”بالکل نہیں!“ وہ قطعی لہجے میں بولا۔
”مقتول کے ساتھ آپ کے تعلقات کیسے تھے؟“ میرا
انداز بھر تہل ہوا۔
”خوشگوار.....!“
”اور طرم کے ساتھ؟“
”اس کے ساتھ بھی اچھے ہی تھے۔“ وہ میرے موکل
کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”لیکن پچھلے کچھ عرصے سے یہ
خاصا چڑھا اور بد مزاج ہو گیا تھا، اس لیے میں نے اسے منہ
لگنا چھوڑ دیا تھا۔“
”اس کے چڑھے پن کا سبب وہی ہے تا جو آپ
نے وکیل استغاثہ کے سوالات کے جواب میں ثابت کرنے
کی بھرپور کوشش کی ہے؟“
”جی ہاں، جی ہاں..... ویسی..... وہ جلدی سے بولا۔
”یعنی مقتول بے پناہ خوبیوں کا مالک تھا.....“ میں
نے اس کی سوچ کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا۔ ”طرم کے
ذہن میں یہ ڈیرینج تھا کہ نظامی صاحب بہت جلد اس کی
چھٹی کر دیں گے جب ہی وہ مقتول کی بیٹھے بیٹھے زہر اگل رہا تھا؟“
”اللہ آپ کا بھلا کرے وکیل صاحب! بالکل صحیح۔“
”اللہ آپ کا بھی بھلا کرے منیجر صاحب! اب آپ
بھی حقیقت بیان کر دیں!“
”جی کون سی حقیقت؟“ وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے
دیکھنے لگا۔
میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ حقیقت کہ کیا
مقتول واقعی اتنی خوبیوں کا مالک تھا کہ طرم کو اس کی ذات
سے ایسا تک خطرہ پیدا ہو گیا تھا؟“
”جی ہاں..... اس امر میں تو کسی شک و شبہ کی گنجائش
ہی نہیں!“
”مجھے آپ کی بات سے اتفاق کرنا پڑے گا منیجر
صاحب!“ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔
”نظامی صاحب نے بھی مقتول کی ایک حیرت انگیز صلاحیت
کا ذکر کیا تھا.....؟“
میرے انکشاف انگیز انداز کے جواب میں وہ پوچھتے

بتا رہا تھا۔" نطای صاحب نے متول کی کون سی حیرت انگیز صلاحیت کا ذکر کیا تھا۔؟
"یہی کہ وہ..... ایک بہترین منبر بھی ثابت ہو سکتا تھا.....!"

"منبر کا تو مجھے پتا نہیں....." وہ بد مزہ سا ہو کر بولا۔
"لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ وہ میز اور مارکیٹنگ کا پتہ تھا۔ یوں سمجھ لیں کہ وہ سامہریا کے برف زاروں میں فروخت کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔"

"ربانی صاحب! میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔" آپ کے پاس اسد نطای نے اپنے بیان کے اختتام پر تو یہ ارادہ بھی ظاہر کیا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کی امریکا سے واپسی کا انتظار کر رہے تھے..... اس کے بعد متول کو اس فرم کا جی ایم بنادیا جاتا۔"

"آپ نے سنا ہوگا....." پاس از آکویر رایت! وہ کنہ سے اچکاتے ہوئے بولا۔ "اگر نطای صاحب نے ایسا کوئی ارادہ ظاہر کیا ہے تو ان کی مرضی ہے۔ میں بھلا اس سلسلے میں کیا کہہ سکتا ہوں چنانچہ.....!"

"آپ کہیں نہیں بلکہ فرمائیں ربانی صاحب! میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "اور یہ فرمائیں کہ کیا پاس کے اس فیصلے سے آپ کو کوئی خوف محسوس نہیں ہوا تھا؟ ایک فرم میں کوئی ایک جی ایم ہی رہ سکتا ہے نا۔ اگر مستقبل قریب میں نطای صاحب، متول کو اپنی فرم کا جنرل منبر مقرر کر دیتے تو آپ خود کو کہاں کھڑا دیکھتے.....؟"

"اپنی نوکری کے حوالے سے ڈر اور خوف صرف انہی لوگوں کو ہوتا ہے جو اندر سے خالی ہوں!" جی ایم نے طنز یہ انداز میں میرے موکل کی طرف دیکھا پھر میری جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ "اللہ نے مجھے "میرے کام" کی بھرپور صلاحیت دی ہے۔ اگر نطای صاحب کو واقعی میری ضرورت نہ رہتی تو میں کہیں اور چلا جاتا....." لٹائی توفیق کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر فلسفیانہ انداز میں بولا۔

"پائے گدالنگ نیست، ملک خدا تنگ نیست!" میں نے اس کے فلسفے کو ایک طرف رکھتے ہوئے، انتہائی مختلف موڈ سے سوال کیا۔ "ربانی صاحب! دفتر میں آپ کی آمد و شد کے اوقات کیا تھے؟"

"میں عموماً صبح دس بجے دفتر پہنچ جایا کرتا تھا۔" اس نے جواب دیا۔ "اور چھ بجے آف کرتا تھا۔ نطای صاحب چونکہ اس سے پہلے ہی اٹھ جاتے تھے لہذا چھ کے بعد بیٹھے رہنے کی کوئی تک نہیں بنی تھی۔"

"میری معلومات کے مطابق، وقوعہ کے روز اسد نطای صاحب پانچ بجے دفتر سے رخصت ہو گئے تھے۔" میں نے اس کے پلٹے اور فریہ چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ "اس کا مطلب ہے، آپ اس روز بھی حسب معمول چھ بجے ہی گھر گئے ہوں گے؟"

"جی ہاں..... بالکل، بالکل.....!"
"آپ کا گھر کراچی کے کس علاقے میں واقع ہے؟"
"عمود آباد میں۔"

"مجھے یہ بھی پتا چلا ہے کہ وقوعہ کے روز آپ آٹھ بجے کے قریب اپنے گھر پہنچے تھے۔" میں نے ٹوٹنے والے انداز میں کہا۔ "کبھی کے دفتر سے آپ کے گھر تک کا فاصلہ زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے کا ہے کیونکہ آپ کے پاس اپنی کار ہے۔ اس حساب سے آپ کو ساڑھے چھ بجے یا زیادہ سے زیادہ پونے سات بجے اپنے گھر پہنچ جانا چاہیے تھا۔ کیا آپ کہیں اور سے ہوتے ہوئے گھر آئے تھے جو اتنی دیر لگ گئی.....؟" میں نے ڈر اور کورک کرا ایک گہری سانس خارج کی پھر وارنک بھرے الفاظ میں کہا۔

"ربانی صاحب! ایک بات کو ذہن میں رکھیے گا کہ اگر وقوعہ کے روز آپ گھر جانے سے پہلے کہیں اور بھی گئے تھے تو آپ کو اس وقت کا حساب دینا ہوگا مطلب، یہ ثابت کرنا ہوگا کہ آپ نے وہ وقت کہاں اور کس کے ساتھ گزارا؟"

"میں کہیں..... بھی نہیں گیا۔" وہ ہاتھ کی پٹت سے اپنی پیشانی کو پوچھتے ہوئے بولا۔ میرے استفسار نے اس کے سینے ہلچل اڑا دیے تھے۔ "ایک تو اس دن مجھے ٹریفک بڑا جم ملا تھا۔ پھر گھر اور فرم کے راستے کے درمیان اچانک میری کار خراب ہو گئی۔ آدھا، پونا گھنٹا اس کا مرض کھنکھنے میں لگ گیا تھا۔!"

"وقوعہ کے روز، جب آپ دفتر سے رخصت ہوئے تو اس وقت وہاں اور کون کون موجود تھا؟" میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"اس وقت صرف متول اور طرم ہی وہاں موجود تھے۔" اس نے جواب دیا۔ "اور یہ دونوں ایک ہی کمرے میں رو برو بیٹھے ہوئے تھے۔"

"آپ نے نکلنے وقت ان میں سے، کسی سے کوئی بات کی تھی؟"
"جی نہیں.....!" اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔
میں نے ایک مرتبہ پھر سوالات کا زوہ یہ تبدیل کیا اور

تکبیر انداز میں، استغاثہ کے گواہ کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔
"کیا آپ کا بیک اکاؤنٹ ہے ربانی صاحب؟"
"جی ہاں..... بالکل ہے۔" وہ مضبوط لہجے میں بولا۔
"ایک اکاؤنٹ یا..... ایک سے زیادہ؟"
"صرف ایک!"

"یہ وہی اکاؤنٹ ہے نا جہاں آپ تنکا تنکا جمع کر رہے ہیں! میں نے سننا تے ہوئے انداز میں پوچھا۔
"بگلا خریدنے کے لیے.....؟"

"جی ہاں....." وہ ہچکچاہٹ آمیز انداز میں بولا۔
"اگر میں کوئی غلطی نہیں کر رہا تو آپ کا اکاؤنٹ نمبر یہی ہے نا....." میں نے ڈرامائی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "ون، تھری، فو، فائیو، فور، ڈیش، سیون.....؟"

"جی ہاں....." وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "لیکن آپ کو میرا اکاؤنٹ نمبر کس نے بتایا؟"

"معلومات حاصل کرنے کے میرے اپنے ذرائع ہیں جو میں آپ پر غار نہیں کر سکتا۔" میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ "کیا آپ معزز عدالت کو بتائیں گے کہ آپ کے اکاؤنٹ میں اس وقت کتنی رقم موجود ہے؟"

"آپ کی بخشش پر آمنا....." وہ ایک استغاثہ کو اچانک ہوش آ گیا۔ "میرے فاضل دوست پری سے اتر گئے ہیں۔ یہاں برعدان مرڈر کیس کی ساعت ہو رہی ہے اور موصوف استغاثہ کے معزز گواہ کے اکاؤنٹ کی جانچ پڑتال میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ تو عدالت کے قیمتی وقت کا سراسر زیاں ہے۔ میری عدالت سے درخواست ہے کہ ذہنی طور پر ایسے فضول ہتھکنڈوں سے باز رہنے کی تاکید کی جائے۔"

جج نے بڑی گہری نظر سے مجھے دیکھا اور غصے سے بھرے لہجے میں مستفسر ہوا۔ "بیک صاحب! کیا اس بینک اکوٹری کا زیر ساعت کیس سے کوئی تعلق ہے؟"

"بالکل ہے جناب۔ اور بڑا گہرا تعلق ہے۔" میں نے اپنی فائلوں پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "اور چند لحاظ کے بعد یہ تعلق مکمل کمر سے آنے ہی والا ہے۔"

"آپ جرح جاری رکھیں بیک صاحب.....!" جج نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

میں استغاثہ کے گواہ غلام ربانی کی طرف متوجہ ہو گیا۔
"جی ربانی صاحب! آپ مجھے اپنے بینک بینکس کے بارے میں بتانے والے تھے؟"
"میں انگریز بینک اکاؤنٹ تو نہیں بتا سکتا۔" وہ گھبرائے

ہوئے انداز میں بولا۔ "اس کام کے لیے مجھے بینک سے رجوع کرنا ہوگا۔"

"انگریز بینک گھر کی ضرورت نہیں ہے ربانی صاحب۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "آپ اندازاً بتا دیں، ویسے....." لٹائی توفیق کے بعد میں نے اضافہ کیا۔
"جو شخص کسی خاص مقصد کے لیے رقم جمع کر رہا ہو، اسے جمع شدہ ایک ایک پینا انگلیوں پر یاد ہوتا ہے۔"

اس نے خوں نکل کر اپنے حلق کو تڑپا کر پھر بیٹھے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میرے مطابق اندازے کے مطابق، اس وقت بینک میں ڈیڑھ لاکھ کی رقم جمع ہوگی۔"

"اور یہ رقم آپ بنے تنکا تنکا، قطرہ قطرہ جمع کی ہے.....!" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ "بھئی یک شت کوئی بڑا اکاؤنٹ آپ نے اپنے اکاؤنٹ میں کریڈٹ نہیں کیا.....؟"

"جی نہیں....." وہ گڑبڑا گیا۔
"ایک جواب دیں ربانی صاحب! "میرا انداز جارحانہ ہو گیا۔ "آپ نے اپنے اکاؤنٹ میں بھی کوئی بڑا اکاؤنٹ ڈیپازٹ کیا یا نہیں.....؟"

"بڑے اکاؤنٹ..... سے آپ کی کیا مراد ہے.....؟"
"وہ ایک مرتبہ پھر پینا صاف کرتے ہوئے بولا۔

"(مطلب..... پچاس ہزار یا اس سے زیادہ رقم.....؟)" میں نے پوچھا۔

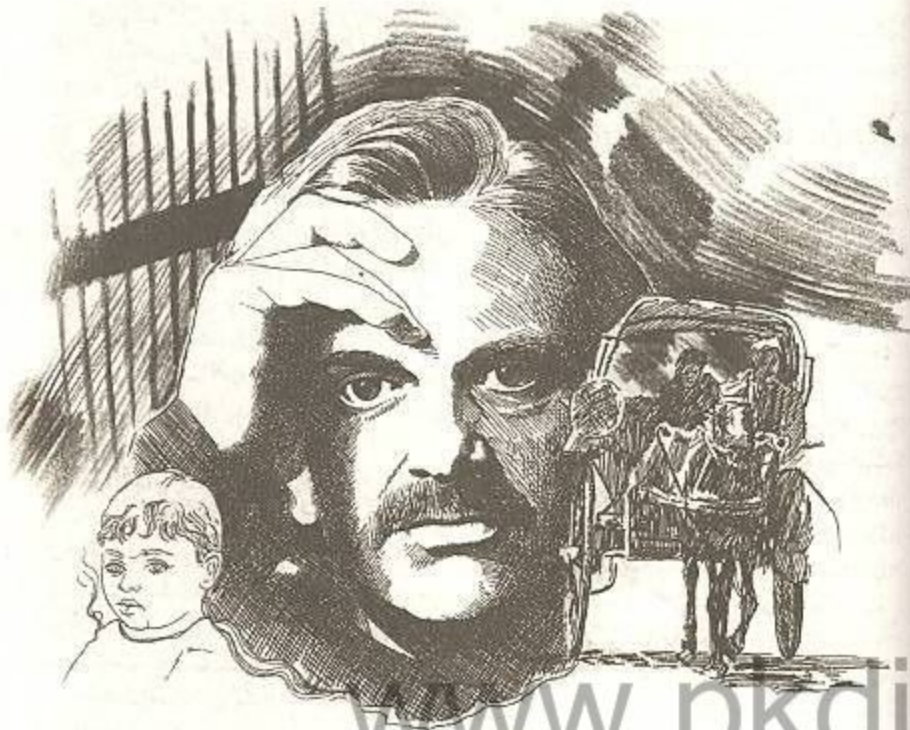
"نہیں.....!" وہ بے حد پریشانی کے عالم میں بولا۔

اس کے انکار نے میرا کام آسان کر دیا۔ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "مسٹر ربانی! انیس اپریل کی صبح آپ کے اکاؤنٹ میں ساڑھے ستر ہزار روپے جمع ہوئے ہیں۔ پچاس ہزار کمیشن اور تین ہزار کا ایک کراس چیک....."

"وہ چیک تو میرے..... ایک دوست..... نے دیا تھا۔!" وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔
"میرا اس دوست کے ساتھ کچھ لین دین تھا۔"

"جنید خان....." میں نے طنز یہ انداز میں کہا۔
"آپ کے اس دوست کا نام جنید خان ہے نا جس نے آپ کو تین ہزار کا کراس چیک دیا تھا.....؟"

"آپ جنید خان کو..... کس طرح جانتے ہیں.....؟"
اس کی حیرت میں خوف بھرا ہوا تھا۔
"میں نہ صرف جنید خان کو اچھی طرح جانتا ہوں بلکہ



گمشدہ

عمیر شاہ

چاہے کوئی انسان ہو یا کوئی قیمتی چیز..... اکثر اوقات پاس رہنے پر ان کی اہمیت کا احساس نہیں ہوتا..... مگر جب اچانک وہ شے دسترس سے دور ہو جائے تو دل خزاں رسیدہ ہونے کے مانند لرز اٹھتا ہے۔ وہ بھی کچھ ایسی ہی صورت حال سے دوچار تھا۔

کوئے ہوئے رستوں اور چروں کے پانے کا عجیب انداز

ابھی ایک دھماکے سے اڑ جائے گی۔ یہ تاگا فضاؤں میں گم ہو جائے گا..... یہ چلے پھرے لوگ اچانک مرجائیں گے۔ یہ سب دکائیں، بلندئیں تباہ کیوں نہیں ہو جائیں۔ اتنی بڑی قیامت ٹوٹنے کے بعد اب تک یہ سب کچھ سلامت کس طرح ہے؟ زلزلہ بار بار صرف میٹیکوسٹیٹ میں ہی آتا ہے۔ تمام رنگ، خوشبو اور ہوا میں ختم ہو جاتی چائیں، قیامت آج ہی برپا ہونا چاہیے۔

”ایک بچہ گم ہو گیا ہے۔ اس کی عمر چار سال ہے۔ گندی رنگ، گھالی پٹری اور سرخ چمیل پہنی ہوئی ہے، جسے ملے سہرائی فرما کر شی پولیس اسٹیشن پہنچا دے اور ہزار روپے انعام پائے۔“
تاگلے کی اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا ایک شخص اعلان کرتا جا رہا تھا۔ تاگا آہستہ آہستہ آگے بڑھتا رہا۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تقریباً تیس برس کا نوجوان سوچوں میں غرق تھا۔ وہ کسی بھی صورت میں نارمل معلوم نہیں ہوتا تھا، وہ سوچ رہا تھا۔ ”یہ بڑا ک

حیر، دو شکار..... ایک کام، دہرا فائدہ..... تم نے ایک کام سے دہرا فائدہ حاصل کر لیا۔ عدنان علی کے قتل سے تمہاری نیجری کی پوسٹ بھی محفوظ ہو گئی اور تمہیں تنکا تنکا نہیں، بلکہ ایک ہی جھڑ پورے پیاس جمع میں کل ملا کر ستر ہزار روپے بھی مل گئے..... کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

یقیناً میں غلط نہیں کہہ رہا تھا لہذا وہ کوئی مدلل جواب نہ دے سکا۔ میں نے اس کی شکست کو یقینی بناتے ہوئے فرار کی تمام راہیں مسدود کر دی تھیں۔ وہ لاکھ ہاتھ پاؤں اور زبان کو حرکت میں لاتا لیکن اس کے لیے کوئی بھی جانے پناہ باقی نہیں بچی تھی۔ میں نے اپنی جرح کے جال میں اسے پھنسا کر بے بس اور بے کس کر دیا تھا۔

جب میرے پیام استفسارات اور مسلسل پوچھتاچھ کے نتیجے میں وہ کوئی بھی معقول جواب نہ دے سکا تو مج نے غلام ربانی کو شامل تفتیش کرنے کے احکام صادر کر دیے۔

آئندہ چشتی پر عدالت نے میرے موکل کی باعزت بری کر دیا۔ کیونکہ غلام ربانی نے عدنان علی کے قتل کا اقبال کر لیا تھا۔ اس نے کچھ اس قسم کا بیان دیا تھا۔

”عدنان کے تیزی سے بڑھتے ہوئے دفتری عمل وغل نے جہاں فیصل کو پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا وہاں میں بھی بے حد فکر مند تھا۔ کیونکہ اسد نظامی ڈھکے چھپے الفاظ میں یہ ارادہ ظاہر کر چکے تھے کہ وہ مستقبل قریب میں عدنان کو نیجری سیٹ پر بیٹھا دلچسپ رہے ہیں۔ چنانچہ ان حالات میں، جب میرے دوست جنید خان نے ایک کام (فیصل کو کسی مصیبت میں ڈالنے کا کام) کی پرکشش آفر دی تو میں فوراً تیار ہو گیا۔ یہ

میرے لیے بہت آسان ثابت ہوا تھا۔ میں نے چند روز تک ایک مخصوص پروپیگنڈا کیا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ فیصل کسی بھی وقت عدنان کو مشیڈ نقصان پہنچا سکتا ہے۔ پھر موقع ملنے ہی میں نے عدنان کا کام اس صفائی سے کر دیا کہ اس کے قتل کے الزام میں فیصل بھائی چڑھ جائے لیکن..... میری بد قسمتی کہ عین وقت پر میرا منہ بے میل ہو گیا.....!“

یہ جو کچھ بھی ہوا تھا اس میں غلام ربانی کی بد قسمتی کا ہاتھ تھا یا فیصل کی خوش قسمتی کا دخل لیکن ایک بات طے تھی کہ اس سارے معاملے میں فیصل کی ”ہمدردی“، پیش پیش روی تھی..... وہ ہمدردی جو اس نے ابتدا میں نورین کے ساتھ کی تھی اور بعد ازاں اشتیاق کے ساتھ۔ اس عمل میں درحقیقت، فیصل کا کوئی قصور نہیں لیکن وہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ..... بعض اوقات ہمدردی بڑی اونٹنی بن جاتی ہے!

(تحریر: حُسام بٹ)

اس کے گرو عامر ملک کو بھی ”ا“ میں نے زہریلے انداز میں کہا۔ ”جواس وقت جیل کاٹ رہا ہے اور جیل کے اندر بیٹھ کر ڈوریاں ہلا رہا ہے، اسی کے ایک ”کام“ کے لیے جنید خان نے ہمیں میں ہزار کا چیک دیا تھا۔ تم نے عامر ملک کا کام سلی آجیو انداز میں کر دیا ہے.....؟“ میں ”آپ“ سے ”تم“ پر آگیا تھا۔

”ملک..... کون..... سا کام.....؟“ وہ ہلکا ہٹ بھرے انداز میں بولا۔ ”مم..... میری تو تھی..... سمجھ میں نہیں آ رہا.....!“

بات ختم کر کے ربانی نے کپڑے کی ریٹنگ کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور گہری گہری سانس لینے لگا۔ ان لحاظ میں وہ دوسرا بعض نظر آ رہا تھا۔

”تمہارے دماغ میں اس وقت ہر شے بڑی آسانی سے بیٹھ جائے گی جب تمہیں ایکوزڈ باکس میں کھڑا کر کے کڑی جرح سے گزارا جائے گا۔“ میں نے درشت انداز میں کہا۔

”جنید خان اور عامر ملک کی سسٹی خیر کہانی بعد میں چھیڑی جائے گی۔ پہلے یہ بتاؤ، بیس ہزار کے چیک کے علاوہ جو پیاس ہزار روپے تمہارے اکاؤنٹ میں، انیس اپریل کی صبح جمع ہوئے وہ کہاں سے آئے تھے.....؟“ میں نے لٹائی تو فٹ

کر کے حاضرین عدالت پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی پھر وکیل استغاثہ کو فخریہ انداز میں دیکھنے کے بعد اپنی بات مکمل کر دی۔

”کیا یہ وہی پیاس ہزار روپے ہیں جو مقتول کی میز کی دراز سے غائب ہوئے تھے؟“

”پپ..... پانی.....!“ وہ بے حد گھبرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”پانی ملے گا..... لیکن میرے سوالات کے جواب کے بعد.....!“ میں نے بڑے ظالمانہ انداز میں کہا۔

غلام ربانی کے چہرے پر زردی کھنڈی۔ منج نے گہری دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

”بیک صاحب! یہ عامر ملک اور جنید خان کا کیا قصہ ہے؟“ میں نے نہایت ہی مختصر مگر جامع انداز میں معزز عدالت کو وہ کہانی سنائی جس کے اہم کرداروں میں فیصل، نورین، اشتیاق اور عامر ملک شامل تھے۔ میں خاموش ہوا تو منج نے کہا۔

”بیک صاحب! پلیز کنٹینیو.....!“

میں وہ بارہ استغاثہ کے گواہ غلام ربانی کی طرف متوجہ ہو گیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”تو اس کو کہتے ہیں..... ایک بیٹھ، دو کاج..... ایک

چہ عادتیں

خلیفہ ہارون رشید نے لوگوں سے کہا کہ ”نیک بننا چاہتے ہو تو بچوں جیسی عادتیں بنالو۔“

خلیفہ ہارون نے کہا کہ بچوں میں 6 ایسی عادتیں ہوتی ہیں اگر بڑے انہیں اپنانے تو سب ولی بن سکتے ہیں۔

(1) رزق کا غم نہیں کرتے۔

(2) مل کر کھاتے ہیں۔

(3) لڑتے ہیں تو دل میں کینہ نہیں رکھتے۔

(4) اپنے بڑوں سے ڈرتے ہیں۔

(5) ذرا سی دھکیلے تو روتے ہیں۔

(6) مستقل دشمنی نہیں کرتے۔

مرسلہ: ذی حادثہ۔

رکھنے کا اشارہ کیا۔

”تمہارے چلو۔“ اس نے بانیے ہوئے رکشے والے کو کہا۔

رکشا مناسب رفتار سے چلتے لگا۔ پہلے تو اس کے دل میں

آیا کہ وہ رکشے والے کو تیز چلنے کا کہے۔ ”شاید پولیس والوں

نے اس کے بیک کو تلاش کر لیا ہو اور وہ معصوم تمہارے میں رو رہا

ہو۔“ اگلے ہی لمحے دوسرے خیال نے سرا بھارا۔ ”تو اہستہ چلنا چاہیے، شاید میرا اشارہ راستے میں کہیں ہو اور

رکشے کی تیز رفتاری کے سبب میں اسے نہ دیکھ سکوں۔“ نہیں،

رکشے کو تیز چلنا چاہیے۔“

وہ کوئی فیصلہ نہیں کر رہا تھا کہ رکشا تمہارے کے سامنے

رک گیا۔ کراہ دے کر وہ جلدی جلدی اندر چلا گیا۔ وہ سیدھا

جا کر بڑے مٹی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ”سامیں! امیرے بچے

کی کوئی خبر ملی؟“ اس نے آس کی کھیل میں امید کا پتھر پھینکا۔

بڑے مٹی نے بڑی مونچھوں کو مڑوڑتے ہوئے سراٹھایا۔

اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی، اس نے کہا۔ ”بیٹھو، بیٹھو،

مبارک ہو۔“

نیکلت گویا تار کی جھنڈی لگی۔ جیسے سورج، چاند، ستارے

اور روشنی کے تمام وسیلے ایک نیک روشن ہو گئے ہوں۔

”میں نے تو تمہارے گھر سیاہی بھی بھیجا تھا تاکہ پہچان کر

اپنا بچہ لے جاؤ، سیاہی تمہارے گھر پہنچا نہیں گیا؟“

”نہیں سامیں، لیکن کہاں ہے وہ۔۔۔۔۔ میرا بچہ کہاں

ہے؟“

”ذرا صبر کرو، وہ رو رہا تھا۔ میں نے اسے اپنے کوارٹر پر

اپنے بچوں کے پاس بھیج دیا ہے۔“ بڑے مٹی نے بتایا پھر اس

کمر گویا ہوش میں آگئی۔ ”ٹریا نے تو بھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اسے مضبوط سہارے بھی کبھی اچانک کمزور ہو سکتے ہیں، آج کے دن بچے کے کم ہو جانے کے بعد ٹریا کے لیے یہ دوسرا بڑا سانحہ تھا۔ ازدواجی زندگی کے چھ برسوں کی مدت میں آج اس نے اپنے شوہر کا بالکل ایک نیا روپ دیکھا تھا۔ ٹوٹا ہوا تاجی کا ایک نیا منظر جس نے اسے روح کی گہرائیوں تک چل کر رکھ دیا تھا۔

دفعتاً ٹریا نے خود کو سنبھالا، وہ اپنا بازو پھیلا کر اسے اپنی آغوش میں لے کر بولی۔ ”تم بھی۔۔۔ تم بھی اس طرح رو رہے ہو؟ پھر میرے بچے کو کون دھوئے گا۔۔۔ مجھے کون سہل دے گا؟“

اس نے چہرہ اٹھا کر اپنی بیوی کی طرف دیکھا پھر اس کے سینے میں منہ چھپا کر بچوں کی طرح سستے لگا۔ بالکل اس طرح جیسے کبھی کبھی اس کا چار سالہ بیٹا ماں کے سینے میں منہ چھپا کر روتا تھا لیکن اب بیوی کے سینے میں چہرہ چھپا کر سستے ہوئے رفتہ رفتہ اس کے حواس بحال ہونے لگے، چند لمحوں کے بعد وہ پیچھا

ہوا چہرہ اٹھا کر بولا۔ ”صبر کرو ٹریا۔۔۔ میں تمہارے شہزادے کو تلاش کر کے لے آؤں گا۔ اسے ضرور لے آؤں گا۔“

ٹریا بھی اور اس کے لیے پانی کا گلاس بھرا لائی، اس نے دو

مٹھنٹ کی کرگاس فرش پر رکھ دیا پھر اپنے وجود کے منتشر حصوں

کو سمیٹ کر اٹھ کھڑا ہوا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ ٹریا

وہ بھی آواز میں دعا میں مانگنے لگی۔

وہ پرامید اور متعاشی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا فٹ

باتھ پر چلا جا رہا تھا۔ سڑک پر گزرتے والے تانگوں اور رکشوں

پر بھی نظر ڈال لیتا تھا۔ اس خیال کے تحت کہ شاید اس کا چاند نظر

آ جائے لیکن اسے ہرست تار کی نظر آ رہی تھی۔ اماں کی رات

کی تار کی۔

اچانک اس کے ذہن پر بے لگام اور منتشر خیالات نے

دوبارہ بغاوت کر دی۔ ”رکشوں کے چار پہیے بھی تو ہو سکتے ہیں اگر

آگے بھی دو پہیے لگے ہوئے ہوں تو کیا فرق پڑ جائے گا؟

سانیکل ایک پیسے پر چلتی چاہیے اگر مہاری ایک پیسے والی سانیکل

چلا سکتا ہے تو دوسرے لوگ بھی چلا سکتے ہیں، ہم سب کو مہاری

ہونا چاہیے۔ ویسے بھی ہم مہاری ہی تو ہیں۔۔۔ ہم اپنا تمام شاخود

ہیں، سامنے والی بلڈنگ کو اگر جڑ سے اکھاڑ کر الٹا رکھ دیا جائے

تو۔۔۔ تو بلڈنگ کے گھونسلوں میں رہنے والے انسان ہاتھوں پر

اٹے چلتے ہوئے خود ہی باہر نکل آئیں گے۔۔۔۔۔ اودھ۔۔۔۔۔

اچانک وہ گھنٹوں کے ٹل سڑک پر آن کر۔۔۔ چلتے چلتے فٹ باتھ

پر کئی تیز سے ٹھوکر لگی تھی۔ قریب سے گزرنے والے لوگ اسے

چپتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ جلدی

سے وہ اٹھ کھڑا ہوا اور قریب سے گزرنے والے خالی رکشے کو

بھول کر حیرت اور خوف سے اعلان سننے لگے۔ ان کے کھلتے ہوئے پھول سے چہرے سر جھامگے۔ وہ سوچنے لگا۔ ”ممکن ہے ان بچوں میں سے کوئی میرے جانی کے ساتھ کھلا ہو۔۔۔ ان معصوموں میں سے کسی نے میرے بچے کے ساتھ قتلکاریاں ماری ہوں۔۔۔۔۔“

دفعتاً اس کے دل میں آیا کہ وہ تانگے سے اتر کر ایک ایک بچے کو چوم لے، انہیں پیار کرے لیکن اس خیال سے وہ باز رہا کہ ممکن ہے بچے اس کے عمل سے ہراساں ہو جائیں۔ وہ خود پر جبر کیے بیٹھا رہا۔ اعلان مکمل ہوا تو تانگہ آگے بڑھنے لگا۔ بچے حیرت اور خوف سے تانگے کو جاتا ہوا دیکھتے رہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ اب وہ اپنا کھیل جاری نہیں رکھ سکیں گے، اسے انسوس ہونے لگا۔ اسے اپنے اندر طوفان سا اٹھتا محسوس ہونے لگا۔

اس کا چار سالہ بچہ آٹھ بجے سے لاپتا تھا، گیارہ بجے اس نے تلاش شروع کی تھی اور دو بجے تمہارے میں جا کر باقاعدہ رپورٹ درج کرادی تھی پھر اس نے شہر بھر میں اعلان کرانا شروع کر دیا تھا۔ اب شام کے سات بج چکے تھے۔ اس دوران میں وہ دوسرے تمہارے جانے کا معلوم کر آیا تھا لیکن بچے کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں ہو سکا تھا۔

اعلان کرنے والے کی آواز بھی اب جواب دینے لگی تھی۔ وہ گردن کھما کر بولا۔ ”بھائی! اللہ سے امید رکھو۔ انتقام اللہ تمہارا پیکل جائے گا۔ ہم نے پورے شہر میں اعلان کر دیا ہے۔“

پھر اس نے تانگے والے کو گھر واپس چلنے کا کہا۔

وہ جیسے ہی اپنے گھر کے سامنے تانگے سے اتر۔ اس کی مایوس نگاہ اپنی بیوی پر پڑی جو دروازے سے لگی باہر جھانک رہی تھی۔ گھر میں داخل ہوتے ہی اس کی بیوی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ ”کہاں ہے میرا بچہ؟ کہاں ہے؟“ تم اکیلے گھر کیوں آئے ہو؟“

وہ ہاتھوں کی طرح چیخنے لگی۔ پہلے تو وہ صبر سے کام لیتا رہا، سینے میں اٹھنے والے دریا کے سامنے بندھنے کی کوشش کرتا رہا لیکن جب دریا میں طوفان اٹھ رہا ہوں تو مضبوط سے مضبوط انسان بھی اپنا ٹھنڈا کھو بیٹھتے ہیں۔ اس کے ضبط کے تمام بندھن ٹوٹ گئے۔ وہ اپنی بیٹھائی پر تھما مار کر زمین پر بیٹھ گیا اور دھڑاں مار مار کر رونے لگا۔ ”میں کیا کروں۔۔۔ کہاں سے لاؤں اپنے جانی کو۔۔۔ کہاں تلاش کروں اسے۔۔۔ میری دنیا تباہ ہو گئی۔“

وہ سسکیوں میں بہتا چلا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے حالات نے اسے مکمل طور پر شکست دے دی ہے۔ اس کی بیوی اس کے قریب بیٹھ گئی لیکن وہ اپنے شوہر کو اس طرح ٹوٹا ہوا دیکھ

وہ اچانک منتشر خیالات سے چونک کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اس کی نگاہوں میں گلابی رنگ انک کر رہ گیا تھا۔ تانگہ کسی نامراد عاشق کی طرح آہستہ آہستہ چلتا رہا۔ اعلان کرنے والا چلتے ہوئے تانگے سے ریڈیو تانگہ نرس کی طرح رنے ہوئے جملے دہراتا رہا۔ ”ایک بچہ کم ہو گیا ہے۔۔۔۔۔“

وہ سوچتا رہا۔ ”میرا بچہ صبح سے گم ہے۔۔۔ اس نے ناشتا بھی کیا ہوگا یا نہیں۔ اس تانگے کا گھوڑا اس قدر آہستہ کیوں چل رہا ہے؟ اس واہیات گھوڑے کو مرنے چاہیے۔ اسے اس مریض گھوڑے کو گولی مار دینی چاہیے، بد بخت سے چلا ہی نہیں جاتا۔ اس نے تو مجھ سے خرچی بھی نہیں لی تھی۔“

تانگہ شہر کے ایک اہم چوراہے پر جا کر رک گیا۔ اعلان کرنے والے کی زبان کا ٹیپ چلنا شروع ہو گیا۔ ”حضرات ایک ضروری اعلان سنئے۔ ایک بچہ کم ہو گیا ہے۔۔۔۔۔“

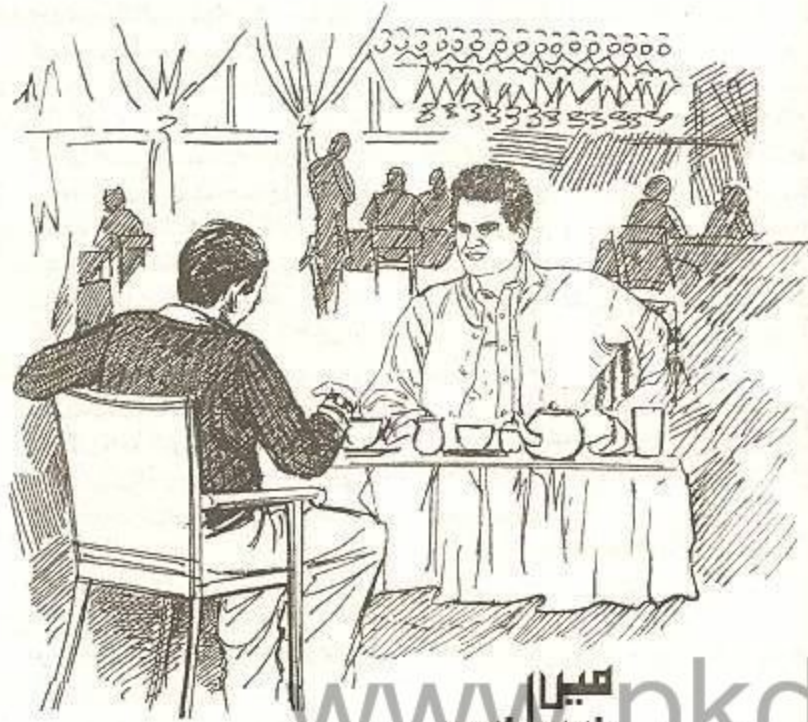
چھپلی سیٹ پر بیٹھا ہوا شخص بار بار چونک کر ادھر ادھر دیکھنے لگتا۔ اس کی آنکھیں چاروں طرف گردش کرنے لگیں۔ دفعتاً اس کی نگاہ گلابی رنگ پر جا کر انک گئی۔ کسی نے گلابی رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھے لیکن وہ گلابی کپڑے کسی چار سالہ بچے نے نہیں تھے جس برس کے نوجوان نے پہنے ہوئے تھے جو سڑک کے کنارے کسی سے باتیں کر رہا تھا۔

تانگے کی چھپلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ ”واہیات آدمی۔۔۔ اسے گلابی رنگ کے کپڑے پہننے کی کیا ضرورت تھی آخر؟“ وہ دانت تیش کر سوچنے لگا۔

”اف۔۔۔۔۔ خدا یا ازلزلہ کیوں نہیں آ جاتا۔ میرے بچے، میرے لعل تم کہاں ہو؟“ اس کے ہونٹوں سے سسکی نکلی۔ اس نے کوئی چیز خلق سے اتارنے کی کوشش کی لیکن اسے محسوس ہوا جیسے کوئی گولا اس کے زخموں میں پھنس کر رہ گیا ہے۔ اس کی آنکھوں سے دو آنسو نکل کر اس کی کودیں گر گئے۔ اس نے گردن جھکا کر دونوں ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ دیے۔

تانگہ دھیرے دھیرے چلتا رہا۔ اعلان مسلسل دہرایا جا رہا تھا، ایک جگہ سڑک کے قریب واقع پارک میں چھوٹے بچے کھیل رہے تھے۔ وہ ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے خوب شور مچا رہے تھے۔ اچانک وہ تانگے والے کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر چیخا۔ ”رکو۔۔۔۔۔ رکو۔۔۔۔۔“ پھر وہ اسی غیر متوازن آواز میں اعلان کرنے والے سے بولا۔ ”ان بچوں کی طرف منہ کر کے اعلان کرو شاید ان بچوں نے میرے بچے کو دیکھا ہو۔“

اعلان کرنے والے نے چہرہ گھما کر اسے گھورا پھر وہ بچوں کی طرف منہ کر کے اعلان کرنے لگا۔ ایک بچے کے گم ہو جانے کا سن کر پارک میں کھیلنے والے معصوم بچے کسم گئے۔ وہ کھیلنا



ہیں نہ سناؤں

منظر امام

اس دنیا میں ہٹ دھرم لوگوں کی کمی نہیں ہے۔ اس کی سرشت میں بھی یہی ایک خوبی بڑی نمایاں تھی جس کی بدولت دنیا جہاں کی دولت اس کے قدموں میں ڈھیر تھی مگر وہ پھر بھی مان کر نہ دیا۔ مگر کیا..... یہی تو ایک مسئلہ تھا جسے کوئی منوانا چاہتا تھا اور وہ ماننے کے لیے تیار نہ تھا

بے جس اور مفاد پرست معاشرے کی ایک ہلکی سی جھلک

وہ ایک مفلوک الحال آدمی تھا۔

میں نے اسے ایک معمولی سے ہوٹل میں چائے پیتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس کی نگاہیں برابر والی میز پر تھیں۔ جہاں کچھ لوگ چائے کے ساتھ بیکٹ اور کیک وغیرہ بھی کھا رہے تھے۔ اس مفلوک الحال کی نگاہیں ان بیکٹوں پر لگی ہوئی تھیں۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ اس کے پاس صرف چائے کے

ہی میے تھے۔

بیکٹ اور کیک وغیرہ کھانے والوں کے درمیان اس بات

بند ہو گیا ہو۔

ایک سپاہی نے اس کے قریب آ کر سرگوشی کی۔ ”انعام کی رقم کہاں ہے؟“

”حاضر سائیں!“ اس نے جیب کی طرف ہاتھ بڑھا کر دے دیا۔

”میں تو وہ پہری سے جیب میں لیے پھر رہا تھا۔“

سپاہی اسے بازو سے پکڑ کر باہر کی طرف لے گیا۔ ”تو یہاں کے پیچھے پیچھے کمرے سے باہر آئی۔“

”انعام پر تو ہمارا حق ہے سائیں!“ سپاہی نے چلتے چلتے کہا۔ ”کیونکہ تمہارے بچے کو اغوا کر لیا گیا تھا۔ ہم نے اسے برآمد کیا ہے۔“

”اغوا کیا گیا تھا؟“ وہ بری طرح چونک گیا۔ اس کے خوشی سے مہکتے ہوئے چہرے پر دوسوں کا جال سا چمک گیا۔ ”لیکن کس نے اغوا کیا تھا میرے بچے کو؟ اور کیوں؟“

”وہ دیکھو۔“ سپاہی نے لاک اپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ ہے وہ منحوس شخص جس نے تمہارا بچہ اغوا کیا تھا۔“

لاک اپ کے فرش پر ایک ادھیڑ عمر... شخص لیٹا ہوا کڑوا رہا تھا۔ وہ دونوں نفرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سلاخوں کے قریب چلے گئے۔ ان دونوں کے پیروں پر نظر پڑنے ہی سلاخوں کے پیچھے قیدی نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ اس کے جسم اور چہرے پر چوڑوں کے بے شمار نشانات تھے، بچے کو ماں کی آغوش میں دیکھ کر قیدی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے پھر وہ اپنے مضروب جسم کو تھمیت کر سلاخوں کے قریب آیا، کافی جدوجہد کے بعد وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکا

پھر وہ گھر اسانس لے کر بولا۔

”بھائی! میں نے آپ کا بچہ دوپہر کے وقت پھاٹک کے پیچھے روٹے ہوئے دیکھا تھا..... میں اسے اپنے ساتھ لے کر بہت بھگتا رہا لیکن اس کے وارثوں کا پتا معلوم نہیں ہو سکا..... آخر کار میں تمہانے میں رپورٹ کرنے کے لیے یہاں پہنچا..... اور اٹا انہوں نے مجھے ہی بند کر دیا۔ ظالموں نے بہت مارا ہے..... آہ.....!“

قیدی ایک لمبے کے لیے خاموش ہوا۔ اس نے پھٹے ہوئے ہونٹ پر زبان پھیری اور شیا کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر شفقت کی چاندنی چمک گئی۔ ”بھن! مبارک ہو..... تمہارا بچہ تمہیں مل گیا..... مم..... میرے بھی چھوٹے چھوٹے بچے ہیں بھن.....!“

✠

نے ہانک لگائی۔ ”اکو..... اڑے ادا کو!“

لمحے بعد کے بعد بول کا جن آن حاضر ہوا۔ ”جی سائیں!“

”اڑے جاؤ، میرے گھر سے بالک کو لے آؤ۔“

”حاضر سائیں!“ بوڑھا سپاہی اکبر جانے لگا تو وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

”تم کہاں جا رہے ہو؟“ بڑے فٹنی نے قدرے تیزی سے کہا۔ ”اتنی جلدی مت کرو پیارے، آرام سے میرے سامنے بیٹھو۔“

سپاہی کے جانے کے بعد وہ بے چینی سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اسے گزرنے والا ہر لمحہ صدی کی طرح پھیلتا ہوا طویل محسوس ہونے لگا۔ گویا کائنات ساکت ہو گئی تھی، اچانک شیا ایک سپاہی کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ آتے ہی کمرے میں چاروں طرف دیکھنے لگی۔ اس کی نظر شوہر پر بھی پڑی لیکن اس نے اسے نظر انداز کر دیا۔

”کہاں ہے میرا شہزادہ؟“ اس کے ہونٹوں سے چیخ سی نکلی۔ وہ ہلکی سی چیخ اپنے اندر صدیوں کا کرب سموئے ہوئے تھی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور بیوی کا بازو تھام کر اسے اپنے قریب

متنچ پر بٹھالیا۔ ”ابھی آ رہا ہے.....“ اس نے شیا کو تسلی دی۔ ”بڑے فٹنی صاحب نے اسے اپنے گھر کھینچ دیا تھا۔ سپاہی اسے لینے گیا ہے۔“

شیا کی آنکھوں میں یکا یک کئی دے روشن ہو گئے۔ ”مجھے معلوم تھا کہ تم بھی یہاں پتا کرنے ضرور آئے ہو گے لیکن جیسے ہی سپاہی پیغام لے کر آیا تو مجھ سے رہا نہیں گیا اور چلی آئی۔“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دونوں کی بے چینی نگاہیں دروازے پر گڑی تھیں۔ اس دروازے پر چہاں سے چند لمحوں کے بعد زندگی کی نئی ہوائیں پھلنے والی تھیں۔ اچانک

سپاہی کمرے میں داخل ہوا۔ ساکت کائنات میں گویا جان پڑ گئی۔ سپاہی کی گود میں ان کی زندگی کی کائنات کا روشن اور جگمگاتا ہوا چاند تھا۔ وہ دونوں بیک وقت اٹھے اور سپاہی کی طرف لپکے، بچہ ماں باپ کو دیکھ کر خوشی سے رونے لگا۔

دونوں کے چار ہاتھ ایک ساتھ بچے سے پٹ گئے۔ دونوں ایک ہی وقت میں اپنے بچے کو گلے سے لگنا چاہتے تھے۔

کچھ دیر کے بعد اس نے بچہ شیا کے حوالے کر دیا، شیا اسے اپنے سینے سے لپٹا کر چومنے لگی۔

”سائیں! آپ کے بڑے احسان ہیں ہم پر.....“ اس نے آنسو پونچھتے ہوئے فٹنی سے کہا۔ کوشش کے باوجود وہ مزید کچھ نہ بول سکا۔ گویا حلق سے نکلنے والے الفاظ کا راست

پر بحث چھڑی ہوئی تھی کہ اس دنیا میں جنوں کا وجود ہے یا نہیں۔ میں نے دیکھا کہ وہ مفلوک الحال ان کی باتوں میں بھی دلچسپی لے رہا تھا اور اس کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ سی مسکراہٹ بھی تھی۔

میں اس مفلوک الحال کے برابر والی خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے اپنی چائے کی پیالی اٹھائی۔ اس کی حالت پر مجھے آنسوؤں ہونے لگا تھا۔ کچھ سوچ کر میں نے اسے مخاطب کیا۔ ”بھائی جان، یہ لوگ کیا بحث کر رہے ہیں۔“ میرا اشارہ برائے میری میز والوں کی طرف تھا۔

”ارے سب بے کاری یا نہیں ہیں۔“ مفلوک الحال نے کہا۔ ”بھلا بتاؤ، اس دور میں جن وغیرہ کہاں ہوتے ہیں۔“

”نہیں بھائی ایسی بات نہیں ہے۔ ہر دور میں ہوتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”میرے پاس ایسی باتوں کو ماننے کا وقت ہی نہیں ہے۔“ ”تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ تم ایک چٹائی کو جھٹلانے کی کوشش کر رہے ہو۔“

”رہنے دو بھائی۔“ اس نے بے زاری سے کہا۔ ”بہت سنی ہیں ایسی باتیں۔ مجھے تو آج تک کوئی دکھائی نہیں دیا۔“

اسی دوران ہیرا آرڈر لیے میرے پاس آ گیا تھا۔ میں نے اس ٹیبل پر آنے سے پہلے اسے چائے اور کیک وغیرہ کا آرڈر دے دیا تھا۔ پھر میں نے اس مفلوک الحال سے کہا۔

”بھائی۔ برائے مانو تو کیک بات کہوں۔“

”ہاں کہو۔“

”میں نے کیک وغیرہ منگوا لیے ہیں۔ تمہیں بھی میرا ساتھ دینا ہوگا۔“

وہ اپنے ہونٹوں پر زبان بھیسے لگا، یعنی وہ بے چارہ واقعی ہجو کا تھا۔ ہیرا مفلوک بہ چیزیں لے آیا تھا اور مجھ سے زیادہ اسی مفلوک الحال نے کھایا تھا۔ کھانے کے دوران ہم ادھر ادھر کی باتیں بھی کرتے رہے تھے۔ ”نام کیا ہے تمہارا؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”شاہد کریم۔“ اس نے بتایا۔ ”اور تمہارا؟“

”فرطوس۔“

”فرطوس؟“ اس نے حیرت سے دہرایا۔ ”یہ کیا نام ہوا۔“

”یہ ایک یونانی نام ہے۔ میرے گپاؤ اجداد یونان سے آئے تھے۔ اس لیے میرے خاندان والوں کو اس قسم کے نام رکھنے کا جنون ہے۔“

”عجب بات ہے۔“ وہ ہنس پڑا۔ ”ویسے نام ہے مزیدار۔“

”تم کرتے کیا ہو۔“ میرا مطلب ہے کیا کام کرتے ہو؟“ میں نے دریافت کیا۔

”کام ہی تو کوئی نہیں ہے میرے پاس۔“ اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”کچھ بھی نہیں ہے، بس دن بھر کام کی تلاش میں رہتا ہوں اور رات ہوئی ہے تو اپنی کوٹھری میں جا کر سو رہتا ہوں۔ آج میری جیب میں صرف دس روپے تھے، جن سے میں نے یہ چائے پی لی ہے، بس اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔“

”تمہاری چائے کے پیے بھی میں دے دوں گا۔“

”ارے نہیں۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”کیوں اتنی مہربانی کر رہے ہو۔“

”اس لیے کہ تم مجھے اچھے لگے ہو۔“ میں نے کہا۔

”بات یہ ہے بھائی کہ میں اس شہر میں اکیلا ہوں، کسی دوست کی تلاش میں بیٹھ کر رہا ہوں۔ تمہیں دیکھا تو دل چاہا کہ تمہیں اپنا دوست بنالوں۔“

”چلو، اس میں کوئی نقصان والی بات نہیں ہے۔“ وہ بے نیازی سے بولا۔ ”تم میرے دوست بن گئے۔“

”تم رہتے کہاں ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”رہتا کہاں ہے۔ بزرگ لاٹن میں ہزار روپے مہینے پر ایک کوٹھری لے رکھی ہے، اسی میں وقت گزارنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔“

”کیا میں تمہارے ساتھ تمہاری کوٹھری تک چل سکتا ہوں۔“

”تم؟“ اس نے پھر حیران ہو کر میری طرف دیکھا۔

”پھر کچھ سوچ کر بولا۔“ چلو تم بھی کیا یاد کرو گے۔“

میں نے پیسے ادا کیے اور اس کے ساتھ اس کوٹھری میں آ گیا جس میں وہ رہا کرتا تھا۔ اس کوٹھری کی حالت خود اسی کی طرح خستہ تھی۔

صرف ایک چار پائی، ایک کونے میں مٹی کے تیل کا ایک چولہا، جس کے ساتھ کچھ برتن۔ ایک کرسی اور ایک چھوٹی سی میز کے علاوہ یہاں اور کچھ نہیں تھا۔ ”بس بھائی فرطوس۔“ اس نے ایک گہری سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ”یہی ہے میری کل کائنات۔ اگر تم کہو تو میں تمہارے لیے چائے بنا دوں۔“

”ضرور بنا دو۔“

”لیکن معاف کرنا۔ یہ چائے ذرا جاپانی اسٹائل کی ہوگی۔“ اس نے بتایا۔

”یہ جاپانی اسٹائل کی چائے کیا ہوتی ہے؟“

”یعنی شمس میں دو دھوا اور شکر وغیرہ نہ ہو۔“ اس نے بتایا۔ ”کیونکہ میرے پاس ایسی عیاشیوں کے لیے پیسے ہی

نہیں ہوتے۔ اس لیے صرف چائے کی پتی خرید لیتا ہوں اور چائے کچھ کراہی کو پتیارہتا ہوں۔“

”کوئی بات نہیں، مجھے بھی ہر قسم کی چائے پینے کی عادت ہے۔“

”پھر تو میں ابھی چائے بنا دیتا ہوں۔“

اس نے چائے بنا دی۔ یہ اس کا حوصلہ تھا کہ وہ ایسی بد مزہ اور کڑی چائے پیا کرتا تھا۔

”یار شاہد تمہیں یاد ہے۔ ہوٹل والے بندے کس بات پر بحث کر رہے تھے۔“ میں نے چائے کی پیالی رکھتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں یاد ہے۔“ اس نے برا سامت بنایا۔ ”وہ بے وقوف اس بات پر اٹھے ہوئے تھے کہ جنوں کا وجود ہے یا نہیں۔“

”تمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے؟“

”مجھے پتہ ہے کہ میں ایسی چیزوں کو نہیں مانتا۔“ اس نے کہا۔ ”میرا اعتقاد ہی نہیں ہے۔“

”اگر میں یہ کہوں کہ میں ایک جن ہوں تو پھر تمہارا کیا ری ایکشن ہوگا؟“

”چائے دے یار، کوئی اور بات کر۔“

”میں سچ کہہ رہا ہوں، میں جن ہوں۔“ میں نے کہا۔

”میں نہیں مانتا بھائی۔ چاہے تم کچھ بھی کہتے رہو۔“

”اچھا تو پھر میں غائب ہو کر دکھاتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ اور اس کی نگاہوں کے سامنے سے غائب ہو گیا۔ وہ منٹ کے بعد میں پھر اس کے سامنے حاضر ہو گیا۔ ”ہاں، اب بتاؤ، اب کیا کہتے ہو۔“

”میں نے کہا کہ میں نہیں مانتا۔“

”کیا؟“ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”تم پاگل تو نہیں ہو؟“

”ارے بھئی، آج کل سائنس کا زمانہ ہے۔“ وہ مسکرا کر بولا۔ ”نیکینالوجی بہت ایڈوانس ہو گئی ہے۔ انسان نہ جانے کیا کیا کرنے لگا ہے، اس لیے تم نے کوئی خاص کارنامہ نہیں کیا ہے۔“

”عجب آدمی تھا، میرے استے واضح ثبوت دینے کے بعد بھی مان کر نہیں دے رہا تھا۔“ اچھا۔ اب اگر میں تمہاری حالت تبدیل کر دوں تو؟“ میں نے پوچھا۔ ”اس وقت تم کیا کہو گے؟“

”وہ ایک دوسری بات ہوگی۔ اس وقت میں سوچوں گا۔“

”تو پھر اپنی آنکھیں بند کر لو اور جب میں کہوں اس وقت کھول دینا۔“

پندرہ منٹ کے بعد میں نے اس سے کہا کہ وہ اپنی

آنکھیں کھول لے۔ اس نے جب آنکھیں کھولیں تو سب کچھ بدل چکا تھا۔ اس کے جسم پر اب ایک مناسب لباس تھا۔ وہ اپنی کوٹھری کے بجائے ایک فلیٹ میں تھا۔ تین کمروں کا ایک خوبصورت سا فلیٹ، جس میں فرنیچر بھی تھا اور ایک ٹی وی بھی، غرضیکہ وہ سب کچھ تھا جو اس قسم کے کسی اپارٹمنٹ میں ہو سکتا ہے۔ وہ بہت حیران ہو کر ہر طرف دیکھ رہا تھا۔ ”یہ میں کہاں آ گیا؟“ اس نے پوچھا۔

”اب یہ فلیٹ تمہارا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اس کا سارا فرنیچر یعنی ہر چیز تمہاری ہے اور تمہارے پاس اتنی رقم بھی ہے کہ تم کوئی چھوٹی موٹی دکان کھول سکو۔“

”اور وہ رقم کہاں ہے؟“

”سامنے والی میز کی دراز میں۔“ میں نے اشارہ کیا۔

”چار لاکھ روپے رکھے ہوئے ہیں۔ جو تمہارا ہے۔“

”تمہارا بہت بہت شکر یہ بھائی۔“

”شکر یہ تو ہے لیکن اب تم کیا کہتے ہو؟“

”بھئی، سچ تو یہ ہے کہ میں اب بھی نہیں مانتا۔“ اس نے کہا۔

”کیا؟“ اس بار تو میرا دماغ ہی بھٹا گیا۔ دل چاہا اس کم بخت کا گلا ہی کھونٹ دوں۔ ”انتا سب کچھ ہونے کے باوجود تمہیں یقین نہیں آ رہا؟“

”نہیں بھائی، میرا مزاج ذرا دوسرا ہے۔“ اس نے کہا۔

”اس قسم کی نیکینالوجی اب عام ہو گئی ہے، اس کے علاوہ بعض شعبے باز بھی اس قسم کا تماشا دکھا دیتے ہیں، کیا کہتے ہیں اسے نظر بندی، کچھ دنوں کے بعد چٹائی سامنے آ جاتی ہے۔“

”لیکن یہ نظر بندی نہیں ہے۔“

”میں نے کہا کہ میں نہیں مانتا۔ ہاں اس کا اثر کچھ دنوں تک قائم رہ جائے تو پھر سوچا جاسکتا ہے۔“

”ٹھیک ہے، اب میں تمہارے پاس دو مہینوں کے بعد آؤں گا۔ اس وقت تک تو نظر بندی باقی نہیں رہے گی نا۔“

”چلو کچھ لیتے ہیں۔“

میں اس شخص کو دل ہی دل میں برا بھلا کہتا ہوا واپس آ گیا۔ کم بخت کی طرح مان کے ہی نہیں دے رہا تھا۔ لیکن دو مہینوں کے بعد تو اسے مان ہی لینا پڑتا۔

میں جب دو مہینوں کے بعد پہنچا تو پتا چلا اس نے اسی محلے میں ایک چھوٹی سی دکان کر لی تھی اور اس کی وہ دکان اچھی خاصی چل رہی تھی۔ اس نے اپنی مدد کے لیے ایک ملازم بھی رکھ لیا تھا۔ میں جب اس کے پاس پہنچا تو اس وقت وہ ایک عورت سے جھگڑا کرنے میں مصروف تھا۔ ”نہیں اماں۔ اب

اس سے زیادہ کم نہیں کر سکتا۔ ایک تو آپ کو ویسے ہی سستا دے رہا ہوں۔“ پھر اس نے میری طرف دیکھا۔ ”ہاں، بھئی، اب تمہیں کیا چاہیے؟“

”تم نے مجھے نہیں پہچانا، میں فرطوس ہوں۔“

”اوہ۔“ وہ ہنس پڑا۔ ”معاف کرنا یار۔ مصروفیت ہی ایسی ہے، تم ایسا کرو، دو گھنٹے بعد ملو، میں دکان بند کر کے تم سے ملتا ہوں۔“

دو گھنٹوں کے بعد جب وہ میرے پاس آیا تو ہم ایک ہوٹل میں چلے گئے۔ اس بار اس نے میرے لیے چائے اور کیک وغیرہ کا آرڈر دیا تھا۔ ”ہاں اب بتاؤ، کام کیسا چل رہا ہے۔“

”اوپر والے کی مہربانی ہے بھائی، سب ٹھیک جا رہا ہے۔“ اس نے کہا۔

”اب تو مان لیا نا کہ یہ نظر بندی نہیں ہے بلکہ میں واقعی جن ہوں۔“

”نہیں بھائی، برا مت مانا۔ مجھے اب بھی یقین نہیں آ رہا۔“ ”کیا بکواس کر رہے ہو؟“ مجھے غصہ آ گیا تھا۔ ”اب کیسا ثبوت چاہیے تمہیں۔“

”دیکھو بھائی، میں ذرا آدمی دوسری قسم کا ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”آسانی سے مطمئن نہیں ہوتا، بلکہ سیکھا ہی نہیں ہے۔“

”ہی تو پوچھ رہا ہوں کہ اب کیسے ثبوت کی ضرورت ہے۔“ ”دیکھ یار، ویسے تو سب ٹھیک چل رہا ہے، لیکن ایک پریشانی بھی ہے، تھوک مارکیٹ سے سودا لینے کے لیے میں خود ہی جاتا ہوں۔ گاڑی وغیرہ کی اتنی دشواری ہوتی ہے کہ بس کچھ مدت پوچھو۔ میں نے پرسوں ایک سوزوکی کی قیمت معلوم کی ہے۔ کم بخت چار لاکھ بتا رہا ہے، اگر کسی طرح وہ سوزوکی آجائے تو پھر میری پریشانی ختم ہو جائے گی۔“

”اس کے بعد تو مان لو گے کہ میں کون ہوں؟“ ”ہاں۔ اس کے بعد میں واقعی پوری سنجیدگی سے غور کروں گا۔“

میں تھلا کر رہ گیا تھا۔ پھر میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ”چلو ٹھیک ہے، اپنی جیب میں دیکھ لو، چار لاکھ روپے رکھے ہوئے ہیں۔“

اس نے اسی وقت اپنی جیب سے نوٹوں کی گڈی نکالی اور تنقیر کرنے لگا۔ تنقیر کرنے کے بعد اس نے شکر یہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ ”بہت بہت شکریہ تم نے میری ایک پرابلم حل کر دی۔“

”تو اب کیا کہتے ہو؟“ ”ابھی نہیں بھائی، ابھی تو سوزوکی چلا کر دیکھ لوں۔“

بغیر زیادہ ہنسنے بعد پتا چلے گا کہ یہ نظر بندی ہے یا کیا ہے۔

”ٹھیک ہے۔“ میں غصے سے بیکار نہ رہا تھا۔ ”میں اب تمہارے پاس بیس دنوں کے بعد ہی آؤں گا۔“

بیس دنوں کے بعد پہنچا تو اس نے سوزوکی بھی خرید لی تھی اور ایک ڈرائیور بھی رکھا ہوا تھا۔ ”یار، تم واقعی بہت زبردست چیز ہو۔“ اس نے کہا۔

”میں چیز نہیں ہوں، جن ہوں۔“ ”یہ تو تم خود کہہ رہے ہو نا، جبکہ میں نہیں مانتا۔“

اب صورت حال میری برداشت سے باہر ہو گئی تھی۔ میں نے جھلا کر اس کا گریبان تھام لیا۔ ”پاکل انسان، اب کیوں نہیں مان رہا؟“

”یار، یہ بھی کوئی زندگی ہے جو میں گزار رہا ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”رات دن محنت کرتے رہو، اس کام میں آج کل بچت ہی کہاں ہوتی ہے۔“

”پھر تو کیا چاہتا ہے؟“ ”ہاں۔ کوئی بڑا سپر اسٹور ہو تو بات ہی اور ہوتی ہے۔ آرام سے کاؤنٹر پر بیٹھے رہو۔ صاف ستھرا ماحول، کئی ملازم کام میں لگے ہوئے ہوں، تحاش کی زندگی، یہ سب ہو تو پھر میں تمہارے بارے میں سوچ سکتا ہوں۔“

”چل، یہ بھی ہو جائے گا۔ اس کے بعد؟“ ”اس کے بعد تو سونے کے لیے بہت ناممکن جائے گا۔“ اس نے کہا۔ ”لیکن ایک بات یاد رکھو، کوئی بڑے سپر اسٹور کا مالک ایسے معمولی سے فلیٹ میں نہیں رہے گا۔ اس کے پاس فلیٹ بھی اچھا ہونا چاہیے اور ظاہر ہے اس کے ساتھ گاڑی بھی اچھی ہوگی۔“

”چل، تو بھی کیا یاد کرے گا، تیری یہ خواہش بھی پوری ہو جائے گی۔“

اس کی یہ دونوں خواہشیں بھی پوری ہو گئیں۔ بہت زبردست سپر اسٹور تھا اس کا۔ جس کا نام بھی اس نے انگریزی میں رکھا تھا۔ ”بارکیز“ اور اس کے پاس ایک شاندار گاڑی بھی آگئی تھی۔

اس بار وہ مجھے دیکھ کر مجھ سے لپٹ ہی پڑا تھا۔ ”یار، کس زبان سے تمہارا شکریہ ادا کروں، تم نے تو میری قسمت ہی بدل دی ہے، میں نے ایسی چیزوں کا صرف تصور ہی کیا تھا۔“

”چلو، اب تو یقین آ گیا نا کہ میں جن ہوں۔“ ”نہیں یار، وہ معاملہ دوسرا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”مجھے اب بھی یقین نہیں آیا ہے۔“

”حق انسان، تجھے یقین دلانے کے لیے کیا میں آسمان سے لنگ جاؤں، زمین بھاڑ دوں، بتا کیا کروں؟“

”مجھے اپنے ایک دوست سے مشورہ کر لینے دو۔“ اس نے کہا۔

”کیوں، وہ کیا کر لے گا؟“ میں نے پوچھا۔ ”وہ بہت عقل مند انسان ہے اور جنوں کے بارے میں اس کی معلومات بہت زبردست ہیں۔“ اس نے بتایا۔

”ٹھیک ہے، تو اس سے مشورہ کر لے، ساری صورت حال بتا دینا اس کو۔“

”ظاہر ہے، اس سے کیا چھپاتا۔“ ”تو پھر میں کب آؤں تمہارے پاس۔“

کم از کم ایک مہینے کے بعد کیونکہ وہ کہیں دور سے پر گیا ہوا ہے۔ اس کی واپسی کے بعد ہی صورت حال واضح ہوئی۔ ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

”ٹھیک ہے، میں ایک مہینے کے بعد آ رہا ہوں۔“ ایک مہینے کے بعد اس کے پاس پہنچا تو اس نے بتایا۔

”ہاں یار، دوست سے ملاقات ہو گئی اور میں نے اس سے مشورہ بھی لے لیا۔“

”کیا کہا اس نے؟“ ”اس نے کہا کہ یہ سب کوئی ایسی بات نہیں ہے، جس کی بنیاد برسرِ کی جو جن مجھ لیا جائے۔ یہ سب تو معمولی کرشمے ہیں، اصل کام تو یہ ہے کہ تم مجھے سرکار میں کوئی عہدہ دلا دو۔“

”میں تمہارا کچھ تحفظ دوں گا۔“ میں بھٹکا تھا۔ ”سب کچھ تمہاری آنکھوں کے سامنے ہے، اس کے باوجود تم مان کر نہیں دے رہے، اب اس سے زیادہ ہٹ جھری اور کیا ہوگی۔“

”تم مجھے کوئی عہدہ دلا دو۔ پھر سوچوں گا۔“ ”اچھا نا خلف انسان، یہ بتا عہدے کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا۔“

”الیکشن آنے والے ہیں، الیکشن میں کامیابی دلا دو۔“ اس نے کہا۔ ”میں آزاد امیدوار بن کر کھڑا ہو جاتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے، تو اپنی یہ حسرت بھی پوری کر لے۔“ اس نے اس بار جو کام بتایا تھا۔ اس میں جن ہونے کے باوجود مجھے اچھی خاصی محنت کرنا پڑی تھی۔ اس کے لیے الیکشن کی مہم چلانا۔ اس کو اس قابل کرنا کہ وہ زوردار تقریریں کر سکے۔ پھر لوگوں کے ذہنوں کو اس طرف راغب کرنا کہ وہ صرف اسی کو ووٹ دیں۔

اس کے لیے اخبار میں خبریں شائع کروانا۔ غرضیکہ اس کی طرف سے مجھے اچھی خاصی محنت کرنی پڑی تھی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ انتہائی شاندار طور پر کامیاب ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے مخالفین کو ہزاروں ووٹوں سے شکست

دی تھی۔ بڑے بڑے جغادری پیکر اکبر رہ گئے تھے کہ آخر یہ کیا ہو گیا کسی کو بھی اس کی کامیابی کی توقع نہیں تھی، لیکن اس نے جیت کر ایک مثال قائم کر دی تھی۔

بہر حال نئی حکومت بنی اور اسے ایک انتہائی اہم وزارت بھی مل گئی۔ یعنی اس کی عہدے والی شرط بھی پوری ہو گئی تھی۔

جب یہ سب ہو چکا تو میں اس کے پاس پہنچ گیا۔ ”ہاں، اب بتاؤ، اب کیا کہتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں یار۔“ وہ اپنا سر کھاتے ہوئے بولا۔ ”یہ ٹھیک ہے کہ میرے ساتھ یہ سب کچھ ہو گیا ہے، لیکن میں تمہیں اب بھی جن تھیں نہیں کر سکتا۔“

”بے وقوف نا لائق، بد معاش، دھوکے باز۔“ میں اس پر برس پڑا تھا۔ ”اب اور کیا کی رہ گئی ہے، کیا چاہتا ہے تو؟“

”ہاں ایک بات ہے۔ اگر تم وہ پوری کر دو تو پھر میں تمہیں جن مان لوں گا۔“

”چل، وہ بات بھی بتا دے۔“ ”تم آئندہ سے اگر میرے سامنے نہ آئے تو پھر میں تمہیں جن مان لوں گا۔“

”کچھ کہہ رہے ہو؟“ ”بالکل سچ!۔“

”ٹھیک ہے، پھر میں کبھی تمہارے سامنے نہیں آؤں گا۔“ اور میں پھر اس کے سامنے نہیں گیا۔ ہو سکتا ہے کہ اب اس نے مجھے جن تسلیم کر لیا ہو، میں نے یہ بات جب اپنے استاد جن کو بتائی تو وہ سر ہینے لگا۔ ”بے وقوف، اس آدمی نے تجھے بے وقوف بنایا ہے کیونکہ یہ اس طرح سے ترقی کرنے والوں کی پرانی پرنکس ہے۔“

”کیا مطلب استاد؟“ ”تو جا کر دیکھ، یہ جو بڑے بڑے صنعت کار، لیڈر سیاست دان ہیں۔ انہوں نے کس طرح ترقی کی ہے، ان سبھوں کے پیچھے کوئی نہ کوئی جن ضرور ہوتا ہے، چاہے وہ ان کا استاد ہو۔ ان کے والدین ہوں، کوئی دوست ہو، بیوی ہو، کوئی بھی ہو اور جب ترقی کر جاتے ہیں تو پھر ”میں نہ مانوں“ بن جاتے ہیں۔ نہیں مانتے کسی کا احسان بلکہ انتہا ہے کہ یہ اپنے خدا کا احسان بھی نہیں مانتے جس نے انہیں زندگی دی، بولنا اور چلنا سکھایا، جب یہ اس کا احسان نہیں مانتے تو پھر تو کس کھیت کی مولیٰ ہے۔ خرد دار آئندہ سے ایسا تجربہ مت کرنا۔ ورنہ ہمیشہ دھجی رہے گا۔“

✽ سعید الظفر صدیقی.....کراچی
یہ جیتی جاتی بستی ہوئی کھنڈر کیے
ہوا بکیر عنی تیرے میرے گھر کیے
جنہیں تھا زعم بہت اسے ہوش و دانش پر
بہکتے رہ گئے وہ لوگ عمر بھر کیے

✽ جنید احمد ملک.....کراچی
کتنی دیر لگائی میں نے بکڑے کام بنانے میں
بیت گئے ہیں کئی زمانے جا کر واپس آنے میں

✽ محمد قاسم.....خوشاب
مجھ میں بے لوث محبت کے سوا کچھ بھی نہیں
تم اگر چاہو تو میری سوچوں کی تلاشی لے لو



✽ مایین فاطمہ.....اوکاڑہ
یہ رکھ رکھاؤ محبت سکھا گئی اس کو
وہ روکھ کر بھی مجھے ہسکرا کے ملتا ہے

✽ مظہر.....قلعہ
مرے قریب جو آیا، وہ ڈوب جائے گا
اٹل رہے ہیں میرے درد کے چناب ابھی

✽ صوبیدار (ر) انوار گلش.....لیہر چھاؤنی
قلم کے ماتھے پہ پھر ابھری ہے اک تازہ شکن
پھر کوئی دنیا میں خونی انقلاب آنے کو ہے

✽ ظہور احمد فاضل.....تونسہ شریف
یا سکون امن کو ڈس لے گی ناگن، ظلم کی
یا کہ پھر انسانیت پر اک شباب آنے کو ہے

✽ ظفر عباس زیدی.....بھوآنہ
ہمارے پیار کی دنیا مثال دینے لگی
یہ خوف ہے کہ جہاں کی اسے نظر نہ لگے

✽ زائد نے اس خیال سے بیچ ہی توڑ دی
کیا گن گن کے اس کا نام لوں جو بے حساب دے

✽ چوہدری مقبول احمد.....مختہ جٹاں والا
کبھی ہوئی تھی تیرے لیے جس دل میں محبت
دل آج بھی وہی ہے مگر پہلے جیسی وفا نہیں

✽ حسین عباس بلوچ.....ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
پیاروہ اور میرے دل میں بڑھا دیتا ہے
بھی روتا ہے کبھی مجھ کو کڑا دیتا ہے

✽ عبداللطیف شام.....مرشد آباد پشاور
وہ میرا چاند میری آنکھوں سے اوجھل ہو کر
اک ستارہ میری آنکھوں میں سجا دیتا ہے

✽ ایم افضل انصاری.....ڈنگہ شہر
اس شخص کے چہرے کی اداسی کو تو دیکھو
لگتا ہے کہ مدت سے وہ رویا ہی نہیں ہے

✽ ایم افضل انصاری.....ڈنگہ شہر
لے نہ تجھے رکھ زندگی میں
پھول کی طرح تو مہنگے خدا کرے

✽ اشفاق شاہین.....کھارادرہ کراچی
زعمہ رہے نام ابد تک تیرا
عید کی خوشیاں مبارک تجھے خدا کرے

✽ اشفاق شاہین.....کھارادرہ کراچی
ہماری رات کے جنگل میں آگ پھیلی ہے
بجھا نہ پاؤ تو جلنے کا حوصلہ رکھنا

✽ رقیہ تنویر.....کراچی

اس سمندر میں طوفان بڑے آتے ہیں
اس کے ساحل پہ گھر بنانے کی ضد نہ کر

✽ عبدالغفور خان خٹک.....چھب ضلع ایک
بے وفا کہنے کی جرأت بھی نہ کرنا اس کو جی
اس نے اقرار کیا کب تھا مسکراہ کیا

✽ کرن ایوب.....نارتھ کراچی
مدتوں کے بعد تم نے رخ کیا اس کی طرف
کیا یہی تھا آئینے کے ٹوٹ جانے کا سبب

✽ جعفر حسین.....ضلع چنیوٹ
وہ بھی کیا عجیب شخص تھا کہ جس کی ذات پر محسن
جب اعتبار بڑھ گیا تو اختیار نہ رہا

✽ شبیر ناقد.....ڈیرہ غازی خان
تو ہی میری زندگی کا راز ہے
تو ہی میری بے خودی کا ساز ہے

✽ محمد عقیل چھٹہ.....حافظ آباد
تو میری دھڑکن مری آواز ہے
تو میری روح ناقد میری جاں

✽ محمد عقیل چھٹہ.....حافظ آباد
وہی اصل مکان و لامکان ہے
مکان کیا شے ہے؟ انداز بیاں ہے

✽ محمد عقیل چھٹہ.....حافظ آباد
خضر کیوں کر بتائے، کیا بتائے
اگر مایہ کہے دریا کہاں ہے

✽ محمد عقیل چھٹہ.....حافظ آباد
اب تو کچھ غیر سا لگنے لگا تیرا غم بھی
دیکھ مایوس ہوئے جاتے ہیں کتنے ہم بھی

✽ لبنی کنول.....دادو
دھردیاں، خلوص، دلا سے، تسلیاں
دل ٹوٹنے کے بعد تماشے بہت ہوئے

✽ چنگیز اسلم کوندل.....ڈسٹرکٹ جیل، منڈی بہاؤ الدین
وہ آنکھیں دیواریں کتنی ریتی ہیں
ان آنکھوں میں شاید کوئی قصہ ہے

✽ محمد اشفاق سیال.....شورکوٹ شی
اس کے ہاتھوں سے جو خوشبوئے حنا آتی ہے
ایسا لگتا ہے کہ جنت سے ہوا آتی ہے

✽ جمیل سکسٹرز.....منڈی صادق بئج
جس بڑھ جائے تو بینائی چلی جاتی ہے

کھڑکیاں کھول کے رکھ تازہ ہوا آنے دے
تیرے روکے سے وہ بد عہد کہاں رکتا ہے؟

✽ محمد احمد.....ملتان
پاؤں چھونے سے تو بہتر ہے اسے جانے دے

✽ محمد احمد.....ملتان
زعمی اور طرح اب تو گزاری جائے
عشق کی جیت کے بازی کوئی ہاری جائے

✽ اطہر حسین.....کراچی
تجھ کو پا کر بھول گئے ہیں اسنے آپ کا کونا بھی
اب کیا اپنا ہونا بھی اور کیا نہ ہونا بھی

✽ محمد فائز.....اردو بازار، کراچی
نہیں ہی جب خواب ہوئی ہوں کیسے دن اور کبھی رات
کروٹ کروٹ آگ لگے ہے اپنا نرم پھونکا بھی

✽ محمد فائز.....اردو بازار، کراچی
تجھ کو پا کر بھول گئے ہیں اسنے آپ کا کونا بھی
اب کیا اپنا ہونا بھی اور کیا نہ ہونا بھی

✽ علیہ رزاق.....لاہور
جو دن ڈھلا تو گرا شام کے اندھروں میں
پس سحر جو کڑی دھوپ کا مسافر تھا

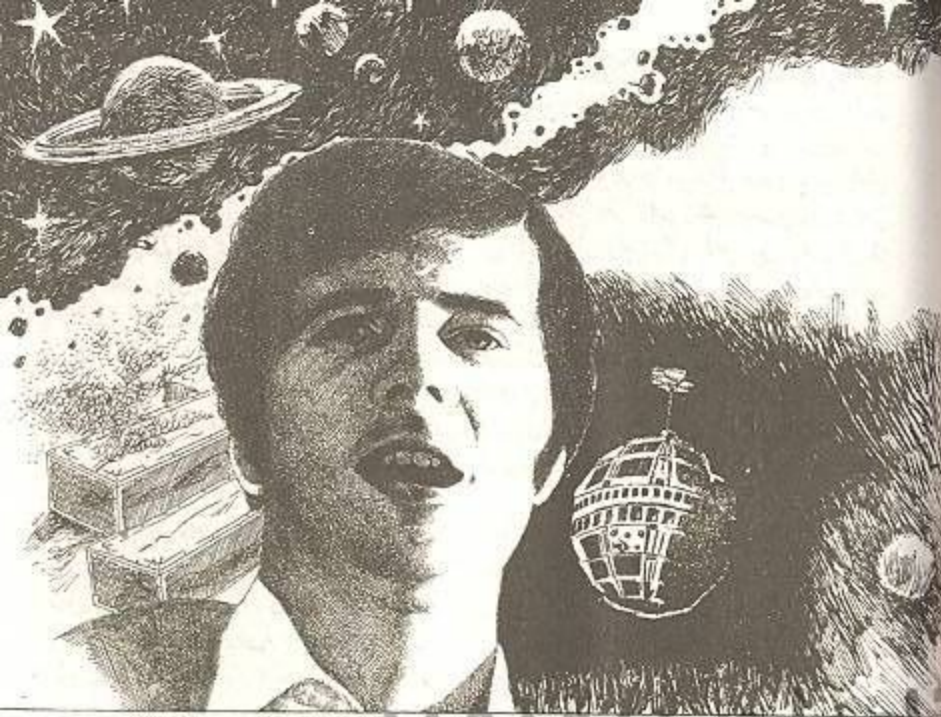
✽ علیہ رزاق.....لاہور
پس سحر جو کڑی دھوپ کا مسافر تھا
پس سحر جو کڑی دھوپ کا مسافر تھا

✽ علیہ رزاق.....لاہور
پس سحر جو کڑی دھوپ کا مسافر تھا
پس سحر جو کڑی دھوپ کا مسافر تھا

✽ علیہ رزاق.....لاہور
پس سحر جو کڑی دھوپ کا مسافر تھا
پس سحر جو کڑی دھوپ کا مسافر تھا

✽ علیہ رزاق.....لاہور
پس سحر جو کڑی دھوپ کا مسافر تھا
پس سحر جو کڑی دھوپ کا مسافر تھا

✽ علیہ رزاق.....لاہور
پس سحر جو کڑی دھوپ کا مسافر تھا
پس سحر جو کڑی دھوپ کا مسافر تھا



در انداز

مریم کے خاتم

سائنسی تحقیق کے مطابق اس دنیا کے علاوہ اور بھی بے شمار سیارے آباد ہیں۔ جہاں زندگی کے آثار پائے جاتے ہیں۔ وہ بھی ایک ایسے ہی سیارے میں جاہلچہ تھے جہاں مخلوق نہ زندوں میں شمار ہوتی تھی اور نہ مردوں میں۔ جو مر چکے تھے مگر پھر بھی زندگی سے بھرپور تھے۔ ان کے جسم جراثیموں کا گڑھ تھے لیکن وہ ہر لحاظ سے صحت مند دکھائی دیتے تھے۔ اور پھر ایک لمحہ وہ آیا جب لڑخ خیز حالات میں اسے ایک طویل خاموشی اختیار کرنا پڑی۔ اتنی طویل کہ اس پر مردنی چھا گئی مگر۔۔۔ وہ پھر بھی زندہ تھا۔۔۔ پس اسی بات نے ہمازی دنیا کے کرتا دھرتانوں کو حیرت میں مبتلا کر ڈالا۔

دوسریں میں تحلیل ہونے والی مخلوق کے شہر کر دینے والے واقعات

جاتی ہے اور اس دوران میں اسے کھانے پینے کی حاجت نہیں رہتی ہے۔ دور دراز جانے والے خلائی مشن جوسالوں پر محیط ہوتے ہیں ان کے خلا باز اپنے طویل سفر کے دوران میں منزل مقصود پہنچنے تک کا وقت سو گز گزاتے ہیں۔ اس فیند کی وجہ سے ان کا جسم طویل عمر سے خلا میں رہنے کے باوجود ناکارہ نہیں ہوتا۔۔۔ کیونکہ کائنات کے بغیر انسان کا جسم تیزی سے

جیمس مارش عالمی اسپیس ایجنسی کے بورڈ کے سامنے بیٹھا تھا۔ ایک ہفت پہلے نظام شمسی کی سرحدوں پر گشت کرنے والے ایک جنگی خلائی جہاز نے ایک چھوٹے سے خلائی جہاز کو آوارہ پا کر اسے چپک کیا تو اس میں جیمس مارش سوتا ہوا پایا گیا تھا۔ وہ خاص ہائی بریٹ چہر میں سورا تھا جس میں لینے والے پر ایک مخصوص مدت کے لیے نیند طاری ہو

☆ شاہدہ ریاض..... اسلام آباد
دل تو کہتا ہے کہ یوں وقت کو زنجیر کریں
خواب بھی لوح مکافات پہ تحریر کریں
لے کے اے درد تجھے آتو گئے ہم دل تک
اب بھلا اور کہاں تک تری توقیر کریں
☆ ثلیل الرحمان عوام یار..... بہاولنگر
اپنوں نے وہ رنج دیے ہیں، بیگانے یاد آتے ہیں
دیکھ کے اس ہستی کی حالت ویرانے یاد آتے ہیں
☆ ملک محمد انور..... جی ٹی روڈ واہ کینٹ
کسی سے حال دل زار مت کہو سائیں
یہ وقت جیسے بھی گزرے گزار لو سائیں
☆ تحریم کاکھی..... لائڈھی کراچی
کیا ہے عشق تو شکوہ نہ کر زمانے کا
بیاں ہوا تو عیا حسن اس فسانے کا
☆ امتیاز خان خشک..... ضلع انک
درخت سوکھ گئے رک گئے ندی نالے
یہ کس مگر کو روانہ ہوئے گھر والے
کہانیاں جو سناتے تھے عہد رفت کی
نشان وہ گردش ایام نے مٹا ڈالے
☆ محمد عرفان بکھوہ..... جتوئی
مجھے تیرے تغافل نے وہاں پہنچا دیا آخر
جہاں اب تیری نظر بھی بہ آسانی نہیں جاتی
☆ ڈاکٹر عدنان ناصر..... ڈسٹرکٹ جیل رحیم یار خان
مجھے اتنا نہ یاد آؤ میں خود کو تم سمجھ بیٹھوں
مجھے احساس رہنے دو مری اپنی بھی ہستی کا
☆ ثانیہ زیدی..... گجراتوالہ
دن بھر سورج کے ڈر سے گلیوں میں چھپ رہتے ہیں
شام آتے ہی آنکھوں میں وہ رنگ پرانے آجاتے ہیں
جن لوگوں نے ان کی طلب میں صحرائوں کی جھول اڑائی
اب یہ جس ان کی قبروں پر پھول چڑھانے آجاتے ہیں
☆☆☆

☆ عدیل افروز..... کراچی
جد سے سگزر کے عشق کیا ٹوٹ کر وفا
دیکھو تو اک جنون میں کیا کیا نہیں کیا
☆ محمد صادق..... نیوکراچی
میں دے رہا ہوں کب سے کڑے امتحان دیکھ
پھر بھی ہے زندگی پہ مرا کتنا مان دیکھ
☆ عامر ثار..... لاہور
کسی نے رکھ دیا تھا دل بساط پر لاکر
یونہی نہیں دل و جاں ہار کر گئے ہم لوگ
☆ عذرا صنوبر..... جہلم
غربت میں کیا بتائیں گزری ہے کس طرح سے
دن تھا بہت ہی ظالم ہاں رات مہریاں تھی
☆ اہیہ اکرم..... میرپور خاص
یوں تو قدم قدم پر تھی گردش زمانہ
اک بے زباں محبت بھی اپنے درمیاں تھی
☆ محمد حفیظ طاہر..... شورکوٹ
اسے زہریلی خوشبوؤں کے رنکس ہار دیتا ہوں
میں جس سے پیار کرتا ہوں اسی کو مار دیتا ہوں
☆ احمد رضا..... شارع فیصل کراچی
میلے ہے یہ گاؤں کا، سب ڈھول بجانے آؤ
وہی خوں کی موجوں کو طوفان بنانے آؤ
☆ بنین اصغر..... کورنگی کراچی
لاکھوں شکلوں کے میلے میں تجا رہنا میرا کام
بھیس بدل کر دیکھتے رہنا تیز ہواؤں کا کہرام
☆ اختر روجیل..... ملتان
”اپنے گھر کو واپس جاؤ“ رو رو کر سمجھاتا ہے
جہاں بھی جاؤں میرا سایہ پیچھے پیچھے آتا ہے
☆ اسلم اقبال..... گلشن اقبال کراچی
شور کرتے، گونجتے، ٹھنکھنکھ کالے بادلو!
لاؤ اس بھولے سے کی دل جلائی شام

محفل شعروسیخت

کوین
برائے
شمارہ
اکتوبر
2010

نام :
پتا :

کمزور ہونے لگتا ہے۔

چھان بین کے بعد پتا چلا کہ جیسے دو سال پہلے لگی وے کیکشاس کے ایک بازو میں بھیجی جانے والی خلائی ٹیم کا حصہ تھا۔ رواں کی ایک سال بعد جب اس ٹیم کے خلا باز اپنی منزل پر پہنچ کر جاگے اور انہوں نے ایک سیارے کا جائزہ لیتا شروع کیا تو اس کے بعد زمین سے ان کا رابطہ منقطع ہو گیا اور جب دوبارہ رابطہ بحال نہیں ہوا تو اس خلائی مشن کو نام فزنی کر لیا گیا تھا۔ اس ٹیم کے مشن جو نظام شمسی سے بہت دور جاتے تھے انہیں بہت زیادہ خطرات رہتے تھے اور عام طور سے ایسے مشن چالیس فی صد ہی کامیاب رہتے تھے۔

تیس سال پہلے لیا گیا تھا۔ اس نے جو ابتدائی بیان دیا، اس کے مطابق ان کے خلائی جہاز پر پراسرار قسم کی مخلوق نے حملہ کیا تھا۔ اس کا بیان تفصیلی نہیں تھا اور پھر جتنی خلائی جہاز میں کوئی ایسا ماہر نہیں تھا جو اس کی بات سمجھ سکتا۔ انہوں نے اسے زمین کی طرف روانہ کر دیا۔ جہاں تک وہ تو جیس کے جسمانی اور ذہنی معائنے میں گزر گئے تھے۔ ڈاکٹروں نے ذہنی اور جسمانی لحاظ سے اسے فٹ قرار دیا تھا۔ تب اس سے انٹرویو کے لیے عالمی خلائی ایجنسی کا ایک بورڈ تشکیل دیا گیا جو اس سے سوالات کر کے اس سارے معاملے کی چھان بین کر رہا تھا۔ وہ جس مہم کا حصہ تھا اس میں تیس افراد شریک تھے اور وہ واحد فرد تھا جو ندرت پر کراہیں آیا تھا۔

بورڈ تین افراد پر مشتمل تھا۔ ٹیٹو جو بورڈ کا سربراہ تھا اور اس کے دو نائب بیٹ شیری اور مائیکل سلٹنی۔ ٹیٹو ذات خود خلا باز کپتان رہ چکا تھا۔ بیٹ نفسیاتی تجربے کی ماہر تھی اور مائیکل کائنات میں پائی جانے والی دوسری مخلوقات کا ماہر تھا۔ اپنی آمد کے ایک ہفتے بعد تیس ان کے سامنے موجود تھا۔

”مسٹر جیس۔“ ٹیٹو نے انٹرویو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ”کیا تم بتانا پسند کرو گے کہ تم اور تمہارے ساتھیوں کے ساتھ کیا ہوا تھا؟“

”جی ضرور۔۔۔۔۔ لیکن یہ ایک طویل داستان ہے کیا معزز ارکان کے پاس اتنا وقت ہے؟“

”تم فکر مت کرو۔“ ٹیٹو نے جواب دیا۔ ”یہ بورڈ اسی کام کے لیے تشکیل دیا گیا ہے۔“

”ٹھیک ہے جناب۔“ جیس نے گہری سانس لی۔ ”میری کوشش ہوگی کہ کوئی بات نہ نہ جائے۔“

☆☆☆

لگی وے کے بعید ترین بازو کی طرف جانے والی یہ اولین مہم تھی۔ اس سے پہلے اتنے طویل فاصلے پر زمین سے

کوئی خلائی مہم نہیں بھیجی گئی تھی۔ اس مقصد کے لیے ایک بہت بڑا خلائی جہاز بنایا گیا تھا جو طویل سفر کی ضرورت کو برداشت کر سکتا تھا اور اس میں تمام ضروری آلات موجود تھے۔ علمہ تیس افراد پر مشتمل تھا اور اس خلائی جہاز کا کپتان میخائل ایوری تھا۔ جیس کا تھوڑا فیئر تھا یعنی اس خلائی جہاز میں اس کی حیثیت تیسرے نمبر پر تھی۔ جیس چیف پائلٹ بھی تھا اور خلائی جہاز اڑانا اس کی ذمہ داری تھی۔ کیونکہ یہ ایک طویل مہم تھی اور انہیں منزل مقصود پر پہنچنے میں ایک سال کا عرصہ لگ جاتا۔ اسی لیے نظام شمسی سے باہر آنے کے بعد وہ خلائی جہاز کو اس کے راستے پر آٹو پائلٹ کرنے کے بعد وہ سب ہائی برینٹ چمبرز میں لیٹ کر سو گئے۔ ایک سال بعد خلائی جہاز کا کمپیوٹر ان کو خود پہنچا دیتا۔

خلائی جہاز برق رفتاری سے بھی زیادہ رفتار سے سفر کرتا رہا اور ایک سال بعد اس مقام پر پہنچ گیا جس کا ان لوگوں کو جائزہ لینا تھا۔ مخصوص مدت پوری ہوتے ہی کمپیوٹر نے ہائی برینٹ چمبرز کھول دیے اور وہ جاگ گئے۔ جیس کو اگرچہ پہلے ہی ہائی برینٹ نیند کا تجربہ ہو چکا تھا لیکن اتنی طویل مدت کے لیے وہ پہلی بار سو رہا تھا۔ اس کی آنکھ کھلی تو اس کا خیال تھا کہ وہ بہت مشکل سے حرکت کر سکے گا لیکن جب وہ اٹھا تو اسے لگا جیسے وہ محض رات بھر کی بہترین نیند کے بعد تروتازہ اٹھا ہے۔ اسے اپنے جسم اور صحت میں کوئی کمی نہیں لگ رہی تھی۔ ایسا ہی اس کے ساتھی بھی محسوس کر رہے تھے۔

انہوں نے اپنی وردیاں پہنیں اور سب سے پہلے کھانے کے کمرے میں پہنچے۔ کھانے کی میز پر ایوری نے انہیں بتایا کہ اس مقام پر بے شمار ایسے سیارے ہیں جو ساز و اور ماحول کے لحاظ سے زمین جیسے ہیں۔ انہیں ان سیاروں کا سروے کرنا تھا اور اندازہ لگانا تھا کہ مستقبل میں اگر انسان یہاں آباد ہونا چاہے تو اس کے کیا امکانات ہیں۔ یہاں ایک ایسا سورج تھا جس کے مدار میں زمین جیسے دہنوں سیارے تھے۔ انہیں ان سیاروں کا بھی جائزہ لینا تھا۔

کھانے کے بعد وہ کپتان برج میں آئے یعنی وہ ہال جہاں سے اس سارے خلائی جہاز کو کنٹرول کیا جاتا تھا۔ انہوں نے کمپیوٹر سے کمانڈر کے اس علاقے کا جائزہ لینا شروع کیا۔ کمپیوٹر نے از خود اس نظام شمسی میں آنے والے اولین سیارے کے گرد خلائی جہاز کا مدار قائم کر لیا تھا۔ اعداد و شمار سے پتا چل رہا تھا کہ یہ ٹھوس سیارہ تھا۔ اس کا سائز زمین سے معمولی سا بڑا تھا اور سطح کا درجہ حرارت صفر سے ذرا اوپر تھا۔ ہوا میں آکسیجن کا تناسب بھی زمین سے ذرا زیادہ تھا اور

امکان یہ تھا کہ انہیں اس کی ہوا میں سانس لینے میں دشواری پیش نہیں آئے گی۔ ابھی یہ اندازہ لگنا دشوار تھا کہ سیارے پر زندگی کی کوئی قسم موجود ہے یا نہیں۔ خلائی مہمات کے آغاز سے کئی ایسے سیارے دریافت ہو چکے تھے جہاں زندگی مختلف صورتوں میں پائی جاتی تھی لیکن ان کی نوعیت زمین کے جانوروں جیسی تھی۔ ان میں کوئی ذہین مخلوق نہیں تھی۔ اب تک انسان اپنے جیسی ذہین مخلوق تلاش نہیں کر سکا تھا۔

اس نظام شمسی میں مہم بھیجے کا مقصد بھی یہی تھا کہ یہاں انسان جیسی کسی ذہین اور عقلی صلاحیت رکھنے والی مخلوق کا پتا چلا جا سکے۔ اس کام کے لیے ان کے پاس صرف دو مہینے کا وقت تھا۔ دو مہینے میں انہیں اپنا کام مکمل کر کے واپسی کا سفر شروع کرنا تھا جس میں مزید ایک سال لگ جاتا۔ انہیں کل تین سیاروں پر تحقیق کرنا تھی۔ اس میں سے ایک سیارہ یہ بھی تھا۔ جیس ایوری کی ہدایت کے مطابق خلائی جہاز کو موزوں مدار میں لانے لگا۔ سیارے کو چاروں طرف سے گھرے بادلوں نے گھیر رکھا تھا جس کی وجہ سے اس کی سطح نظر نہیں آ رہی تھی۔ لیکن ان کے پاس معلومات حاصل کرنے کے اور بھی طریقے تھے۔ انہوں نے طے کیا کہ پہلا مشن سیارے کے خطا استوا پر اتر جائے گا۔

فیصلہ ہوتا ہی اس پر عمل درآمد کی تیاری کی جانے لگی۔ خلائی جہاز پر ایک درجن سے زیادہ چھوٹی خلائی مشینیں جو کسی بھی سیارے پر اترنے کی صلاحیت رکھتی تھیں۔ جیس جانے والی پہلی ٹیم کا سربراہ تھا اور اس کے ساتھ پانچ افراد اور تھے۔ جیس کا کام اصل میں مشن کو پائلٹ کرنا تھا وہ اس کام کا ماہر تھا۔ کیونکہ انہیں سیاروں پر لینڈنگ کسی بھی خلائی سفر کا مشکل ترین مرحلہ ہوتا ہے اس لیے جیس ہی پائلٹ کرتا۔ اس کے علاوہ سینکڑا فیئر ریلے اور پارک بھی مشن اڑا سکتے تھے لیکن انہیں جیس جیسی مہارت حاصل نہیں تھی۔

وہ سب ساز و سامان کے ساتھ تیار ہو کر مشن میں آگئے جو خلائی جہاز سے الگ ہو کر سیارے کی طرف روانہ ہو گئی۔ ان کے پاس تحقیق کرنے والے سارے آلات تھے لیکن وہ سب ہتھیاروں کے استعمال کے بھی ماہر تھے اور ان کے پاس کسی بھی صورت حال سے نمٹنے کے لیے تمام ہتھیار موجود تھے۔ انہیں پتا نہیں تھا کہ سیارے پر انہیں کس قسم کے خطرات سے واسطہ پڑے گا۔ بیس منٹ بعد وہ سیارے کی سطح کے قریب تھے جہاں اس وقت آمدنی جیسی ہوا نہیں چل رہی تھی۔ مگر یہ بہت تیز نہیں تھی۔ جیس نے ایک ہموار میدان دیکھ کر اس میں مشن اتار لی۔ مشن کسی نیلی کا چٹری طرح لینڈ ہو

خوشی

”جیم آخر کیوں تم روزانہ کسی نہ کسی فقیر کو کھانا کھانے کے لیے دروازے پر بٹھا رہی ہو؟“

”میں اس بات کی خوشی محسوس کرتا چاہتی ہوں کہ دنیا میں کوئی آدمی ایسا بھی ہے جو میرے پکائے ہوئے کھانے کو نقص لگائے بغیر خاموشی سے کھا لیتا ہے۔“

ایم افضل انصاری..... ڈنگہ شہر

کتنی تھی۔ سامنے والے شیشے سے باہر گرد آلود ہوا نہیں چل رہی تھی۔ انہیں آکسیجن کی ضرورت نہیں تھی پھر بھی احتیاطاً انہوں نے ماسک لگا لیے تھے۔ جیس نے مشن کا دروازہ کھولا اور اس کے پانچوں ساتھی نیچے اتر گئے تھے جیس کا رابطہ اوپر خلائی جہاز سے تھا اور باہر جانے والے ساتھیوں سے بھی تھا۔ ”یہاں ہوا نہیں بہت تیز ہیں۔“ ایک کارکن جولیو نے کہا۔ وہ باہر جانے والی ٹیم کا سربراہ تھا۔ ہواؤں کا شور اس کی آواز میں شامل تھا۔

”کیا کسی قسم کی کوئی مصنوعی تنصیب نظر آ رہی ہے؟“ جیس نے پوچھا۔

”نہیں ہر طرف قطری میدان ہے۔“ جولیو نے جواب دیا۔ ”سامنے ایک چھوٹی سی پہاڑی نظر آ رہی ہیں۔ ہم اس طرف جا رہے ہیں۔“

تیس کو وہ کیمروں میں واضح نظر نہیں آ رہے تھے۔ گرد آلود ہواؤں اور بادلوں کی وجہ سے ماحول نیم تاریک تھا اور حد نگاہ محدود تھی۔ جیس نے انہیں حکم دیا۔ ”کوئی ایک دوسرے سے اتنا دور نہ جائے کہ وہ نظروں سے اوجھل ہو جائے۔“

”ہم خیال رکھیں گے۔“ جولیو نے جواب دیا۔ وہ اور اس کے ساتھی پہاڑی کی طرف روانہ ہو گئے۔ کچھ دیر میں وہ مشن کے کیمروں کی حد سے نکل گئے تھے۔ البتہ ان کے لباس میں لگے کیمرے سے ان کے آس پاس کا ماحول کسی قدر دکھائی دے رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ زمین پر کسی صحرائی خطے میں ہوں۔ باہر درجہ حرارت دس ڈگری سینٹی گریڈ تھا لیکن ہوا میں نمی کا تناسب تقریباً صفر تھا یعنی اس سیارے پر پانی نایاب تھا۔ شاید نمی کی وجہ سے اس کا سارا پانی بادلوں کی صورت میں جمع رہتا تھا بارش ہونے پر یہ پانی فوراً اڑ کر

دوبارہ ہاڈولوں میں پہنچ جاتا ہوگا اور اسے زمین میں جذب ہونے کا موقع ہی نہیں ملتا ہوگا۔ یہی وجہ تھی کہ زمین کے ہاڈولوں کے برعکس اس سیارے کے ہاڈول بہت دبیز اور سیارے کی سطح سے پچاس کلومیٹر زور تک موجود تھے۔

تیس ان لوگوں کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ پہاڑی کے پاس پہنچ گئے تھے اور اب اس پر چڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ تیر ہواؤں کی وجہ سے انہیں بہت دشواری پیش آرہی تھی۔ پہاڑی زیادہ بلند نہیں تھی شاید سو فٹ اونچی ہوگی لیکن اس پر جانے کے لیے راستے نہیں تھے۔ وہ کسی نہ کسی طرح پتھر پکڑتے ہوئے اوپر چڑھنے میں کامیاب رہے تھے۔ تیس نے فوراً ہی جولیو کی حیرت زدہ آواز سنی۔

”میرے خدا یہ کیا ہے؟“

”جولیو کیا ہے؟“ تیس نے جولیو کا کمر اٹھا لیا لیکن اس سے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہ چھوٹی سی میٹری پر مشتمل بہت سادہ اور بلیک اینڈ وائٹ کمر تھا۔

”یہ کوئی عجیب سی چیز ہے۔“ جولیو نے کہا۔ ”مجھے لگ رہا ہے جیسے کوئی خلائی جہاز ہے۔ لیکن اس کی حالت لمبے عرصے ہو رہی ہے اور یہ نہ جانے کب سے یہاں پڑا ہے۔“

”جہاز نے کریش لینڈنگ کیا ہے؟“

”نہیں اس کی ہاڈی ریج سلامت نظر آرہی ہے۔ لیکن بہر حال یہ استعمال میں نہیں ہے۔ کیا ہم اس کی طرف جائیں؟“

”ہاں لیکن بہت احتیاط کے ساتھ اور کسی بھی خطرے کی صورت میں تم لوگوں کو واپس آنا ہوگا۔“

”ٹھیک ہے جنتا۔“ جولیو نے کہا اور اتر کر اس خلائی جہاز کی طرف بڑھنے لگا جو ان کی مشن کے مقابلے میں دس گنا بڑا تھا۔ اب تیس کو خلائی جہاز نظر آ رہا تھا۔ اس کی ساخت عجیب سی تھی اور اس کا زمین سے کوئی تعلق محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ یقیناً یہ کسی اور مخلوق کا جہاز تھا۔ جولیو اور اس کے ساتھی اس کے قریب پہنچ گئے۔ جہاز سیاہ رنگ کی کسی وحات سے بنا ہوا تھا۔ اس میں اندر جانے کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ اس کے گرد گھوم کر راستہ تلاش کرنے لگے۔ آخر ایک جگہ انہیں ایک سلوب جہاز کے اندر جاتا دکھائی دیا اور انہوں نے تیس کو اس سے آگاہ کر کے اندر جانے کی اجازت چاہی۔

”ٹھیک ہے لیکن محتاط رہنا۔“ تیس نے انہیں اجازت دے دی۔

پہلے جولیو اندر گیا۔ سلوب اندر ایک چھوٹے سے ہال میں لٹکا جوتا تھا اور اس ہال سے خلائی جہاز کے اندر جانے

کے لیے راستے نکل رہے تھے۔ وہ انداز سے سے خلائی جہاز کے اگلے حصے میں جانے لگے کیونکہ وہیں انہیں آ جامل سکتے تھے۔ اندر کی ساخت بھی ایسی تھی جو جولیو اور اس کے ساتھیوں نے آج تک کسی انسانی خلائی جہاز میں نہیں دیکھی تھی۔ اس نے جیسے نے کہا۔

”ایسا لگ رہا ہے ہم کسی اور ذہین مخلوق کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔“

”لیکن وہ ذہین مخلوق کہاں ہے؟“ تیس نے سوال کیا۔ ”اس جہاز کی حالت سے تو نہیں لگ رہا کہ اس کے اندر کوئی زندہ چیز ہوگی۔“

جہاز اندر سے بھی جاہ حال تھا اور جاہ جاٹونی ہوئی چیزیں اور جہاز کا لمبہ پڑا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اندر کسی نے جان بوجھ کر چابی پھیلانی ہو۔ وہ جہاز کے اگلے حصے میں آئے جہاں جہاز کو کنٹرول کرنے والی مشینیں تھیں لیکن وہ ان کی نوعیت سمجھنے سے قاصر تھے۔ یہاں بھی تابی اور برادی کے آثار نمایاں تھے۔ جولیو نے کہا۔ ”ایسا لگتا ہے یہ آپس میں لڑ رہے ہیں؟“

”کون؟“ تیس نے پھر سوال کیا ”اگر کوئی مرا تھا تو اس کی لاش یا اس کے کچھ آثار ہونے چاہئیں۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو مگر اندر۔“ جولیو نے اس کی تائید کی۔ ”ہمیں اب تک کوئی ایسی چیز نہیں ملی ہے جسے ہم کسی مخلوق کے آثار قرار دے سکیں۔“

جولیو اور اس کے ساتھی اگلے حصے کا معائنہ کر کے جہاز کے عقبی حصے میں آئے۔ جہاز کا پچھلا حصہ گول ڈسک نما تھا اور اندر سے یہ ایک بہت بڑا ہال ثابت ہوا۔ جب وہ اس میں داخل ہوئے تو انہیں وہ چیز مل گئی جس کے وہ متلاشی تھے۔ یہاں ایک طرف تابوت نما درازیں تھیں جن کا باہر والا حصہ شیشے کا تھا اور ان کے اندر انہیں ایک عجیب سی مخلوق کی نظر آئی۔ جولیو نے فوراً اس بارے میں تیس کو بتایا۔ تیس نے حکم دیا۔

”اس کے قریب جاؤ لیکن کسی بھی چیز کو نہیں چھونا ہے یہ حکم سب کے لیے ہے۔“

جولیو ایک تابوت کے قریب گیا اور اس نے ہاتھ میں پکڑی نارج کی روشنی اس پر ڈالی۔ جہاز کے اندر روشنی تھی لیکن اس میں ہل مدھم بھی۔ البتہ شیشے کے تابوتوں میں ہلکی سی روشنی تھی اور اصل میں یہی روشنی ہال میں پھیل رہی تھی۔ تیس نے کمرے میں دیکھا کہ تابوت میں ایک ایسی سی چیز تھی۔ اوپر کی طرف اس کا منہ تھا اور یہ منہ کسی چھلی جیسا تھا۔ اس کے لیے ہاتھ اس کے برابر میں رکھے تھے اور پاؤں

چھوٹے تھے۔ ہاتھ بیروں میں چھ لہمی اور نوکلی انگلیاں تھیں۔ اس مخلوق کی لمبائی پانچ فٹ سے زیادہ نہیں تھی اور جسم کہیں سے بھی چھانچ سے زیادہ موٹا نہیں تھا۔

”کیا یہ مردہ ہے؟“ تیس نے سوال کیا۔

”یہ ظاہر تو ایسا ہی لگ رہا ہے۔“ جولیو نے روشنی میں اس کا قریب سے معائنہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ان میں کسی قسم کی حرکت نہیں ہے۔“

”مشتین سے چپک کرو؟“

جولیو کے پاس ایک مشین تھی جو کسی چیز میں معمولی سی حرکت بھی نوٹ کر لیتی تھی۔ اس نے مشتین استعمال کی لیکن اس پر بھی کسی قسم کی حرکت نہیں ہوئی۔ اگر یہ مخلوق ہالی برنیٹ پر بھی تب بھی اسے سانس لینا چاہیے تھا اور اس کا دل دھڑکنا چاہیے تھا۔ جولیو کی اس بات پر تیس نے کہا۔ ”ہم نہیں جانتے کہ یہ زندگی کی کس قسم سے تعلق رکھتی ہے۔ ہماری زمین پر بھی پودوں کا دل میں دھڑکتا۔“

جولیو کا ایک ساتھی فوگ ایک تابوت کے بالکل پاس تھا اور وہ دوسروں سے نظر بچا کر اسے کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تابوت کے ساتھ ہی کچھ پتھر لگے تھے۔ اس نے ایک پتھر دیا تو اچانک ہی تابوت کا ڈھکن کھلنے لگا اور پھر ایسی آواز آئی جیسے کہیں سے کس پر پڑے خار جھونک رہی ہے۔ جولیو چلا یا۔

”فوک! تم نے کیا کیا؟“

فوک اب خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹا تھا کیونکہ تابوت سے کوئی دھواں نما چیز نکل رہی تھی اور رفتہ رفتہ ہال میں پھیل رہی تھی۔ تیس نے جولیو سے پوچھا۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے؟“

”فوک نے ایک تابوت کھول دیا ہے۔ اس سے کوئی عیس نکل رہی ہے۔“ تیس نے جواب دیا۔

”تم لوگ فوراً اس ہال سے نکل جاؤ۔“ تیس نے حکم دیا تو وہ سب ہال سے نکلے والے راستے کی طرف بڑھ گئے لیکن ان کو باہر نکلنا نصیب نہیں ہوا کیونکہ فوک اچانک نیچے گر گیا تھا اور وہ فرش پر اڑیاں رگڑ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کا سانس رک رہا ہو۔ جولیو اس کی طرف جھکا۔ اس نے فوک کو اٹھانے کی کوشش کی۔

”فوک! کیا ہوا ہے؟“

لیکن فوک کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ از خود اٹھ سکے۔ اس کا جسم اڑے جا رہا تھا۔ جولیو اور دوسرے اسے اٹھانے کی کوشش کر رہے تھے کہ ان میں سے ایک اور نیچے گر گیا اور وہ بھی فوک کی طرح اڑیاں رگڑنے لگا۔ اس دوران میں فوک ساکت ہو گیا تھا اور اس کے لباس سے ششک اس کے اعضا

کی حالت نشتر کرنے والا آگہ تیار ہا تھا کہ اس کے دل کی دھڑکن اور سانس رک چکی ہیں اور اس کے دماغ میں کوئی تحریک باقی نہیں رہی۔ تیس دم بہ خود سا بیٹھا تھا چند لمبے پہلے تک زندہ فوگ مر چکا تھا۔ پھر اس نے سنبھل کر جولیو سے کہا۔

”فوک! کوچھو دو تو فوک! باہر نکلنے کی کوشش کرو۔“

اس دوران میں فوک کا تیسرے ساتھی بھی اسی طرح نیچے گر کر اڑیاں رگڑ رہا تھا۔ صرف ایک ساتھی اپنے دوسرے ساتھی کے ہمراہ حیران پریشان انہیں دیکھ رہا تھا پھر جیسا کہ واحد ساتھی بھی گرا تو اس کا حوصلہ جواب دے گیا اور وہ دروازے کی طرف لگا۔ تیس چیخ چیخ کر اسے وہاں سے نکلنے کا کہہ رہا تھا مگر وہ بھی عین دروازے پر پہنچ کر گر گیا۔ اب وہ تیس کی بات کا جواب نہیں دے رہا تھا۔ ان میں چار مر چکے تھے اور صرف جولیو زندہ تھا۔ تیس اس پر خلائی جہاز کو اس حادثے کی رپورٹ کرنے لگا اور جب تک وہ انہیں کچھ بتاتا جولیو بھی مر چکا تھا۔ کم سے کم ان کے واسطے سانس نشتر کرنے والا آگہ یہی بتا رہا تھا۔ ابوری اور دوسرے بھی پریشان تھے پھر ابوری نے فوری طور پر تیس کو واپس خلائی جہاز میں آنے کا حکم دیا۔ وہ نیچے اتر کر جولیو اور اس کے ساتھیوں کو دیکھنا چاہتا تھا لیکن ابوری نے اسے سختی سے منع کر دیا۔

”کیا ان پانچ کا حشر دیکھ کر بھی تمہیں عقل نہیں آئی ہے۔ تم فوراً واپس آؤ۔“

مجبوراً تیس نے مشن پر اڑنا ہی اور خلائی جہاز کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کا خیال تھا کہ اسے ایک بار اس پراسرار خلائی جہاز میں جا کر دیکھنا چاہیے تھا کیونکہ اس کے ساتھی اس مخلوق کے نہیں بلکہ عیس کا شکار ہوئے تھے اور انہیں مدد کی ضرورت تھی۔ وہ ایسا لباس پہن کر ان کی مدد کے لیے جاسکتا تھا جو کسی بھی قسم کی عیس سے بچاؤ کرتا ہو۔ یہ لباس مشن میں موجود تھا۔ وہ خلائی جہاز تک پہنچا تو دوسری امدادی مشن پرواز کے لیے تیار تھی اور اس میں اس شخص کو لباس کے ساتھ چھ دوسرے افراد تھے۔ تیس نے ابوری سے کہا۔

”میں بھی جاؤں گا میں بہتر رہنمائی کر سکتا ہوں۔“

کپتان ابوری اس کی بات مان گیا اور وہ بھی اس مشن کے ساتھ سیارے کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس مشن کو پارکاؤڈا رہا تھا اور اسے مشن کو اس جگہ پر لینڈنگ کرنے میں بہت دشواری پیش آئی تھی۔ تیس نے کوشش کی تھی کہ اس بار لینڈنگ اس پراسرار خلائی جہاز کے پاس ہی ہو۔ مگر پارکاؤڈا میں کامیاب نہیں ہوا تھا اور مشن نے ذرا دور لینڈنگ کی۔ ہواؤں کی شدت میں تیزی آگئی تھی اور ایسا لگ رہا تھا کہ سیارے کی سطح

پرشدیدریت کا طوفان جاری ہے۔

وہ تیار ہو کر نیچے اترے اور اس بار پارکر مشن میں رہا۔
جیمس نے اس سے کہا۔ ”ہمارے اترتے ہی دروازہ بند کر دیتا۔“
”تم فکر مت کرو۔“ پارکر نے جواب دیا۔

جیمس باہر آیا تو ہواؤں کی شدت کا اسے پہلی بار اندازہ ہوا اس میں حرکت کرنا آسان نہیں تھا لیکن وہ کسی نہ کسی طرح خلائی جہاز تک پہنچ گئے تھے۔ اس کا اندازہ جانے والا سلوک اسی طرح کھلا ہوا تھا۔ جیمس کے ساتھ آثاریات کے ماہر جوزف نے خلائی جہاز کی باڈی کو دیکھا اور بولا۔

”اس قسم کی دھات سے ہم واقف نہیں ہیں اور یہ جہاز ہمارے لحاظ سے یہاں کم سے کم پچاس برس سے کھڑا ہے۔“
”یعنی اس کے اندر موجود مردے کم سے کم پچاس سال سے تابوتوں میں پڑے ہیں۔“ جیمس نے کہا۔ وہ ان لوگوں کو اس ہال کی طرف لے جا رہا تھا جہاں ان کے پانچ ساتھی گیس کا شکار ہوئے تھے۔ ذرا دیر بعد وہ اس ہال کے سامنے تھے اور جب وہ اندر داخل ہوئے تو جیمس دم بہ خورہ گیا کیونکہ وہاں اس کے کسی ساتھی کے لاش نہیں پڑی تھی۔ وہ پانچوں غائب تھے۔ جوزف نے جیمس کی طرف دیکھا۔

”لاشیں کہاں ہیں؟“

”وہ اسی جگہ گرے تھے۔“ جیمس نے وضاحت کی۔
”تب ان کی لاشیں کہاں گئیں؟“

جوزف یا کسی اور نے جیمس پر شک نہیں کیا تھا کیونکہ وہ سب بہت تجربے کار مجھے ہوئے لوگ تھے۔ لاشوں کے غائب ہونے کا مطلب تھا کہ یہاں کوئی اور بھی تھا جس نے لاشیں غائب کی تھیں۔ وہ سب چوکنا ہو گئے اور اپنے ہتھیار سنبھال لیے۔ لیکن وہاں ہال میں انہیں کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ فوک نے جوتاوت کھول دیا تھا وہ اسی طرح کھلا ہوا تھا اور اس میں انہیں مخلوق کی لاش اسی طرح پڑی تھی۔ انہوں نے ہر طرف تلاشی لی۔ ابھی وہ ہال میں تھے کہ پارکر نے انہیں ریڈیو پر پکارا۔

”اے کیا تم لوگ مشن کے باہر آگئے ہو؟“
”نہیں۔“ جیمس نے جواب دیا۔ ”ہم سب خلائی جہاز کے اندر ہیں۔“

”تب یہ کیوں ہیں۔ مجھے صاف نظر نہیں آرہے ہیں۔ لیکن لباس تم لوگوں جیسا لگ رہا ہے۔“
”مشن کے باہر کچھ لوگ ہیں۔“ جیمس نے ساتھیوں سے کہا۔ ”ہمیں واپس جانا ہوگا۔“

وہ تیزی سے خلائی جہاز سے باہر آئے اور مشن کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں جیمس نے پارکر کو پکارا لیکن

اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ وہ مزید فکر مند ہو گئے تھے۔ جوزف نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔ ”ہم کس جہنم میں آکر پھنس گئے ہیں؟“

”یہاں کوئی اور مخلوق ہے۔“ جیمس بولا۔ مکمل لباس اور تیز ہواؤں کی وجہ سے ان کو چلنے میں دشواری ہو رہی تھی۔
”واہ تم نے کیا تحقیق کی ہے۔“ جوزف نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔ ”یہ خلائی جہاز اور اس میں موجود لاشیں دیکھنے کے بعد بھی تم یہ بات کہہ رہے ہو۔“
جیمس ایک لمحے کو جھنجھلا گیا تھا۔ ”تم میری بات نہیں سمجھ رہے ہو۔“

اسی لمحے انہیں اپنے ریڈیو میں کھڑکڑانے کی آواز آئی اور پھر انہوں نے جو یو کی آواز سنی۔ جیمس کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا کیونکہ جو یو تو مر چکا تھا۔ مگر وہ کہہ رہا تھا۔ ”جیمس تم کہاں ہو اور یہ مشن غلط جگہ کیوں کھڑی کر دی ہے؟“
”ت۔۔۔۔۔ تم جو یو ہو؟“ جیمس نے پوچھا۔

”ہاں میں اور کوں ہو سکتا ہوں۔“
”تم مشن کے اندر ہو؟“
”ہاں ہم مشن میں آگئے ہیں لیکن اس میں اور کوئی نہیں ہے۔“

”ہم پارکر کو ہاں چھوڑ کر آئے تھے۔“
”یہاں پارکر یا اور کوئی بھی نہیں ہے۔“

”ہم آکر ہے ہیں۔“ جیمس نے کہا۔ اس نے جوزف کی طرف دیکھا۔ ”کوئی بہت بڑی گڑبڑ ہو رہی ہے۔ جو یو اور اس کے ساتھی مشن میں ہیں اور پارکر غائب ہے۔“
پارکر کہاں غائب ہو گیا تھا اس کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ دس منٹ بعد وہ سب مشن میں تھے جہاں جو یو اور اس کے سارے ساتھی زندہ موجود تھے۔ جیمس نے ان سے پہلا سوال یہی کیا۔ ”تم لوگ فچ کیسے گئے؟ آلات تمہارے تمام وائل سائن ساکت دکھا رہے تھے۔“

”ہمیں نہیں معلوم۔۔۔ ہم تو بے ہوش ہو گئے تھے اور جب ہوش میں آئے تو تم غائب تھے۔ ہمیں ریڈیو پر پکارتے رہے۔ پھر ہم خود مشن کی طرف آئے لیکن مشن بھی اپنی جگہ نہیں تھی۔“ جو یو نے بتایا۔

”پھر تم لوگوں نے کیا کیا؟“
”ہم سمجھے کہ تم نے کسی وجہ سے مشن دھڑلے سے اڑا دیا ہے۔“
”تم کہیں اور کھڑا کیا ہے۔“

”ریڈیو پر رابطہ نہ ہونے پر تمہیں سمجھ جانا چاہیے تھا کہ مشن یہاں نہیں ہے۔“

”ہم اسے ریڈیو کا کوئی نقش سمجھے تھے۔“ جو یو بولا۔ صرف وہی بول رہا تھا اس کے ساتھی خاموش تھے۔
جیمس نے انہیں بتایا کہ ان کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا تھا۔ پھر ایوری نے اسے واپس بلایا اور وہ دوسری مشن کے ساتھ سیارے پر آیا تھا جسے پارکر پائلٹ کر رہا تھا۔ لیکن اب پارکر غائب تھا۔ یہ سن کر جو یو کی تجویس تین گھنٹے تک جیمس انہیں یہاں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اس نے غصے سے کہا۔
”تم نے یہ بھی نہیں سوچا کہ آلات دھوکا بھی دے سکتے ہیں اور تم ان پر بھروسہ کر کے ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔“
”میں تو تم لوگوں کے پاس آنا چاہتا تھا کیونکہ میرا بھی یہی خیال تھا لیکن ایوری نے مجھے واپس آنے کا حکم دیا تو مجھے اس کی تعمیل کرنا پڑی تھی۔“

”اگر ہمیں مدد ملتی تو ہم اس دوران میں بچ چکے بھی مر سکتے تھے۔“ جو یو بدستور غصے میں تھا لیکن وہ بہر حال زندہ بچ گیا تھا اور جیمس کو اب پارکر کی فکر تھی۔ اس کا مشن خالی چھوڑ کر جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس نے جو یو کی طرف دیکھا۔
”تم لوگ اندر کیسے آئے؟“

”مشن کا دروازہ کھلا تھا اور اندر کوئی بھی نہیں تھا۔“
”یہ ممکن نہیں ہے۔ پارکر مشن خالی چھوڑ کر نہیں جاسکتا ہے۔“ جیمس نے نفی میں سر ہلایا۔

”میں نے نہیں حقیقت بتا دی ہے۔“ جو یو نے سرود لہجے میں کہا۔ ”ممکن ہے وہ کسی وجہ سے باہر گیا ہو؟“
”ہمیں اسے تلاش کرنا ہوگا۔“ جیمس نے کہا اور اس نے فوری طور پر دو دروازہ پر مشتمل چارٹیمس بنا کر مشن سے باہر بھیج دیں۔ پھر وہ خلائی جہاز کو رپورٹ کرنے لگا۔ ایوری نے اسے حکم دیا۔ ”پارکر کو تلاش کرتے ہی تم سب واپس آ جاؤ۔“

پارکر ایک نیم گھنٹہ کے بعد حالت میں مشن سے سو قدم دور پڑا ملا جسے وہ اٹھا کر مشن میں لے آئے تھے۔ جیسے ہی جیمس کو معلوم ہوا کہ پارکر مردہ حالت میں ملا ہے اس نے لانے والوں کو حکم دیا کہ اسے براہ راست محفوظ چیمبر میں ڈال دو۔ اس چیمبر کا دروازہ مشن کے باہر سے بھی کھلتا تھا۔ پارکر جو یو کے دو ساتھیوں کو ملا تھا۔ انہوں نے اسے محفوظ چیمبر میں ڈال دیا۔ جیمس نے باقی افراد کو کال کر کے واپس مشن میں بلایا اور ان کے آتے ہی وہ خلائی جہاز کی طرف روانہ ہو گئے۔ کپتان ایوری نے جیمس سے کہا کہ وہ مشن کو مخصوص پورٹ پر لے آئے۔ یہ مخصوص پورٹ باقی جہاز سے الگ تھی۔ اس جگہ رکھ کر ان کا بھی معاہدہ کیا جاسکتا تھا۔ اگر انہیں کوئی مخصوص بیماری یا کیفیت لاحق ہو جاتی تو یہیں ان کا علاج بھی کیا جاسکتا تھا۔

ماہنامہ سنی لائٹ



ماہِ دفاعِ تہذیب کے
شائے کی گیسٹ لائبریریاں

خود کش

ذاتی تبدیلیاں شہت انداز فکر کو تقویت دیتی ہوں تو۔۔۔ وہ تبدیلیاں تمام کائنات کو جنت بنا دیں۔۔۔ کچھ ایسی ہی تبدیلیوں کی حامل تحریر **ایچ اقبال** کے قلم سے

لکھا

وہ سناٹات جو زندگی کو موت کا کھیل بنا دیتے ہیں۔۔۔ موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا کرداروں کا سنی خیر ماجرا **طاہر جاوید مغل** کا جوشیلا سلسلہ

گرداب

نفرت اور سازشوں کے درمیان جینیتی پر جوش محبت اور مکر و عزائم رکھنے والوں کا خوشی مکر اور

اسما قادری کی سلسلے وار داستان **جرم کتھائیں**

مغربی دنیا کے گنگ ڈھنگ۔ معاشرت و تہذیب کے گرگ و خوک جاسوسی و مہم افروسانی سے بھر پور کہانیاں

دو نمبر **سرورق کے رنگ**

سیدھے طریقے سے کام نہ نکلے تو ہر شخص دوسرا طریقہ ڈھونڈ ہی لیتا۔ آپ کے پسندیدہ کردار شامی اور تہوور کی جیلہ سازیاں **نقلم کاشف زبیری** کی کرشمہ سازیاں

الت بصر **سرورق کے رنگ**

منظر امام کا نام ہوا اور سب کچھ سیدھا سادہ ہو ہی نہیں سکتا۔۔۔ الت بصر کے رنگ ڈھنگ نرالی انداز میں

جینی نکتہ چینی

آپ کے تھمرے۔۔۔ مشورے۔۔۔ جھنجھٹیں۔۔۔ شکایتیں۔۔۔ اور ہر نئی دلچسپ باتیں۔۔۔ کتھائیں

جیس نے شل پورٹ پر روکی اور وہ سب اتر کر طبی معائنے والے حصے میں آگئے۔ یہاں جہاز کا ڈاکٹر ہوم اور اس کا نائب مین مشینوں کی مدد سے ان کا معائنہ کر سکتے تھے۔ وہ باری باری طبی معائنے کے عمل سے گزرنے لگے تھے۔ سب سے پہلے جولیو اور اس کے ساتھیوں کو اس عمل سے گزارا گیا۔ اس کے بعد باقی افراد کی باری آئی۔ سب سے آخر میں خود کار و بوٹ پارکر کی لاش لینے گیا اور جب پارکر وہاں آیا تو وہ اسے زندہ پا کر حیران رہ گئے۔ جیس نے اسے مردہ قرار دینے والے دونوں افراد کو پکڑ لیا اور وہ قسمیں کھانے لگے کہ جب انہوں نے پارکر کو دیکھا تو وہ مردہ تھا۔ اس کی نبض اور سانس دونوں برقی ہوئی تھیں۔

جیس انہیں میں پڑ گیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ پہلے جولیو اور اس کے ساتھی مر گئے اور پھر زندہ ہو گئے اس کے بعد پارکر بھی مردہ حالت میں ملا اور اب زندہ ہو گیا۔ اس دوران میں پارکر بھی معائنے سے فارغ ہو گیا تھا۔ ہوم اور مین نے ان تمام افراد کو بالکل ٹھیک حالت میں قرار دیا تھا۔ انہیں نہ تو کوئی انفیکشن تھا اور نہ ہی ان کے جسم میں کوئی غیر معمولی کیمیائی چیز پائی گئی تھی۔ وہ ہر لحاظ سے صحت مند تھے۔ اس لیے انہیں جہاز میں آنے کی اجازت دے دی گئی۔ راستے میں جیس نے پارکر سے پوچھا۔

”جیس شل میں چھوڑا تھا تم اس سے سو قدم دور کیسے پہنچے اور تم بے ہوش کیسے ہوئے؟“
پارکر انہیں میں پڑ گیا۔ اس نے جواب دیا۔ ”مجھے صحیح سے نہیں یاد ہے میں شاید اپنی نشست پر بیٹھے بیٹھے بے ہوش ہو گیا تھا۔“

”یعنی تم نے شل سے باہر جانے کی کوشش نہیں کی تھی؟“
”میں ایسی کوشش کیوں کرتا جب کہ مجھے معلوم ہے میں شل خالی چھوڑ کر باہر نہیں جاسکتا۔“

”پھر تم باہر کیسے پہنچے؟“
”مجھے نہیں معلوم۔“ پارکر نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ میں تم سے سن رہا ہوں۔ میں نے تو خود کو ہوش میں آنے کے بعد شل کے محفوظ جبر میں پایا تھا۔“

جیس کو لگ رہا تھا کہ انہیں کوئی گڑبگڑ تھی۔ اس سارے کی فضا میں مسئلہ ہوتا تو سب اس مخصوص کیفیت سے گزرتے لیکن اس مخصوص کیفیت کا شکار صرف جولیو اور اس کے ساتھی ہوئے تھے یا پھر پارکر ہوا تھا۔ جیس کا دل کہہ رہا تھا ساری گڑبگڑ اس مخلوق کا تابوت کھلنے سے شروع ہوئی تھی۔ ایوری نے ہنگامی میٹنگ طلب کر لی۔ جس میں خلائی جہاز کا سارا

عملہ شامل تھا۔ انہوں نے صورت حال پر غور کیا تھا لیکن کوئی نہیں سمجھ سکا کہ سارے پر ہوا کیا تھا۔ جیس نے یہاں اپنا خیال پیش کر دیا۔ اس نے کہا۔
”میرا خیال ہے ساری گڑبگڑ اس پر اسرار مخلوق کا تابوت کھلنے سے ہوئی ہے۔“

ایوری کو اس سے اتفاق نہیں تھا۔ ”اس صورت میں پارکر کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا تھا؟“

”ممکن ہے اس تک بھی تابوت کے اثرات آئے ہوں۔“
جیس کی اس بات پر جولیو طنزیہ انداز میں ہنسا۔ ”میرا خیال ہے یہ کوئی پرانی بار مسودی نہیں ہے۔“

جیس نے اسے ناگواری سے دیکھا۔ ”میں کسی بار مسودی کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ اس تابوت سے کوئی کیمیائی یا بائیولوجیکل اثرات نکلے تھے جو تم پر مرتب ہوئے اور وہی اثرات کسی طرح پارکر تک پہنچے کیونکہ وہ بھی تمہاری طرح بہ ظاہر مردہ ہو گیا تھا۔“

”ہم مردہ نہیں ہوئے تھے۔“ جولیو کے ایک ساتھی نے احتجاج کیا۔ ”ہم صرف بے ہوش ہو گئے تھے۔“

”واٹشل سائن نشر کرنے والے آلات کسی وجہ سے خراب بھی ہو سکتے ہیں۔“ جولیو نے اپنے ساتھی کی تائید کی۔

”تب تم پارکر کے بارے میں کیا کہو گے اسے تو تمہارے ساتھیوں نے مردہ قرار دیا تھا۔“

”وہ جلدی میں تھے اور اس ماحول میں آدمی اپنے حواس کیسے برقرار رکھ سکتا ہے۔ ان سے پارکر کی نبض اور سانس چیک کرنے میں غلطی ہو سکتی ہے۔“

”یعنی تم کہنا چاہ رہے ہو کہ جو ہوا اس کا تابوت کھلنے سے کوئی تعلق نہیں ہے؟“ جیس نے نفی سے کہا۔

”میرا یہی خیال ہے۔ شاید وہاں کی ہوا میں کوئی ایسی تاثیر ہے۔“

”تمہارے علاوہ چھ آدمی اور بھی گئے تھے۔“ جیس نے اسے یاد دلایا۔ ”انہیں تو کچھ نہیں ہوا۔“

وہ سب مل جل کر حفاظتی لباس میں تھے اور آکسیجن تنک استعمال کر رہے تھے۔ جولیو نے جواب دیا۔ ”کیونکہ پارکر بھی بتائی حفاظت کے باہر نکل گیا تھا اس لیے اس پر بھی وہی کیفیت طاری ہوئی تھی۔“

”اگر تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ ہم پر کوئی انفیکشن اثر کر گیا ہے تو تم غلطی پر ہو۔“ پارکر نے جیس کی طرف دیکھا۔ ”ہوم اور مین نے ہمیں مکمل طور پر چیک کیا ہے۔ کیا ان لوگوں نے ہمارے اندر کوئی تبدیلی پائی ہے؟“

”نہیں۔“ ہوم نے جواب دیا۔ ”تم لوگوں کے اندر کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے اور تم سب مکمل طور پر فٹ ہو۔“

جیس نے محسوس کیا کہ وہاں اس کے حامی کم تھے اور کپتان ایوری بھی جولیو سے متفق نظر آ رہا تھا۔ اس نے میٹنگ کے آخر میں کہا۔ ”خوش قسمتی سے ہم اس ایڈونچر سے بہ حفاظت باہر آنے میں کامیاب رہے ہیں لیکن اب اس سارے میں مکمل لباس میں جانا ہے۔“

”ہمیں اس پر اسرار مخلوق پر تحقیق کرنی چاہیے۔“
ڈاکٹر ہوم نے کہا۔

”اس کے لیے ہمیں اس مخلوق کے تابوت خلائی جہاز میں لانے ہوں گے اور اس معاملے میں بہت احتیاط سے کام لینا ہوگا۔“

میٹنگ برخاست ہو گئی۔ مسلسل سزاور ٹرینشن نے جیس کو تھکا دیا تھا اور وہ سونے کے لیے اپنے کمرے میں آ گیا۔ یہ کمرہ انہیں بلکہ بیڈ روم، لاؤنج اور ایک چھوٹے سے کچن پر مشتمل مکمل یونٹ تھا۔ اگرچہ کھانے کے لیے میس تھا لیکن وہ خود کچھ پکانا چاہتا تو اس کے لیے یہاں تمام انتظامات موجود تھے۔ جیس نے سونے سے پہلے ایک گلاس دودھ لینے کا سوچا اور وہ دودھ گرم کر رہا تھا کہ دروازے کی ٹھنکی بجی۔

پارکر کوئی تھا اس نے بلند آواز سے پوچھا۔ ”باہر سے لی کی آواز آئی۔“

”میں ہوں جیس۔“
جیس نے دروازہ کھولا تو ریڈ اندر آیا۔ جیس نے اسے بیٹھنے کا کہتے ہوئے کافی کا پوچھا۔ اس نے سر ہلایا تو جیس نے اسے کافی پاٹ سے کافی نکال کر دی اور خود دودھ کا گلاس لے کر اس کے سامنے آ بیٹھا۔ اس نے میٹنگ میں محسوس کیا تھا کہ ریڈ کچھ کہنے کے لیے بے چین ہے مگر وہ کہتے کہتے رک جاتا تھا۔ جیس نے پوچھا۔

”میرا خیال ہے تم اس موضوع پر کوئی خاص بات کہنے آئے ہو؟“

ریڈ نے سر ہلایا اور بولا۔ ”مجھے کپتان اور ڈاکٹر سے اختلاف ہے۔ انہیں جولیو اور پارکر وغیرہ کو اتنی جلدی کلیر قرار نہیں دینا چاہیے تھا۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“
”اس پر اسرار خلائی جہاز میں جو کچھ ہے وہ ہمارے لیے بالکل اجنبی ہے اور اس معاملے میں ہمیں ہر قدم بہت احتیاط سے اٹھانا چاہیے۔“ ریڈ بے چین ہو رہا تھا۔ ”ایوری اس بات کو اتنی اہمیت نہیں دے رہا ہے۔“

جیس نے غور سے اسے دیکھا۔ ”کیا تم نے اس

طرز قلم

ایک دفعہ علامہ محمد اقبال سڑک پر سے گزر رہے تھے کہ اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک خوبصورت لڑکی کھڑکی سے باہر کا نظارہ دیکھ رہی ہے۔ آپ اسے دیکھنے لگے۔ گاڑیاں آپ کے کھڑے ہونے سے رک گئیں۔ کیونکہ راستہ بند ہو گیا۔

ادھر سے لڑکی نے کہا:
جو نیچے سے اوپر ضم دیکھتا ہے
وہ اپنا سر قلم دیکھتا ہے
آپ نے فرمایا:

نہ تجھ سے غرض نہ تجوی صورت سے
میں تو مصور کا طرز قلم دیکھ رہا تھا

آگ

ایک آدمی کے کپڑے میں آگ لگ گئی تو وہ بھاگنے لگا۔ اس کے پیچھے ایک آدمی دوڑا۔ اتنے میں کسی نے پہلے والے آدمی کو ٹکرا دیا اور آگ بجھ گئی۔ اس کے پیچھے بھاگنے والا بھی پہنچ گیا اور کہنے لگا۔ ”آگ تو بعد میں بھی بجھائی جاسکتی تھی۔ مجھے ایک سرکیٹ تو سلگانے دیتے۔“

نثر

ایک شخص سڑک پر جا رہا تھا اور ساتھ ساتھ گڈیری بھی چوس رہا تھا۔ دوسرا شخص اس کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا اور چوی ہوئی گڈیریاں جو کہ پہلا شخص پیچھا کر رہا تھا وہ اٹھا کر دوبارہ چوستا۔ اتنے میں پہلے شخص نے اسے دیکھا اور کہا۔ ”ارے کتنے کنبوس ہو، چھٹی ہوئی گڈیریاں چوس رہے ہو شرم نہیں آتی۔“
دوسرا شخص: ”شرم تو مجھے آتی چاہیے۔ ایک قطرہ رس بھی نہیں چھوڑتے۔“
(A.S.۔۔۔۔۔ خیر بختون خوا)

بارے میں ایوری سے بات کی ہے؟“
ریڈ نے سر ہلایا۔ ”ابھی میں اسی کے پاس سے آرہا ہوں۔ میں نے اس سے مطالبہ کیا ہے کہ جو لیو، پار اور باقی چار افراد کو فی الحال الگ کر کے آپریشن میں رکھا جائے۔ لیکن ایوری نے میرا مطالبہ مسترد کر دیا۔ اب ہمیں کچھ کرنا ہوگا۔“
جیمس نے سوچا اور نفی میں سر ہلایا۔ ”ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ کیونکہ کمانڈر ایوری ہے۔ ہم اسے تجویز دے سکتے ہیں اس پر اپنا فیصلہ مسلط نہیں کر سکتے۔“
ریڈ بھی سوچ میں پڑ گیا۔ پھر اس نے کہا۔ ”اگر ہم اس بارے میں اپنے طور پر تحقیق کریں تو ممکن ہے ایوری کو قاتل کرنے کے لیے ہمیں کوئی نقصان مل جائے۔“
”اپنے طور پر تحقیق؟“ جیمس نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ”وہ کیسے؟“
”اگر ہم کسی کے علم میں لائے بغیر سیارے پر موجود خلائی جہاز تک جائیں اور جانے کی کوشش کریں کہ وہاں کیا ہوا تھا؟“
”ہم کسی کے علم میں لائے بغیر کیسے جا سکتے ہیں؟“ جیمس نے اعتراض کیا۔
”جا سکتے ہیں۔“ ریڈ کا لہجہ سرگوشی آمیز ہو گیا تھا۔ ”ہم اس جہاز کے سینڈ اور تھرڈ آفسرز ہیں اور ہم جاتے تو بہت کچھ کر سکتے ہیں۔“
جیمس نے سوچا وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اگر وہ چاہتے تو کسی کے علم میں لائے بغیر جہاز سے باہر جا سکتے تھے۔ وہ سیارے تک بھی جا سکتے تھے۔ وہ ریڈ کی تجویز مانتے ہوئے ہنگامہ بازی تھا کیونکہ اگر وہ پکڑے جاتے تو ان پر چارج لگتا اور ان کا ریکارڈ وارنٹ دار ہو جاتا۔ ممکن ہے کہ پتہ ان کو معطل کر کے انہیں گھروں میں نظر بند کر دیتا۔ وہ اس کا اختیار رکھتا تھا۔ بہر حال جیمس کا جذبہ اتنا تھا کہ جیمس اور ریڈ یہ خطرہ مول لینے کے لیے تیار ہو گئے۔ انہوں نے جیس گھٹنے بعد جانے کا فیصلہ کیا۔ جب ان کی ڈیوٹی آف ہو جاتی۔ اس وقت تک وہ جہاز کے سسٹم میں ایسی تبدیلیاں کر سکتے تھے کہ ان کی روانگی راز ہی رہتی۔
اس دن جیمس نے محسوس کیا کہ جو لیو، اس کے ساتھی اور پارکر جیپ سے تھے۔ وہ کام بھی بے دلی سے کر رہے تھے اور یہی بارہائیں نے انہیں آنکھوں آنکھوں میں ایک دوسرے سے بات کرتے دیکھا تھا۔ جب کوئی ان کے پاس آتا تو وہ ایک دوسرے سے لائق بن جاتے تھے۔ لیکن جیمس ان کی اداکاری محسوس کر رہا تھا۔ اس نے ریڈ کو اس بارے میں بتایا تو اس نے کہا۔ ”میں خود کچھ ایسا ہی محسوس کر رہا ہوں۔“

آخراں کے درمیان کیا کچھوی پک رہی ہے؟“
”اس کا ہمیں اندازہ اس وقت ہو گا جب ہم ان حالات سے گزر رہیں جن سے یہ گزر رہے ہیں۔“
جیمس نے خلائی جہاز میں موجود سات نمبر مشن کا تعلق جہاز کے مواصلاتی سسٹم سے ختم کر دیا۔ اب اس کی روانگی یا آمد کی اطلاع جہاز کے مرکزی کنٹرول سسٹم کو نہیں ہو سکتی تھی۔ جب ان کی ڈیوٹی ختم ہونے کا وقت آیا تو وہ دونوں بہ ظاہر اپنے آپ کو مشن کی طرف جانے لگے لیکن درمیان میں ایک جگہ سے انہوں نے راستہ تبدیل کیا اور مشن نمبر سات کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہ جہاز کے سب سے مخفی حصے میں تھے اور وہاں عام طور سے کوئی نہیں جاتا تھا۔ وہ پورٹ بیچ کر مشن میں داخل ہوئے اور اسے جہاز سے الگ کر کے سیارے کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس مقام کو وہ پہلے مشن کے کمپیوٹر میں ڈال چکے تھے جہاں پراسرار خلائی جہاز موجود تھا۔
جب وہ سیارے کی سطح تک پہنچے تو وہاں بدستور طوفان جاری تھا۔ شاید وہاں ہمہ وقت طوفان جاری رہتا تھا۔ جیمس کیونکہ خود مشن کو بالکل کر رہا تھا اس لیے اس نے خلائی جہاز کے بالکل پاس مشن کو اتار لیا۔ انہوں نے مکمل طور پر محفوظ لباس پہنے، مین میں آکسیجن کا انتظام بھی کیا۔ اس کے بعد وہ مشن سے اتر کر خلائی جہاز کی طرف روانہ ہوئے۔ سلوب والے راستے سے اندر داخل ہوئے جی انہوں نے اپنے ہتھیار سنبھال لیے تھے اور کسی بھی غیر متوقع صورت حال سے نمٹنے کے لیے تیار تھے۔
بال میں تابوت ویسے ہی رکھے تھے۔ ان کی دلچسپی کا مرکز وہ تابوت تھا جس کو فوگ نے کھول دیا تھا اور اس کے بعد سے یہ سارا پیکر شروع ہوا تھا۔ انہوں نے تاریکی کی تیز روشنی میں اس مخلوق کی لاش کا جائزہ لیا۔ وہ بالکل سادہ پڑھی اور گزشتہ دو دن سے کھلی ہوا میں ہونے کی وجہ سے وہ کچھ خشک اور سکڑی ہوئی لگ رہی تھی۔ ریڈ نے کہا۔
”یہ یقینی طور پر لاش ہے۔“
جیمس نے اسے وہیں موجود ایک دھاتی اوزار سے پھینکا۔ اس کا جسم نرم اور کسی قدر لچکا تھا۔ ریڈ نے پوچھا۔
”جب فوگ نے اسے کھولا تھا تو کیا اس کے اندر پہلے سے عیسائی تھی؟“
”میں نے تو جہ نہیں دی تھی، کیونکہ میں اس تابوت کو کمرے سے دیکھ رہا تھا جس کے سامنے جو لیو تھا۔“
ریڈ نے اس کی طرف دیکھا۔ ”میرا خیال ہے ہمیں ایک اور تابوت کھول کر گرہ بگڑنا چاہیے۔“

جیمس ہنگامہ کیا۔ ”کیا یہ مناسب ہوگا؟“
”بالکل! آخر فوگ نے بھی تو یہی کیا تھا اور اس نے تمہارے حکم کی صریحاً خلاف ورزی کی تھی۔“
”ہاں یہ تو ہے اس بات پر میں نے اس سے جواب طلب نہیں کیا تھا۔“
”کیونکہ انہوں نے تمہیں دوسری باتوں میں الجھا دیا تھا۔“
جیمس ریڈ کے اصرار پر ایک اور تابوت کھولنے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس نے کھٹنے والے تابوت کے برابر والے تابوت کا بند دیا اور اس کا شیشے کا ڈھکن ہلکی سی آواز کے ساتھ کھل گیا۔ فوراً ہی جیمس نے دیکھا کہ مخلوق کی لاش سے بنفارت باہر نکلنے لگی تھی۔ وہ جلدی سے پیچھے ہٹا اور اس نے ریڈ کو اشارہ کیا۔
”یہ دیکھو وہ کسی عیسائی ہے۔“
جیمس اب بال میں پھیل رہی تھی اور رفتہ رفتہ قلیل ہوتی جا رہی تھی۔ جیمس خوف زدہ تھا کہ اس گیس کے ان پروپی اثرات نہ ہوں جو جو لیو اور اس کے ساتھیوں پر ہوئے تھے۔ گیس نکلنے کے مشکل سے دو منٹ بعد فوگ گر گیا تھا اور چار منٹ کے اندر اس کے باقی ساتھی بھی گر چکے تھے ان کا جسم مردہ ہو گیا تھا۔ لیکن اس منٹ گزر جانے کے بعد جب کوئی رد عمل نہیں ہوا تو جیمس نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس نے ریڈ سے کہا۔
”میرا خیال ہے یہ چیز سانس کے راستے جسم میں داخل ہوئی ہے اور پھر اثر کر رہی ہے۔“
”اب ذرا اس کا تجزیہ کر لیا جائے۔“ ریڈ نے کہا اور اس نے ایک چھوٹی سی لیکن طاقت ور برقی خوردبین نکالی اور دوسرے تابوت میں رکھی مخلوق کی لاش سے ایک چھوٹا سا ٹکڑا کاٹ کر الگ کیا۔ اس نے یہ ٹکڑا خوردبین کے شیشے پر رکھا اور اسکرین پر اس کا معائنہ کرنے لگا۔ چند لمحے بعد اس نے جیمس سے کہا۔ ”دیکھنا یہ کچھ عجیب ہے جراثیم ہیں اس میں۔“
جیمس نے خوردبین کی اسکرین پر دیکھا تو اسے ٹکڑے کے ساتھ سفید رنگ کے چھوٹے چھوٹے جراثیم نظر آئے جو حرکت کر رہے تھے۔ ریڈ نے خوردبین کی طاقت بڑھا کر تو یہ واضح نظر آنے لگا۔ یہ اصل میں سفید رنگ کی مٹی سی گیندیں تھیں جو بے چینی سے ادھر ادھر حرکت کر رہی تھیں۔ جیمس کا بائیولوجی سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن جہاں تک اس کی معلومات تھیں اس نے بھی اس قسم کے جراثیم کے بارے میں نہیں سنا تھا۔ کم سے کم ان جراثیم... کا انسانوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ریڈ نے کہا۔
”میرا خیال ہے ان جراثیم کا اثر تھا جو جو لیو اور اس

کے ساتھی عارضی طور پر مردہ ہو گئے تھے۔“
”لیکن جب ڈاکٹر ہوم نے ان کا معائنہ کیا تو اس وقت ان جراثیم کا کیوں پتہ نہیں چلا؟“ جیمس نے اعتراض کیا۔
”ممکن ہے وہ جراثیم قلیل ہو گئے ہوں اور جسم کے دفاعی نظام نے ان پر قابو پا لیا ہوگا۔“
ریڈ کی وضاحت قابل قبول تھی لیکن جیمس نے اصرار کیا۔ ”مگر ہمیں کسی بہانے سے ان لوگوں میں سے کسی کا جسمانی معائنہ بھی کرنا ہوگا۔“
”وہ لوگ شاید اس کی اجازت نہیں دیں گے۔“ ریڈ نے کہا۔
”ہم کوشش کر سکتے ہیں۔“ جیمس نے اصرار کیا۔
ریڈ نے خوردبین کی سلاخ خارج کر دی تھی کہ ہمیں یہ جراثیم ان کے ساتھ لگ کر نہ چلے جائیں۔ یہ سفید گیند نما جراثیم اس مخلوق کے جسمانی خلیوں کے درمیان حرکت کر رہے تھے یعنی یہ اس کے جسم میں داخل ہو گئے تھے۔ انہوں نے جراثیم... کا نمونہ لینے کا خطرہ مول نہیں لیا کیونکہ اگر یہ خلائی جہاز میں آزاد ہو جاتے تو ممکن ہے پورا خلائی جہاز ہی ان کا شکار ہو جاتا۔ وہ واپس آئے، مشن میں بیٹھے اور جس طرح خاموشی سے گئے تھے اسی طرح خاموشی سے واپس آ گئے۔ کسی کو ان پر شک نہیں ہوا تھا۔ اگلے دو دن میں جیمس نے محسوس کیا کہ جو لیو اور اس کے ساتھیوں کا رویہ مزید پراسرار ہو گیا تھا اور وہ اکثر ساتھ ہوتے تھے اور... مشترکہ سرگرمیوں جیسے کھانے اور تفریح کے دوران بھی الگ گروپ بنا کر رہتے تھے۔ وہ دوسروں سے اب بات چیت بھی کم کرتے تھے۔ جیمس کا شک بڑھ گیا تھا۔ اس نے ریڈ سے تنہائی میں کہا۔
”ہمیں ان میں سے کسی کا جسمانی معائنہ کرنا ہوگا اس سے شاید پتا چلے کہ ان کا رویہ ایسا کیوں ہے؟“
ریڈ نے کہا۔ ”ہمیں انہیں ہوشیار کیے بغیر اپنا کام کرنا ہوگا۔“
”وہ کیسے؟“
ریڈ نے سوچ کر کہا۔ ”ان میں سے کسی کا جسمانی نمونہ حاصل کرنا ہوگا۔“
جیمس سمجھ گیا۔ ”ہاں اس کی کوشش کی جا سکتی ہے۔“
اگلے روز جیمس کپتان برج سے بچ کے وقفے میں مشن کی طرف جا رہا تھا کہ اس کی نگر سائنے سے آتے ہوئے فوگ سے ہوئی اور فوگ نے ہلکی سی سسکاری بھر کر اپنا ہاتھ تھام لیا۔ اس نے سر دھڑکنے سے جیمس کی طرف دیکھا۔ ”یہ کیا چیز جیسی ہے مجھے؟“

تجسس نے دیکھا اس کی جیکٹ کا ایک بٹن ٹوٹ جانے سے نوکیلا ہو گیا تھا، وہی نوگ کو لگا تھا۔ دھم نوگ کے ہاتھ پر آیا تھا اور اس نے اسے دوسرے ہاتھ سے دبا رکھا تھا۔ تجسس نے وضاحت کی تو وہ اسے گھورتا ہوا چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد تجسس نے ہاتھ میں دبانٹھا سائیکل فوئل جیب میں رکھ لیا۔ اس میں ایک پتھی سے سوئی تھی جس نے نوگ کے ہاتھ سے اس کے جسم کا ایک معمولی سا حصہ نکال لیا تھا اور وہ سوئی سینکڑوں ہزاروں حصے میں اس فوئل میں محفوظ ہو گئی تھی۔ تجسس جانے لگا تھا کہ اس کی نظر فرش پر پڑے سفید رنگ کے مائع پر پڑی۔ یہ بالکل خون کی طرح لگ رہا تھا لیکن اس کا رنگ سرخ کے بجائے سفید تھا۔ تجسس نے اس پر توجہ نہیں دی تھی۔ وہ مہین کی طرف چلا گیا وہاں ریڈ اس کا منتظر تھا اور تجسس نے سر کے خفیف سے اشارے سے اسے بتایا کہ اس نے اپنا کام کر لیا ہے۔

شام کو کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ اپنے اپارٹمنٹ میں آیا۔ کپتان ایوری نے اگلے روز سارے پر جانے والی مہم کے سلسلے میں رات کو بیجے مینٹک بلائی تھی۔ کیونکہ خلائی جہاز میں دن رات کا کوئی تصور نہیں تھا اس لیے انہوں نے زمین کا وقت اپنا رکھا تھا اور سارے معمولات اسی کے مطابق انجام دیتے تھے۔ ابھی تجسس اور ریڈ کے پاس اتنا وقت تھا کہ وہ نوگ کے جسم سے حاصل کیے ہوئے نمونے کا تجزیہ کر کے کسی نتیجے پر پہنچ سکیں۔ تجسس کو ریڈ کا انتظار تھا اور وہ کچھ دیر بعد آگیا۔ خوردبین اس کے پاس تھی۔ اس نے احتیاط سے فوئل میں موجود نمونے کو شیشے کے پیس میں منتقل کیا اور پھر اس کا معائنہ کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد اس نے حیرت زدہ آواز میں کہا۔

”میرے خدا اس میں بھی وہی جراثیم موجود ہیں۔“

تجسس نے جلدی سے اسکرین میں دیکھا۔ ریڈ نے منظر کو واضح کیا تو انسانی خلیات کے درمیان وہی گیند نما سفید جراثیم صاف نظر آنے لگے تھے۔ وہ دونوں دہشت زدہ ہو گئے۔ ریڈ نے ہمت کر کے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے یہ چھ افراد انفیکٹ ہو چکے ہیں۔“

تجسس کچھ اور بھی سوچ رہا تھا۔ ”اگر یہ لوگ انفیکٹ ہو چکے ہیں تو انہوں نے دوسرے لوگوں کو کیوں متاثر نہیں کیا جب کہ وہ سب سے کھل مل رہے ہیں۔“

”اس کی کوئی نشانی دیکھ ہوگی۔“ ریڈ نے کہا۔ ”لیکن ہمیں کپتان کو فوراً خبردار کرنا چاہیے۔“

تجسس نے اسے روکا۔ ”اپنی جلدی نہیں۔ کسی کے خون میں جراثیم پائے جانا کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے۔ اصل بات ان لوگوں کا بدلا ہوا رویہ ہے۔“

”جب تحقیق ہوگی تو ان کے رویے کی وجہ بھی سمجھ میں آجائے گی۔“

”مجھے شبہ ہے کہ کپتان ایوری شاید ان لوگوں کو الگ تھلک نہیں کرے گا۔“

”پھر بھی ہمیں ان کے بارے میں بتانا چاہیے۔“ ریڈ بولا۔ ”اور آج مینٹک میں آگاہ کر دے گا اور وہاں خوردبین ثبوت کے طور پر پیش کر دیں گے۔“

تجسس چاہتا تھا کہ وہ اس معاملے میں مزید تحقیق کریں لیکن ریڈ کے کہنے پر وہ مان گیا کہ انہیں یہ سارا معاملہ مینٹک میں کپتان اور دوسرے لوگوں کے سامنے رکھ دینا چاہیے۔ وہ رات کو مینٹک میں پہنچے اس میں کل دس افراد تھے ان میں انفیکٹ گروپ سے صرف پارک اور جو لیو تھے۔ باقی نچلے درجے کے لوگ تھے جو اس قسم کی مینٹک میں شامل نہیں ہوتے تھے۔ جیسے ہی سب اپنی جگہوں پر بیٹھے ریڈ نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

”میں کل کی مہم کے انجنڈے سے ہٹ کر کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“

کپتان ایوری اور دوسروں نے چونک کر اسے دیکھا۔ ایوری بولا۔ ”کوئی اتنی اہم بات ہے مسٹر ریڈ؟“

”اس سے نہیں زیادہ اہم ہے۔ ممکنہ طور پر یہ اس جہاز اور اس میں سوار افرادی قوت کا سوال ہے۔“

ریڈ نے پہلے خوردبین اس کے ملاحظے کے لیے پیش کی اور پھر بتایا۔ ”یہ نوگ کے جسم سے حاصل شدہ نمونہ ہے اور اس میں وہی جراثیم ہیں جو سارے پر موجود مخلوق کے جسم میں ہیں۔ میں اور تجسس خود ان کا مشاہدہ کر کے آئے ہیں۔“

”یہ کیا بکواس ہے۔“ جو لیو غریبا۔ ”تجسس کوئی اختیار نہیں ہے کسی کے جسم سے اس کی مرضی کے بغیر نمونے لینے کا۔“

”ہاں لیکن ہم نے جو نمونے لیے ہیں ان کے مطابق نوگ انفیکٹ ہے اور ہمیں یقین ہے کہ ہم، پارک اور باقی تین افراد بھی ان جراثیم کا شکار ہو چکے ہو۔“

”یہ بکواس ہے۔“ پارک بولا۔ ”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم میں سے کوئی انفیکٹ نہیں ہے۔“

”اگر ایسا ہے تو اس کی بڑے آرام سے تصدیق ہو سکتی ہے۔“ ریڈ نے کہا۔ ”تم سب کا بلڈ لے کر چیک کیا جائے تو حقیقت خود سامنے آجائے گی۔“

”ہم کوئی بلڈ ٹیسٹ نہیں دیں گے۔“ جو لیو اپنی جلد سے کھڑا ہو گیا۔

کپتان ایوری خاموشی سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ جو لیو اور پارک نے اپنے رویے سے خود کلام کر دیا تھا کہ وہ کچھ چھپا رہے تھے۔ کپتان نے جہاز کے سیکورٹی افسر جان چین سے کہا۔ ”ان دونوں اور باقی چار افراد کو حراست میں لے لو اور ان سب کو الگ بند کر دو۔“

جو لیو چلا یا۔ ”تم ایسا نہیں کر سکتے۔ ہمارا تصور کیا ہے؟“

جان نے ہتھکڑی لٹکائی اور جو لیو کی طرف بڑھا لیکن اس نے جو کیا وہ کسی نے سوچا نہیں تھا۔ اس نے اچانک میز سے پیپر کٹر اٹھا لیا اور بولا۔ ”خبردار کوئی میرے پاس نہ آئے۔“

جان ہشادہ بدستور جو لیو کی طرف بڑھتا رہا تو اس نے پیپر کٹر اپنے گلے سے لگا لیا۔ ”میرے پاس آئے تو میں خودکشی کر لوں گا۔“

اس پر بھی جان نہیں رکا اور جب وہ جو لیو کے پاس پہنچا تو اس نے اچانک پیپر کٹر اپنے گلے میں اتار لیا۔ جان مشدرد رہ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ جو لیو صرف دھمکی دے رہا ہے۔ ورنہ ایسی بات پر خودکشی کون کرتا ہے۔ پھر وہ اچھل کر پیچھے ہٹا کیونکہ جو لیو کے کتے ہوئے گلے سے سفید رنگ کا سیال اچھل کر باہر نکل رہا تھا اور وہ دھڑا سے فرش پر گر گیا۔ اس کے کتے گلے سے سفید سیال بالکل خون کی طرح ابل رہا تھا اور فرش پر پھیل رہا تھا۔ تجسس فحش ارادی طور پر مینٹک روم کے دروازے کے قریب چلا گیا جب کہ باقی سب جو لیو کے پاس جمع ہو رہے تھے جو آخری دموں پر تھا۔ کسی نے اسے بچانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس دوران میں جان نے پارک کو دبوچ لیا تھا لیکن اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی اور سکون سے کھڑا رہا تھا۔

جیسے ہی جو لیو کا جھٹکے لیتا جسم ساکت ہوا اس سے سفید عیس نما چیز خارج ہونے لگی۔ اس کے پاس موجود لوگ خوف زدہ ہو کر کچھ بچھے بیٹھے تھے۔ تجسس سب سے پیچھے تھا۔ اس نے جیسے ہی سفید عیس دیکھی وہ بھاگا اور مینٹک روم سے نکل گیا۔ اسے معلوم تھا کہ اب کیا ہوگا۔ جو لیو کی لاش کے پاس موجود افرادی قوتی طور پر اس کیس کا شکار ہو چکے تھے جو اصل میں گیس نہیں بلکہ سفید رنگ کے ننھے سنے جراثیم تھے۔ یہ جراثیم بھی نہیں بلکہ کوئی ایلیمن مخلوق تھی جو انسان پر قابض ہو جاتی تھی۔ ورنہ جراثیم تو انسان کو جسمانی طور پر متاثر کرتے ہیں اس کے ذہن پر قبضہ نہیں کرتے۔ تجسس یہ بھی جان گیا تھا کہ ان جراثیم سے انفیکٹ افراد دوسروں کو کیوں متاثر نہیں کر رہے تھے۔ جب تک انفیکٹ فرد زندہ ہوتا تھا یہ جراثیم کسی اور کو نہیں لگتے تھے لیکن جیسے ہی وہ مرنا جراثیم اس کے آس پاس کے لوگوں پر حملہ آور ہو جاتے تھے۔ تجسس کو عقب سے لوگوں

کے چھپنے چلانے کی آوازیں آرہی تھیں۔

تجسس اپنے اپارٹمنٹ کی طرف جا رہا تھا اچانک اسے سامنے سے جو لیو کے دو انفیکٹ ساتھی اپنے دو ٹھیک ساتھیوں کو پکڑے نظر آئے۔ وہ مینٹک روم کی طرف جا رہے تھے۔ تجسس نے راست بدل دیا وہ اب خلائی جہاز کے ایک خفیہ چیمبر کی طرف جا رہا تھا جس میں کوئی بھی نہ تھا۔ وقت ضرورت پناہ لے سکتا تھا۔ اس چیمبر میں بہت ساری ایسی چیزیں تھیں جن تک کسی عام کارکن کی رسائی نہیں تھی اور اس مقدمہ کے لیے چیمبر میں داخلہ کا طریقہ صرف پہلے تین افسران یعنی کپتان ایوری، ریڈ اور تجسس کو پتا تھا۔ وہ بھاگتا ہوا چیمبر کے دروازے تک پہنچا اور اس نے جلدی سے نمبروں والے لاک پر مخصوص کوڈ ڈالا۔ اسی وقت اسے عقب سے بھائے قدموں کی آواز آئی۔ جیسے ہی دروازہ کھلا وہ اندر داخل ہوا اور اسے بند کرنے والا بٹن دبا دیا۔ اسی لمحے راہداری میں پارک نمودار ہوا اور بڑی تیزی سے بند ہوتے دروازے کی طرف لپکا۔ تجسس نے محسوس کیا کہ وہ دروازہ بند ہونے سے پہلے اندر آئے گا۔ اس لیے تجسس آگے آیا اور جیسے ہی پارک اس کے پاس آیا۔ اس نے پوری قوت سے پاؤں پارک کے پیٹ میں مارا۔ پارک اور تجسس دونوں مخالف سمت میں جا گئے۔ اس دوران میں دروازہ بند ہو گیا۔

تجسس نے جلدی سے کنٹرول روم پہنچے قابو میں کیا۔ اب کوئی خلائی جہاز تو اس کی مرضی کے بغیر نہیں لے جا سکتا تھا۔ اس دوران میں چیمبر کے دروازے کے باہر کی لوگ جمع ہو گئے تھے۔ یہ پارک اور جو لیو کے ساتھی تھے۔ پارک نے کہا۔ ”تم مجھے نہیں سکتے۔“

”نی الحال تو میں یہاں محفوظ ہوں۔“

”یہ تمہاری خوش فہمی ہے۔“ پارک بولا۔ ”جلد ہم یہاں موجود ہر فرد کو اپنے جیسا بنائیں گے اور اس کے بعد تم اکیلے رہ جاؤ گے۔“

”کیا تم لوگ ایلیمن ہو؟“ تجسس نے اس کی بات نظر انداز کر کے کہا۔

”ہم اس سارے کے مالک ہیں۔“ پارک بولا۔

”سارے پر موجود خلائی جہاز تمہارا ہے؟“

”نہیں سارے پر ہمارا کچھ بھی نہیں ہے کیونکہ ہم کسی قابل نہیں ہیں۔ تم ہماری حجامت دیکھ چکے ہو اس حجامت کے ساتھ ہم کیا کر سکتے ہیں لیکن ہم نے اپنے اندر ایک وصف پیدا کر لیا ہے۔ ہم کسی بھی زندہ چیز کے اندر گھس کر اس پر قبضہ کر سکتے ہیں اور اسے اپنی مرضی سے استعمال کر سکتے ہیں۔“

”تم لوگ ان لاشوں کے اندر تھے؟“

”ہاں ہم کسی جاندار کے اندر ہی زندہ رہ سکتے ہیں۔ یہ مخلوق بہت پہلے آئی تھی اور ہم نے اس پر قبضہ کر لیا مگر پھر اس کی طبیعت پروری ہو گئی اور یہ ایک ایک کر کے مرنے لگے۔ اپنی بقا کے لیے ہم نے ان کی لاشوں کو تابوتوں میں ڈال دیا اور انہیں سیل کر دیا۔ ان میں ہم محفوظ ہو گئے تھے۔ اگر کوئی ان تابوتوں کو کھولنے کی کوشش کرتا تو وہ ہمارا شکار ہو جاتا جیسے کہ تم لوگ ہو گئے ہو۔“

”مگر تم لوگوں کو کوئی زندہ جسم نہ ملے تو؟“

”تو ہم کچھ دیر میں مر جاتے ہیں۔ لیکن ایسا ہوا نہیں ہے ہمیں اپنی بقا کے لیے کوئی نہ کوئی جسم مل جاتا ہے۔ اصل میں ہم کسی زندہ جسم میں ہی اپنی تعداد بڑھا سکتے ہیں۔“

”یعنی تم لوگ وائرس ہو؟“

”ہاں ہم ایک لحاظ سے وائرس ہیں۔“ پارک مسکرایا۔

”لیکن ہم کسی جسم کو تباہ نہیں کرتے ہیں بلکہ اسے اپنے کام میں لاتے ہیں۔ اس کی معلومات اور ذہانت کا فائدہ اٹھاتے ہیں ہم اس کی ذہانت کے مرکز پر قبضہ کر لیتے ہیں۔ اس کی سوچیں اس کی یادداشت اور اس کی شخصیت تک اپنا لیتے ہیں۔“

”تم لوگ عام حالات میں دوسروں کو کیوں انہیکٹ نہیں کرتے؟“

”کیونکہ جب ہم کسی جسم میں داخل ہوتے ہیں تو اس وقت تک کے لیے اس کے قیدی بن جاتے ہیں جب تک وہ جسم زندہ ہوتا ہے اور جب وہ مر جاتا ہے تو ہم آزاد ہو جاتے ہیں ویسے یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے تم نے دیکھا جب ہم نے آزاد ہونا چاہا تو جو بیونے خود کو مار دیا۔“

”نہیں یہ دیکھ رہا تھا اور اس کا ذہن امکانات پر غور کر رہا تھا۔ اگر اس خوف ناک اور مخمی سے مخلوق نے زمین تک رسائی حاصل کر لی تو اسے پوری زمین کے انسانوں اور دوسرے جانداروں پر قبضہ کرنے میں چند دن سے زیادہ نہیں لگیں گے۔ پارک اور اس کے ساتھی وہاں سے چلے گئے تھے اور کچھ دیر بعد اس نے دروازے کے پیشے سے ایوری سمیت دوسرے افراد کو آتے دیکھا ان میں ریڈ بھی تھا۔ ایوری نے اس سے کہا۔“

”دروازہ کھول دو ہم نے حالات پر قابو پا لیا ہے۔“

”مجھے یہ وقف مت بناؤ۔ تم ان سب پر بھی قبضہ کر چکے ہو اور اب یہ سب تمہارے حکم کے غلام ہیں۔“

”ایوری درست کہہ رہا ہے۔“ ریڈ آگیا۔ ”ہم نے ان پر قابو پا لیا ہے تم دروازہ کھول دو۔“

”اچھا تم اپنے بازو پر چھوٹا سا کٹ لگاؤ اگر اس سے نکلنے والے خون کا رنگ لال ہوا تو میں مان لوں گا کہ تم بدستور

انسان ہو۔“

ریڈ اس کی بات سن کر جھنجھلا گیا تھا۔ ”لگتا ہے تم اس طرح نہیں مانو گے۔ اگر ہم نے فیصلہ کر لیا تو اس دروازے کو کانٹے میں ایک گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں لگے گا اس کے بعد تم خود کو بجائے کے لیے کیا کرو گے؟“

”جیسے خاموش رہا تھا۔ اس پر کپتان ایوری نے ویلڈنگ مشین لانے کا حکم دیا۔ جیسے جانتا تھا وہ ٹھیک کہہ رہے تھے۔ ویلڈنگ مشین اس مضبوط ترین دروازے کو مشکل سے ایک گھنٹے میں کاٹ دیتی اور اس کے بعد وہ ان کے رحم و کرم پر ہوتا۔ جیسے ہی کپتان ایوری نے حکم دیا وہ تیزی سے حرکت میں آیا۔ اس نے چہرے کے اندرونی حصے کا رخ کیا اور کنٹرول پینٹل کی مدد سے ایک خاص خانہ کھولا۔ جس کے اندر سرد ترین گیس بھری ہوئی تھی وہ کچھ دیر گیس خارج ہونے کا انتظار کرتا رہا پھر وہ اس خانے میں اتر آیا۔ اندر ایک چھوٹے سے گول کمرے کے وسط میں فرش پر ایک سلیڈر نما چیز بیست تھی۔ اس نے اس کے کی بورڈ پر کوڈز ٹیچ کیے تو سلیڈر کا اوپری حصہ کھل گیا اور اس میں موجود چیز سامنے آ گئی۔ یہ انسانوں کا تیار کردہ تیار کن ترین بم تھا جو پھٹ جاتا تو اس پورے خلائی جہاز کو ریزہ ریزہ کر دیتا۔ اس نے ہم کا سسٹم آن کیا اور اس کے خود بہ خود حرکت میں آ جانے والے نظام میں ایک گھنٹے کا ٹائم سیٹ کر کے اس کے لاک توڑ دیے۔ اب ہم کو ایک گھنٹے بعد پھٹنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ یہ کام کر کے وہ تیزی سے اس خانے سے باہر آیا۔ پہلے اس نے جا کر دیکھا۔ وہ لوگ ویلڈنگ مشین لے آئے تھے۔ یہ بہت جدید مشین تھی اور اگر

چہرہ کا دروازہ کسی عام دھات کا بنا ہوتا تو وہ مشین اسے دس منٹ میں کاٹ ڈالتی لیکن اس دھات کو کاٹنا بھی آسان کام نہیں تھا۔ اس چہرے کے عین نیچے ایک چھوٹا سا خلائی جہاز تھا۔ اس نے خلائی جہاز تک جانے کا راستہ کھول کر اس کے سارے بیرونی دروازے جن سے اندر آیا جاسکتا تھا کھیل کر دیے۔ ابھی تک ان لوگوں کا دھیان اس طرف نہیں آتا تھا۔ درندہ اس راستے سے اندر آ سکتے تھے۔ اس نے خلائی جہاز کا سسٹم آن کیا اور اسے فوری طور پر بڑے جہاز کے مرکزی کنٹرول سے الگ کر دیا۔ اب وہ مکمل طور پر اس کے اختیار میں تھا۔

وہ اوپر آیا تو دروازہ نصف کے قریب کٹ چکا تھا۔ اس نے کپتان ایوری سے کہا۔ ”سنو کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم مجھے یہاں سے جانے کی اجازت دے دو؟“

کپتان ایوری نے اشارے سے ویلڈنگ مشین استعمال کرنے والے کو روک دیا پھر اس نے کہا۔ ”یہ ممکن نہیں

ہے کیونکہ یہ ہماری بقا کا سوال ہے۔“

”میں تم لوگوں کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔“

لیکن کپتان ایوری نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی۔ اس نے اشارہ کیا اور ویلڈنگ مشین چلانے والے نے اپنا کام شروع کر دیا۔ ہم پھٹنے میں ابھی نصف گھنٹا باقی تھا۔ اتنا ہی وقت دروازے کو کھٹکنے میں لگتا۔ وہ چاہتا تھا کہ جب وہ یہاں سے نکلے تو ان لوگوں کو اس کا تعاقب کرنے کا موقع نہ ملے۔ کیونکہ اس خلائی جہاز میں ایسی مشین بھی تھی جن میں شاہ کنہیں موجود تھیں جو اس کے خلائی جہاز کو دور سے تباہ کر سکتی تھیں۔ اس لیے وہ وقت کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ دروازے کے پاس کھڑا اسے کانٹے جانے کا سنہرا دیکھتا رہا۔ وہ خطرہ مول لے رہا تھا۔ کیونکہ دروازے میں ذرا سا سوراخ ہو جاتا تو جراثیم کے اندر آنے کا امکان تھا۔ وقت آہستہ آہستہ گزر رہا تھا۔ اب میں منٹ رہ گئے تھے۔ پھر پندرہ منٹ اور پھر دس منٹ۔

دروازہ اس کے اندازے سے پہلے کھٹنے والا تھا اور اس کے بعد ان لوگوں کو اندر آنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ وہ خلائی جہاز کی طرف بھاگا۔ اس کے اندر داخل ہو کر اس نے دروازہ اندر سے بند کیا اور اسے بڑے جہاز سے الگ کرنے کی تیاری کرنے لگا۔ اسے معلوم تھا کہ انجن اشارت ہوتے ہی ان لوگوں کو تباہ کر دیا جائے گا مگر اب لگنا اس کی بجوری بن گیا تھا۔ کیونکہ ہم پھٹنے میں صرف پانچ منٹ باقی تھے۔ اسے اپنے خلائی جہاز کو محفوظ طے تک لے جانا تھا تاکہ اس تباہی کا اس پر اثر نہ پڑے۔ اس نے خلائی جہاز کو آزاد کرنے والا بیورو دیا اور جہاز الگ ہو کر نچے جانے لگا۔

ذرا دیر بعد جیس نے اس کا تھروگل کھینچا تو خلائی جہاز سرعت سے آگے بڑھا اور بہت تیزی کے ساتھ بڑے خلائی جہاز سے دور جانے لگا۔ ہم پھٹنے میں ایک منٹ باقی رہ گیا تھا اور پھر یہ ایک منٹ بھی پورا ہو گیا اور ایک خیرہ کن شعلے نے اس سب کا تاریک حصے کو روشن کر دیا تھا۔

☆☆☆

”اس کے بعد کیا ہوا؟“ بل نے پوچھا۔

جیس نے جواب دیا۔ ”جب مجھے یقین ہو گیا کہ میں بچ گیا ہوں تو میں نے خلائی جہاز کو آٹو پائلٹ کر کے اس کے کمپیوٹر میں زمین کا راستہ سیٹ کر دیا اور خود ہائی بریٹ چہرے میں لیٹ کر سو گیا۔“

”یعنی تم اعتراف کر رہے ہو تم نے ایک قیمتی خلائی جہاز اور اس کے آئینے افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا؟“ بل نے کہا۔

”ہاں لیکن وہ انسان نہیں تھے بلکہ ایسے ایلینز بن چکے تھے، جن سے پوری انسانیت کو خطرہ تھا۔ ذرا سوچیں اگر وہ زمین پر آ جاتے تو یہاں کیسی تباہی پھیلاتے۔“

”تم درست کہہ رہے ہو۔“ شیری بولی۔ ”ہم نے تمہارے خلائی جہاز کا جو ریکارڈ چیک کیا ہے اس سے تمہاری بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ تمہاری اور دوسرے افراد کی بات چیت محفوظ ہے اور اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہر صورت میں تمہیں چہرے سے باہر نکالنا چاہتے تھے جبکہ ان کی باتوں سے ان کے غیر انسانی مخلوق ہونے کا صاف پتا چل رہا تھا۔“

”جیس خوش ہو گیا۔“ ”تب تو مجھے برکوئی الزام نہیں ہے۔“

بل کیر مسکرایا۔ ”نہیں ابھی تم برکوئی الزام نہیں ہے لیکن جب تک تحقیقات مکمل نہیں ہو جاتیں تم کو زیرِ عمر نرا رہنا ہوگا اور فی الحال تمہارا خلائی پائلٹ کا انسٹنس بھی مکمل ہے۔“

”میں اس قسم کی تحقیقات کا طریقہ کار جانتا ہوں جناب اور میں آپ کو مکمل تعاون کا یقین دلاتا ہوں۔ میں نے جو کیا وہ انسانوں کو بچانے کے لیے میری بہترین کوشش تھی۔“

بورڈ نے اس کا اولین اسٹروپو فٹم ہونے کا اشارہ دیا اور جیس مینٹ روم سے نکل آیا۔ ان دنوں وہ ایک چھوٹی سی سرکاری عمارت میں مقیم تھا اور اسے فی الحال باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اسے اس کی رہائش گاہ میں تمام سہولتیں فراہم کی گئی تھیں۔ اس کے بعد اس کے کئی نمیش ہوتے اور پھر اس کا طبی معائنے بھی ہوا۔ اسے ہر لحاظ سے کیئر قرار دے دیا گیا تھا۔

چھ مہینے کی طویل مدت کے بعد اسے اس قید سے رہائی ملی اور ساتھ ہی اسے اس کے عہدے پر بحال بھی کر دیا گیا تھا۔

جیس اس دن بہت خوش تھا۔ اس نے بورڈ کو سب بچ بچ بتایا تھا سوائے ایک بات کے اور وہ یہ تھی کہ جب وہ ہائی بریٹ چہرے میں لیٹنے جا رہا تھا اس کی وردی کی جب سے وہ فوٹاں نکل کر چہرے میں گری تھی جس میں اس نے نوک کے جسم سے غموں لپا تھا۔ جہاز میں شاید کوئی مسئلہ تھا جس کی وجہ سے وہ لوگ انسانی جسم میں مکمل طور پر جذب نہیں ہو سکے تھے اور ان کا خون سرخ رہ گیا تھا لیکن زمین پر آنے کے بعد جذب ہونے کا یہ عمل مکمل ہو گیا تھا اور جیس کا جسم مکمل طور پر انسانوں جیسا تھا کوئی طبی نمیش اس کی حقیقت نہیں جان سکتا تھا۔

فی الحال وہ اکیلا تھا اور ابھی مرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اسے معلوم تھا جب اس کی موت ہوگی تو ان کی تعداد میں اضافہ ہوگا اور بہت جلد وہ وقت آ جائے گا جب زمین پر ان کا راج ہوگا اور وہ انسانوں کو اپنا غلام بنالیں گے۔

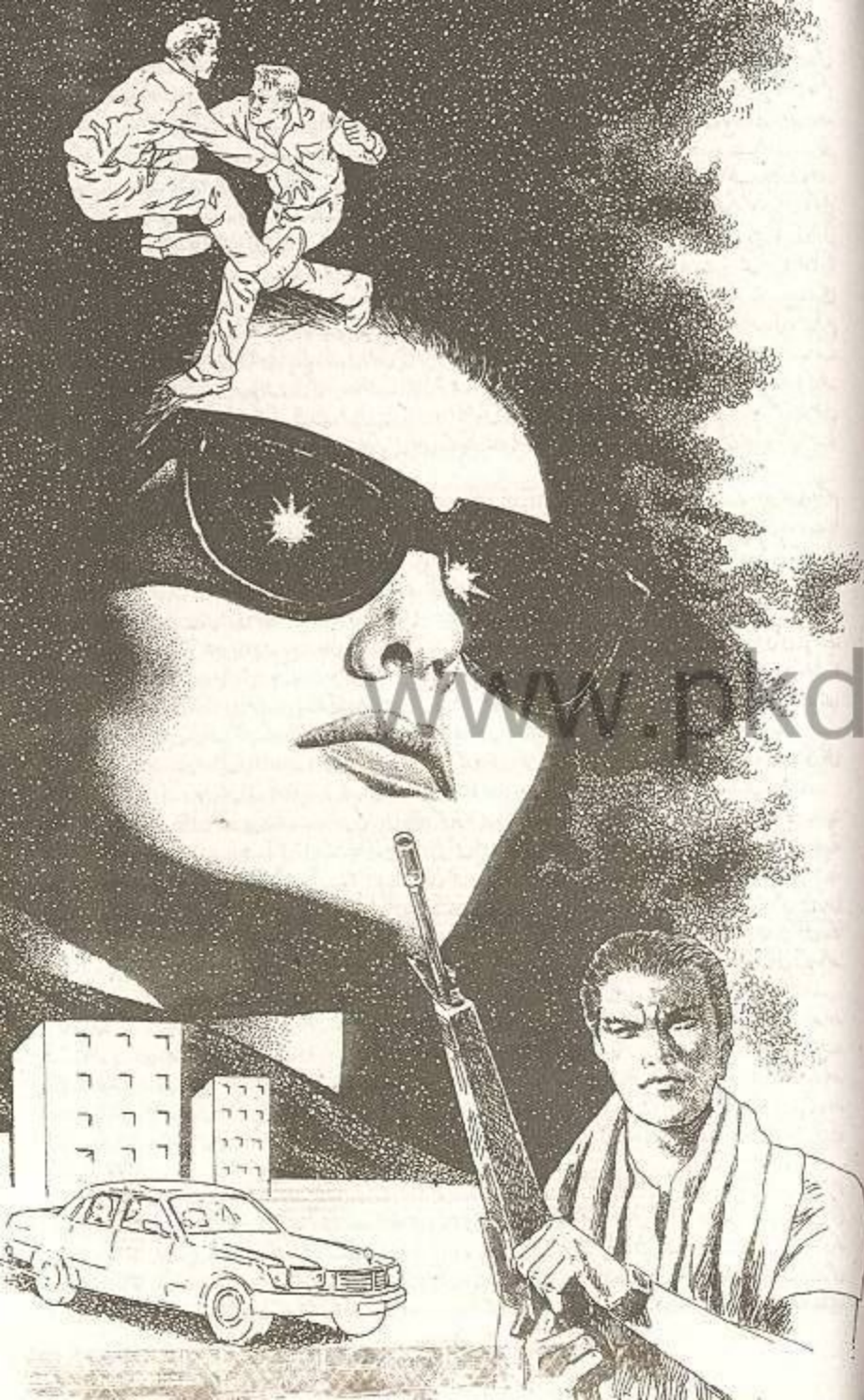
سپیس ڈائجسٹ 191 ستمبر 2010

قسمت کے پھیر میں الجھے ایک نوجوان کی کتھا، حالات اور واقعات کا بہانہ اسے دیار غیر لے گیا جہاں وہ انٹری تھا مگر خود کو کسی کھلاڑی سے کم نہیں سمجھتا تھا۔ ایسا کھلاڑی جسے کسی بساط پر شکست نہیں دی جاسکتی تھی۔ اس کا انٹری پن اسے کھلاڑیوں کے مقابل کامیابیاں دلاتا رہا۔ اسے پردیس راس آگیا تھا جہاں کی ہنگامہ خیزیاں اس کا دل لپھاتی تھیں مگر دوسری طرف دیس میں اس کی لائری کھل گئی، ایسی لائری کہ جس کے بعد اسے لوٹنا تھا۔ انٹری سے کھلاڑی بننے کے بعد وہ لوٹا۔ تو ہنگامے اور شرارتیں اس کے ساتھ تھیں۔ قدم قدم پر آنسو اور لمحہ لمحہ قہقروں سے لبریز اس انٹری کی کہانی جس کا دل دو حصوں میں منقسم تھا۔

دور حاضر کے فتنوں اور حالات کی عکاس ایک داستان رنگ برنگ

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

مرد و پیش کا احوال۔ مہرشی کا کمال۔ ایک داستان لا زوال، آج کے زندہ کرداروں کی عقل کہانی جسے احمد اقبال کی زمانہ شناس نگاہ دورِ بحرِ آفریں اندازِ تحریر نے تخلیق کیا۔
سنے پڑھنے والے یہاں سے شروع کریں۔



اٹھارویں صدی کے آغاز میں انگریز فوج کو شاہ افغانستان کے لشکر نے ایک عبرت ناک شکست دی۔ فتح جانے والا واحد شخص ایک ڈاکٹر تھا جسے دشمنی حالت میں میرے پردا کے پرداؤں نے اپنی تیل گاڑی میں ڈال کر جہازت پر پتاس کے قلعے میں انگریز فوج کو پہنچایا۔ انعام کے طور پر انگریز حاکم نے اجازت دی کہ وہ طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک جتنی زمین کا پتھر اپنی تیل گاڑی دوڑا کر لگائیں گے وہ ان کے نام کر دی جائے گی۔ یوں ست بدھائی کی ریاست وجود میں آئی۔ میرے آباؤ اجداد اب کہلاتے۔ انگریز کے دور حکومت میں وہ خطا باطل اور انعامات سے نوازے گئے۔ انہوں نے کثیر دولت حاصل کی اور ایک شاندار جوہر تعمیر کی۔ ریاست کے چوتھے حکمران کو ایک فقیر کی بدعا کی اور اس کے چھ جہان بیٹے باری باری مختلف حالات کا شکار ہو کر مر گئے۔ آخری بیٹے کو باپ نے جان بچانے کے لیے سات مسند پارانلہن بھیج دیائیں جن کی خرابی کے باعث جہاز بحر الکاہل میں گر گیا اور اس کا کوئی مسافر نہ بچا۔ باپ نے عام روایات میں اپنی جان بچانے کے لیے یوں کو کوئی مار کے ایک نوٹس میں پیچھا اور پھر خوشی کر لی۔ جوئی کے باقی برقیں موجود ہیں لیکن وہ خوشی نکواں بند کر دیا گیا ہے۔ جوئی نصف صدی سے زیادہ عرصہ غیر آباد پڑی رہی۔ میرے والد لاہور کے ایک کالج سے ریٹائرڈ ہوئے۔ میں ان کا کھانا بیٹا قاضی زماٹ طالب علمی میں میرا متعلق ایک سیاسی تنظیم کے دہشت گردوں سے ہو گیا جو مجھے بلک بیل کر کے برطانیہ کو لے کر آئے اور میرے پرستار کے رے۔ میری زندگی بچانے کے لیے والد صاحب نے سہا نے امریکا بھیج دیا۔ ہارڈ سے ایم بی اے کرنے کے بعد مجھے لندن میں لاہور ڈاکٹر کے پرنسپل فرم میں اعلیٰ عہدے پر کام کرنے کا موقع ملا لیکن فرم کے مالک کی اکلوتی بیٹی ایلینا مجھ پر فریفتہ ہو گئی۔ وہ مجھ سے شادی کے لیے اپنا گھر، ملک اور مذہب چھوڑنے پر تیار تھی اور اپنا نام تک بدل کر عاشق بن گئی تھی۔ عاشق کے انتہائی شریف شخص حسین اور دولت مند ہونے کے باوجود میں نے اسے ٹھکرادیا کیونکہ میں فریال کو چاہتا تھا اور ہم شادی کا فیصلہ بھی کر چکے تھے۔ فریال پہلے ماڈل اور ایڈیٹر بن گئی تھی اور اپنی بے وقتی کے باعث ایک عیاش اور مارا فحش چوہری سلطان سے مل گئی تھی کہ جس کی جوشقین سراج لڑکیوں کو کلسا زین کراچی ہوس کے جال میں پھنسا دیتا تھا۔ وہ میرا اور فریال کا جانی دشمن بن گیا لیکن ہم نے چھ سال تک اس کی رقابت اور عداوت کا مقابلہ کیا۔

اب تک لندن میں مجھے ایک ویلن کے ذریعے اپنے کسی رشتے کے پرداؤں نے طلب کیا۔ وہ عمر کے آخری حصے میں تھے اور درمیان کے سوا ان کا سارا جسم مفلوج تھا۔ ان کے یقین اور معاملہ کے طور پر ملے کے مطابق میں ان کا رشتہ دار تھا۔ چنانچہ اپنی وصیت کی رو سے انہوں نے مجھے ست بدھائی کا وارث بنا دیا۔ یہ ویلن ساتویں بیٹے بنے جن کا جواز لندن میں جاتے ہوئے مسند میں کر گیا تھا۔ ممبئی کی اطلاع غلطی کی کوئی مسافر زندہ نہیں بچا۔ وہ فتح جانے والے واحد مسافر تھے جو بیہوشی میں لیٹے تھے پر تھرتے ہوئے برطانیہ کے ساحل تک پہنچ گئے تھے۔ کڑھت ساٹھ سال سے وہ زندہ لاش بنے پڑے تھے۔ سراسر افراسیاد اور اس کے مدد سے انڈیا لندن میں میری موجودگی کا علم ہوا۔ لہذا وہ مجھے اپنا وارث مقرر کر کے مر گئے۔

اب مجھے لوٹ کے پاکستان جانا پڑا۔ ست بدھائی کی مالی شان مگر محسوس نہیں کی جانے والی جوئی اور جاگیر ساٹھ ستر سال سے غیر آباد پڑی تھی ریاست کی بی بی روڈ پر لاہور اور جہلم کے درمیان دینے جانے والی سڑک پر پتاس کے قلعے کے کھنڈر سے چند فوٹو میٹر کے فاصلے پر تھی۔ ایک ٹیکسٹر جو پہاڑ کا پہاڑی سلسلہ اور ٹیلا کو بیان تھا، دوسری طرف دریائے کین تھا جس پر بجلی بنانے کا منصوبہ سال ڈیم آگن کوٹیشن نے مطلع ہوا کہ وہ کین پتھر پر ڈالنے کا ڈال دیا تھا اور دیگر دیکھو کیل سیکل شیشم کے درختوں کا جنگل تھا۔ جوئی کے چھٹا نمونہ ہندو مجبور یوں اور مفلوج افراد یوں سے ملے تھے جسے میرے جوارات، سونے چاندی کے زیور، برتن اور شیش ہاتھو اورات کا جن میں گڑیاں بھی شامل تھیں اتنا بڑا خزانہ ملا جس کی مالیت کروڑوں سے بڑھ کر اور ایک ہجرتی بیٹی تھی۔ اس کے آخری مالک برسوں میں ایک پھر لگا جاتے تھے۔ ان کے مقرر کردہ حافظ اور ملازم جوئی کے احاطے میں بنے سرفروٹ کوارڈر میں رہتے تھے۔

جب میں نے گردنوں کے دیہات میں بیٹے والوں کی زیویں حالی دیکھی تو لندن واپس نہ جانے کا فیصلہ کیا۔ خود میرے والدین بھی جا چکے تھے۔ اپنے چند دوستوں کی کلمی حمایت سے میں نے علاقے کی ترقی کے لیے ایک پروگرام بنایا جس میں اسکول اور اسپتال قائم کرنے کے علاوہ جنگلات کا فروغ، فریجی بنانے اور اسپتور کرنا اور دریائے کین سے پین بجلی پیدا کرنے کا منصوبہ شامل تھا۔ میں علاقے کے مفلوکہ اہل لوگوں کو روڈ کار کے ساتھ رہائش، تعلیم اور بہت عزت زندگی دینا چاہتا تھا۔ مجھے دوستوں سے مدد اور لوگوں سے پذیرائی لی لیکن علاقے کا جدید پیشی جاگیر میرا دشمن ہو گیا۔ روایتی ڈیڑھ بے طرح دو کھیتی باڑی رعایا کے ساتھ جانوروں سے بدتر سلوک کرتا تھا۔ خود کو گاناں جانے والے اور بڑا بڑا کا جھنگ تھا، انڈین کی تیل میں پایڈز تھیں جہاں کھانا اور معمولی طور پر شکاری کی توں کے آگے ڈال دیتا تھا۔ اسے گوارا نہ تھا کہ اس علاقے کی غلامی و غلامی سے اپنے۔ اس کی بھرپور عداوت کے باوجود میں نے اپنا کام جاری رکھا اور اسکول کے ساتھ اسپتال بھی قائم کر دیا۔ میری انسان دوستی اور بھرپور کی شہرت پہلی کوئی زمانہ گواہی موبائی اسکی کی سیٹ فخر سے میں آخر آئے گی جسے وہ اپنا موروثی حق سمجھتا تھا۔

ابتدا میں شہر چھوڑ کر میرے ساتھ آنے والوں میں میرا نامور صحابی دوست راجا اور اس کی محبت و ڈاکٹر شہناز کے علاوہ میری چچا زاد بہن راجہ اور میرے والدین شامل تھے۔ ہر علاقے کا کافی گرامی ڈاکٹر اور صحابی اور دوست بن گیا جس کے گرد وہ دہشت پس برقی سوار ہو گئے۔ شاہی بادشاہ نے میرے کہنے سے فیصلہ کیا کہ جب چیف منسٹر اسپتال کے قیامی منصوبے کا افتتاح کرنے آئے گا تو وہ اپنے گروہ کے ساتھ بھسار پیچنگ دے گا اور معافی ملنے کے بعد ست بدھائی میں باعزت زندگی گزارے گا لیکن اس خفیہ پروگرام کی خبر دشمنوں کو مل گئی اور انہوں نے پولیس مقابلے کا ڈراما راجا کے سب کو راستے میں مار ڈالا۔ دشمنی شاہی بادشاہ کو اس کی بیوی کوئی نکال کر لے گئی۔ خود مجھے انکار کرنے اور کھل کر اس کی کوشش کی بار ہو گئی جو میرے محافظ اور مستتر خاص میں کی ذہانت، حاضر دماغی اور جرأت سے کام لیا۔

شرعی قانون وراثت کے مطابق مجھ سے پہلے ریاست کے وارث میرے والد اور چچا ہی ہوتے لیکن مجھے وصیت کی رو سے مالک و بھرا بنانے والا برطانوی شہری تھا اور خود میں نے برطانیہ میں قیام اور ملازمت کے دوران برطانوی شہریت حاصل کر لی تھی چنانچہ اس فیصلے کو پاکستان کی کسی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جاسکتا تھا۔ چچا اور چچا کی خواہش کے مطابق اگر میں ان کی اکلوتی بیٹی راجہ سے شادی کر لیتا تو حق ممبئی کا ڈاکٹر ہو سکتا تھا لیکن میں فریال کے مساوی کو قبول نہیں کر سکتا تھا۔ میں صدمہ منگتی کی جان لینے کا سبب بنا اور مجبور ہو چکا یاں ہو گئے۔ انڈین قہانے کی حوالات میں نقل کر دیا گیا لیکن پولیس نے اسے بھی خودی قرار دے کر معاملہ دیا دیا۔ میں نے راجہ کو بہن کا درجہ دیا اور وہ ست بدھائی میں میرے ساتھ رہی۔ اس نے عہد کی شادی میں دوبارہ کھانا کھایا۔

بدھیتی سے دھوکا دینے والے میرے دوست تھے رشتہ راتہ راتہ بھی مجھے حق ممبئی اور اپنے والدین کی موت کا ڈسے دار کھینچے گی۔ جوئی میں آنے کے بعد میں نے ایک پرانے محافظ کی بیوی نور جہاں کو دیکھا جو ر حقیقت اس کی راشی تھی۔ اس محافظ نے جوئی کو لوٹ کے بہت دولت اکٹھی کی تھی اور بدھو فرشتی سے خلیات فروشی تک ہر کاروبار میں نور جہاں کو استعمال کرتا تھا۔ میں نے دیکھا کبھی کسی لیکن نور جہاں جیسی عورت نہیں دیکھی۔ اس کے حسن و شباب کی چٹا کاری سے دنیا کا کوئی مرد خود کو کھو دیکھ سکتا تھا۔ پہلی ملاقات میں ہی نور جہاں نے مجھے کر لیا تھا کہ وہ مجھے حاصل کر کے رہے گی۔ اس نے مجھ سے سراسم استرا کر کے میں جائزہ مانا کر کوئی دیکھا فریال سے محبت اور شادی کے عہدہ بیان کے باوجود میں نور جہاں کے جال میں بری طرح پھنس گیا۔ اس نے میرے لیے اپنے نام ہندو شہر کو بھی لے کر دیا اور میں نے اسے قانون کی گرفت سے بچانے کے لیے دن رات ایک کر دیے فریال پہلے ہی ست بدھائی جیسے دہشت گردانے میں داخل ہو گئی۔ وہ میرے ساتھ لندن، پیرس اور نیویارک جیسے شہروں کی چکا چوندی زندگی کے خواب دیکھی تھی نور جہاں کے معاملے نے اسے جواز فراہم کر دیا اور وہ لوٹ کر شہر یوں میں قدم جمانے کے لیے میرے بدترین دشمن چوہری سلطان کے پاس پہنچ گئی۔ اس بار اخلاقی حدود کی پروا نہ کرنے کے باعث اسے زبردست کامیابی ملی۔ موقع ملنے ہی اس نے چوہری سلطان کو قتل کر دیا اور اپنے اعلیٰ سراسم کے باعث قانون کی گرفت میں آنے سے بھی محفوظ رہی۔ اس نے اپنا دولت کے ساتھ شہریت کمانے کا خواب پورا کیا لیکن بدھائی زیادہ کمائی۔

نور جہاں کس کے اثرات سے بچنے کے لیے طویل عرصہ روپوش رہی۔ پھر ماہ نور بن گئی۔ ایک شہنشاہ کا دربار اور اسپتور کا حصول مشکل تھا۔ میں اسے لندن لے گیا تاکہ وہ کچھ عرصہ وہاں گزار کر انٹرنیڈ ڈیکوریشن کا کورس کرے اور پھر اپنی حق شخصیت کے ساتھ ست بدھائی پہنچ جائے۔ میں اسے لاہور آرٹس کی مدد سے برطانوی شہریت بھی دلوانا چاہتا تھا۔ دوسرا بعد لندن پہنچ کر کچھ پراگشکاف ہوا کہ عاشق دوبارہ لطیفان بن چکی ہے اور پڑھتیں کے باعث نشہ کرتی ہے۔ شادی ہونے کے باوجود وہاں تو جہانوں کے ساتھ مشغول خاندان میں رہنے چلی جاتی ہے۔ اس کی ماں مرگئی تھی اور باپ سیاسی اور کاروباری معاملات میں الجھا ہوا تھا۔ عاشق کا مشغول مجھے دیکھتے ہی پھر ایک جنون کی شکل میں لوٹ آیا، اسے نور کو انکار کیا کہ اب مجھے مجبور کیا کہ اب میں اس سے شادی کروں۔ نور کی جان بچانے کے لیے مجھے یہ ڈراما بھی کرنا پڑا۔ چند دن بعد اس کے عیاش باپ کو لاہور پر اس کی وارث شہریت کا عاشق کی لیکن وہ جانتا تھا کہ عاشق اس کی برسی لپٹا کر چلا جائے گا لیکن اس نے میرے لیے پہلے اپنی ایک سوئیں لیکن پاؤں ڈھکی جائے گا اور پھر اس کا رو با مالک مجھے بنا دیا۔ وہ کھتا تھا کہ مجھ سے شادی کے بعد عاشق کی ٹھیک ہو جائے گی اور وہ یوں ہی اس کے وارث ہوں گے۔ میرے انکار اور اس باپ کی موت نے عاشق کے احساس جرم کو نشہ پد ترک دیا اور وہ اپنے ہوں کا قہار ادا کرنے کے لیے ترک دنیا کر کے جہنم میں بن گئی اور میرے کھانے کے باوجود اس نے واپس آنے سے انکار کر دیا۔

قدرت کی طرف سے خوش نصیبی کی یہ دوسری لازمی میرے لیے ایک آزمائش بن گئی، میرا بھی میں وسیع کاروبار، شاندار مل اور بے اندازہ دولت کا مالک بن گیا تھا۔ یہ طور یہاں اکیلے رہنے پر راضی تھی اور وہ ہاتھ بڑے بڑے کھلا سکتی تھی۔ پاکستان میں ست بدھائی کی ریاست، جوئی اور میرے ترقیاتی منصوبے تھے۔ میں یہاں رہتا تھا واپس جاتا۔ پھر ہندو فریق معمولی واقعات پیش آئے۔ ایک مجھ کو جھڑپ میں گیا جو چیف کہلاتا تھا۔ اس نے دس سال پہلے لاہور میں مجھے اپنی سیاسی تنظیم میں دہشت گردی کے لیے استعمال کیا تھا۔ اب وہ لندن میں جلا وطنی اور روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ اس نے کہا کہ اگر میں اسے اپنا سیاسی مشیر بناؤں تو آئندہ انتخابات میں اسے خریف رانا کو شکست دے کر صوبائی اسمبلی میں بھیج سکتا ہوں۔ اس کے بغیر میرے مقاصد حاصل نہیں ہوں گے اور سیاسی فٹنڈ آگرمی کے پھٹنڈے سے آزمانے بغیر مجھے کامیابی نہیں ہوگی۔ میں نے بھلاہ اس کی پیشکش قبول کر لی۔

ست بدھائی کے اسپتال کو دست دینے میں میرے ساتھ ایک ڈاکٹر باپ بیٹا شامل تھے، اس کی تیسری کن فیض بھی ڈاکٹر تھی لیکن محبت میں ناکامی اور پھر شوہر کے قتل نے اسے نفسیاتی سرکش بنا دیا تھا۔ مجھ دیکھتے ہی اس نے مجھے اپنا سابق محبوب وحید مانا یاد دہشک مار گئی ہو گئی گی۔ وحید ایک اہل ابائی مصور تھا جو لندن میں عیاش تھا، رہتا کہ اپنا نام لے کر اپنے چچا کے ساتھ رہتا تھا۔ مجھ سے اپنی جان بچانے کے لیے وحید کو پاکستان لے جانا ضروری تھا۔ میں اس سے ملا تو مجھ پر دیا۔ وہ وہ بہرہ گیری کارکن کا بیوی اور ایک تک شیش کے مشق کا بہار تھا۔ میں نے اس کے تمام قہرے بے باقی کیے اور اسے اپنے ہمراہ پاکستان لے جانے پر آمادہ کر لیا۔ چیف نے مجھے پہلی بیوی دی کہیں وہ کھانے کو اپنے ذہنی کیت کے طور پر بھی استعمال کر سکتا ہوں۔ چیف کا کل نام قلام علی تھا۔

اب فریال میری زندگی سے کھل چکی تھی۔ میں یہ کر سکتا تھا کہ ست بدھائی کو راجہ کے سپرد کروں تاکہ اس کا حق ممبئی کا احساس فتم ہو اور خود نور کے ساتھ لندن میں رہ کر کاروبار کو مزید پھیلانے کیونکہ عاشق کا چرچ سے لوٹ کر پھر دینداری کی طرف آنا عید از قیاس تھا۔ بالآخر نور کے کھانے سے میں نے لندن اور ست بدھائی دونوں جگہ رہنے کا فیصلہ کیا تاکہ نہ کاروبار ستر ہو اور نہ ترقیاتی منصوبے یا میرا سیاسی مستقبل فتم ہو۔

لاہور آرٹس کے تمام ملازم مجھے ساری خرابی کا ڈسے دار کھینچے تھے۔ وہ سب اسٹیج جالمازمت چھوڑ گئے۔ لاہور کے سابق شوہر اور پاؤں کا ڈرنے میری راستوں سے بے خبری کے باعث ایک ویران احاطے میں لے جا کر قتل کرنے کی کوشش کی جہاں اس کے دو دیگر پہلے سے موجود تھے۔ انڈین مارشل آرٹ میں میری مہارت کا اندازہ کیسے ہو سکتا تھا۔ ان تینوں کو ایک آؤٹ کر کے میں نے قلام علی کو طلب کیا اور خود۔ علیہا نے مجھے چرچ چلا گیا۔ قلام علی نے احاطے میں کھڑا کرکیش چلا کر بیت کے دھرم میں لاکھوں کو دیا جو وہاں پہلے سے موجود تھا۔ چوہیں مجھے گزرنے سے پہلے وہ گردن کا ہو گیا۔ میں نے اپنے بیان میں وہ سب بتا دیا جو قلام نے امداد میں بتایا تھا۔ چار کے بدگنا راجہ جانی جان بچانے کے لیے وعدہ صاف گواہ بن گئے۔ عدالت میں سماعت فتم ہونے کے بعد ایک عورت چرچ چرچ کر مجھے لاہور آرٹس کا قاتل قرار دینے لگی۔

3 اب آپ مزید واقعات ملا جملہ فریال سے

گیٹ کے پاس جو شخص کلا شتوف نما کوئی آتھیں میں مصروف تھا۔ وہ اپنی گن کو ایک ہاتھ سے اوپر اٹھاتا تھا۔ اسلحہ تھے بے نیازی سے کھڑا تھا، وہ ایک بے مصرف کھیل پھر دوسرے ہاتھ سے اس کو اس گرفت میں لینے کی مہارت پر

پکٹ رکھا تھا۔ میں نے سخت جدوجہد کے بعد اپنے درد سے سکتے جسم کو حرکت دی اور ہاتھوں کے بل خود کو اُپر اٹھایا۔ میری بھوک اور پیاس لکھنٹ لوٹ آئی۔ میں نے جھپٹ کر پانی کی بوتل اٹھائی اور کئی گھونٹ لیے۔ اس سے میرا سانس پھول گیا اور مجھے تسلی محسوس ہوئی، تھوڑا سا پانی واپس نکل گیا۔ احتیاط۔ احتیاط۔ میرے دماغ نے مجھے ٹوکا، میں رک گیا۔ چند منٹ بعد میں نے تھراپسٹ فاسک کو تھوڑا سا میز چاہا۔ اس میں سے بھاپ دھنکی کافی میز پر گری۔ ایک بار پھر صبر کا دم کا دماغ تھک رہا تھا۔ مجھ سے پھوٹ گیا اور میں نے بسکٹ کے پکٹ کو بھاڑ دیا، پکٹ کھٹکے نیچے گرے، کسی وحشی کی طرح میں نے چار بسکٹ چپاے بغیر نکل لیے، میرے حلق میں پھنسا سا لگا، میں نے کافی کے تھرماس ٹنگ میں الٹا اور گرم گرم کافی کا ایک گھونٹ لیا تو ہونٹوں کے ساتھ میری زبان بھی جل گئی۔ میں نے پروا نہیں کی۔

دس منٹ بعد نہ ہاں بسکٹ کا کوئی ریزہ بچا تھا اور نہ تھرماس میں کافی لیکن میری حالت میں نمایاں تبدیلی آئی تھی۔ اب میں کھڑا ہو سکتا تھا، میں چل کے دروازے تک گیا اور اسے کھولنا چاہا مگر وہ باہر سے بند تھا۔ میں نے اس پر زور زور سے ہاتھ مارے، پھر کھڑکی کا پردہ ہٹا کے دیکھا۔ مجھے کچھ نفرت آئی۔ باہر اندھیرا تھا یا کھڑکی کے شیشوں کے سامنے سیاہ پردہ۔

میں نے دوسرے دروازے کو دیکھا۔ وہ ہاتھ روم ہی تھا، میں پھر بند پر ایڑیاں میرے خد، یہ میں کہاں پھنس گیا۔ میں کب سے یہاں ہوں اور مجھے اسیر رکھنے والے کون ہیں؟ رفتہ رفتہ مجھے سب یاد آ رہا تھا۔ میں سامنے کے بلائے پر اسٹیل اور گھوڑوں کا سودا کرنے گیا تھا، اس نے کہا تھا کہ لارڈ ارلٹ کے دوست ڈیوک آف کنٹر شائر ہیں۔ ریس کے میدان میں ان کے سب سے بڑے حریف تھے اور وہ مجھ سے منہ مائی قیمت پر تمام گھوڑے خریدنا چاہتے تھے۔ اس کے لیے وہ مجھے بلینگ چیک دے رہے تھے۔

پھر وہاں سے مجھے اغوا کیا گیا۔ یہ اغوا کار کون تھے؟ وہ مقامی اسکن ہیڈ فٹلے نہیں تھے۔ میری اپنی زبان بولنے والے ایشیائی تھے، میری جان کے دشمن تو گورے ہو گئے تھے۔ لارڈ ارلٹ کے پرانے تنگ خوار۔ ایشیاء کے ہمدرد۔ اس کی فرم کے ملازم۔ عام اگرچہ جو ایک عالی نسب لارڈ کی جگہ میرے جیسے کالے ایشیائی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے، لیکن مجھے اغوا کر کے قید میں رکھنے اور اذیت دینے والے تو گورے نہیں تھے۔

پھر کیا وہ کرائے کے بدعاش تھے؟ گوروں نے خود کو شک سے محفوظ رکھنے کے لیے انہیں استعمال کیا تھا؟ آج کل ہر چیز کرائے پر ملتی ہے۔ کرائے کے قاتل، کرائے کے گواہ۔ میں جب چھوٹا تھا تو سب سے چھپ کر کرائے کی سائیکل لیتا تھا اور ہاکی گراؤنڈ میں چلاتا تھا، ایک پارکی منفرد اور مشتعل کھانے نے نگر ماری تو سائیکل سے گر کے میری ٹانگ ٹوٹ گئی تھی اور باکو پتا چل گیا کہ مسجد میں سپاہ پڑھنے کے بہانے میں کہاں گیا تھا۔

نور کا خیال بجلی کے کوندے کی طرح میرے دماغ میں آیا۔ جیسے خاموش تاریک رات میں پتا نہیں چلا کہ گھٹا کب اٹھی اور اچانک بجلی چمکتی ہے۔ کیا اس کے ساتھ بھی، نہیں۔ اس کا کوئی قصور نہ تھا۔ میاں نواب صاحب قبلہ۔ اس کا یہ قصور کیا کم ہے کہ وہ تمہاری ہے، جیسے یہ جان تمہاری ہے، یہ زندگی تمہاری ہے، عذاب جسم پر آئے گا تو جان بھی جائے گی۔

میں نے اپنا سر تھام لیا، معلوم نہیں وہ کہاں اور کس حال میں ہوگی۔ اسے کچھ پتا ہے یا نہیں۔ کب سے میں اس جہنم میں ہوں۔ ایک دن۔ ایک ہفتہ۔ ایک مہینہ۔ کچھ معلوم نہیں۔ کیا راجا کو کچھ معلوم ہوگا؟ میری اچانک کشدگی کے بعد کیا ہوا ہوگا۔ لندن کی پولیس تو وارادات سے پہلے اس کا سراغ لگانے کی شہرت رکھتی ہے۔

ابھی تک کسی نے میرا سراغ کیوں نہیں لگایا۔ آخر اس وحشیانہ کھیل کا انجام کیا ہوگا۔ میری موت؟ مگر کیا میری موت سے سارے مقاصد حاصل ہو جائیں گے۔ وہ سب کچھ میرا ہی رہے گا جو از روئے قانون مجھے ملا ہے۔ اور جو میرا ہے وہ میرے بعد ان کی ملکیت ہوگا جو میرے وارث ہوں گے، لیکن ابھی کون ہے میرا وارث؟ نہ میری بیوی ہے نہ بچے، نہ بھائی نہ بہن۔ جو ہے صرف ایک راہب ہے جو خون کا رشتہ ہونے کی بنا پر جتنی وراثت رکھتی ہے اور قانون سے یہ حق تسلیم بھی کر سکتی ہے۔

یہ کوئی اطمینان بخش یا مثالی صورت حال نہیں تھی راہب کے پاس ابھی اپنا کچھ بھی نہیں تھا۔ جو تھمیرا ہونے کے ناتے اس کا بھی تھا۔ کم سے کم میں ایسا ضرور بچھتا تھا لیکن خود راہب اس سے مطمئن نہیں تھی۔ وہ کہہ رہی تھی کہ اسی میں کیا ہوں؟ میرا کیا ہے، کچھ بھی نہیں۔ جو ہے تم سے ایک رشتے کی بدولت ہے۔ شاید تم ہو، میں صرف تمہاری وجہ سے شہزادی ہوں ورنہ کچھ نہیں۔

میرے خیالات کی رو ایک دھماکے سے بکھر گئی،

اچانک دروازہ کھلا اور چیف اندر آ گیا۔ ایک لمبے کے لیے میں چپک چپکا تاک بھول گیا۔ یہ ایسا نظارہ تھا جو میری آنکھوں کے لیے اور آنکھوں کے ویلے سے دماغ تک پہنچنے والے مرکز اطلاعات کے لیے ناقابل یقین تھا۔

بے اختیار میں نے کہا۔ ”تم۔۔۔۔۔“ چیف اپنی مخصوص وضع قطع، بریکر انداز اور پردہ نعت چال کے ساتھ لیوں پر فاختانہ مسکراہٹ سجائے آگے بڑھا اور صوفے پر براجمان ہو گیا۔ اس نے سگریٹ کا کش لے کر دھواں اور چھوڑا اور بولا۔ ”ہاں۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔“

”لیکن تم تو۔۔۔۔۔“ میں سوال کرتے کرتے رک گیا۔

”میں۔۔۔۔۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہارا سوال ادھورا کیوں رہ گیا۔ خود تمہیں بھی اعزاء ہوا ہوگا کہ ایک شخص دو جگہ نہیں ہو سکتا۔ بالکل نہیں ہو سکتا نواب رفیق احمد شیرازی، تم یہاں ہو تو ست بدھالی میں نہیں ہو سکتے، لیکن تمہیں کیا معلوم کہ تم کہاں ہو۔ لندن میں یا ست بدھالی میں۔۔۔۔۔ ہاں میں تمہارے سامنے ہوں، ون ہنڈرڈ پرسنٹ۔ کیونکہ چیف کسی قید خانے کے لیے نہیں بنا اور کوئی قید خانہ ابھی تک چیف کے لیے نہیں بنا۔“

”کیا تم کو نہایت پر ربائی مل گئی ہے؟“

اس نے قہقہہ مارا۔ ”کیونکہ پتر۔۔۔۔۔ تم پیدا آئی انگریز نہ کسی۔ لندن کے باسی اور برطانوی شہریت رکھتے ہو۔ کیا تمہارے خیال میں یہاں بھی وہی جملہ لو چلا ہے جو اپنے وطن میں ناممکن کو ممکن کر دکھاتا ہے؟ کیا اس نظام انصاف میں یہ ممکن ہے کہ ایک شخص جس پر قتل عہد کا الزام ہو، واقعی شہادت اس کے خلاف ہو اور ایک نہیں تین تین چشم دید گواہ اسے بھکی کی کڑی پر بٹھانے کے لیے بے چین ہوں۔ کوئی جیل توڑ کے نکل آئے۔“

”اسی لیے میں ابھی تک یقین کرنے سے قاصر ہوں کہ تم ہو۔“

”کم آن۔۔۔۔۔ مجھے چھو کے سوچو کہ دیکھو۔۔۔۔۔ ہم تو بہت قریب رہے ہیں، آنکھوں سے نہ دیکھو، تم پھر بھی میرے وجود کو محسوس کر سکتے ہو۔“

”اوکے۔۔۔۔۔ واٹ ناؤ۔۔۔۔۔ جو ناممکن تھا، تم نے ممکن کر دکھا یا مسٹر ہیرمن۔“

”واٹ ناؤ۔۔۔۔۔ تم ہی بتاؤ۔۔۔۔۔ کیا کرنا چاہتے ہو۔“

”تمہیں اپنا اور میرا وقت ڈرامائی ڈائلاگ بازی میں ضائع نہیں کرنا چاہیے، اگر تم نے مجھے زندہ چھوڑ دیا تو میں پھر

وہی کروں گا، جو میں نے کیا تھا۔ تم کو اتنا بے وقوف سمجھنے کی غلطی میں کیسے کر سکتا ہوں۔ جہت کل ہی یو باسٹرولڈیز کو۔“ میں نے چلا کے کہا۔

اس نے سگریٹ کے نصف حصے کو قالین پر ڈالا اور جوتے سے ٹکڑے بچھا دیا۔ ”تم نے یہ کچھ سمجھا تھا کہ چیف ایک آدمی ہے، میں واقعی تم سے تعاون کا جذبہ رکھتا تھا اور تم ابھی تک انتقام کی آگ میں جل رہے تھے۔ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی۔ کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی تم نے مجھے سزائے موت دلوانے میں۔ ارے ہمت تھی تو خود کھ کر تے مجھے۔“

اچانک ایک ایسی بات ہوئی جس کی بظاہر کوئی اہمیت نہ تھی لیکن اس نے پوری پوزیشن بدل دی۔ چیف کے پیچھے وہ دروازہ تھا جس سے اس نے ڈرامائی انٹری دی تھی، اندر آنے کے بعد اس نے دروازے کو متغیر نہیں کیا تھا۔ ایسی غلطی وہ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ دروازے کے باہر سب محافظ ہوں گے۔ چیف بھی یہی دیکھ نہیں لے سکتا تھا کہ ان کے اندر آنے کا راستہ بند کرے اور میرے رحم و کرم پر رہ جائے۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کے سامنے ہونے اور میرے خالی ہاتھ ہونے سے فرق نہیں پڑتا۔ میں وہ موقع خود بھی حاصل کر لیتا ہوں جب اس کے ریوالور کی جھک لگایاں بے مصرف ثابت ہوں اور میں ایک وار سے اس کی گھینے جیسی گردن توڑ دوں۔

دروازہ جیسے ہوا سے ہلا اور کوئی آہٹ پیدا کیے بغیر ایک بلی اندر آ گئی۔ وہ سیاہ رنگ کی سیاہ بلی جوان اور خوبصورت تھی۔ دے پاؤں چلتی ہوئی وہ آہستہ آہستہ چیف کے قریب پہنچ گئی۔ مجھ سے بات کرتے کرتے چیف نیچے جھکا اور اس نے بڑی نرمی سے بلی کو اٹھا کے اپنی گود میں بٹھالیا اور پیار سے اس کے ریشمی بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

میرے لیے یہ نظارہ ناقابل یقین تھا۔ میں جانتا تھا کہ چیف کو بلیوں سے الٹی ہے۔ وہ بلیوں کے خوف کی نفسیاتی بیماری میں مبتلا تھا۔ دنیا کو کچ کرنے کے خواب دیکھنے والا عظیم ہنر جس نے آدھی دنیا کو تباہ کر دیا تھا۔ لاکھوں انسانوں کو مروا دیا تھا اور جس کے یہودیوں پر مظالم کی انسانیت سوز داستانیں تاریخ کا حصہ ہیں۔ وہ بھی بلی سے ڈرتا تھا، شاید زندگی میں اس کی دو ہی کمزوریاں تھیں، ایسا براؤن کی محبت اور بلی سے ڈر کا نفسیاتی مرض۔ دونوں سے وہ مرے دم تک نجات حاصل نہ کر سکا تھا۔ دوسری جنگ عظیم میں شکست کے بعد جب اس نے ایک دکانے میں خوشگوشی کی

تو اس کے ساتھ مرنے والی صرف اپوا براؤن تھی۔
چیف کی اس دہشت اور جسمانی کمزوری کا علم مجھے پہلے سے تھا۔ ملی اگر اتفاق سے بھی اس کے سامنے آ جاتی تو چہرے پر خوف کے آثار پسینے کے قطرے بن کے نمودار ہو جاتے تھے۔ اس کے ساتھ وہ جھٹکتے لگتا تھا اور بی کو فوراً دور کیا جاتا تو اسے دے کا سا دورہ پڑ جاتا تھا۔ خواتین کا چھٹکی یا کا کروچ سے دہشت زدہ ہونا ایک عام بات ہے حالانکہ دونوں ہی بے ضرر مگر بے خطر بات ہیں۔

یہ ناممکن تھا کہ چیف کی کوچھو بھی سکے۔ یہاں اس نے میرے سامنے بی کو گود میں بٹھا رکھا تھا اور بڑی محبت سے اس کو سہارا رہا تھا۔ اس کا ہرگز مطلب یہ نہیں تھا کہ اس نے اپنے نفسیاتی خوف پر قابو پایا ہے یا اس نے اپنی الاربی کا علاج کر لیا ہے۔ یہ دونوں کام ممکن نہیں ہوتے چنانچہ اس کا ایک اور صرف ایک مطلب نکالا جاسکتا تھا۔

وہ چیف نہیں تھا۔ اس جیسا تھا۔ اس نتیجے پر پہنچنے میں مجھے دیر نہیں لگی لیکن میں نے پوری کوشش کی کہ میری صورت کے تاثرات میں تبدیلی نہ آئے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اپنے سامنے بیٹھے چیف کے نقش پانی کو زیادہ غور سے دیکھنا شروع کیا اور چند منٹ میں ایسی بہت سی علامات تلاش کرنے میں کامیاب رہا جو میرے یقین کی تائید کرتی تھیں۔

چیف بے چند بار ملنے والا یا اسے سرسری نظر سے دیکھنے والا اصلی نقلی کے فرق کو محسوس نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی صورت کے نقوش وہی تھے۔ بالوں کا اندازہ اور آنکھوں کا رنگ بدلا جاسکتا تھا۔ قد کا ٹھہ اور وزن کے فرق میں انہیں میں کے فرق کو نوٹ کرنا مشکل تھا۔ کپڑے اس نے بالکل چیف جیسے پہنے تھے لیکن اصل کمال اس کی آواز کا اور اس کے انداز و اطوار کا تھا۔ یہ کمال اس نے یقیناً مشق اور مہارت سے حاصل کیا ہوگا۔ اس کا Mannerism کی نقل کرنا قابل تعریف تھا۔ وہ اسی طرح سے ہاتھ ہلاتا، ویسے ہی آنکھیں کھمکتا تھا۔ ہونٹ مسکیرتا تھا۔ وہی الفاظ عمار سے یہاں تک کہ گالیاں بھی وہی استعمال کرتا جو چیف کرتا تھا اور آواز کا لہجہ بھی اس نے نقش مطابق اصل کر لیا تھا۔

اپنا ڈبلی کیٹ رکھنا بہت سے مشہور لوگوں کے لیے سیکورٹی کی ضرورت بن جاتا ہے۔ حقیقت کوئی نہیں جانتا کیونکہ یہ بات ہمیشہ ٹاپ سیکریٹ رکھی جاتی ہے۔ مشہور ہے کہ جنرل پرویل کا ایک ڈبلی کیٹ تھا۔ بعض اوقات وہ بظہر سے خفیہ جنگی حکمت عملی پر مدد کرات کرنے میں مصروف ہوتا

تھا اور اس کا ڈبلی کیٹ فوجوں کی کمان کرتا رہتا تھا۔ اپنے ملک میں مرحوم امیر محمد خان نواب آف کالا باغ کے بارے میں بھی ایسا ہی کہا جاتا ہے کہ کہیں وہ خود نہیں جانا چاہتے تھے تو اپنے ڈبلی کیٹ کو بھیج دیتے تھے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ اس کی افادیت یقیناً کچھ میں آتی ہے۔ آج جب ہمارے حاکم ورجنوں حلقہ جی گاڑیوں اور سیکڑوں محافظوں کی معیت میں کسی سڑک سے گزرتے ہیں تو ایک جیسی بہت سی گاڑیوں میں سے کسی ایک میں ہوتے ہیں۔ دیکھنے والے کو کچھ پتا نہیں چلتا کہ وہ کس میں تھے۔ خدا نخواستہ کوئی انہیں مارنا بھی چاہے تو کسے مارے۔ یہ تو بہت ہی آسان ہے کہ اپنے ڈبلی کیٹ کو سرکاری گاڑی میں روانہ کریں اور خود نکل جائیں کسی میں یا موٹر سائیکل پر تو ان کی طرف کسی کا گمان بھی نہیں جاسکتا۔

چیف نے ایک زمانے میں بڑی دہشت گردی پھیلائی تھی اور اس کی جان کے دشمن بہت تھے۔ ظاہر ہے مارے جانے کا خوف اسی کو ہوگا جس کا کوئی جانی دشمن ہوگا۔ جس کو یہ ڈر نہ ہو، وہ حفاظتی انتظامات کے بارے میں سوچے گا بھی نہیں۔ اس زمانے میں چیف نے بڑی تلاش کے بعد اپنا ایک ہم شکل رکھ لیا تھا۔ یہاں ایک دلچسپ واقعہ کا ذکر بھی میں نہیں کر سکتا۔ فلموں میں ڈبلی کیٹ عام ہوتے ہیں۔ مای گرائی ہیرو جو مشکل اور جان جو کھوں کا کام نہ کر پائیں یہ ڈبلی کیٹ کرتے ہیں کیونکہ ان کی جان اتنی قیمتی نہیں ہوتی۔ فلم ”شبستان“ کی شوٹنگ کے دوران فلم انسٹار شیاں کی حادثاتی موت ہو گئی تھی، باقی آدمی فلم اس کے ڈبلی کیٹ کے ساتھ پوری کی گئی اور دیکھنے والوں کو کہیں بھی فرق کا پتا نہیں چلا۔

میں نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے نقلی چیف میں باریک بینی سے چند فرق تلاش کیے۔ اخبار رسالوں میں اکثر دو ایک جیسی تصویریں شائع ہوتی ہیں کہ فرق بتائیں۔ یہ بھی ایسا ہی کیس تھا۔ ایک تو مجھے اس شخص کی گردن کے نچلے حصے میں دائیں جانب تل نظر نہیں آیا۔ تل اس کے اوپر والے ہونٹ پر تھا جو چیف کے ہونٹ پر نہیں تھا۔ نقلی چیف کے بائیں ہاتھ کی انگلی میں منگنی کی انگلی تھی۔ اصل چیف کے دائیں ہاتھ میں تھی اور برسوں بعد یہ انگلی ایسے پھس چکی تھی کہ اسے اتارنا ہی ناممکن تھا۔ مزید یہ کہ اصل چیف کی انگلی میں تھکینے پر انگریزی حرف ایس کندہ تھا۔ ہو سکتا ہے اس کی کسی منگنیتر کا نام ایس سے شروع ہوتا ہو۔ منگنی وہ کرتا رہتا تھا اور شادی اس نے فرزانہ نام کی ایک ماڈل سے کی تھی جو صرف

چھ ماہ اس کے ساتھ رہی اور پھر غائب ہو گئی۔ چیف نے کہا کہ وہ غلاق لے کر امریکا چلی گئی مگر اس کی تصدیق کبھی نہ ہوئی۔ نقلی چیف کی انگلی پر کوئی نگینہ نہیں تھا۔

جب مجھے سارے ثبوت مل گئے تو پورا یقین ہو گیا کہ میرے سامنے بیٹھا ہوا بہرو بیٹا ہے۔ اصل چیف تو اس وقت بھی پولیس کی تحویل میں اور کسی خیل میں بند ہوگا۔ یہ ایک اچھی چال تھی، جو ناکام ہو گئی۔ یہ ٹھیک ہے کہ میری فوت مشاہدہ نے بعد میں بڑا کام کیا لیکن چیف کے پلان کا بیڑا غرق کرنے والی تو درحقیقت وہی مصوم سی کالی بی بی تھی جو کسی پلان کے بغیر گھومتی پھرتی، ہاں آگئی۔ چنانچہ میں نے اسے تائید از دی سے موسوم کیا اور ایک دم مستعد ہو گیا۔ اب یہ ضروری تھا کہ اپنی ہوشیار سی ظاہر نہ کروں۔ یہ تاثر دیتا رہوں کہ میں چیف کو اصل ہی سمجھ رہا ہوں۔

خاموشی کے ایک مختصر وقفے کے بعد چیف صکرایا۔ ”یاد رہے اچھا ایکٹر بھی نہیں بن سکتے۔“ میں نے کوشش بھی نہیں کی۔

اس نے بی کو مجھ پر کھینچ مارا۔ بی نے دہشت زدہ آوازیں نکالیں اور چیخے کرتے ہی فرار ہو گئی۔ ”کوشش پوری کی تھی تم نے۔“ یادداشت کے ضائع ہونے کا ڈر مارا گیا تھا۔ میں نے سخت بے کہا۔ ”مجھے ترکیب خبر لگیا رہے کا علم نہیں تھا۔ اور میری جگہ تم ہوتے تو جان پھانے کے لیے کیا کرتے؟“

”یہ سوال کر رہے ہو تم مجھ سے؟“

”ہاں۔۔۔۔۔ اور کس سے کروں۔“

اس نے تہقیر مارا۔ ”مرنے سے اتنا ڈرتے ہو؟ کیا ہوگا اگر تم مر جاؤ گے؟ کچھ نہیں۔۔۔۔۔ یہ دنیا ایسے ہی چلتی رہے گی۔ ست بدھائی کی ریاست بھی۔ اور یہ شیرازی اینڈ سنی بھی۔“

”اس کے باوجود میں جینا چاہتا ہوں۔ جیسے تم جینا چاہتے ہو۔“

”یہ کی بات تم نے پہلی کام کی بات۔ اسے کہتے ہیں بٹائے باہمی کا سمجھوتا، جیواور جیسے دو۔“

”مجھ سے تم کیا چاہتے ہو؟“ میں نے کہا۔

”ویری سہل۔۔۔۔۔ میرے خلاف اپنے شوٹر چاری کے قتل کا الزام واپس لے لو۔“

میں نے کہا۔ ”چاری کی طبی موت نہیں تھی۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ وہ قتل تھا، اس کی لاش کو ٹکڑیوں کے ایک

کیفیت

میں نصران حضرات پر آتا ہے جو بے سوچے سمجھے یہاں کے موسم پر نکتہ چینی کرتے ہیں اور اس کی وضاحت نہیں فرماتے کہ انہیں کونسا موسم ناپسند ہے۔ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ کراچی میں موسم ہر لحاظ سے بھلاؤ کی طرح بدلتا رہتا ہے۔ ہم نے تو یہاں تک دیکھا ہے کہ ایک ہی عمارت کے کرایہ دار ایک منزل سے دوسری منزل پر تبدیلی آج آپ وہاں کی غرض سے جاتے ہیں۔ یہاں آپ دسمبر میں ملل کا کرتہ یا جون میں گرم پتلون پہن کر نکل جائیں تو کسی کو ترس نہیں آئے گا۔ اہل کراچی اس واللہ اعلم بالصواب قسم کے موسم کے اس قدر عادی ہو گئے ہیں کہ اگر یہ دو تین گھنٹے تبدیل نہ ہو تو وحشت ہونے لگتی ہے اور بڑی بوڑھیاں اس کو قرب قیامت کی نشانی سمجھتی ہیں۔ ہوتا ہے کہ کچھ خاصے خلاف اوڑھ کر سوائے اور صبح پٹکا جھلتے ہوئے اٹھیں۔ یا محکمہ موسمیات کی پیش گوئی کو ملحوظ رکھتے ہوئے صبح برساتی لے کر گھر سے نکلے اور دوپہر تک لوٹنے کے سبب بالائی بالا اسپتال میں داخل کرادے گئے۔ کہاں تو رات کو ایسی شفاف چاندنی چٹکی ہوئی تھی کہ چار پانی کی پتلیوں کے کھٹل گھن گھنے اور کہاں صبح دس بجے کھرے کا یہ عالم کہ ہر بس ہیلڈ لائٹ جلائے اور اوس سے بیگل سڑک پر خربوزے کی پھانک کی طرح پھسل رہی ہے۔ بعض اوقات تو یہ کھراٹا گھرا ہوتا ہے کہ نوواردوں کو کراچی کا اصل موسم نظر نہیں آتا۔ موسم کی کنون کی یہ کیفیت ہے کہ دن بھر کے تھکے ہمارے پھیری والے شام کو گھر لوٹتے ہیں تو بغیر استعارہ کے یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ صبح اٹھ کر بھول کی بھی گرم گرم موجک پہلی پچیں یا آگس کریم۔

مشتاق احمد یوسفی کی کتاب ”چراغ تے“ سے اقتباس

تھی اور سب کچھ واپس مانگ رہی تھی۔
”یہ ایلیشا کسے مان سکتی ہے۔“

”اس نے تسلیم کیا ہے کہ فون پر اس نے رفیق سے بات کی تھی تو اس بات پر انفس کا اظہار کیا تھا کہ وہ لارڈ ارلٹ کے خاندانی محل کو کبھی سچ رہا ہے اور ان کے انتہائی شوق سے پالے ہوئے گھوڑوں کو کبھی مزید یہ کہ وہ فرم کا نام بدل کے اپنے نام پر رکھ رہا ہے، لیکن وہ صرف درخواست کر سکتی تھی کہ رفیق ایسا نہ کرے۔ اسے روک نہیں سکتی تھی۔ مالک وہ ہے۔ اس نے کہا کہ ایک نن کے لیے جھوٹ بولنا گناہ عظیم ہوگا۔ اس لیے میں سچ کہوں گی۔ مجھے رفیق پر سخت غصہ تھا اور میں انتہائی رنجیدہ تھی، لیکن اس سے میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی کہ میں اپنا حق ملکیت واپس چاہتی ہوں۔“

”تمہاری مرضی کا بیان دینے کے لیے میرا عدالت میں حاضر ہونا ضروری ہے۔ اگر یہاں سے تم میرا حلف نامہ دستخط کروا کے لے جاؤ تو وہ قبول نہیں ہوگا۔“

”یہ مجھے بھی معلوم ہے، لیکن پتہ ہے۔“

”الو کے چٹھے۔“ نہیں کس نے حق دیا ہے کہ مجھے اس نام سے پکارو۔ راجا کے علاوہ کوئی مجھے یہ نہیں کہہ سکتا۔“

اس نے اصل چیف کے انداز میں بے وجہ قہقہہ لگایا۔
”یہ پیار کا نام ہے۔ برا کیوں مانتے ہو نواب صاحب۔ عدالت میں آپ خود ہی پیش ہو گے اپنے وکیل ملک ارشد کے ساتھ۔“

”اس میں تمہیں کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوتا۔“ وہ کچھ دیر مختصر سے کمرے میں ادھر ادھر بٹھلا رہا۔ ”تم نو روکتنا چاہتے ہو، اتنا ہی جتنا فریال کو چاہتے تھے یا اس سے پہلے۔“

میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”اس فضول سوال کا مقصد یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔“

وہ ایک دم پلٹا۔ ”چو! کس تمہاری ہوگی نواب رفیق۔ اور یہی ایک خطرے کی بات ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ تم اپنے انتقامی جذبہ پر اپنی محنت کو قربان کر دو، تمہارا ماضی کا ریکارڈ کوئی بہت قابل رشک نہیں ہے۔“

”کیا مطلب۔“

”مطلب یہ کہ عدالت میں جا کے تم یوژن لے لو۔۔۔ اپنی بات سے پھر جاؤ اور عدالت کو وہ سب بتا دو جو تمہارے ساتھ ہوا۔ کچھ بھی نہیں جانے گا۔ میری فرد جرم میں انخوا اور جس بے جا میں رکھنے کے جرائم بھی شامل ہو جائیں گے تو

اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ جہاں میر دیاں سوا میر۔ لیکن نور تمہاری محبت میں اپنی جان سے جائے گی۔“

میں چونکا۔ ”تم اسے قتل کرنے کی دھمکی دے رہے ہو۔“

”یہ دھمکی نہیں۔۔۔ ہم اسے واقعی قتل کر دیں گے۔ فوراً۔۔۔ اور تمہیں اس کی لاش مل جائے گی، سالم نہیں۔۔۔ گلوڑوں کی صورت میں۔۔۔ کیونکہ وہ پہلے سے ہمارے قبضے میں ہوگی۔“

”کیا تم نے اسے بھی اٹھایا ہے؟“

”نہیں۔۔۔ اس کے قریب کوئی نہیں پھٹک سکتا۔ اس کی اپنی سیکرٹری سخت ہے، پھر لندن پولیس اس کی حفاظت کر رہی ہے۔ اس نے دودن میں کھرا مچا دیا ہے۔“

”پھر تم اسے وثوق سے کیوں کہہ رہے ہو کہ۔۔۔“

”رفیق صاحب۔۔۔ اگر سودا منظور ہے تو سنو۔۔۔ ابھی میں تم کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا لیکن جانے سے پہلے تم نو رو کو فون کر کے بلاؤ گے۔ رازداری اور اعتماد کے ساتھ، تم اس سے کہو گے کہ وہ تمہاری رہائی کے لیے اپنے ساتھ پچاس ہزار پاؤنڈ لائے۔“

”پچاس ہزار پاؤنڈ۔۔۔“

”ہاں۔۔۔ اب تک اسے مختلف لوگ پبلک کال آفس سے کال کر چکے ہیں، لیکن کال فونوں میں رات ڈھائی بجے کی گئی تھی اور اس سے یہی کہا گیا تھا کہ وہ رفیق کو زندہ سلامت واپس چاہتی ہے تو کسی کو کبھی اس کال کے بارے میں نہ بتائے۔ خصوصاً پولیس کو۔۔۔ اور پچاس ہزار پاؤنڈ تیار رکھے۔ انخوا برائے تاوان کرنے والوں کے اسٹاک میں اس سے کہا گیا کہ نوٹ پرانے ہوں اور چھوٹے ہوں۔۔۔ ان کو سرخ رنگ کے بریف کیس میں ڈالا جائے۔ اس پر دونوں جانب تین انچ قطر کا سفید دائرہ ہو۔“

”اس کا مقصد۔۔۔؟“

”کچھ نہیں، بس کنفیوژن پھیلا نا۔ پولیس نے یہ کال فریس کر لی مگر کال کرنے والا دومنٹ بعد جا چکا تھا۔ دوسری کال ہوئی کل دوپہر اور تیسری گزشتہ رات پھر ڈھائی بجے۔ وہ تیار ہے۔“

”اب میں اسے کہاں بلاؤں؟“

”گورنر سروس کے ذریعے ابھی کچھ دیر پہلے اسے ایک موبائل فون ملا ہوگا۔ اس میں یہ بھی تحریر ہوگا کہ اس نے نمبر پر موصول ہونے والی کال کا ذکر اس نے کسی سے کیا تو شام تک رفیق کی لاش اسے پہنچا دی جائے گی۔ ابھی ہم

تمہیں ایک نیا نمبر دیں گے۔ اس سے تم پاکستان میں راجا کو کال کرو گے۔۔۔ راجا سے کہو گے کہ وہ ایک نیا فون اور نئی سم لے کر نو رو کو کال کرے۔ جو تم راجا سے کہو گے، وہ نو رو کو بتائے گا۔ یہ تمہیں ان کے اعتماد کا کھیل ہے جس میں راز پر صرف نور کی جان ہوگی یا تمہاری۔ نو رو تم قائل کرو گے کہ وہ پچاس ہزار پاؤنڈ لے کر تمہاری بتائی ہوئی جگہ پر اکلی آئے اور کسی کو بتائے بغیر۔ وہ کس حد تک تمہاری ہدایات ماننے ہے، یہ ہم دیکھ لیں گے۔“

میں سمجھ گیا کہ وہ میرے انخوا کو عام انخوا برائے تاوان کا رنگ دے کر پولیس کو گمراہ کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے کھیل میں شامل ہونا ایک خطرناک کام تھا لیکن میرے پاس اور کوئی راستہ بھی نہ تھا۔ یہ نو رسک نو غیر واپس نہیں تھی۔ وہ کہاں غلطی کرتے ہیں، کہاں تقدیر نہیں دھوکا دیتی ہے۔ نو رو کیا کرتی ہے اور کیا نہیں کرتی۔ جھوٹ کیا ہے سچ کیا، ایسے ان گنت سوالوں کا جواب پانے کے لیے مجھے وقت درکار تھا اور یہاں سے نکلے بغیر وقت کا بھی کوئی مصرف نہ تھا۔

میں نے ان کی بات مان لی۔ جو ہوسو ہو۔ یہ ایک مجرمانہ منصوبہ تھا جس کو سمجھنا محال تھا۔ آدمی کی عقل سازشوں کے بہت اچھے ہوئے جال بنتی ہے اور اس کا تانا بانے والے کو اپنے دماغ پر بڑا ناز اور اعتماد ہوتا ہے کہ اس کی نظر سے کچھ پوشیدہ نہیں۔ وہ دیکھ سکتے ہیں کہ آنے والے وقت میں کیا ہوگا اور کیا نہیں ہوگا۔ محض اسے تقدیر اپنا پارٹ پلے کرتی ہے، تدبیر کے بعد۔

اس نئی چیف نے مجھے ایک نیا فون لے دیا۔ ظاہر ہے اس کی رجسٹریشن کو فریس کرنا پولیس کے لیے بھی کاربڑیاں ہوگا۔ وہ کہیں اور پھنک جائیں گے۔ مجرموں کے اور ان کے پکڑنے والوں کے درمیان ذہانت سے ایک دوسرے کو دھوکا دینے کی آکھ چوکی ہر جگہ ہر وقت جاری رہتی ہے۔ میں ابھی اپنی عقل کمرے کے یہ موقع گنوائے کے موڈ میں نہیں تھا جو مجھے ایک پیادہ سی کالی بی کے فضل حاصل ہوا تھا۔ جسے عام طور پر ہمارے ملک میں منحوس سمجھا جاتا ہے۔

میں نے راجا کا نمبر ملایا۔ اس وقت کمرے میں دو منحوس صورت بد معاش اور آگے تھے اور کسی وجہ کے بغیر مجھے دباؤ اور دکھا کے ڈرانا چاہتے تھے۔ میں نے انہیں نظر انداز کر دیا۔

دوسری طرف سے راجا نے کسی سے کہا۔ ”یار یہ کیا ہو رہا ہے؟ اور پھر مجھے سے مخاطب ہوا۔“ ”ہیلو۔۔۔“

میں نے کہا۔ ”راجا۔۔۔“



رژن کہ ہنسوں

ایک جنازہ جا رہا تھا بہت سے لوگ ہمراہ تھے، راستے میں ایک پٹھان بھی ساتھ ہوا۔ کسی نے کہا کلمہ شہادت، پٹھان بولا، زندہ باد، تھوڑی دیر کے بعد پھر کہا گیا کلمہ شہادت پٹھان پھر بولا۔ زندہ باد، کسی نے کہا۔ ”بھئی خان صاحب جنازہ جا رہا ہے۔“ پٹھان بولا۔ ”اچھا میں تو سمجھا کہ جلوس جا رہا ہے۔“

یہ ہوتی ہے دوستی

ایک لڑکا پوری رات گھر نہ آیا، اگلے دن قادر سے کہا۔ ”میں رات کو دوست کے گھر سو گیا تھا۔“ قادر نے بیٹے کے 10 فرینڈز کو فون کر کے پوچھا۔ سب نے کہا میرے پاس تھا۔

اورنگی ناؤں کی راجپی سے رضوان تنولی کریڈیوی کی موعات

میں دیکھ نہیں سکتا تھا اور پھر بھی تصور میں راجا کا ردعمل میرے سامنے تھا، جب وہ چلا یا نہیں۔ اس نے مجھے گالیاں نہیں دیں اور مجھے پرسوالا کی پوچھا نہیں کی تو میں سمجھ گیا کہ وہ تمام صورت حال سے پوری طرح باخبر ہے اور نور نے اسے میرے انخوا کیے جانے کی رپورٹ پہنچا دی ہے۔

”کیا حال ہے تیرا ایکے پتر۔“ کہاں سے بول رہا ہے تو؟

میں نے ہنس کے کہا۔ ”اپنے منہ سے راجا اور کہاں سے۔۔۔؟“

راجا کی متانت برقرار رہی۔ ”تو ٹھیک ہے نا۔“

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

”نور نے سب بتا دیا ہے، تو فکر مت کر ان سے سودا پکا کر لے۔ اور دماغ خنڈا رکھ۔ تو ہے کہاں۔“

میں نے کہا۔ ”مجھے نہیں معلوم۔ اب تو میری بات دھیان سے سن۔ نو رو فون کر۔ نمبر میں بتاتا ہوں۔“

”یہ نیا نمبر ہے؟“

”ہاں۔۔۔ اس سے کہہ کہ پچاس ہزار پاؤنڈ ہدایات کے مطابق لے آئے، میں دوسری کال نہیں کروں گا۔ اسے وہی کرنا ہے جو میں کہہ رہا ہوں۔ اگر اس گفتگو کا ایک لفظ بھی

کسی اور تک پہنچا تو پھر کچھ نہیں ہوگا، یہ لوگ دوسرا چانس دینے والے نہیں ہیں۔“

”ٹھیک ہے..... میں اسے سمجھا دوں گا۔ تو مجھے بتا۔“

میں نے نفی جیف صاحب کی ہدایت کے مطابق راستہ سمجھانا شروع کیا۔ ”اس کو اکیلے آنا ہوگا، اپنی سیکورٹی کو وہ منع کر سکتی ہے لیکن اسے کیا معلوم کہ باہر سے سادہ کپڑوں میں کون اس کے پیچھے لگ گیا۔ پولیس کی اس پر نظر ہوگی، وہ عینی راستے سے نکلے، پیدل اور پھر چھری پکڑے، جو نیا فون اس کے پاس ہے اس پر میں نور کو ہدایات دوں گا کہ اسے کہاں آنا ہے۔“

جیف نے ایک کاغذ کا پرزہ میرے حوالے کیا، میں نے اس پر لکھی ہوئی عبارت ایسے پرچی جیسے یہ بات میں خود راجا سے کہہ رہا ہوں۔ ”نور کو گھر پہنچانے کے ہدایات کے مطابق واپس جانا ہوگا۔ اس کے پیچھے سے پہلے ہی میں گھر پہنچ جاؤں گا۔“

”ٹھیک ہے..... میں اسے سمجھا دوں گا۔“

فون میرے ہاتھ سے لے لیا گیا۔ اب ایک نیا کھیل شروع ہوا۔ میرے ہاتھ کمر کے پیچھے باندھ دیے گئے۔ ایک ربر بینڈ میری آنکھوں پر آگیا۔ مجھے باہر لے جا کر ایک گاڑی میں بٹھا دیا گیا اور گاڑی روانہ ہو گئی۔ دو محافظ میرے دائیں بائیں بیٹھے تھے۔ شاید وہ شخص جو جیف کا کردار ادا کر رہا تھا آگے تھا۔ ان کا چوتھا ساتھی گاڑی چلا رہا ہوگا۔ گاڑی کے شیشے بند تھے۔ باہر کی آوازیں میرے کانوں میں بہت کم آ رہی تھیں۔ ان سے یہ اندازہ کرنا ناممکن تھا کہ ہم کہاں سے گزر رہے ہیں۔

گاڑی آرام دہ اور نرم تھی۔ ہم ایک گھنٹا خاموشی سے سفر کرتے رہے۔ پھر مجھے فون دیا گیا۔ ”راجا کے ذریعے نور سے کہہ دو کہ وہ اکیلا آجائے جہاں چارلی کو فون کیا گیا تھا۔“

میں نے فون کی۔ آدھا گھنٹا اور گزر گیا۔ اس کے بعد میں نے راجا کے ذریعے نئی ہدایات ارسال کر دیں۔ اب نور کوئی سمت میں سفر کرنا تھا۔ اس بات کی تصدیق ہو گئی تھی کہ نور اکیلے آئی ہے اور اس کا تعاقب کوئی نہیں کر رہا ہے۔ اس نفی جیف کو بتانے کو نون مسلسل یہ اطلاع دے رہا تھا کہ سب کچھ ہماری مرضی کے مطابق ہو رہا ہے اور خطرے کی کوئی بات نہیں۔ وہ اسے اپنی کامیابی سمجھ کر فخر سے مسکراتا تھا اور پھر میری طرف دیکھ کر کہتا تھا۔ ”لوکی سیانی ہے۔“

جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا میرا دل ڈوبتا جا رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ میں اس جوئے میں بہا گیا ہوں۔ میں نے اس امید

میں جیف کی ہر بات مانی تھی کہ جب مجھے یہاں سے نکلنے کا موقع ملے گا تو میں فائدہ اٹھاؤں گا۔ میں لندن پولیس سے بھی توقع لگائے بیٹھا تھا کہ وہ اپنی شہرت کے مطابق کوئی کارنامہ سرانجام دیں گے اور مجرم عین اس وقت پکڑ لیے جائیں گے جب وہ پچاس ہزار پاؤنڈ کے ساتھ نور کو بھی لے جائیں گے۔ عنایت کے طور پر..... اگر میں ان کی مرضی کے مطابق عدالت میں اپنا بیان بدل کے جیف کو بے گناہ قرار دلوانے میں کامیاب رہتا ہوں تو وہ نور کو چھوڑ دیں گے۔ لیکن ایسا نہ ہوا، پھر..... ان کی مرضی کا بیان دینے کے باوجود ثبوت اور شہادتوں کی بنیاد پر عدالت نے میرے بیان کو تسلیم نہ کیا۔ پولیس نے ثابت کر دیا کہ میں اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر رہا ہوں۔ میں نور کی جان بچانے کے لیے ایسا کہنے پر مجبور ہوں، یہ تو انہیں معلوم ہوئی جائے گا کہ مجھے رہائی مل گئی ہے تو نور عتاب سے..... میں یہ جھوٹ بھی نہیں بول سکتا کہ نور واپس پاکستان چلی گئی ہے۔

ان بے ضمیر بے کردار کی قیدیں نور پر کیا پڑتی گی؟ وہ مجھے کیا سمجھے گی؟ اپنی رہائی کے لیے میں نے اسے پکڑا دیا۔ بے شک پولیس اور سرانگراں میری بھرپور مدد کریں گے لیکن وہ نور کے بخیر عافیت واپس آنے کی کوئی ضمانت نہیں دے سکتے۔ یہ نفی جیف تو عتاب ہو جائے گا۔ نفی جیف جو ابھی تک قید میں ہے اور اسے جرم کی سزا سنائی جاتی ہے، اس کا انتظار کر رہا ہے اسے سو فیصد پر قائم رہے گا کہ قتل میں نے نہیں کیا تھا، مجھے پھنسا یا گیا ہے۔

گاڑی اچانک رکی تو میرے پریشان خیالات کی رو بکھر گئی۔ میرے لیے طے کرنا ناممکن تھا کہ میں نے فتنہ کی کی تھی یا بے وقوفی۔ ان جرائم پیشہ لوگوں کے سامنے میری کیا چلتی۔ میں نے فوراً مارے جانے پر کچھ وقت حاصل کرنے کو ترجیح دی تھی کہ شاید یہ مہلت فائدہ مند ثابت ہو۔ کچھ ایسا ہو جائے کہ بگڑی بات بن جائے۔ غیب سے کچھ ظہور میں آئے یا تقدیر مجھے کوئی موقع فراہم کر دے..... دس منٹ تک ہم پیدل چلتے رہے۔ پھر مجھے ایک زینہ اترنے کو کہا گیا۔ میری آنکھوں پر پٹی لگی۔ میں کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا کہ میں کہاں ہوں، ہر طرف کی خاموشی یہ احساس دلاتی تھی کہ مجھے شہر سے باہر لایا گیا ہے۔ یہ ڈیل کسی ویرانے میں ہو رہی ہے۔

میں نے کہا۔ ”کیا نور آگئی؟“

”ہاں..... اور وہ بریف کس بھی لے آئی ہے۔“

میں نے عاجزی سے کہا۔ ”میری آنکھوں پر سے یہ پٹی ہٹا دو، تھوڑی دیر کے لیے۔“

”یہ نہیں ہو سکتا۔“

میں نے کہا۔ ”پلیز، میں اسے ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”تم اسے دیکھ نہیں سکتے۔ اس کے اور ہمارے درمیان ایک خستہ عمارت حاصل ہے۔ اس کے بعد مجھے کی طرف ایک سڑک ہے، یہی سڑک آگے سے محکم کے آئی ہے۔ نور اس پر کھڑی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”زور نے کی کیا بات ہے اس میں۔“

ایک زبردست تھپڑ میرے منہ پر پڑا جو اتنا غیر متوقع تھا کہ میں گر پڑا۔ میں نے چلا کے کہا۔ ”نور..... تم کہاں ہو۔“

نور کا کوئی جواب نہیں آیا۔ بے درپے پڑنے والی ٹھوکروں نے مجھے بے حال کر دیا۔ ”تم کچھ نہیں کر سکتے نواب زادے۔ تم نور کو بے جا رہے ہیں اور وہ تم کو اسی وقت ملے گی جب تم اور تمہارا وکیل چارلی کے قتل کے الزام سے جیف کو رہائی دلا دو گے۔“

میں نے فریاد کی۔ ”دیکھو، یہ پاکستان نہیں ہے۔ وہاں سب کچھ ہو سکتا تھا۔ زور زبردستی سے یا رشوت سے، لیکن یہاں۔“

”کوئی پہاڑ نہیں کھودتے تم کو..... صرف یہ کہنا ہے کہ تمہارا الزام لگنا غلط تھا۔ جیف نے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ تم نے اپنا پرانا حساب برائے کرنے کے لیے اسے پھنسا یا۔ چاہے تو الزام اپنے سر لے لو، اس کی اور کو مجرم بنا دو..... یا وہی ہو جو تمہیں سمجھا یا گیا ہے، جب تک جیف واپس نہیں آئے گا نور بھی واپس نہیں آئے گی، آگے تمہاری مرضی..... تمہیں یہ کام کیسے کرنا ہے۔“

”اور..... تم..... نور سے میرا رابطہ کراؤ گے۔“

”یہ ہو سکتا ہے۔ یہ تمہاری نیت پر منحصر ہے..... تم پلان کے مطابق چلو گے تو اسے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ ورنہ۔“

”ورنہ کیا.....؟“

”وہ ہمارے بس میں ہوگی، اس کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“

خاموشی کا ایک مختصر وقفہ آیا۔ کسی نے میری جیب میں سے نیا موبائل فون بھی نکال لیا جس پر میں راجا کے ذریعے نور تک اپنی بات پہنچاتا رہا تھا۔ آس پاس بدستور سناٹا تھا۔ کہیں کسی قسم کی آواز نہ تھی۔ نہ سڑک پر سے کوئی گاڑی گزرنے کی..... نہ انسانوں کے بات کرنے کی..... زندگی میں اتنا بے بس میں نے خود کو بھی محسوس نہیں کیا تھا۔

میں اپنے پر وحشت خیالوں میں اتنا سرگرواں تھا کہ میرے لیے وقت کا احساس بے معنی ہو گیا تھا۔ اچانک مجھے اپنے چاروں طرف خاموشی محسوس ہوئی، ایسی خاموشی جس میں میرے ساتھ صرف میری تنہائی تھی۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”جیف.....“

”جیف..... تم کہاں ہو..... جیف.....! میں چلا یا لیکن میرے کانوں میں صرف اپنی آواز آئی یا اپنی بے چارگی اور بے بسی کی خاموشی۔ وہ لوگ جا چکے تھے۔ وہ نور کو بھی اپنے ساتھ لے گئے تھے اور مجھے نہ جانے کہاں چھوڑ گئے تھے۔

میں نے اپنے ہاتھ آزاد کرانے کی اور اپنی آنکھوں پر چڑھی ہوئی پٹی اتارنے کی دیوانہ وار لا حاصل کوشش کی۔ ایک عجیب طرح کے خوف نے مجھے گھیر لیا۔ شاید وہ مجھے کسی ذہن ان گھر میں بند کر گئے ہوں گے جہاں کوئی میری آواز پر نہیں آنے گا۔ میں چلا تے چلا تے اسی فتنے بے نشان میں سر جاؤں گا۔ بے وقوف..... احمق..... بے عقل نواب رفیق احمد شیرازی، یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ جیف نہیں، تم نے اس سے تعاون کیا؟ نور کو اس کے حوالے کر دیا؟ انہیں پچاس ہزار پاؤنڈ بھی دلا دیے۔ تمہاری سب سزا سنی جو تمہارے دشمنوں کے قتل کر دی۔ اب نہ ست بدھائی کی ریاست ہوگی نہ شیرازی اینڈ پٹنی، نہ وہ محل نہ وہ اصطبل..... نور پھر خوار ہوگی۔

میں نے اپنا سر جھکا۔ یہ میرے دماغ میں کس قسم کے فضول خیالات کی یلغار ہے، ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ اگر میں یہاں سے نکل گیا تو سب ٹھیک کر لوں گا۔ یہاں سے نکلنا کیا مشکل ہے، جب وہ مجھے لائے تھے تو میں چند زینے اتر کے نیچے آیا تھا، نہ اس وقت کسی نے کوئی دروازہ کھولا تھا اور نہ بعد میں اس کے بند ہونے کی آواز آئی تھی، وہ زینہ کہیں قریب ہی ہوگا، میں اسے تلاش کر سکتا ہوں۔

کئی بار گرنے اور دیوار سے ٹکرانے کے بعد بالآخر میرے قدموں نے زینہ تلاش کر لیا۔ ایک دم میرا حوصلہ دو چند ہو گیا، آہستہ آہستہ ایک ایک کر کے میں اوپر کی جانب بڑھتا گیا۔ پھر میرا اگلا قدم ہموار سطح پر پڑا۔ زینہ ختم ہو گیا تھا، میں نے چلا کے کہا۔ ”ہیلو..... کوئی ہے؟“

مجھے یہاں چھوڑے جانے والوں نے کہا تھا کہ سڑک اسی کھنڈر کے نیچے سے گزرتی ہے، کھنڈر سے شاید میں باہر آ گیا تھا۔ اب کیا مجھے نیچے کود جانا چاہیے؟ معلوم نہیں سڑک

میں نے اسے روکا۔ ”اٹ ازل آزل رات..... مجھے تھوڑا سا پانی منگوادو، یہ ابھی ہوش میں آجائے گی۔“

اس نے مجھے ہائی منگوادیا۔ ”مجھے سخت جرت ہے کہ اچانک اسے کیا ہوا، ابھی تمہارے آنے سے پہلے نور بالکل نارمل طریقے پر مجھ سے بات کر رہی تھی۔“

میں نے کہا۔ ”ہاں، یہ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آسکتی۔ کسی کی نظر اندر اٹھنے والے جذبات کے طوفانوں کی شدت کا کیسے اندازہ کر سکتی ہے۔“

وہ میری بات کچھ سمجھا لیکن اس نے خدا کا شکر ادا کیا جب پانی کے چند چھینے پڑنے کے بعد نور نے آنکھیں کھول دیں اور کچھ دیر میں خفت زدہ سی اٹھ بیٹھی۔ راجر کے علاوہ بھی کچھ لوگ اس کے ہسپتالی رومل کا مشاہدہ کر کے جا چکے تھے۔

میں نے کہا۔ ”تم واقعی پاگل ہو..... خود کو تماشا بنالیا سب کے سامنے۔“

وہ مجھے دیکھتی رہی۔ ”جو کچھ ہوا اس پر میرا اختیار نہیں تھا۔ میں کوئی ایکٹنگ نہیں کر رہی تھی۔“

میں نے کہا۔ ”آئی ایم سوری، میرا یہ مطلب نہیں تھا جان لیکن موقع محل ہی تو دیکھنا چاہیے۔ کچھ کنٹرول رکھنا چاہیے اپنے جذبات پر۔ خیر..... یہ بتاؤ، اب طبیعت ٹھیک ہے تمہاری؟“

”میں ٹھیک ہوں۔“ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”تم کیسے ہو، مجھے بہت کمزور لگ رہے ہو۔“

میں نے کہا۔ ”جہاں مجھے رکھا گیا تھا۔ وہ کوئی صحت افزا مقام نہیں تھا۔ تم بتاؤ کہ یہاں کیسے آئیں۔ تمہیں تو وہ بد معاش لے گئے تھے؟“

کیپٹن راجر ہماری گفتگو کیا سمجھتا، ہم دونوں ہی ایک بحرانی کیفیت سے گزر رہے تھے۔ وہ ہم سے یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ دیکھو تمہاری باتوں میں میرا وقت ضائع ہو رہا ہے اور فوراً قانونی کارروائی شروع کر دیتا۔ یہ وہاں کی پولیس کا خالص انسانی وصف ہے، وہ غیر انسانی رویہ بھی اختیار نہیں کرتے خصوصاً عام شریف لوگوں کے ساتھ۔

کیپٹن راجر نے گھڑی دیکھی۔ ”میرا خیال ہے کہ قانونی کارروائی کو کچھ دیر کے لیے ملتوی کر دینا چاہیے۔“

میں نے کہا۔ ”اٹ ازل آزل رات..... کیپٹن..... ہم اپنا بیان دینے کے لیے تیار ہیں۔“

”دراصل مجھے ایک کام سے جانا تھا اور وہاں میرا وقت یہ پچھاننا آخر ضروری ہے، باقی کارروائی ہم کل صبح پر رکھ

لیتے ہیں۔“

باتی کیا..... کارروائی ابھی شروع ہی نہیں ہوئی تھی۔ اس نے زبانی طور سے چند سوالات پوچھے ہی تھے کہ میں پہنچ گیا اور کارروائی رک گئی۔ میں نے اس کی پیشکش کو قبول کر لیا۔ ہماری گاڑی باہر موجود تھی۔ یہ وہی گاڑی تھی جو پولیس کو میرے اغوا کے بعد فارم ہاؤس کے باہر لاوارث گھڑی ملی تھی۔ اب اس میں ایک ڈرائیور موجود تھا جس کی صورت میرے لیے اجنبی تھی۔ دوسرا اس کے ساتھ سرینٹ پر رکھے سو رہا تھا۔

ہمیں دیکھتے ہی ڈرائیور نے گاڑی اشارت کی تو اس کا ساتھی بھی مستعد ہو کے بیٹھ گیا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ دونوں حفاظتی عملے کا حصہ ہوں گے اور ہر جگہ آتے جاتے ہمارے ساتھ رہیں گے۔ تمام راستہ نور میرے کندھے پر سر رکھے آنکھیں بند کی خاموش بیٹھی رہی۔ میں واپس ارلنڈ ہاؤس پہنچا تو مجھے سب کچھ بہت بدلا ہوا لگا۔ جس سیکورٹی کو میں نے غیر ضروری سمجھتے ہوئے فتح کر دیا تھا وہ پہلے سے زیادہ نظر آ رہی تھی۔ سوشی نے اور پولیس نے حفاظتی انتظامات کو ناگزیر قرار دیتے ہوئے ایک فول پروف سسٹم نافذ کر دیا تھا جس میں ہائی گاڑی کارڈز کے علاوہ کچھ بہت کچھ تھا۔ کلوز سرکٹ کیمرے خود کار الارم، مخصوص فریکوئنسی پر سٹیل دیے والے آلات۔

اپنے کمرے کی خلوت میں بیچتے ہی نور کو پھر جذباتی کمزوری نے مغلوب کیا اور اس نے روتے روتے مجھ سے مطالبہ کیا کہ بس اب یہ سب چھوڑ دو اور چلو واپس..... لعنت لندن پر، ارلنڈ سیشن پر اور شیرازی اینڈ کمپنی پر..... میں صرف سنتا رہا اور اسے کئی دہائیے ہوئے اچھا اچھا کہتا رہا۔ بالآخر وہ پرسکون ہو گئی۔ میں خود شدید فیشن میں تھا لیکن نور کو سنبھالنے کی ذمہ داری بھی میری تھی چنانچہ میں نرمی سے اور محبت سے اسے سمجھاتا بھی رہا اور اپنی کئی ہنگامی باتوں سے اس کو ہنسائے کی کوشش بھی کرتا رہا۔

کچھ دیر میں وہ ہاتھ منہ دھو کر اور لباس بدل کے آگئی تو میں بھی غسل کرنے چلا گیا۔ پھر ہم نے میز پر بیٹھ کے رات کا کھانا کھایا۔ اب نور سے پوچھا جاسکتا تھا کہ اس پر کیا مبنی اور میں بھی بتا سکتا تھا کہ میرے ساتھ کیا ہوا تھا۔ اس سے پہلے جب نور نے بات کرنی چاہی، میں نے اسے روک دیا تھا کہ ابھی نہیں..... کریں گے بات، جلدی کیا ہے۔

پہلا سوال میں نے کیا۔ ”میرے ساتھ جو ڈرانا ہوا سو ہوا، کیا وہ تمہیں اغوا کر کے نہیں لے گئے تھے.....؟ پچاس

ہزار پاؤنڈز کے ساتھ۔“

”لے گئے تھے..... ان کے پیچھے پیچھے پولیس پہنچ گئی۔ وہ سب پکڑے گئے.....“ نور نے کہا۔ ”پوچھو کیسے؟“

میں نے کہا۔ ”لندن کی پولیس ایسے کارنامے سر انجام دینے کے لیے مشہور ہے۔ کیسے کہ جواب میں کیسے دوں؟“

وہ بولی۔ ”پولیس کو میں نے بلایا تھا، اپنے پیچھے۔“

”تم نے بلایا تھا؟“

اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”تمہارے اصلیل جانے کے کوئی ایک گھنٹے بعد وہاں سے سامن نے فون کیا تھا۔ بے چارہ سامن..... پولیس نے میرے بیان پر اسے تفتیش کے لیے پکڑ لیا تھا۔ وہ کیا بتاتا.....؟“

”اس نے کہاں فون کیا تھا.....؟“

”اس نے آفس میں فون کیا تھا، تم سے بات کرنے کے لیے۔ مگر اسے بتایا گیا تھا کہ نواب رفیق ایک گھنٹہ پہلے گاڑی لے کر کہیں گئے ہیں۔ اس نے معلوم کرنے کی کوشش کی کہ تم آفس میں ہو یا نہیں، وہاں اس کی بات مجھ سے ہوئی۔ اس نے کہا کہ میں یہاں ان کا انتظار کر رہا ہوں۔ اس نے بتایا کہ میں نے انہیں ایک گاہک سے ملوانے کے لیے بلایا تھا۔“

میں نے کہا۔ ”یعنی فون کال جیوٹی تھی۔“

”سامن نے کہا کہ لارڈ رفیق کے آنے کے بعد میں ڈیوک آف کنٹرشائر کو اطلاع دیتا..... لیکن وہ ابھی تک پہنچے نہیں حالانکہ انہوں نے کہا تھا کہ میں آ رہا ہوں۔ پہلے تو میں نے کہہ دیا کہ ہو سکتا ہے کوئی اور ضروری کام نکل آیا ہو، پھر میں نے تم سے بات کرنے کی کوشش کی تو آدھے گھنٹے تک تمہارا فون بند ملا۔ مجھے تشویش ہوئی۔ میں نے پھر سامن سے پوچھا تو اس نے کہا کہ لارڈ رفیق ابھی تک نہیں آئے۔“

”یہ نواب سے میں لارڈ کب بنا۔“

”صرف سامن ہی نہیں..... یہاں اور لوگ بھی تمہیں لارڈ رفیق کہنے لگے ہیں..... عادت کے مطابق، نواب ان کی زبان پر نہیں چڑھتا۔ پہلے لارڈ ارلنڈ کہتے تھے، ان کی جگہ تم آئے ہو تو لارڈ رفیق ہو گئے۔ خیر..... سامن کی بات پر مجھے تشویش لاحق ہوئی، میں نے سوشی سے کہا کہ آخر رفیق گیا کہاں اور اس سے رابطہ کیوں نہیں ہو رہا ہے، اس نے کہا کہ تھوڑی دیر اور دیکھتے ہیں، کیا پتا فون خراب ہو گیا ہو۔“

”سامن نے ٹیکٹ پر میری گاڑی نہیں دیکھی تھی؟“

”وہ باہر گیا بھی نہیں..... ڈھائی گھنٹے بعد اس نے پھر یہی کہا کہ میں لارڈ رفیق کا انتظار کر رہا ہوں اور مجھے تشویش

ہو رہی ہے۔ پھر میں نے پولیس سے اپنے اندیشوں کا اظہار کیا۔ پولیس پہلے میرے اندیشوں کو سیرس نہیں لے رہی تھی لیکن جب میں نے گزشتہ رات کے پرخاندات واقعے کا ذکر کیا جس میں سل پرست متصحب گورے اسکن ہیڈز نے سوشی کے کمرے واپس آتے ہوئے ہمر حملہ کیا تھا اور سوشی نے بھی تائیدی تو پولیس نے ریج یعنی انٹیلیجنس میں سامن کو فون کیا اور اس سے کہا کہ وہ اصلیل سے ارلنڈ سیشن کے راستے پر دیکھے۔ وہ ٹیکٹ سے نکلا ہی تھا کہ اسے تمہاری لاوارث گھڑی ہوئی گاڑی نظر آگئی۔ اس نے فوراً پولیس کو بتادیا اور دس منٹ میں ایک پولیس کار وہاں پہنچ گئی۔ پھر سرانگرساں اور جاسوس آگئے۔ انہوں نے مجھے مطلع کیا اور میں سوشی کے ساتھ ایک پولیس کار میں گئی۔ پولیس نے وہاں معمول کے مطابق اپنی کارروائی کی۔ انہوں نے فکر پرش لے لے اور فوٹو گراف..... وہاں دوسری گاڑی کی موجودگی ثابت ہوئی تھی جس میں تمہیں اغوا کر کے لے جایا گیا تھا۔ انہوں نے ٹارڑوں کے پرنس دیکھے۔ جھاڑیاں دیکھیں جہاں اغوا کار چھپ کر بیٹھے تھے۔ بعد میں سراغ لگانے والے کتے طلب کیے گئے اور واردات کی خبر پولیس کے نیٹ ورک پر پھیلا دی گئی۔

پولیس نے مجھ سے بہت کچھ پوچھا۔ میں نے سامن کے رویے کا ذکر کیا جو مجھے بھی مخالف لگا تھا اور تمہیں بھی..... وہ ہمیں اپنا نیا مالک سمجھ کے ناخوش تھا۔ وجہ وہی..... ہم نو دو لیتے اور گھٹیا لوگ تھے۔ غیر خاندانی، سونے پر سپاہیہ کہ یہ کہہ اٹھیں۔ کالے لوگ، میں نے اسی پر شک ظاہر کیا۔ اس سے پہلے چارلی اپنی خباثت دکھا چکا تھا اور نکل کے سارے ملازمین احتجاجاً مستعفی ہو گئے تھے۔ انہیں یہ ملکیت کی تہہ ملی ناپسند اور نا منظور تھی۔ میرے بیان پر..... میرا خیال ہے کہ میں غم و غصے میں اس حد تک آگے چلی گئی کہ میں نے سامن کو ہی جرم بنادیا تھا کہ اس نے دھوکے سے فون کر کے تمہیں بلایا ہوگا، خیر بعد میں خود ڈیوک آف کنٹرشائر نے تصدیق کر دی کہ وہ مجھ سے خریدنا چاہتے تھے۔ سامن نے ان سے بات کی تھی اور انہوں نے کہا تھا کہ وہ لارڈ رفیق کو مت مانگی قیمت دینے کے لیے تیار ہیں یہاں تک کہ بلیک چیک بھی دے دیں گے۔ دراصل گھوڑوں کی محبت سے زیادہ ان کو اپنے حریف دوست لارڈ ارلنڈ کی موت کا خدمہ تھا اور ان کی معمولی سے جذباتی ہمدردی تھی۔ ان کے بیان سے سامن کی جان بخشی ضرور ہو گئی لیکن اس پر شک برقرار رہا۔

میری جو حالت ہوئی سو ہوئی..... سوشی کا وعدہ سے برا

حال تھا۔ اس نے پولیس پر دھاوا ڈالنے کے لیے ایک پریس اسٹینٹ جاری کر دیا۔ پولیس کا سارا محکمہ ایک دم جیسے سارے کام چھوڑ کے اس کیس میں لگ گیا۔ ہر وقت صبح شام نئے احکامات ملتے تھے، نئے انتظامات کیے جاتے تھے۔ انہوں نے ہر طرف خفیہ پولیس کے لوگ سادے کپڑوں میں متعین کر دیے تھے اور امکانات کے ہر پہلو کو سامنے رکھا تھا۔ بہت سے لوگ گرفتار ہوئے اور تفتیش کے بعد چھوڑ دیے گئے۔ وہ بار بار مجھے شناخت کے لیے بلایا گیا۔ محل کے پرانے خادم طلب ہوئے جن میں میجر لوی بھی شامل تھی۔ وہ سخت برافروختہ تھی اور الٹا پولیس کو دھمکی دیتی رہی کہ وہ ان کے خلاف ہتک عزت کے ہر جانے کا کیس کرے گی۔ میں نے کسی پرائیوٹ سکیورٹی انجمنی کی خدمات حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کی تو پولیس نے مجھے تین نام دیے کہ یہ قابل اعتبار ہیں۔ ایک سے میں نے کنٹریکٹ بھی کر لیا لیکن ایک بہت بڑا کام پولیس نے کیا۔ بتاؤ یہ کیا ہے؟

میں نے فوراً ایک پنڈلی برزخ کا نشان دیکھا۔ اس پر میڈیکل ٹیپ سے کراس بنا ہوا تھا اور گرد کی جگہ پر گہری سرخی تھی۔ ایک خفیف سا نشان خون کا بھی تھا۔ میں نے اسے انگلی سے چھو کر کہا۔ ”یہ کوئی چوٹ لگی ہے؟“

اس نے مسکرائے لیکن میں سر ہلا کر ”نہیں۔“

میں نے کہا۔ ”کوئی چیز چھپی ہوگی۔ درود ہوتا ہے۔“

وہ تجھ بھار کے ہنسی۔ ”تم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ اسی زخم کی وجہ سے اس وقت میں تمہارے سامنے بیٹھی ہوں۔“

میں نے بے وقوفی کی طرح پوچھا۔ ”وہ کیسے؟“

اس نے کہا۔ ”اس بینڈیج کے پیچھے ایک الیکٹروک جپ ہے۔ ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے جان لیون یہاں کی پولیس سرانجامرسانی کے لیے سائنسی آلات اور ایجادات سے کیا کچھ کرتی ہے، ایک رات میرے پاس کنیشن راجر آیا میں کبھی معمول کی تفتیش کے لیے آیا ہوں۔ ہاں۔ یہ پہلی رات کی بات ہے، اس کے ساتھ ایک دیلا پلا ہے وہ وقف نظر آنے والا ڈیوایر تھا۔ اس نے اندر آ کر مجھے خبردار کیا کہ لارڈ رفینک کا سراغ تو ہم گائیں گے لیکن میڈم۔۔۔ آپ خود بہت خطرے میں ہیں، وہی لوگ آپ کو بھی لے جاسکتے ہیں جن کی تحویل میں آپ کا دوست ہے، وہ آپ کو بلانے کے لیے انہی کو استعمال کریں گے اور وہ مجبور ہوں گے۔ کسی نہ کسی وجہ سے انکار نہیں کر پائیں گے۔“

میں دم بخود بیٹھا تھا۔ ”کتنا صبح اعزاء تھا ان کا۔۔۔“

”ہاں۔۔۔ اس نے کہا کہ ہم آپ کو ایک چھوٹی سی تکلیف دیں گے، اس سے آپ کا تحفظ سونپ دینا ہو جائے گا۔ یہ ہمارے پولیس سرجن ہیں، یہ آپ کے جسم میں ایک ٹرانسمیٹر لگائیں گے۔ ٹرانسمیٹر کے نام پر میں ڈر گئی کہ شاید پیٹ میں کوئی آکڑ ڈالیں گے۔ اس نے مجھے سمجھایا کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں، یہ آپ کے ناخن کے برابر ایک چپ ہوگی جو سگنل نشر کرتی ہے، اس نے مجھے پیش جو گراگ والوں کی ایک ڈویژن دکھائی جس میں سائنسدانوں نے کچھ برمنڈوں کے گلے میں لکڑی نما لاکٹ ڈالے تھے اور اس سے ان کی نقل و حرکت پر نظر رکھی جاتی تھی۔ یہ لاکٹ جو سگنل دیتے تھے اس سے معلوم ہوتا رہتا تھا کہ برمنڈ کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے۔ بعض لاکٹ کیسرے والے بھی تھے، جانوروں کو تحفظ فراہم کرنے والے ادارے اور ریسرچ کرنے والے یہ تکنیک ہر جگہ استعمال کر رہے ہیں۔ پھر اس نے مجھے وہ چپ دکھائی۔ وہ ناخن کے برابر تو تھیں مگر کھلی تھیں، ایک انچ سے کچھ کم لمبائی اور چوڑائی تھی اور تقریباً تین کی میٹر موٹی۔ کنیشن راجر نے کہا کہ یہ میری جلد کے نیچے ٹرانس پلانٹ ہوگی۔ اس میں ایک بیٹری ہے جو میرے جسم کی حرارت سے چارج ہوتی رہے گی اور اس کا ٹرانسمیٹر ایک مخصوص فریکوئنسی پر مسلسل سگنل نشر کرے گا۔ پولیس کے ریسورسینز پر اسے مانٹر کیا جائے گا۔ اوپر سے دیکھنے میں یہ کسی بزم کی بینڈیج نظر آئے گا۔ ہم اس کے آس پاس کی جگہ کو ایسا ہی بنادیں گے۔ آپ کو چلتے ہوئے احساس تک نہیں ہوگا لیکن دن رات آپ جہاں جائیں گی ہمیں سگنل ملے گا اور پتا چلا رہے گا کہ آپ کہاں ہیں۔ میں حیران تو خیر تھی، پھر بھی میں نے پوچھا کہ یہ جلد کے نیچے ہی کیوں ضروری ہے۔ اس نے کہا کہ میڈم۔۔۔ خداوند کرے کہ آپ انگوٹھوں لیکن انگوٹھ کرنے والے جسم پر کچھ چھوڑتے نہیں، نہ پکڑے نہ زبرد۔ وہ آپ کے بالوں میں بھی دیکھیں گے اور ٹاپس بھی اتروالیں گے۔ گھڑی یا موبائل فون کا تو سوال ہی نہیں۔ ہر صورت میں یہ زخم اپنی جگہ رہے گا۔ وہ بچی کو نہیں اتاریں گے۔ پتی بھی کہاں یہ میڈیکل ٹیپ کا معمولی کراس ہے۔ اس کے آس پاس جو سرنی تھرنے دیکھی جا جو خون کا معمولی سا داروغہ ہمیں نظر آیا۔ وہ کچھ بھی نہیں۔ میک اپ کا رنگ ہے لیکن اس سے چوٹ کا پتا چلتا ہے کہ زخم کے آس پاس کی جگہ بھی متاثر ہوئی ہے۔“

”یہ تو واقعی کمال کیا پولیس نے۔۔۔“

”جب مجھے بلایا گیا تو مجھے کنیشن راجر کی بات یاد آئی۔ ابھی تک انگوٹھ کرنے والوں کا کچھ پتا نہیں تھا کہ کون

ہیں۔ اب مجھے معلوم ہو گیا کہ تمہیں تاوان کے لیے انگوٹھا کیا گیا ہے۔ راجر نے کہا تھا کہ جب لارڈ رفینک آپ کو بلائیں گے تو ان کے پاس اس کے سوا چارہ نہیں ہوگا۔ وہ کسی بھی وجہ سے مجبور ہوں گے۔ بالکل ٹھیک کہا تھا اس نے۔۔۔ اب پولیس کو کچھ بتانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے وہی کیا جو مجھ سے کہا گیا۔ میں ڈر بھی خوف زدہ نہیں تھی کہ میرے ساتھ کیا ہوگا۔ الٹا مجھے امید ہو گئی تھی کہ اب مجرم بچ نہیں سکتے۔ میں بچاں ہزار پاؤں ڈنڈے کر خفیہ طریقے سے نکلی لیکن میری نقل و حرکت خفیہ کہاں تھی۔ پولیس کو فوراً معلوم ہو گیا کہ میں کہاں جا رہی ہوں۔ وہ سامنے کی طرح میرے پیچھے آئے مگر شہر سے باہر آ کے غائب ہو گئے۔ مجھے اپنی گاڑی میں لے جانے والے اپنی طرف سے انتہائی محتاط تھے اور ان کی گاڑی سے ایک گلو میٹر پیچھے دوسری گاڑی صرف یہ دیکھنے کے لیے چلی رہی تھی کہ پولیس یا کوئی اور ان کے تعاقب میں تو نہیں ہے لیکن پولیس نے مخالف سمت سے بلکہ تین طرف سے سگنل ریسو کیا۔ ظاہر ہے سگنل تو ایک دائرے میں نشر ہو رہا تھا اور اس کی ریج بہت تھی۔ پولیس نے اپنے طور پر نتیجہ اخذ کر لیا تھا کہ میرے ساتھ وہی ہو رہا ہے جس کا انہیں اندیشہ تھا۔ یعنی تم نے مجھے بلایا ہے اور میں رازداری سے پولیس کو یا کسی اور کو بتائے بغیر جا رہی ہوں۔ انہوں نے تین گاڑیوں کو روانہ کیا جو ایک ایک سمتوں سے آئیں لیکن ان کے پیچھے کوئی نہیں گا۔ پولیس کا خیال تھا کہ یہ لوگ صبح ہوں تو پولیس کا بھی مقابلہ کر سکتے ہیں۔ ان کے فرشتوں کو خبر نہیں ہوئی اور پولیس سر پر آکھڑی ہوئی۔“

”تمہارے ساتھ انہوں نے کوئی بدسلوکی تو نہیں کی تھی؟“ میں نے پوچھا۔

”سوال یہ ہے کہ تم بدتمیزی کسے سمجھتے ہو۔ اگر تمہاری مراد دست درازائی سے ہے تو جواب ہے نہیں۔ ممکن ہے موقع ملتا تو وہ کرتے۔۔۔ ایک مرد کے مقابلے میں عورت کو صرف جسمانی تشدد کا خطرہ ہی نہیں ہوتا۔ بے آبروئی کا زور زیادہ ہوتا ہے، تمیز سے بات کرنے والا ان میں کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ سب انتہائی گھٹیا اور بازاری زبان استعمال کر رہے تھے اور یہ ثبوت فراہم کر رہے تھے کہ وہ کتنے گھٹیا مجرم ہیں۔“

”یعنی اعلیٰ مجرم بھی ہوتے ہیں۔“

”کیا تم نے دیکھے نہیں؟۔۔۔ اکبر خان کے ساتھ میں ایسے لوگوں سے ملی ہوں جو ذان تھے، مافیا کو کنٹرول کرتے تھے لیکن کیا مہذب اور شائستہ۔ خوش لباس، خوش ذوق، آداب مجلس کے واقف۔ دیکھ کے کوئی سوچ بھی نہیں سکتا

مونالیزا

مونالیزا کا سنا تھا اور اسی کی تلاش تھی۔ صاحبو! پروپینڈا بڑی چیز ہے۔ ہم نے بہت چھوٹی عمر میں، دس بارہ سال کے سن میں پہلی بار مونالیزا کا ذکر پڑھا تھا اور اس کی تصویر میرنگ خیال کے سالن سے میں دیکھی تھی۔ جو کچھ تھا نقادان کرام نے مونالیزا کی مسکراہٹ کے باب میں لکھا تھا اسے پڑھ کر تو ہم متاثر ہوئے لیکن تصویر دیکھ کر نہیں۔ پھر سیکڑوں باریہ تصویر دیکھی اور آخر خیال کیا کہ یہ آخر نقلیں ہیں اصل میں ضرور کوئی بات ہوگی۔ پس ہم لودر میں سٹیٹ روم میں بیٹھے تو دم بخود تھے۔ ایک تصویر کے سامنے لوگوں کا جھوم تھا۔ صرف اس ایک تصویر کے گرد سرخ باتات کا فریم تھا اور اوپر شیشہ تھا۔ ہم نے اسے دور سے دیکھا، پاس سے دیکھا۔ بہت جی کوکڑا کیا۔ لیکن صاحبو! آپ لوگوں نے بھی یہ تصویر دیکھی ہے۔ اس میں کون سی خاص بات ہے۔ ایک عورت ہے جس کے جسم میں کسی طرح کی موزونیت نہیں۔ ایک چہرہ ہے جس پر کسی طرح کے جذبات نہیں۔ کسی طرح کی شوشی۔ غم کی کیفیت نہیں اور ایک مسکراہٹ یا نیم مسکراہٹ ہے جو آپ کسی بھی شخص کے چہرے پر دیکھ سکتے ہیں۔ لیونارڈو ڈی ونچی کے ہم بہت قائل ہیں اور اس کے شاہکار ہم نے دیکھے ہیں لیکن یہ تصویر؟ ہے ادب شرط منہ نہ کھلوا سیں۔ ایک باریکی نے اسے چڑھا دیا۔ باقی لوگ تقلید اکھسی پر کبھی مارتے گئے۔ اگر کسی کی رائے ایسی ہوتی جیسی ہماری ہے تو مروت کے مارے یا نقادوں کے ڈر سے چپ ہو گیا کہ بدذوق کی تہمت نہ اٹھائے۔ مونالیزا کے دلدادگان ہم پر نفرین بھیجتے سے پہلے ازراہ انصاف اس تصویر کو ایک نظر دیکھ لیں اور ایک بے ذول غبی چہرے پر اس اتھنا نہ تار کو ملاحظہ فرمائیں جو مسکراہٹ بنتے بنتے رہ گیا ہے۔ پھر جو جی چاہے ہمارے بارے میں کہیں۔

ابن انشا کے سفر نامے ”دنیا گول ہے“ سے اقتباس

”ان بد معاشوں نے خود اپنے پاؤں پر کلیڑی مار لی ہے۔ اتنا آسان سمجھ رکھا تھا انہوں نے قانون کی آنکھوں میں۔“

216 مستقیم 2010

میں نے کہا۔ کور۔۔۔ یہ تم نے کیا نیا سکہ لٹرایا،

بہادر عورت تھی جس نے زندگی میں بڑے شیب و فراز دیئے

تھے لیکن میرے سامنے بیٹھی ہوئی ماہ نور اس زندگی سے بھاگ کے آئی تھی اور اس نے میری محبت کے سائبان میں پناہ لے لی تھی۔ رفتہ رفتہ اس نے اپنے گرد ایک جذباتی جوار کا قلم کر لیا تھا جس میں وہ خود کو صرف میرے ساتھ محفوظ دیکھتی تھی۔ یہ سمجھتی تھی کہ باہر کی دنیا اس کا کچھ نہیں لگا سکتی۔

اور میں تھا کہ اسے پھر اسی کاروباری دنیا میں سمجھ لایا تھا۔ اس کو مجبور کر رہا تھا کہ وہ جذبات کو ایک طرف رکھے۔ اسے عملی ہونے کا ثبوت دے، دنیا دار بنے۔ میرے ساتھ مل کے بڑھ چلائے اور مزید دولت کمانے کی جدوجہد میں میرا ساتھ دے۔ یہ سب کچھ بھی وہ اکبر خان کے لیے بھی کر رہی تھی۔ صرف یہ سنا کمانا اور کاروبار چلانا اس کا مقصد حیات ہوتا تو وہ اکبر خان کو چھوڑتی ہی کیوں اور اس کے قتل کا الزام اپنے سر کیوں لیتی، یہ صرف محبت تھی جو اسے میری طرف کھینچ لاتی تھی، یہ ایسی محبت تھی جس میں وہ مجھ سے کچھ طلب کرنے کی روادار نہ تھی۔ یہ بالکل غیر مشروط محبت تھی بالکل یکطرفہ۔ اس نے مجھے بتا دیا تھا کہ میں فریال سے شادی کروں تو اسے کوئی فرق نہیں پڑتا اور اس سے شادی نہ کروں تب بھی اس کی محبت وہی رہے گی، بس میں اسے خود سے دور نہ کروں۔

وہ جو کچھ کر رہی تھی محبت میں میرے لیے کر رہی تھی وہ دنیا پر کچھ ثابت کرنے کے لیے اور نہ مجھے ایسے کر کے لے لے۔ وہ میری خوشی کے لیے کچھ بھی کر سکتی تھی۔ اور کرنی رہی تھی لیکن اب شاید یہ نروس بریک ڈاؤن کا نتیجہ تھا کہ اس کے دل کی بات زبان پر آگئی اس نے صاف کہہ دیا کہ وہ کیا چاہتی ہے اور میں نے اس کے دل کی بات سمجھ لی۔

لندن کے سنجیدہ اخبارات میں جرائم کی خبروں کو نمایاں جگہ نہیں دی جاتی لیکن وہاں بھی ایسے اخبارات کی کمی نہیں جیسے ہمارے ملک میں عام طور پر شام کو شائع ہونے والے کہلاتے ہیں لیکن دوپہر سے بھی پہلے مارکیٹ میں آجاتے ہیں۔ خود ہماری پاکستانی برادری اردو زبان میں ایسے اخبارات شائع کرتی ہے جن کے پڑھنے والوں کی تعداد ہزاروں کو تو کیا سیکڑوں میں ہی رہتی ہے اور یہ اخبارات بھی مفت تقسیم کیے جاتے ہیں اور اشیا لوں پر ایسے ہی دوسرے اخبارات کے ساتھ پڑے نظر آتے ہیں۔

انہی اخبارات نے میرے کیس میں بڑی دلچسپی لی اور انہو پر اے تاوان کی واردات کو خوب بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔ کچھ رپورٹرز اور میرا انٹرویو بھی کرنا چاہتے تھے۔ انہیں میں نے قریب نہیں سمجھتے دیا۔ پھر بھی کچھ میگزینوں سے منسلح انرٹ سنیشن کے باہر منزل لاتے رہے اور میرے

تغاقب میں بھی آئے۔ انہوں نے ہماری تصویریں بھی اتار لیں اور ہمیں پتا نہیں چلا۔ اٹالوی زبان میں ایسے جان کاروگ بن کر تغاقب کرنے والے صحافیوں کو پاپاراززی کہا جاتا ہے۔

ان اخبارات نے ہمیں بہت کچھ بتا دیا۔ میں پاکستان کی ایک بہت بڑی ریاست کا بادشاہ قرار پایا۔ ایک نے مجھے حکمران لکھا۔ نور ملکہ ہوئی اور اس کا مقابلہ ملکہ نور جہاں سے کیا گیا تو مجھے جہانگیر کہا گیا۔ اس کے بعد انگریزوں کے لئے لیے گئے کہ وہ یہاں بھی اپنی نسلی برتری اور کیت کے خناس میں مبتلا ہیں۔

افسوس کی بات یہ تھی کہ کچھ اخبارات نے ایلیشا کے ساتھ میرے معاشرے کی بنیاد پر وہ کہانیاں شائع کر دیں جو غلط تو خیر نہیں تھیں مگر مکمل درست بھی نہ تھیں۔ ان میں ہمارے عشق کو ساری خرابی کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔ مجھے بے وقاف اور چال باز کہا گیا کہ ایک اور لڑکی کے ساتھ کچھ سے اڑا رہا ہوں اور دل شکستہ ہیر و دیو چھوڑ کے سنیاں لے چکی ہے کسی دن خود کشی بھی کرے گی۔ جتنے جتنے تھے اتنی باتیں۔

ایسے صحافیوں سے محفوظ رہنے کا ایک طریقہ تو قانونی تھا کہ میں ہر بے بنیاد خبر یا غلط رپورٹ پر ہر اخبار کو نوٹس جاری کر دوں۔ ظاہر ہے یہ ناممکن تھا۔ لوہان خبریں کو بہت انجوائے کرتی تھی لیکن مجھے ایک کاروباری ادارے کے سربراہ کی حیثیت سے اپنی گندول کی فکر تھی۔ میرے قانونی مشیر ملک ارشد نے مجھے مشورہ دیا کہ میں دو چار دن کے لیے غائب ہو جاؤں۔ بہتر ہوگا کہ کسی کو بتائے بغیر جیس چلا جاؤں۔ اس سے معاملات خود ہی ختم ہو جائیں گے۔

یہ تجویز مجھے پسند آئی۔ میں خود بھی تبدیلی کے لیے ایک بریک چاہتا تھا۔ میرے ڈاکٹر نے اس کی تائید کی۔ لندن کے اعصاب متھکن معاملات نور کو اور مجھے ڈپریشن میں مبتلا کر رہے تھے اور اس کا سب سے مؤثر علاج یہی تھا کہ ہم کچھ دن کے لیے سب کچھ بھول کے صرف تفریح کریں۔

مجھے اس تجویز پر پوری بھی آئی کیونکہ بالکل ایسا ہی مشورہ مجھے ست بدحالی میں دیا گیا تھا۔ راجا سمیت میرے تمام خیر خواہ اس حق میں تھے کہ کچھ دن کے لیے میں لندن چلا جاؤں کیونکہ ست بدحالی کے حالات میری ذہنی اور اعضائی صحت کو متاثر کر رہے تھے۔ چنانچہ میں نور کے ساتھ لندن آ گیا تھا۔ اب لندن کا ڈاکٹر بھی یہی کہہ رہا تھا کہ چند دن کے لیے سارے مسائل کو بھول کر لندن سے دور چلے جاؤ۔ بے اختیار مجھے مرزا غالب یاد آئے۔ اب تو گھبرا کے یہی کہتے ہیں

مر جا نہیں گئے۔ مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جا نہیں گئے۔ ست بدحالی سے لندن۔ لندن سے پیرس۔ پیرس سے آگے اپنی مرضی سے کم اور نور کے اصرار سے زیادہ مجبور ہو کے میں نے سپر ڈال دی اور ہم پیرس پہنچ گئے۔ یہ میڈیکل ایڈوائس تھی چنانچہ پولیس نے اپنی ساری کارروائی مؤخر کر دی۔

اس قسم کی تبدیلی کے اثرات ہمیشہ خوش گوار ہوتے ہیں اور پیرس کو شہر ایسا ہے کہ کرشمہ دامن دل کا کشیدہ کہ جا میں جا ست۔ ہر طرف حسن۔ خوب صورتی۔ فیشن اور خوشبو۔ پھولوں کے رنگ اور نور نے مصوری اور سنگتراشی کے مجسمے۔ دنیا میں سب سے زیادہ سیاحوں کے پیرس آنے کی یہی وجہ ہے۔

میں اور نور بھی لوٹ کر آئے تو بہت تازہ دم اور خوش تھے۔ ہمارے واپس آتے ہی مصروفیات کا سلسلہ پھر شروع ہوا۔ چیف کا معاملہ زیادہ سنگین ہو گیا تھا۔ اس کے اہم ساتھیوں نے ایک اہمقانہ منصوبے کے ذریعے اسے چھڑانے کی جو کوشش کی تھی اس سے جرم کی سنگینی اور بڑھ گئی تھی۔

انہو پر اے تاوان میں استعمال ہونے والی ساری رقم ہمیں لوٹا دی گئی تھی۔ ایک صبح مجھے اور نور کو شناخت پر یہ قسم کی کارروائی کے لیے کاؤنٹی جیل لے جایا گیا۔ وہاں ایک ایک کر کے تمام مہمانوں کو ہمارے سامنے پیش کیا گیا۔ کئی چیف کو دیکھ کر میں حیران بھی ہوا اور مجھے قسمی بھی آئی۔ وہ اصل چیف سے بالکل مختلف تھا۔ اس کی صورت کے نقوش میں تھوڑی بہت مماثلت ضرور تھی لیکن اس کا میجر اسٹائل وگ کا مہون منت تھا۔ وہ مجھ تھا اور وگ کے بغیر ذرا بھی چیف نہیں لگتا تھا۔

میں نے اس شخص سے کہا۔ ”مجھے تمہاری بے وقوفی پر افسوس ہوتا ہے۔ آخر کیا ضرورت تھی تمہیں اس شخص کی خاطر یہ سوانگ بھرنے کی جو تمہارے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا؟“

”تم دیکھنا۔ وہ خود بھی نکل جائے گا اور پھر مجھے بھی نکال لے گا۔“ اس نے ہٹ دھرمی یا بے شرمی سے کہا۔ میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ ”مجھے تو وہ وقت بہت دور نظر نہیں آتا جب وہ اور تم ایک ساتھ بکلی کی کرسی پر بٹھائے جاؤ گے۔ پاکستان نہیں لندن ہے۔ یہاں انہو پر اے تاوان کی سزا بھی موت ہے۔ اور یہاں رشوت یا سفارش کام نہیں آتی۔“

اس کا رنگ زرد پڑ گیا۔ ”مرنا تو ایک دن سب کو ہے۔“

سائیکل

جب سائیکل بنی نئی ایجاد ہوئی تو ایک آدمی نے اپنے بیٹے کو سائیکل لے کر دی، اس کا بیٹا سائیکل لے کر باہر نکلا، تو لوگوں نے دیکھا کہ لڑکے کو کوئی چیز اٹھا کر لے جا رہی ہے اور لڑکا لاتیں چلا رہا ہے لیکن وہ چیز لڑکے کی جان چھوڑ نہیں رہی، لوگوں نے ڈنڈے مار مار کے سائیکل کو توڑ دیا لڑکے باپ کو پتا چلا تو غصے سے بھرا ہوا آیا اور لوگوں سے کہا۔ ”تم بھتو تم نے میرے بیٹے کی سائیکل کو توڑ دیا۔“

لوگوں نے جواب دیا۔ ”چودھری جی اللہ کا شکر ادا کریں کہ آپ کے بیٹے کی جان بچ گئی، یہ عجیب چیز آپ کے بیٹے کو اٹھا کر لے جا رہی تھی، ہم لوگ نہ ہوتے تو یہ پتا نہیں اسے کہاں لے جاتی۔“

پاکستانی

جنہم میں عذاب کے کنوؤں پر ایک ایک فرشتے کی ڈیوٹی تھی جب کوئی جہنمی کنویں سے باہر نکلتا تو فرشتے اسے دوبارہ دیکھ دیتا، ایک کنواں فرشتے کی ڈیوٹی کے بغیر تھا، ایک فرشتے نے پوچھا۔ ”ہر کنوئیں پر تو فرشتہ مقرر ہے پھر وہ کنواں فرشتے کے بغیر کیوں ہے۔“ جواب ملا۔ ”اس کنوئیں میں پاکستانی ہیں، جب بھی کوئی لنگنے کی کوشش کرتا ہے دوسرے اس کی ٹانگ پکڑ کے پھر اندر کھینچ لیتے ہیں۔“

ترکیب

کھلونوں کی دکان پر ایک جیسے دو ہرن رکھے تھے ان پر ہرنوں پر ان کی تینیں درج تھیں ایک ہرن کی قیمت پانچ سو جبکہ دوسرے ہرن کی قیمت دو سو درج تھی۔ ایک گاہک نے دونوں کو اچھی طرح دیکھا اور کم قیمت والا ہرن خرید لیا۔ جب گاہک دکان سے چلا گیا۔ سلا مین نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ”دیکھا ہماری سامان بیچنے کی یہ ترکیب، کبھی ناکام نہیں ہوتی۔“

مرسل: رضوان تنولی کریم دی۔

”اور جس کا رو بار میں تم چیف کا ساتھ دے رہے تھے۔ اس میں یہی ہونا تھا۔“ افسوس یہ ہے کہ ایسا بہت دیر سے ہوا۔ جتنے لوگوں کی جان تم نے لی۔ جتنی زندگیاں کو تم نے برباد کیا اس کے بعد یہ سزا کوئی سزا نہیں۔“

”تم بھی تو چیف کے ساتھیوں میں تھے۔“

”غلط۔ میں اس کا شکار تھا۔ لیکن میں بچ گیا تھا۔ شاید خدا نے مجھے اسی لیے بچایا۔ زندہ رکھا اور پھر یہاں پہنچایا۔ کہ یہ نیک کام میرے ہاتھوں سرانجام پائے۔ ہر فرعونے راموے۔ افسوس پھر بھی ہوتا ہے کہ تمہارے بیوی بچے تا عمر تمہارے اعمال کی سزا جیتیں گے۔“

اس نے کہا۔ ”ان کے پاس پیسا بہت ہے۔“

”ویری گڈ۔ آج پتا چلا کہ پیسا شوہر کا اور باپ کا قبادل ہو سکتا ہے۔ چلو پھر جاؤ تم بھی۔“

تقریباً آٹھ ماہ بعد چیف کی سزائے موت پر عمل درآمد ہوا۔ اس کے ساتھی کو مجموعی طور پر ساٹھ سال قید کی سزا ملی۔ باقی افراد کی یہ عبادتیں سے چالیس سال بھی۔ ان کا ذکر آگے نہیں آئے گا۔

ست بدحالی میں میرا سب سے ہی رابطہ تھا۔ راجا اصل حقائق سے پوری طرح باخبر تھا اور اس نے ہزاروں میل دور سے بھی ہر معاملے میں مجھے صائب مشورہ دیا اور اپنی حاضر دماغی، ذہانت اور معاملہ جی سے مجھے احساس نہیں ہونے دیا کہ میں اکیلا ہوں۔ بے شک نور وہاں میرا حوصلہ بڑھانے کے لیے موجود تھی لیکن اس کا سہارا محض جذباتی تھا۔ میں نے اس سے بہت زیادہ توقعات وابستہ کر لی تھیں اور اسے بہت سی ایسی ذمے داریوں میں شریک کر لیا تھا جن کا بوجھ اٹھانا اس کے بس کی بات نہیں تھی لیکن میری خوشی کے لیے اس نے انکار نہیں کیا حالانکہ وہ ایک عام عورت تھی جسے جسمانی طور پر صنف نازک شمار کیا جاتا ہے۔ اعصابی اور جسمانی طور پر بھی وہ عموماً مرد کے مقابلے میں کمزور ثابت ہوتی ہیں۔ بالآخر ایک ایسی نوبت آگئی تھی جب نور نے صاف انکار کر دیا تھا کہ میرے بغیر وہ یہاں نہیں رہے گی۔

پیرس میں قیام کے دوران میں نے ہر ملے کوئی کاروباری یا قانونی مسائل کی بات نہیں کی۔ یہ ہم نے روانگی سے پہلے ہی طے کر لیا تھا اس کے باوجود ہم میں سے کوئی ایسی بات چھیڑ دیتا تھا تو دوسرا فوراً اسے روک دیتا تھا۔ یہ ایک مصنوعی اور شعوری کوشش تھی حقائق سے روگردانی تھی فراہمی کوشش تھی۔ شرمگاہ کی طرح خطرے کے ڈر سے ریت میں منہ چھپانے والی بات تھی لیکن اس کا فائدہ ہوا۔

اس تمام عرصے میں سوشی نے جس خلوص اور مہارت سے کمپنی کے معاملات چلائے اس کی تعریف الفاظ میں نہیں کی جاسکتی۔ اس کی مدد کے بغیر میں نے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس نے میری خواہش کے مطابق عملے میں تبدیلی کی تھی۔ نئے اسٹاف میں زیادہ تر پاکستانی تھے۔ یہ وہ ہونہار نوجوان تھے جن کی اپنے وطن میں قدر نہ ہوئی یا جنہیں ان کی صلاحیت کے مطابق نہ کام ملا اور نہ معاوضہ تو وہ بدل ہو کے باہر نکل گئے۔ ایسی مثالیں کیڑوں نہیں ہزاروں ہیں۔

یہاں کے سارے معاملات راجہ کے سپرد کر دینے کا آئیڈیاز رفتہ رفتہ مجھے قائل کر رہا تھا کہ یہ میرے مسائل کا سب سے بہتر حل ہے اور خود راجہ کو مطمئن کرنے کا بھی۔ میں نے جتنا اس پر غور کیا اتنا ہی اس تجویز کی افادیت کا قائل ہوتا چلا گیا۔ لیکن میں نے کوئی فوری فیصلہ نہیں کیا۔ میں اس معاملے میں واپس ست بدحالی پہنچ کر راجا سے اور دوسرے لوگوں کے علاوہ راجہ سے بھی مشورہ کرنا چاہتا تھا۔

اب میں واپسی کے متعلق سوچنے لگا تھا کہ ایک رات سیکورٹی گارڈز نے مجھے کسی ہربرٹ اپنسر کے آنے کی اطلاع دی۔ اگر یہ پیشگی اطلاع دیے بغیر اور وقت ملاقات لیے بغیر اپنے گھر پہنچاؤ کے لیے مجھے نہیں جاتے۔

میں نے کہا۔ ”میں کسی ہربرٹ اپنسر کو نہیں جانتا۔ وہ کیا چاہتا ہے؟“

”اس نے کہا ہے کہ مقصد ملاقات وہ صرف آپ کو بتائے گا؟“

میں نے کہا۔ ”اچھا فون اسے دو۔“

فون پر آواز آئی۔ ”لارڈ ارنسٹ۔۔۔ مجھے سوشی نے آپ سے ملنے کو کہا تھا۔“

میں نے کہا۔ ”لیکن سوشی نے یہ بات مجھے نہیں بتائی۔“

وہ برامانے بغیر بولا۔ ”کیا اس میں میرا قصور ہے؟“

”مشر ہربرٹ اپنسر۔۔۔ آپ ایک منٹ انتظار کریں میں سوشی سے کفرم کر لوں۔“

میں نے سوشی سے پوچھا۔ ”یہ ہربرٹ اپنسر کون ہے؟“

کہتا ہے اسے تم سے بھیجا ہے؟“

”اور ریت۔۔۔ آئی ایم سوری۔۔۔ میں مصروفیت میں تمہیں بتانا بھول گئی۔ یہ وہی برادر ہے جو محلات، قدیم کوٹھیوں، نوادرات اور جواہرات وغیرہ کے سودے کرتا ہے۔“

میں نے ہربرٹ اپنسر کو اندر بلا لیا۔ خلاف توقع وہ

ایک عمر رسیدہ شخص تھا جس کے سر کے بال بہت گھٹے اور لمبے ہونے کے ساتھ بالکل سفید تھے۔ جیسا کہ اس نے بعد میں بتایا کہ اس کی عمر ستر سال ایک سو ستر دن اور چودہ گھنٹے تھی۔ لیکن اس کی صحت بہت سے جوانوں سے اچھی تھی اور وہ حد درجہ خوش مزاج اور خوش لباس شخص تھا۔

”آئی ایم سوری مسٹر اپنسر۔۔۔ آپ کو انتظار کرنا پڑا۔“

وہ مسکرا کے صوفے پر بیٹھ گیا۔ ”معذرت سوشی کو کرنی چاہیے۔ لیکن میں انتظار کا عادی ہوں۔ پیدا ہونے کے لیے مجھے نو مہینے ماں کے پیٹ میں انتظار کرنا پڑا۔ جوان ہونے کے لیے اٹھارہ سال انتظار کرنا پڑا تا کہ میں کسی خوب صورت لڑکی پر ڈورے ڈال سکوں۔ انتظار میں اب بھی کر رہا ہوں۔“

میں نے ہنس کے کہا۔ ”کس بات کا؟“

”میرے کا اور کس کا۔۔۔ اور میں اپنے وارثوں کو مسلسل مایوس کر رہا ہوں۔ ہر سال کہتا ہوں کہ بس یہ آخری سالگرہ ہے۔ میری آٹھویں بیوی سب سے زیادہ دھبی ہے کیونکہ اس کی عمر ایک ایک سال کر کے بڑھتی جا رہی ہے اس نے آٹھ سال قبل مجھ سے شادی کی تھی تو وہ تیس سال کی تھی۔“

میں نے حیرانی سے کہا۔ ”یعنی تم سے نصف عمر کی؟“

”مجھے اس سے فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ میں کی ہوتی تب بھی کیا تھا۔۔۔ دراصل ایک بچہ جی نے اسے متعلق کیا تھا کہ دو سال میں تم مالدار ہو جاؤ گی۔ اس وقت ہم منگنی کر چکے تھے۔ جو تین سال رہی۔ پھر وہ شادی کے لیے بلند ہو گئی۔“

میں نے کہا۔ ”دولت مند بننے کے اور بھی طریقے تھے۔“

”ہاں۔۔۔ مگر اس نے یہی طریقہ پسند کیا تو اس کی مرضی۔۔۔ دراصل اسے یقین ہوگا کہ میں اپنا وعدہ نبھائوں گا اور آئندہ میری سالگرہ نہیں بری ہوگی۔ اب وہ مجھے چھوڑ بھی نہیں سکتی۔ کیا پتا میں اسی سال روانہ ہو جاؤں۔۔۔ اور کچھ پانچیس پچری مار دوں۔ تیس سال بعد وہ جو جائے گی اڑسٹھ کی۔ اور مجھے یقین ہے جلتے کڑھتے پہلے ہی مر جائے گی۔۔۔ ورنہ خودکشی کر لے گی۔“

میں نے کہا۔ ”کیا اب ہم برنس کی بات کریں؟“

”شیور۔۔۔ دراصل میں تم سے ملنے آ گیا ورنہ یہ بات فون پر دو منت میں ختم ہو جاتی۔ میں پوچھتا کہ بے دخل ہونے کا کیا لو گے۔ تم ایک رقم بتاتے۔ میں کہتا

اوکے۔ اور بس۔“

”یعنی میں کچھ بھی مانگ لیتا؟“

”اب مانگ کے دیکھو۔ کیا چاہیے تمہیں اس محل کا؟“

میں نے کہا۔ ”اگر میں سوئین کہوں۔۔۔ پھر؟“

”میرا جواب وہی ہوگا۔ انتظار تمہیں زیادہ کرنا پڑے گا۔“

میں نے کہا۔ ”کتنا زیادہ؟“

”میرے خیال میں پچاس سال سے کافی کم۔“ وہ سوچ کے بولا۔

میں نے پوچھا۔ ”کتنا کم؟“

”چھ سات ہفتے کم۔“ اس نے کہا اور پھر اپنے مذاق پر خود ہی ہنسا۔ ”اتنا جی لو گے؟“

میں نے کہا۔ ”مسٹر اپنسر۔۔۔ مجھے یہاں کی جانکاردوں کی مالیت کا کچھ پتا نہیں۔ تم میری رہنمائی کرو۔“

نور کا فی لے آئی اور وہیں بیٹھ گئی۔ ہربرٹ اپنسر نے اسے غور سے دیکھا۔ ”تمہاری ٹیکر ٹیری۔ گرل فرینڈ۔ یا وائف؟“

”سب کچھ۔“ میں نے کہا۔ ”تھری ان ون۔“

اس نے کہا۔ ”میں اپنی زندگی کے تجربات کی قسم کھا کے کہتا ہوں کہ تم خوش قسمت ہو۔ ایسی حسین لڑکی میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ دیکھی ہوتی تو تمہاری طرح قناعت کر کے بیٹھ جاتا۔ یوں نہ بھٹکتا پھرتا۔ خوب سے خوب تر کی تلاش میں۔“

نور کا چہرہ سرخ ہو کے خوشی سے دھنکے لگا۔

اپنسر نے کہا۔ ”یہ کل کوئی ڈھائی سو سال پہلے تعمیر ہوا تھا لارڈ ارنسٹ کے دادا کے دادا نے اسے کوئن الزبتھ کے زمانے میں خریدا تھا۔“

”لیکن یہ اتنا پرانا تو نہیں لگتا؟“

”عورت۔۔۔ مگر اور شیئری کی دیکھ بھال کی ضرورت ہوتی ہے۔“ اس نے کسی تکنیکی طرح ارشاد فرمایا۔ ”ان کو خطاب بھی ملکہ الزبتھ اول نے دیا تھا۔ اس وقت بھی یہ اتنا ہی بڑا تھا اور میرا خیال ہے کہ اس کے بارغ اور نقشے میں کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ بعد میں آنے والے یعنی لارڈ ارنسٹ کے باپ نے اور سب سے زیادہ لارڈ ارنسٹ نے اس کی مرمت اور رنگ و روغن اور اندرونی آرائش پر سب سے زیادہ وقت اور پیسا خرچ کیا۔ اب یہ ایک تاریخی ورثہ ہے۔“

اس کی ظاہری شکل و صورت بدلی نہیں جاسکتی۔۔۔۔۔ اسے گرا کے کوئی تجارتی عمارت کھڑی کرنے کا تو سوال ہی نہیں۔۔۔۔۔ چنانچہ اب اس کے خریدار بہت کم ہیں۔۔۔۔۔ اور ایسے لوگ جو نوادرات کی قدر کریں کم ہوتے جا رہے ہیں۔۔۔۔۔ انہیں دوستوں اور شیروں نے کیا قیمت لگانے کو کہا۔۔۔۔۔ اور خود تم کیا تو فیع رکھتے ہو؟ اب تو میں نے گلی لپٹی رکھے بغیر تمہیں اس کی تاریخی حیثیت بھی بتادی۔

میں نے کہا۔۔۔۔۔ ”جو قیمت میں نے پہلے بتائی تھی۔۔۔۔۔ اگر میں اسے نصف کروں؟“

وہ عیاری سے مسکرایا۔۔۔۔۔ ”تو وقت بھی نصف ہو جائے گا۔“

”اس حساب سے تو دس ملین کے لیے مجھے دس سال چاہئیں؟“

”نوسر۔۔۔۔۔ صرف دس منٹ۔۔۔۔۔ شاید اس سے بھی کم۔۔۔۔۔ ایک چمک لکھنے میں جتنا وقت لگتا ہے۔“

”مسٹر اسپنسر میری کم آگاہی کا مذاق نہ اڑاؤ۔۔۔۔۔ میں نے کہا تھا کہ میری راہنمائی کرو۔“ میں نے ہنسی سے کہا۔

”لاڈر ریش۔۔۔۔۔ میں نہ کسی کی کم طلی سے فائدہ اٹھاتا ہوں اور نہ کسی سے غلط بیانی کرتا ہوں۔۔۔۔۔ آپ کا دوست بن کر میں دوسرے شخص کو ٹوٹوں گا نہیں۔۔۔۔۔ مگر یہ ہے وہ آپ سے بھی زیادہ سادہ لوح ہو۔۔۔۔۔ شوق میں دینی جتنی قیمت دے جائے۔۔۔۔۔ بعد میں پچھتاے اور بچھے کو سے۔۔۔۔۔ میں اس کی بھی راہنمائی کروں گا۔۔۔۔۔ مجھے ہر حال میں دونوں سے حق محنت وصول ہوگا۔۔۔۔۔ کمیشن اس کے لیے ذرا گھٹیا لفظ ہے۔

اس کی قیمت آپ ہیں اور پچیس کے درمیان وصول کر سکتے ہیں۔۔۔۔۔ میں ملین پاؤنڈز آپ کو فوراً بھی مل سکتے ہیں۔۔۔۔۔ ایک ہفتے میں۔۔۔۔۔ پچیس کے لیے شاید پچیس ہفتے لگ جائیں۔۔۔۔۔ یہ آپ کی قسمت ہے کہ گاہک پہلے آجائے۔“

”میں پچیس ہفتے انتظار کر سکتا ہوں۔۔۔۔۔ گویا چھ مہینے۔“

”ویری گڈ۔“ اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔۔۔۔۔ ”مجھے وہ نوجوان پسند ہیں جو تذبذب میں اپنا اور دوسروں کا دماغ خراب نہ کریں۔“

”یہ ہو سکتا ہے کہ میں واپس پاکستان چلا جاؤں۔۔۔۔۔ اور پھر آ جاؤں۔۔۔۔۔ اس سے کوئی فرق تو نہیں پڑے گا؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔۔۔۔۔ ”آپ کون سا محل اپنے ساتھ لے جاؤ گے۔“

”خریدار اسے دیکھنا چاہیں گے؟“

وہ ہنسنا۔۔۔۔۔ ”خریدار انہی میں سے کوئی ہوگا جو اسے بار بار

دیکھ چکے ہوں گے اور حسرت رکھتے ہوئے گئے کہ اس میں رہائش اختیار کریں۔۔۔۔۔ اس حسرت کے بغیر اتنی بڑی رقم کون نکال سکتا ہے۔ اس سے کہیں کم میں جدید صنعت کی اس سے دینی بڑی عمارت کہیں بھی لی جاسکتی ہے۔۔۔۔۔ ساری بات ہے جذبے کی قدر شناسی کی۔۔۔۔۔ اب یہ سودا تو ہو گیا۔“ اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔

”اگر ہو گیا تو بڑی خوشی کی بات ہے۔“

”مگر مگر کیسی۔۔۔۔۔ آپ نے پچیس ملین پاؤنڈز میں رضا مندی ظاہر کی ہے اور میں نے چھ ماہ کی مہلت لی ہے۔۔۔۔۔ ہم دونوں شریف اور اپنی اپنی بات پر قائم رہنے والے لوگ ہیں۔۔۔۔۔ اب ہم آتے ہیں ایک اور اہم سوال کی طرف۔۔۔۔۔ کیا آپ خریدار کا انتخاب بھی کریں گے؟“

میں نے کہا۔۔۔۔۔ ”میں سمجھا نہیں۔“

”آپ نے انجمنی لاڈر کے کھڑوں والے اصطبل کا سودا یوک آف کنٹرول سے کیا ہے۔۔۔۔۔ یہ ایک جنٹلمین ڈیل تھی۔۔۔۔۔ میرے خیال میں اس سے بہتر قدر شناس گاہک اور کوئی نہیں تھا۔ کیا ایسا ہی آپ محل کے بارے میں کریں گے؟“

”دیکھیے۔۔۔۔۔ مجھے کیا پتا کون گاہک آئے گا۔۔۔۔۔ اصطبل کا تو ایک خریدار تھا اور اس نے مجھے بلیک چیک دینے پر رضا مندی ظاہر کر دی ہے۔۔۔۔۔ پھر میں دوسرے سے بات کیوں کروں؟“

”فرض کریں آپ کے پاس تین گاہک ہوں۔۔۔۔۔ ایک آپ کو پانچ ملین زیادہ دینے پر راضی ہو لیکن وہ کسی انڈر ورلڈ مافیا کا سربراہ ہو۔“

”پھر انکار کی ہمت ہی کہاں ہوگی مجھ میں۔“

”ایسی بات نہیں۔۔۔۔۔ وہ آپ کے سامنے فریکٹ جنٹلمین کا نمونہ بن کے آئے گا اور آپ کو پتا بھی نہیں چلے گا کہ وہ کون ہے۔۔۔۔۔ دوسرا خریدار لاڈر کا کوئی پرانا حاسد اور دشمن ہو۔۔۔۔۔ وہ بھی پانچ ملین زیادہ دے۔ اور تیسرا ایک حقیقی قدردان۔۔۔۔۔ نہ دوست نہ دشمن۔“

میں نے کہا۔۔۔۔۔ ”آپ کو یقیناً مایوسی ہوگی مسٹر ہربرٹ اسپنسر۔ میں آج کے زمانے کا کاروباری ذہن رکھنے والا عام آدمی ہوں۔۔۔۔۔ خاصا بزدل بھی ہوں۔۔۔۔۔ میں اس مافیا کے ڈان کے سامنے سر جھکا دوں گا۔“

”مجھے اسی جواب کی اُمید تھی۔ اب دیکھا جائے تو آپ کی توقع پچیس سے بڑھ کر تیس کی ہوگی لیکن میں ایسا نہیں کروں گا۔۔۔۔۔ حالانکہ میں ملین میں میرا کمیشن بھی بڑھ جاتا

ہے۔ لیکن لاڈر نہیں میں پرانے وقتوں کا ایک احمق بوڑھا ہوں جو پرانی قدروں کو آج بھی اہم سمجھتا ہے۔۔۔۔۔ نہ میں لاڈر کے دشمن سے رابطہ کروں گا اور نہ اس ڈان سے۔۔۔۔۔ میری بات صرف حق لوگوں سے ہوگی۔۔۔۔۔ مستحق کا لفظ شاید آپ کو عجیب لگے۔۔۔۔۔ دنیا کے بازار میں ہر وہ شخص مستحق ہے جو قوت خرید رکھتا ہے مگر میرے لیے ایسا نہیں ہے۔“

حقیقت یہ ہے کہ اس بوڑھے شخص کی بات نے مجھے شرمندہ کر دیا۔ انگریز ایک وضعدار اور روایت پسند قوم ہے اور پرانے لوگ حد درجہ قدامت پرست۔۔۔۔۔ میرا صاف پانچ ملین کا نقصان ہو رہا تھا مگر اسے پرواہی نہیں تھی اور میں مجبور تھا۔ اس کی مدد کے بغیر میں نکل اور جا کاد پرانے فروخت کا اشتہار لگانے نہیں سچ سکتا تھا۔۔۔۔۔ پھر یہ نوادرات اور آثارِ قدیمہ نہ رہتی۔۔۔۔۔ عام پرانے ہو جاتی جس کو خواص منہ نہ لگتے۔ عام آدمی صرف زمین کی قیمت لگاتا یا اینٹ پتھروں کی۔ یہ شاید نصف بھی نہ ہوتی۔

تو اب تک خاموش تھی۔ اس نے اچانک ایک بہت اہم سوال کیا جو میرے ذہن سے اوجھل تھا۔ ”مسٹر ہربرٹ اسپنسر۔ ایک بہت اہم پہلو پر آپ نے بات نہیں کی۔ اس محل کی قیمت آپ نے تمام ساز و سامان کے ساتھ لگائی ہے

تو اب تک خاموش تھی۔ اس نے اچانک ایک بہت اہم سوال کیا جو میرے ذہن سے اوجھل تھا۔ ”مسٹر ہربرٹ اسپنسر۔ ایک بہت اہم پہلو پر آپ نے بات نہیں کی۔ اس محل کی قیمت آپ نے تمام ساز و سامان کے ساتھ لگائی ہے

تو اب تک خاموش تھی۔ اس نے اچانک ایک بہت اہم سوال کیا جو میرے ذہن سے اوجھل تھا۔ ”مسٹر ہربرٹ اسپنسر۔ ایک بہت اہم پہلو پر آپ نے بات نہیں کی۔ اس محل کی قیمت آپ نے تمام ساز و سامان کے ساتھ لگائی ہے

تو اب تک خاموش تھی۔ اس نے اچانک ایک بہت اہم سوال کیا جو میرے ذہن سے اوجھل تھا۔ ”مسٹر ہربرٹ اسپنسر۔ ایک بہت اہم پہلو پر آپ نے بات نہیں کی۔ اس محل کی قیمت آپ نے تمام ساز و سامان کے ساتھ لگائی ہے

تو اب تک خاموش تھی۔ اس نے اچانک ایک بہت اہم سوال کیا جو میرے ذہن سے اوجھل تھا۔ ”مسٹر ہربرٹ اسپنسر۔ ایک بہت اہم پہلو پر آپ نے بات نہیں کی۔ اس محل کی قیمت آپ نے تمام ساز و سامان کے ساتھ لگائی ہے

تو اب تک خاموش تھی۔ اس نے اچانک ایک بہت اہم سوال کیا جو میرے ذہن سے اوجھل تھا۔ ”مسٹر ہربرٹ اسپنسر۔ ایک بہت اہم پہلو پر آپ نے بات نہیں کی۔ اس محل کی قیمت آپ نے تمام ساز و سامان کے ساتھ لگائی ہے

تو اب تک خاموش تھی۔ اس نے اچانک ایک بہت اہم سوال کیا جو میرے ذہن سے اوجھل تھا۔ ”مسٹر ہربرٹ اسپنسر۔ ایک بہت اہم پہلو پر آپ نے بات نہیں کی۔ اس محل کی قیمت آپ نے تمام ساز و سامان کے ساتھ لگائی ہے

تو اب تک خاموش تھی۔ اس نے اچانک ایک بہت اہم سوال کیا جو میرے ذہن سے اوجھل تھا۔ ”مسٹر ہربرٹ اسپنسر۔ ایک بہت اہم پہلو پر آپ نے بات نہیں کی۔ اس محل کی قیمت آپ نے تمام ساز و سامان کے ساتھ لگائی ہے

تو اب تک خاموش تھی۔ اس نے اچانک ایک بہت اہم سوال کیا جو میرے ذہن سے اوجھل تھا۔ ”مسٹر ہربرٹ اسپنسر۔ ایک بہت اہم پہلو پر آپ نے بات نہیں کی۔ اس محل کی قیمت آپ نے تمام ساز و سامان کے ساتھ لگائی ہے

تو اب تک خاموش تھی۔ اس نے اچانک ایک بہت اہم سوال کیا جو میرے ذہن سے اوجھل تھا۔ ”مسٹر ہربرٹ اسپنسر۔ ایک بہت اہم پہلو پر آپ نے بات نہیں کی۔ اس محل کی قیمت آپ نے تمام ساز و سامان کے ساتھ لگائی ہے

تو اب تک خاموش تھی۔ اس نے اچانک ایک بہت اہم سوال کیا جو میرے ذہن سے اوجھل تھا۔ ”مسٹر ہربرٹ اسپنسر۔ ایک بہت اہم پہلو پر آپ نے بات نہیں کی۔ اس محل کی قیمت آپ نے تمام ساز و سامان کے ساتھ لگائی ہے

تو اب تک خاموش تھی۔ اس نے اچانک ایک بہت اہم سوال کیا جو میرے ذہن سے اوجھل تھا۔ ”مسٹر ہربرٹ اسپنسر۔ ایک بہت اہم پہلو پر آپ نے بات نہیں کی۔ اس محل کی قیمت آپ نے تمام ساز و سامان کے ساتھ لگائی ہے

تو اب تک خاموش تھی۔ اس نے اچانک ایک بہت اہم سوال کیا جو میرے ذہن سے اوجھل تھا۔ ”مسٹر ہربرٹ اسپنسر۔ ایک بہت اہم پہلو پر آپ نے بات نہیں کی۔ اس محل کی قیمت آپ نے تمام ساز و سامان کے ساتھ لگائی ہے

تو اب تک خاموش تھی۔ اس نے اچانک ایک بہت اہم سوال کیا جو میرے ذہن سے اوجھل تھا۔ ”مسٹر ہربرٹ اسپنسر۔ ایک بہت اہم پہلو پر آپ نے بات نہیں کی۔ اس محل کی قیمت آپ نے تمام ساز و سامان کے ساتھ لگائی ہے

تو اب تک خاموش تھی۔ اس نے اچانک ایک بہت اہم سوال کیا جو میرے ذہن سے اوجھل تھا۔ ”مسٹر ہربرٹ اسپنسر۔ ایک بہت اہم پہلو پر آپ نے بات نہیں کی۔ اس محل کی قیمت آپ نے تمام ساز و سامان کے ساتھ لگائی ہے

میں نے اور تو نے اسے ملے جلے جذبات کے ساتھ الوداع کہا۔ ایک طرف وہ ہمیں آرٹس فیشن کی خصوصی قیمت دلوا رہا تھا کیونکہ اس کے مراسم خصوصی لوگوں سے تھے دوسری طرف وہ اچھی خاصی قیمت کے نوادرات بھی ساتھ ہی خرید رہا تھا جن کی قیمت کا ہمیں کوئی اندازہ نہ تھا۔۔۔۔۔ پھر بھی میرا خیال تھا کہ وہ مالیت میں محل کے برابر کسی صورت نہیں ہو سکتے۔

یہ اگلے روز شام کی بات ہے جب مجھے ایلینا کا فون موصول ہوا۔ ”ریش میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔“

میں نے کہا۔۔۔۔۔ ”کس سلسلے میں؟“

”سلسلہ تو بہت پرانا ہے اور لوگ ایسے بھی ملتے رہتے ہیں۔“

میں نے صاف کہا۔۔۔۔۔ ”آئی ایم سوری، پرانے وقت کی اب کوئی بات نہیں رہی اور ویسے بھی میں بہت مصروف ہوں اپنے کام میں۔“

”مجھے سب معلوم ہے تمہاری مصروفیت کا۔۔۔۔۔ اس نے تلخ ہو کے کہا۔ ”تم میری سیر تفریح کو تم کام کہتے ہو؟“

”سیر تفریح کو اگر میں کام سمجھتا ہوں تو تمہیں کیا۔۔۔۔۔ تفریح تم پر حرام ہے، مجھ پر نہیں۔“

”اس سے پہلے دو دن اچھی تفریح کر اچکے تھے پرانے دوست۔“

مجھے سخت طیش آیا۔ ”واہ۔۔۔۔۔ یہ خوب ترک دنیا ہے کہ چرچ میں ہی باہر سے منٹ منٹ کی خبر مل رہی ہے، کیوں کر رہی ہو یہ ڈراما تم؟“

وہ رو ہانسی ہو گئی۔ ”پلیز ریش، اسنے بے مروت نہ بنو۔“

”یہ بے مروتی نہیں۔ تمہاری بھلائی کے لیے ہے، کیونکہ سیرت میں مصروف ہو جاؤ گی تو تمہارے دل کو وہ سکون ملے گا جو ابھی حاصل نہیں کیونکہ تم دو دنیاؤں کے بیچ میں پھنسلے ہو۔“

میں چند لمحوں کی طرح ادھر سے ادھر ہو رہی ہو۔ میری پریشانی کو چھوڑو۔ اسنے لیے پریشانی کم کرو۔“

اچانک مجھے احساس ہوا کہ دوسری طرف سے ایلینا نے فون بند کر دیا ہے اور میں اکیلا خود سے باتیں کر رہا ہوں۔

نور نے سب سنا تھا لیکن دخل نہیں دیا تھا۔ اس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ”غصہ کیوں کرتے ہو، وہ ٹارٹل نہیں ہے، رحم کے قابل ہے۔“

”ایسا نہ ہو کہ میں ٹارٹل نہ رہوں۔ رحم کے قابل

ہو جاؤں، یہی چاہتی ہے وہ۔۔۔۔۔

”جلو چھوڑو، تم نے سچا دیا ہے، وہ مجھ جائے گی۔ آؤ آج ہم ڈاکٹر شائستہ سے مل آئیں، بہت دن ہو گئے، اس سے فریال کی بھی کچھ خبر ملے گی۔“ اس نے مجھے اٹھنے پر مجبور کر دیا۔

نہ جانتے ہوئے بھی میں نور کے ساتھ ڈاکٹر شائستہ کی طرف چلا گیا۔ مجھے ایک ڈر سا لگا رہتا تھا کہ وہ حد درجہ ذالی سوچ رکھنے والی عورت تھیں نور کے سامنے کوئی غلط بات نہ کر دے۔ اسے بھی میں اپنا رمل سوچ ہی کہوں گا کہ وہ مرد عورت کے رشتے کو شخص حیوانی غلط سمجھتی تھی جس میں اخلاقیات کا کوئی دخل نہیں۔ جس ایک جسامتی ضرورت ہے جو کہیں سے بھی پوری کی جاسکتی ہے جیسے پیٹ کی بھوک کہیں سے بھی کچھ کھا کے مٹائی جاسکتی ہے۔ مغرب میں یہ طرز فکر تیزی سے بردان چڑھ رہی ہے اور ایک طبقہ ایسا بھی پیدا ہو گیا ہے جو خونی رشتوں کی حرمت کا قائل نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ کشتے، بلی بکرے اور بکری یا دیگر جانور کون سے خونی رشتے کا احترام ملحوظ رکھتے ہیں۔ گائے کا کون سا بھائی ہوتا ہے، وہ صرف نکل ہوتا ہے۔

شائستہ کی اس سوچ کے پیچھے بھی ایک حادثہ تھا لیکن مجھے اس کا علم نہیں تھا۔ وہ فریال کی سب سے عزیز سہیلی تھی جس نے لندن کے قیام کے دوران میں سے اور مجھے ملائے رکھا تھا۔ میں تو اچانک ایک دن اس کے چکل میں پھنس گیا تھا۔ جب مجھے اس کے کپٹیکس کا علم ہوا تھا۔ اس سے پہلے وہ میرے ساتھ اتنی رکھائی اور بے رشتی سے پیش آتی تھی۔ خصوصاً فریال کے سامنے کہ میں نے اسے ڈاکٹر غیر شائستہ کا خطاب دے رکھا تھا۔

ڈاکٹر شائستہ نے بڑے تاک سے ہمارا خیر مقدم کیا۔ اب میرے ساتھ اس کا رویہ بالکل بدل چکا تھا۔ وہ نور کے ساتھ بھی بہت فریڈنٹی تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے فریال کے ساتھ تھی۔ یہاں آنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ نور کو اپنے ساتھ لاکے میں نے غلطی کی ہے۔ شاید خود مجھے بھی اس غلطی کو بحال کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ دونوں اندر والے کمرے میں نہ جانے کیا کسم پکس کر رہیں۔ میں نے باہر بیٹھ کے کافی ختم کر لی، پھر احتجاج کیا کہ آخر مجھے اکیلا کیوں بٹھا دیا گیا ہے تو وہ باہر آئیں۔ میں نے نوٹ کیا کہ نور کا رنگ کچھ اڑا ہوا ہے۔

نور فوراً رخصت چاہتی تھی لیکن شائستہ نے کہا کہ باہر کہیں کھانے پر چلتے ہیں۔ میں تو بالکل اکیلی ہی رہتی ہوں،

جہاں جاتی ہوں بچے ساتھ ہوتے ہیں، تم لوگوں کے آنے سے کچھ روک ہوگی۔

اس کے اصرار کے آگے ہماری ایک نہ چلی۔ وہ ہمیں لندن کے ایک عربی ریسٹورنٹ میں لے گئی جہاں کھانا واقعی اچھا اور نیا تھا۔ جب ہم واپس آ رہے تھے تو نور نے خود ہی بولنا شروع کر دیا۔ ”یہ شائستہ کیا چیز ہے آخر، مجھے تو آج ہی پتا چلا۔“

”کیا پتا چلا۔۔۔۔۔؟“ میں نے اپنی نظر سڑک پر رکھی۔

”وہ تو پاگل ہے۔“

میں نے ہنس کے کہا۔ ”ہر پاگل کی نظر میں دوسرا شخص پاگل ہے، وہ کیا کہتی ہے تمہارے بارے میں؟“

”مجھے جانے کی کوئی ضرورت نہیں، اگر مجھے پتا ہوتا تو میں ہرگز تمہیں وہاں نہ لے جاتی۔“

”مطلب یہ کہ اکیلی جاتیں۔“

”آج جو باتیں اس نے مجھ سے کی ہیں، میں کیا بتاؤں تمہیں۔“

میں نے کہا۔ ”مت بتاؤ، مجھے معلوم ہے سب۔“

”تمہیں معلوم ہے؟“ فریال نے بتایا ہوگا۔

میں نے سر ہلا دیا۔ ”ظاہر ہے لیکن دیکھو، ہر سچ شدہ شخصیت کسی حادثے کا نتیجہ ہوتی ہے، جیسے گاڑی، زیادہ تر ٹھیک ہوتی ہیں لیکن اسکیڈٹ ہو جائے تو۔۔۔۔۔“

”جلو اب اپنا یہ فلسفہ مت بکھاؤ، میں آئندہ اس عورت سے نہیں ملوں گی اور تم بھی نہیں۔“

”میں بھی نہیں؟“ میں نے شرارت سے ٹھنڈی سانس لی۔

”اگر تمہیں ایک بات معلوم تھی تو مجھے کیوں نہیں بتائی تھی؟“

”وہ کوئی اچھی بات تھی کہ تمہیں ضرور بتانا۔۔۔۔۔؟“

میں نے کہا۔ ”یہ بتاؤ، فریال کے بارے میں بھی کچھ معلوم ہوا۔“

”اس کے بارے میں خبر اچھی نہیں ہے، وہ کسی فن نسر چھوٹے حاجی مستانہ کے ساتھ رہتی ہے، کسی فلم کا آکٹم سنگ کر رہی تھی۔“

”وہ آکٹم گرل ہو گئی ہے۔“

”اس کے پروفیشن میں سب کام ہیں اور مقصد صرف ایک ہے، ناموری اور پیسا۔۔۔۔۔ وہاں امارات کا کوئی شاہزادہ بھی موجود تھا، اس نے بعد میں فریال کو ساتھ چلنے کی پیشکش کی، فریال نے انکار کر دیا۔ شاہزادے کی تخت بے عزتی ہوئی،

کسی کی مجال نہیں کہ اسے انکار کر سکے، اس وقت وہ تو لال پیلا ہوتا چلا گیا کیونکہ حاجی مستانہ پہنچ گیا تھا اور اس نے کہا کہ ابھی تو یہ میری بیوی ہے لیکن آپ کو پسند ہے تو میں طلاق دے کر آپ کے پاس پہنچا دوں گا، اس کے بعد سے وہ غائب ہے۔“

”غائب ہے؟“

”دہلی میں نہیں ہے۔۔۔۔۔ شہزادہ کچھ رہا ہے کہ اسے حاجی مستانہ نے فرار کر دیا، حاجی مستانہ کا خیال ہے کہ شہزادے نے انوا کر لیا۔ ان کے کاروبار کی تعلقات ختم ہو گئے اور ایک طرح کی دہلی ہو گئی ہے۔ وہ تو حاجی مستانہ بھی کوئی معمولی چیز نہیں، اس کے مراسم شہزادے کے والد ماجد شیخ سے ہیں، فریال کا پتا نہیں کہاں ہے۔“

میں نے کہا۔ ”اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ چھوڑو۔ کوئی اور بات کرو۔“

”فرض کرو، ابھی ہم گھر جا میں اور وہ پہلے سے وہاں موجود ہو۔“

میں نے کہا۔ ”یار کیوں میرا دماغ خراب کر رہی ہو۔۔۔۔۔ کرنا ہے تو اچھی بات کرو ورنہ خاموش رہو۔“

نور نے سخت برا مانا اور کمر بٹختے کے بعد بھی اس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ میں خود بہت دیر جاگتا رہا اور اس وقت کے بارے میں سوچتا رہا جو فریال کے ساتھ گزرا تھا۔

زندگی نے اس کے ساتھ اچھا نہیں کیا تھا۔ پھر فریال نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا تھا، آخر میرا تصور کیا تھا؟

اچانک انٹر کام کا بزر بولا۔ میں نے گھڑی دیکھی تو رات کے سوا بارہ بجے تھے، سیکورٹی گارڈ کو اس وقت مجھ سے بات کرنے کی کیا ضرورت پیش آگئی، اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ وقت سونے کا ہے۔ شاید اسے کوئی ایمر ملتی ہو، یہ سوچ کے میں نے ریسپونڈ کر دیا۔

”سر۔۔۔۔۔ آپ سے کوئی ملے آیا ہے، ایک خاتون ہیں برقعے میں۔“

میں ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔ ایک دم میرا ذہن نور کی بات کی طرف چلا گیا تھا۔ فرض کرو ابھی ہم گھر چائیں اور وہ وہاں پہلے سے موجود ہو۔ کیا فریال سچ جی آگئی تھی۔ برقعہ پہننے کے یہاں آنے والا اور کون ہو سکتا تھا۔ میں کچھ دیر تذبذب میں ریسپونڈ لیے بیٹھا رہا۔ سیکورٹی گارڈ دوسری طرف میرے جواب کے انتظار میں تھا۔

نور کو درمیان دروازے میں دیکھ کے میں نے سکون کا سانس لیا۔ اس نے میری صورت دیکھ کے پوچھا۔

”کیوں۔۔۔۔۔ کیا ہوا۔۔۔۔۔؟“

میں نے ریسپونڈ سے تمہارے کہا۔ ”تمہاری بات سچ ہو گئی نا۔ وہ پہنچ گئی یہاں۔۔۔۔۔ مصیبت۔“

اس نے ریسپونڈ کر کہا۔ ”کون فریال۔۔۔۔۔“ اور پھر گارڈ سے بات کرنے لگی۔ ”فریال نہیں ہے تو پھر کون ہے، نام کیوں نہیں بتاتی، اچھا اسے آنے دو۔“

میں نے پریشانی سے کہا۔ ”کون ہے آخر؟“

”میں دیکھتی ہوں باہر جا کے۔“

”میں بھی چلتا ہوں تمہارے ساتھ۔۔۔۔۔ کوئی پکڑ نہ ہو۔“ میں نے عورت کی بات سنی اور میرے ساتھ۔۔۔۔۔ کوئی پکڑ نہ ہو۔

میں نے اپنا رمل سوچ ہی کہوں گا کہ وہ مرد عورت کے رشتے کو شخص حیوانی غلط سمجھتی تھی جس میں اخلاقیات کا کوئی دخل نہیں۔ جس ایک جسامتی ضرورت ہے جو کہیں سے بھی پوری کی جاسکتی ہے جیسے پیٹ کی بھوک کہیں سے بھی کچھ کھا کے مٹائی جاسکتی ہے۔ مغرب میں یہ طرز فکر تیزی سے بردان چڑھ رہی ہے اور ایک طبقہ ایسا بھی پیدا ہو گیا ہے جو خونی رشتوں کی حرمت کا قائل نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ کشتے، بلی بکرے اور بکری یا دیگر جانور کون سے خونی رشتے کا احترام ملحوظ رکھتے ہیں۔ گائے کا کون سا بھائی ہوتا ہے، وہ صرف نکل ہوتا ہے۔

”کیوں۔۔۔۔۔ کیا ہوا۔۔۔۔۔؟“

میں نے ریسپونڈ سے تمہارے کہا۔ ”کون ہے آخر؟“

”میں دیکھتی ہوں باہر جا کے۔“

”میں بھی چلتا ہوں تمہارے ساتھ۔۔۔۔۔ کوئی پکڑ نہ ہو۔“ میں نے اپنا رمل سوچ ہی کہوں گا کہ وہ مرد عورت کے رشتے کو شخص حیوانی غلط سمجھتی تھی جس میں اخلاقیات کا کوئی دخل نہیں۔ جس ایک جسامتی ضرورت ہے جو کہیں سے بھی پوری کی جاسکتی ہے جیسے پیٹ کی بھوک کہیں سے بھی کچھ کھا کے مٹائی جاسکتی ہے۔ مغرب میں یہ طرز فکر تیزی سے بردان چڑھ رہی ہے اور ایک طبقہ ایسا بھی پیدا ہو گیا ہے جو خونی رشتوں کی حرمت کا قائل نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ کشتے، بلی بکرے اور بکری یا دیگر جانور کون سے خونی رشتے کا احترام ملحوظ رکھتے ہیں۔ گائے کا کون سا بھائی ہوتا ہے، وہ صرف نکل ہوتا ہے۔

میں نے بڑی مشکل سے کہا۔ ”ایلیشا۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔ مجھے یقین نہیں آ رہا۔“

وہ سیدھی اندر چلی گئی۔ ”مجھے اس طرح آنا پڑا۔“

میں اور نور اس کے پیچھے اندر گئے۔ اس وقت تک وہ برقعہ ایک طرف ڈال کے صوفے پر بیٹھ چکی تھی۔ ”اگر میں کچھ کے ساتھ آتی تو اور کیا کرتی، تم نے ملنے سے انکار جو کر دیا تھا۔“

”ایلیشا۔۔۔۔۔ تم چراغ سے کیسے نکل آئیں؟“

”بس نکل آئی۔ میرا تم سے ملنا بے حد ضروری تھا۔“

میں تم سے پوچھنا چاہتی تھی کہ کیا یہ سچ ہے؟ تم ارنسٹ میٹن کے ساتھ ہمارا تمام ساز و سامان بھی سچ رہے ہو؟“

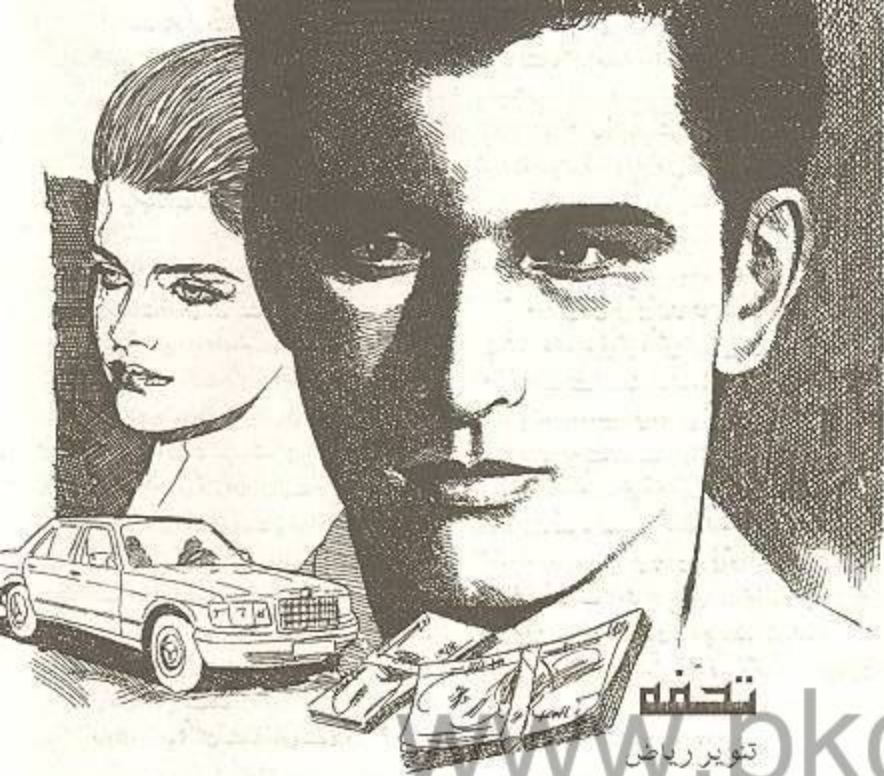
میں نے رکھائی سے کہا۔ ”تم بھول رہی ہو کہ اب وہ میرا ہے۔“

اس نے غصے سے پھر پٹا۔ ”مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنے کمینے اور ذلیل ہو، تمہیں ذرا احساس نہیں کہ اس محل کے علاوہ اس کے اسباب کی میرے نزدیک کیا جذباتی قیمت ہے۔ وہ سب نوادرات ہیں، ان کے ساتھ میری زندگی کی کہانی بڑی ہوئی ہے، میرا بچپن۔۔۔۔۔ میری جوانی۔۔۔۔۔ وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی اور منہ چھپا کے ہٹکیاں لینے لگی۔ نور نے مجھے اشارہ کیا کہ ٹی الحال میں خاموش ہو جاؤں اور اسے پانی کا گلاس پیش کیا۔“ ٹیک اسٹ ایڈری

ایلیشا۔۔۔۔۔

اس نے ایک ہاتھ مار کے گلاس گرا دیا۔ ”یہ کیا چلا رہی ہو مجھے، اس سے بہتر چیز کوئی نہیں رہی اس محل میں۔۔۔۔۔ دنیا

میں نے ریسپونڈ سے تمہارے کہا۔ ”تمہاری بات سچ ہو گئی نا۔ وہ پہنچ گئی یہاں۔۔۔۔۔ مصیبت۔“



تفصیل

تصویر ریاض

دوستی اندھے اعتماد کا دوسرا نام ہے مگر..... جہاں کوئی اعتماد کرتے والے کو ہی اندھا سمجھ بیٹھے وہاں ایک ذرا ٹھہس لگنے سے بہت سوں کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ وہ بھی زندگی کا ایک ایسا ہی مقام تھا جہاں محبت اور دوستی کے درمیان جنگ وجدل جاری تھی..... ایسے مہین ان کے دامن میں اسی زخمی دوست کی جانب سے وہ تحفہ آن گرا کہ جس کی خاطر وہ دوستی کا ہی خون کر بیٹھے تھے۔

بچتارے کی آگ میں جلے والے ایک جوڑے کا دلچسپ واقعہ

ہزار ڈونڈ کی گاڑی اپنے گیران میں ایک ہفتے کے لیے بھی نہیں چھوڑ سکتا۔ میری غیر موجودگی میں تو یہ گھنٹوں میں غائب ہو جائے گی۔

”تم بالکل نگرمت کرو۔“ کرس نے اسے یقین دلایا۔

”تمہاری گاڑی یہاں بالکل محفوظ رہے گی۔“

”ٹھیک ہے۔ اب میں چلتا ہوں۔“ جین مجھے ایئر پورٹ تک چھوڑ دے گی۔ یہ کہہ کر اس نے باہر کھڑی واگس لیکن میں بیٹھی ہوئی سہرے بالوں والی لڑکی کی طرف ہاتھ بلایا اور بولا۔ ”لگتا ہے کہ میں اسے بھی تھوڑا بہت یاد

”میرا خیال ہے کہ یہ تمہارے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔“ کرس نے اپنے دیرینہ دوست کی بات پر سر ہلایا اور اس سے اس کی بالکل نئی ٹی ایم ڈی ٹیوٹوریل کی چابیاں لیتے ہوئے بولا۔ ”میں ڈیوٹی اچھے کیا مسئلہ ہو سکتا ہے۔“

”میری کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا؟“

”وہ میرے معاملات میں دخل اندازی نہیں کرتی۔“ ویسے بھی وہ اب آنے والی ہی ہوگی۔ تم خود اس سے مل لیتا۔“

”صرف آٹھ ماہ کی تو بات ہے۔“ ڈیوٹی فرائیو انداز میں بولا۔ ”نیوزی لینڈ سے واپس آنے کے بعد میں اپنی امانت واپس لے جاؤں گا۔ یہ بات تو یہ ہے کہ میں تینا لیس

ایلیشا..... جو تم سوچ رہی ہو وہ قیامت تک نہیں ہو سکتا۔ اپنے ساتھ مجھے پاگل مت کرو، اب تمہاری واحد پناہ گاہ وہی ہے پاگل خانہ۔“

”میں مر جاؤں گی لیکن واپس نہیں جاؤں گی رفیق! میں واپس جانے کے لیے نہیں آئی تھی، یہ میرا ہمارے، میں اس میں تمہارے ساتھ رہوں گی۔ یہاں سے کوئی مجھے نہیں نکال سکتا۔“ وہ پھر چلائے گی۔

میں نے کہا۔ ”نور..... پولیس کو بلا لو۔“ نور ابھی اٹھی ہی تھی کہ ایلیشا صوفے کے نیچے گھس گئی، بے وقوفی سراسر میری گئی، ابھی تک میں نے نیچے سے ریوالت نکال کر اپنے قبضے میں نہیں لیا تھا، میں اس کی طرف سے بے فکر ہو گیا تھا کہ وہ ایلیشا کی دسترس میں نہیں رہا۔

کچھ دیر پہلے نور نے اسی اندیشے کا اظہار کیا تھا۔ اگر میں تمہارے ساتھ نہ رہی تو تم ایک بیوی کے ساتھ یہاں رہو گے دوسری کے ساتھ وہاں..... اور ایلیشا اس کے اندیشوں کو حقیقت کا روپ دینے کی جلدی آگئی تھی..... لیکن میں فیصلہ کر چکا تھا کہ اب ایلیشا کو پولیس کے حوالے ہی کرنا بہتر ہوگا۔ پولیس اسے واپس چرچ لے جائے یا نہیں اور.....! اس نے گھنٹوں کے بل ہو کے نیچے گھسنا تھا۔ ”ایلیشا باہر آ جاؤ۔“

”نہیں..... اب میری لاش ہی باہر آئے گی۔“

”نہیں نہیں نہیں.....“ وہ دیوانگی میں چلائی۔ ”تم انکار کر چکے ہو..... تم نے پولیس کو طلب کر لیا ہے۔“ مجھے نور کی لڑائی ہوئی آواز سنائی دی۔

”پولیس..... پلیز فوراً ارنس میٹین آ جا میں، ایمر جی ہے۔“

”کی کی جان جا سکتی ہے۔“

میں صوفے کے نیچے گھس گیا۔ ”ایلیشا.....!“

مجھے اندھیرے میں اس کا وجود سائے کی طرح دکھائی دیا۔ وہ سیدھی گئی ہوئی گئی اور اس کے دائیں ہاتھ میں ریوالت تھا۔ میں نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ ”یہ مجھے دے دو۔“

پلیز.....

وہ ہنسی۔ پھر ایک دھماکا ہوا..... میری نظروں کے سامنے گہری تاریکی پھیل گئی۔ میرے کانوں میں پولیس کے سائرن کی آواز گونجی۔ نور چی رہی تھی، میرا نام دہرا رہی تھی..... رفیق..... رفیق..... رفیق.....!

یہ پریچ و سنسنی خیز داستان جاری ہے۔ مزید واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیے

”تم سب کچھ کر سکتے ہو، تم مجھے پاگل خانے میں مرنے سے بچا سکتے ہو، میں بتا رہی ہوں تمہیں..... میں مر جاؤں گی۔“

”وہاں تمہارا علاج ہوگا تو تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔“

”اسے سنگدل اور بے رحم نہ بنو۔ تم چاہو تو سب کچھ کر سکتے ہو، یہ تمہارے لیے کوئی مشکل نہیں، تم میری ذمہ داری لے لو۔“

میں نے گھبرا کے کہا۔ ”ایلیشا میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتا، میں یہ ذمہ داری کیسے لے سکتا ہوں۔“

”بہت آسان ہے۔ تم مجھ سے شادی کر لو تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”میں تم سے شادی کروں؟“

”ہاں..... دیکھو نا..... ڈیڈ ہی چاہتے تھے اور تم کو وارث بنانے کا مقصد کیا تھا۔ تمہارے لیے تو یہ کوئی مشکل کام نہیں، تم مجھ سے بھی شادی کر سکتے ہو اور نور سے بھی۔ تمہارے مذہب میں تو چار کی اجازت ہے، ایک جیسا منصفانہ سلوک کرنے کی شرط ہے، وہ تم پوری کر سکتے ہو۔ اس طرح سارے مسئلے حل ہو جاتے ہیں۔ یہاں میں اور تم ہوں گے۔ مجھے میرا حق بھی مل جائے گا اور تمہیں اپنے حق سے دستبردار بھی نہیں ہونا پڑے گا۔“

”ایلیشا..... یہ ناممکن ہے۔“ میں نے بڑی مشکل سے کہا۔

”کیوں ناممکن ہے..... کیا نور کو اعتراض ہوگا؟..... نہیں ہوگا، مجھے معلوم ہے۔ وہ تو تمہارے ساتھ شادی کے بغیر بھی رہنے پر تیار ہے۔ پہلے تم فریال سے شادی کرنا چاہتے تھے تو اسے اعتراض نہیں تھا، اب مجھ سے کر لو گے، ایک نیک مقصد کی خاطر..... تو وہ تمہیں کیوں روکے گی، کیوں نور..... کیا میں نے غلط کہا.....؟“

نور ساکت و صامت چمچی تھی اور بلیکس جھپکائے بغیر اس لڑکی کو دیکھ رہی تھی جو دیوانہ کار خوشی بشار کی چمکتی جاگتی مثال تھی۔ وہ پاگل تھی لیکن اپنا برا بھلا سمجھتی تھی..... اپنے مفاد کو نہیں بھولتی تھی۔

”تم نے دیکھا رفیق..... نور نے میری تائید کر دی، کیونکہ یہ بہت آسان..... بہت ریٹیکل ہے یہاں میں اور تم..... ست بدھائی میں تم اور نور..... تم یہاں بھی مالک وہاں بھی..... اس میں سب کی بھلائی ہی ہے اور پھر اعتراض کرنے والا کون ہے؟ تم دیکھنا میں ٹھیک ہو جاؤں گی، مجھے معلوم ہے میرے سچا تم ہی ہو سکتے ہو۔“

ایک دم مجھے ہوش آ گیا۔ ”اسٹاپ دس نان سنس

پھر لڑکیوں جیسی چمکیں نہ لگیں

رنگی زلفیں

جن کے گھٹا جب چھا جائیں
یا پھر ہواؤں میں لہرائیں
... جادو سا چھا جائے

میڈی کیم شیمپو

کے پرفارمنس استعمال سے بالوں کی
حفاظت کے ساتھ ساتھ رنگ

اپنے بھرتی پیر
آدھن قیمت میں



MEDICAM SHAMPOO

9 مختلف قسم کے شیمپو

چلا رہا تھا۔ پھر وہ قصبے سے باہر نکل آئے۔ ان کی گاڑی
مضافاتی علاقے میں دوڑ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد ہی انہوں نے
گاڑی ایک ہب کے سامنے روک دی اور ڈرنکس کے لیے
اتر آئے۔

آتش دان کے نزدیک ایک ٹیبل پر وہ دونوں اپنے
اپنے ڈرنکس لیے ایک دوسرے کو تھار آلود نظروں سے دیکھ
رہے تھے۔ کرس نے اپنے لیے سوئٹ ڈرنک کا انتخاب کیا تھا
لیکن میری کچھ زیادہ ہی موڈ میں تھی۔ اسے وائن وائن ہمیشہ
سے ہی پسند تھی پھر وہ اپنی زندگی کے ان خوبصورت ترین
لحظات میں اس سے کیوں نہ لطف اندوز ہوتی۔ تین چار پیگ
کے بعد ہی اس کے اثرات ظاہر ہونا شروع ہو گئے۔ اس کی
زبان لڑکھانے لگی۔ کرس نے اس کی حالت دیکھ کر اٹھنے کا
ارادہ کیا کہ چاک ہی ایک آدمی اس کے سامنے آ گیا۔
”دوست! یہ گاڑی تمہاری ہے؟“ اس نے بی ایم
ڈبلیو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

کرس نے نظر اٹھا کر دیکھا اور بولا۔ ”ہاں۔“
”اچھی ہے، انہی نے تعریفی انداز میں کہا۔ ”گر تم
برانڈ مٹاؤ تو میں یہاں بیٹھ جاؤں۔“

یہ کہہ کر وہ جواب کا انتظار کے بغیر ہی وہاں بیٹھ گیا۔
اس نے اپنا نام جیک بتایا اور ساتھ ہی بی ایم ڈبلیو کے بارے
میں اپنی معلومات بیان کرتے لگا۔ کرس کو محسوس ہوا کہ اس
نے غلطی سے کسی کارابینٹ کو اپنے ساتھ بٹھا لیا ہے۔ کچھ دیر
بولنے کے بعد اس کی تان اس جملے پر آن کر ٹوٹی۔
”گر تم اس گاڑی کو فروخت کرنا چاہو تو میں اسے
خریدنے کے لیے تیار ہوں۔“

”یہ برائے فروخت نہیں ہے۔“ کرس نے بے زاری
سے کہا لیکن عین اسی وقت میری بول پڑی۔
”کیا دوسرے؟“

”میں ہزار پاؤنڈ نقد۔“ جیک نے کہا اور میری کی
طرف دیکھنے لگا۔
”پچیس ہزار۔“ میری نے اپنی ذیماقت بتائی۔

کرس نے بے چینی سے پہلو بدلا اور بولا۔ ”میں پہلے
ہی کہہ چکا ہوں کہ یہ گاڑی برائے فروخت نہیں ہے اور نہ ہی
اس وقت میرے پاس اس گاڑی کے کاغذات ہیں۔“
”یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔“ جیک بولا۔ ”تم مجھ کی
کی جانی دو، میں تمہیں نقد رقم دیتا ہوں۔ تم پولیس میں اس کی
کشتہ کی کی رپورٹ درج کروادینا۔ جب تک پولیس اور
انسورنس والے اپنی کارروائی شروع کریں گے۔ میں اس کا

گلتا ہے۔ البتہ اس ملاقات کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ بڑی مہم
نے میری کو اپنی سبکی کچھ جوانی کے سارے راز اگل دیے
جنہوں نے میری کو اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں سوچنے
پر مجبور کر دیا تھا۔

اس وقت شام کے سات بج رہے تھے۔ کرس آرام
سے صوفے پر ٹائیں پھیلائے ٹیلی ویژن دیکھ رہا تھا کہ میری
اس کے پاس آئی اور کرس کا ہاتھ پڑ کر اسے اٹھانے لگی۔ اس
کے دوسرے ہاتھ میں بی ایم ڈبلیو کی جالی تھی۔ وہ اس کے
قرب ہوئے ہوئے بولی۔ ”میں صرف ایک بار اس میں
بیٹھنا چاہتی ہوں۔“

کرس نے حیرت سے اسے دیکھا اور بولا۔ ”تم ڈبلیو
کی کار میں بیٹھو گی لیکن تمہیں تو اس سے نفرت ہے۔“
میری نے دراز کھول کر ایک تصویر نکالی اور کرس کی
طرف بڑھادی۔ اس میں ایک نوجوان جوڑا کار کی فرنٹ
سیٹ پر بیٹھا لائٹ ڈرائیو سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ لڑکی کے
بال ہوا میں اڑ رہے تھے اور وہ مسکراتے ہوئے فوٹو گرافر کی
جانب دیکھ رہی تھی جبکہ مرد جوانی اور محبت کے نشے میں سرشار
گاڑی چلا رہا تھا۔

”جانتے ہو یہ عورت کون ہے؟“ میری نے پوچھا۔
کرس کے پاس اس سوال کا جواب موجود تھا۔ ”شریہ کہہ
سکتا ہوں کہ تمہارے والدین ہیں۔“

”یہ تصویر مجھے ان کے سامان سے ملی ہے۔ کل جب
ان سے ملنے گئی تو وہ مجھے اپنی پرانی سبکی کچھ کراچی کے
قصبے سنانے لگیں۔ مجھے یہ سب کچھ نہیں سنا چاہیے تھا لیکن
جب میں نے اپنے آپ کو ان کی جگہ رکھ کر سوچا تو خاموش
ہو گئی۔ چالیس سال بعد شاید میں بھی اسی طرح کسی ریٹ
ہوم میں کبھی اپنے بچوں کو جوانی کے قصبے سنا رہی ہوں گی
لیکن میری زندگی میں کوئی ایڈ وچر نہیں اور نہ ہی کسی تیز رفتار
کار میں تمہارے ساتھ لائٹ ڈرائیو پر مچی ہوں۔ اب موقع
ملا ہے تو کیوں نہ ہم اپنی زندگی میں کچھ خوشگوار یادوں کا
اضافہ کر لیں۔“

کرس کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ اپنی پیاری بیوی کی
اس معصوم سی خواہش کو رد کر دے۔ اس نے میری کا ہاتھ تھاما
اور بی ایم ڈبلیو کی جانب بڑھ گیا پھر جب وہ کار میں بیٹھے تو
کرس کا ضبط جواب دے گیا۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور
اسے بڑی احتیاط سے گیس راج سے باہر لے آیا۔ باہر کا موسم
بہت خوشگوار تھا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھوکے میری کے بالوں سے
اٹھیلیاں کر رہے تھے اور کرس سرشاری کے عالم میں گاڑی

رنگ اور نمبر پلٹ تبدیل کر چکا ہوں گا اور یہ گاڑی اپنے نئے گاہک تک پہنچ چکی ہوگی۔

”میرا خیال ہے کہ تمہیں اپنے شوہر کی جانب کے بارے میں بتا دوں۔“ میری نے کہا۔ ”وہ خفیہ پولیس آفیسر ہے اور کارفرماؤں کے کیسوں کی تحقیقات کرتا ہے۔“

جیک نے قہقہہ لگایا اور بولا۔ ”میں کیسے مان لوں۔ اتنی معمولی تنخواہ پر کام کرنے والا شخص اس کار کو فروغ نہیں کر سکتا۔“

”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس کی ناجائز آمدنی بھی ہو۔“

”اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ میں بالکل صحیح شخص سے بات کر رہا ہوں۔“ جیک نے کہا اور کرس سے بولا۔ ”میری پیشکش برقرار ہے۔ تم جب چاہو یہاں آ کر مجھ سے رابطہ کر سکتے ہو۔“

واپسی میں کرس کا موڈ بہت آف تھا۔ اس نے غصے میں آ کر ڈیک بند کر دیا جس پر میری سے ضبط نہ ہو سکا اور وہ جھلاتے ہوئے بولی۔ ”اوہ خدایا! تم اتنے بورنگ کیوں ہو۔ صرف اس لیے کہ اپنے آپ کو سو برابریاں کر سکو۔“

”تمہیں، بلکہ تم نے کچھ زیادہ ہی پی لی ہے اور تمہارا دماغ ابھی تک ٹھکانے نہیں آیا۔“

”شاید تمہیں اچھا نہیں لگا کہ جیک مجھے مسلسل دیکھتے جا رہا تھا۔“

”میری! اس نے ہماری شام برباد کر دی۔ کیا ہم یہاں اس لیے آئے تھے کہ ایک تیسرے درجے کے کاربورو کے ساتھ اس گاڑی کا سودا کریں جو ہماری نہیں ہے۔“

میری نے کوئی جواب نہیں دیا اور مزہ چلاتے ہی بولی۔ ”ستو میری! گاڑی میں گھومنا اور کہیں چھو کر ڈرنک لینا ایک علیحدہ بات ہے لیکن میں نہیں چاہتا کہ اگلے مہینے کے کرائم واج میں میری اسٹوری شائع ہو۔“

اس واقعہ کے چار دن بعد وہ گھر کے کسی کام میں مصروف تھا کہ اسے میری کی چیخ نما آواز سنائی دی۔ وہ فی دی لاؤنچ سے اسے پکار رہی تھی۔ وہ چھپے ہی اس کے پاس پہنچا تو وہ فی دی کی طرف اشارہ کر کے بولی۔ ”دیکھو، کیا آ رہا ہے؟“

اس وقت شام کی مقامی خبریں چل رہی تھیں۔ ایک رپورٹر کسی خاتون کا انٹرویو کر رہا تھا جو اپنے دونوں ہاتھوں میں براؤن کمر کے جگ بگڑے ہوئے بھی جن پر سفید دھاریاں بنی ہوئی تھیں۔ وہ عورت بتا رہی تھی۔

”میں اپنی دکان کے عقب میں کام کر رہی تھی اور وہ تمام ہاؤس دیکھ رہی تھی جو ہفتہ کی شام لوگ وہاں چھوڑ گئے

تھے کہ میری نظر ان نوادرات پر پڑی۔ میں نے اپنے ساتھ کام کرنے والی لڑکی سے کہا کہ وہ اپنے انٹرنیٹ پر ان کے بارے میں معلوم کرے جب ہمیں ان کی اصل قیمت کا اندازہ ہوا، جو کسی طرح بھی پانچ سے لے کر دس ہزار پاؤنڈ سے کم نہیں۔ دراصل اس طرح کی اشیاء یہ حد تک بابت ہیں۔“

”اب آپ ان کا کیا کریں گی؟“ رپورٹر نے پوچھا۔

”ظاہر ہے کہ ہم انہیں شاپ میں فروخت نہیں کر سکتے۔ لہذا ہم نے جمعہ کے روز انہیں نیلام کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس طرح ہمیں ان نوادرات کی اچھی قیمت مل جائے گی۔“

”کیا آپ اس ڈونر کے لیے کچھ کہنا چاہیں گی۔ ممکن ہے کہ وہ یہ پروگرام دیکھ رہا ہو۔“

وہ عورت کمرے کی طرف مڑی اور اپنے چہرے پر مسکراہٹ لاتے ہوئے بولی۔ ”آپ جو کوئی بھی ہیں۔ چیریٹی کے لیے اتنا قیمتی عطیہ دینے پر میں آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔“

میری نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا اور زور زور سے سسکیاں لینے لگی۔

وہ دونوں کافی دیر تک پونہی گم صدمہ منہ رہے۔ ان کے دماغ میں آنکھیں چل رہی تھیں۔ ان کی سوچ ایک ہی نکتہ پر آکر ٹھہر گئی تھی کہ کسی طرح وہ گامیاب جگ واپس مل جائیں۔ بظاہر اس کا ایک ہی طریقہ تھا اور وہ یہ کہ انہیں نیلامی کے ذریعے حاصل کیا جائے لیکن اس کے لیے ایک بڑی رقم کی ضرورت تھی۔ جس کا انتظام کرنا ان کے لیے جو تک ممکن نہ تھا۔ اس دوران میں انہوں نے فی دی اسٹیشن فون کر کے اس خاتون وکر سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ انہیں بتایا گیا کہ اور بھی لوگ یہ دعویٰ کر چکے ہیں کہ وہی ان نوادرات کے حقیقی مالک ہیں اور انہوں نے غلطی سے چیریٹی شاپ کو عطیہ کر دیا تھا لہذا اس سلسلے میں مزید کوئی کار وصول نہیں کی جائے گی۔

میری کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا پھر اچانک ہی اسے خیال آیا کہ اس معاملے پر جیک ہی ان کی مدد کر سکتا ہے۔ وہ پرجوش انداز میں بولی۔ ”میرا خیال ہے کہ ہمیں جیک کی پیشکش قبول کر لینی چاہیے۔ اس رقم سے ہم نیلام میں حصہ لے کر وہ قیمتی جگ دوبارہ حاصل کر سکتے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی قیمت بھی بڑھتی جائے گی۔ اگر ہم نے اس موقع سے فائدہ نہ اٹھایا تو ساری عمر پچھتاؤ کا شکار بن جائے گا۔“

”یہ غیر قانونی ہے اور میں اس جرم میں شریک نہیں

ہو سکتا۔ ہمیں کوئی اور طریقہ سوچنا چاہیے۔“

”ساری عمر سوچتے رہو گے۔ تب بھی اپنی بڑی رقم کا انتقام نہ ہو سکے گا۔“ میری نے اس کے ہاتھ پر پی ایچ ڈی بلیو کی چاپیاں رکھیں اور بولی۔ ”تم فوراً جیک کے پاس جاؤ اور اسے بتاؤ کہ ہم یہ کار بیچنا چاہتے ہیں۔“

”میری! وہ ایک جرائم پیشہ شخص ہے۔“ کرس نے کمزور سا احتجاج کیا۔

”لیکن اس وقت وہی ہماری مدد کر سکتا ہے۔“ میری نے اسے یاد دلایا۔

جیک نے دیکھتے ہی سمجھ لیا کہ کرس کسی ضرورت کے تحت مجبور ہو کر اس کے پاس آیا ہے۔ اس کا رد بار میں رہ کر اسے لوگوں کے چہرے پہنچانے کی عادت ہو گئی تھی اور وہ جانتا تھا کہ کرس گاہک سے کس طرح بات کرتی ہے۔ کرس کا چہرہ پڑھتے ہی وہ جان گیا کہ اب اس سے معاملہ طے کرنا آسان رہے گا۔ وہ اسے پب کے ایک کونے میں لے گیا اور کافہ کے ایک چھوٹے سے کلوے پر ایک ایڈریس لکھ کر بولا کہ وہ جمعہ کے روز صبح نو بجے وہاں پہنچ جائے۔ اس دوران وہ رقم کا بندوبست کر لے گا۔

جمعہ کے روز کرس اور میری مقررہ جگ پر پہنچ گئے۔ کرس پی ایچ ڈی بلیو چلا رہا تھا جبکہ اس کی بیوی اپنی کار میں اس کے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ پہلی نظر میں وہ جگ کرس کو کچھ زیادہ پسند نہیں آئی۔ وہاں رنگ آلود شیشی، ویلڈ ٹنگ مشین اور گاڑیوں کی نمبر پلیٹیں جابجا بکھری ہوئی تھیں۔ وہ ان دونوں کو ایک میز تک لے گیا جہاں دو مال میں لینا ہوا نوٹوں کا ہنڈل رکھا ہوا تھا۔ میری اسے اٹھاتے ہوئے بولی۔ ”نکلتے ہیں؟“

”دس ہزار۔“ جیک ان کے چہروں کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

”لیکن تم نے تو میں ہزار کی بات کی تھی۔“

جیک نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا۔ ”میں اپنی بات پر قائم ہوں لیکن پوری رقم کا بندوبست نہیں ہو سکا۔ فی الحال یہ رکھ لو۔ باقی اگلے مہینے مل جائے گا۔“

”تاویہ سود منظور ہے۔“

”بالکل نہیں۔“ کرس نے جواب دیا۔ ”مجھے پوری رقم چاہیے۔“

”جیسے تمہاری مرضی۔“ جیک نے کہا اور نوٹوں کا ہنڈل اپنی جانب کھینچ لیا۔

”ایک منٹ۔“ میری بولی۔ ”ہمیں منظور ہے۔“

”میری! کرس نے غصے سے کہا۔ ”کیا تمہیں یقین ہے کہ تمیں بقیہ رقم مل جائے گی۔“

جیک نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور بولا۔ ”میں ایک

مصروف آدمی ہوں اور میرے پاس تم دونوں کی بحث سننے کے لیے وقت نہیں ہے۔ اگر منظور ہے تو یہ دس ہزار پاؤنڈ اٹھاؤ اور چالی میرے حوالے کر دو ورنہ بات ختم۔“

دو منٹ بعد وہ دونوں اپنی کار میں واپس جا رہے تھے۔ اب ان کا رخ نیلام گھر کی جانب تھا۔ میری کار چلا رہی تھی جبکہ کرس خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر شرمندگی کے آثار واضح تھے۔ نیلام گھر لوگوں سے کچھ بچھا بھرا ہوا تھا۔ وہاں نوادرات کے شائقین اور تاجروں کے علاوہ بہت بڑی تعداد تماشا دیکھنے والوں کی بھی تھی۔

کرس اور میری کو سب سے آخری قطار میں جگہ مل سکی۔ ہال کی دیواروں کے ساتھ درجنوں لوگ کھڑے تھے جو ٹیلی فون پر غیر حاضر خریداروں سے رابطے میں تھے۔ نیلامی شروع ہوئی اور مختلف اشیاء فروخت کے لیے پیش ہوئی رہیں لیکن خریداروں کی ساری دیکھی ان میں قیمت اور نایاب جگوں میں بھی جن کے حصول کے لیے وہ یہاں آئے تھے۔ نیلامی کا آغاز پانچ ہزار پاؤنڈ سے ہوا جو بڑھتے بڑھتے آٹھ ہزار تین سو پاؤنڈ تک پہنچ گئی۔ اس دوران کرس نے کئی بار بولی لگانے کی کوشش کی لیکن ہر مرتبہ میری نے اسے روک دیا۔ وہ جانتا چاہ رہی تھی کہ سب سے اونچی بولی کہاں تک جاتی ہے پھر کیا ایک ہی کرس کا ہاتھ بلند ہوگا۔ ”آٹھ ہزار پانچ سو۔۔۔ ایک۔“ نیلامی کرنے والے نے بیچ کی طرف دیکھ کر کہا۔

”آٹھ ہزار پانچ سو۔۔۔ دو۔“

”آٹھ ہزار پانچ سو۔۔۔ تین۔“

اس سے پہلے کہ اخباری رپورٹر اور فی دی کے کمرے میں ان کا گھبراؤ کرتے۔ نیلام گھر کی انتظامیہ نے انہیں پچھلے دروازے سے نکال دیا اور نو ہزار آٹھ سو پچھتر پاؤنڈ کی ادائیگی کے بعد وہ قیمتی جگ واپس حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ انہیں نیلام کی قیمت کے ساتھ دس فیصد کمیشن بھی دینا پڑا تھا لیکن میری خوش تھی کہ وہ اپنی ماں کا قیمتی اثاثہ واپس لے آئی۔ اس نے غریب انداز میں وہ جگ ہاتھ میں لیے اور بولی۔

”اب میں بھی اپنے بچوں کو فخریہ طور پر یہ کہانی سناسکوں گی جب وہ مجھ سے ملنے کے لیے ریسٹ روم آیا کریں گے۔“

”ہاں تم شاید ایسا کر سکو۔“ کرس نے جمل کر کہا۔

”لیکن میں تو شرم سے زمین میں گڑا جا رہا ہوں۔“

”آخر تمہیں پریشانی کس بات کی ہے؟“ میری نے پوچھا۔
 ”اتنی انجان نہ بنو۔ ابھی ہمیں پولیس کو اس کار کی
 چوری کی اطلاع بھی دینی ہے اور تم جانتی ہو کہ پولیس مجھ سے
 کیسے کیسے سوالات کرے گی۔“
 ”اگر تم نے کوئی حماقت نہ کی اور براعت و انداز میں ان
 کے سوالوں کے جواب دیتے رہے تو کچھ بھی نہیں ہوگا۔“
 ”اس سے بھی زیادہ پریشانی کی بات یہ ہے کہ میں
 اپنے دوست کو کیا بتاؤں گا۔ یہی کہ میں اس کی نئی اور قیمتی کار
 کی حفاظت نہ کر سکا۔ اوہ خدا! ایک تو میں نے اس کے ساتھ
 بے ایمانی کی اور اب جھوٹ بھی بولنا ہوگا۔“
 میری نے سر ہلایا اور آہستہ سے بولی۔ ”جان! مجھے
 بہت افسوس ہے لیکن ہمارے پاس اس کے سوا کوئی اور راستہ
 بھی تو نہ تھا۔“
 ”تمہارے لیے یہ کہنا بہت آسان ہے کیونکہ وہ تمہارا
 دوست نہیں ہے اور نہ ہی وہ تمہارے دوست کی کار بھی۔“
 ”رہے بھی دو۔“ میری جھلٹاتے ہوئے بولی۔ ”وہ
 ہمیشہ تمہیں استعمال کرتا ہے اگر ایک بار تم نے اسے استعمال
 کر لیا تو کیا ہوا؟“
 ”اگر تم وہ جگہ چیریٹی شاپ میں چھوڑ کر نہ آتیں تو یہ
 سب کچھ نہ ہوتا۔“ کرس نے جل کر کہا۔
 ”میں اپنی غلطی مانتی ہوں۔“ میری نے جواب
 دیا۔ ”لیکن مجھے ایسا کرنے پر کس نے مجبور کیا۔ تمہارے
 دوست نے جو اپنی گاڑی میں اس جگہ کھڑی کر گیا جہاں ماما کا
 سامان رکھا ہوا تھا۔ اگر وہ اپنی کار یہاں لے کر نہ آتا تو یہ
 سب کچھ نہ ہوتا جو کچھ ہوا۔ اس کی ساری ذمہ داری تمہارے
 دوست پر عائد ہوتی ہے۔“
 ”میری کی گفتگو بھی تو کرس نے جھلٹا کر ریسورٹ کیا اور
 بولا۔ ”نہیں!“
 دوسری طرف سے ایک جانی پہچانی آواز سنائی
 دی۔ ”گناہ ہے کہ میں نے غلط وقت پر فون کیا ہے۔ تم کچھ
 پریشان لگ رہے ہو؟“
 وہ ڈیوی تھا۔ کرس نے ایک نظر میری کو دیکھا اور
 بولا۔ ”نہیں۔“ لیکن کوئی بات نہیں۔ سب کچھ ٹھیک ہے۔“
 ”میں تم سے اس کار کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“
 کرس کا سانس رکسے لگا اور وہ صفی ہوئی آواز میں
 بولا۔ ”ڈیوی۔ میں بھی تمہیں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔“
 ”نہیں پہلے میری بات سن لو۔ مجھے تمہاری مدد کی
 ضرورت ہے۔“

”مدد۔ کیسی مدد؟ میں کچھ سمجھا نہیں ڈیوی۔“ کرس نے
 الجھتے ہوئے کہا۔
 ”میں چاہتا ہوں کہ تم وہ کار بیچ دو۔“
 ”کیا؟“ کرس نے چونکتے ہوئے کہا۔
 ”تم نے سنا نہیں۔ اسے بیچ دو۔ میں اب اس پوزیشن
 میں ہوں کہ اس سے تین گنا قیمتی کار خرید سکتا ہوں میں گاڑی
 کے کاغذات بھیج دوں گا لیکن تیس ہزار پاؤنڈز سے ایک قیمتی بھی
 کم نہیں لینا۔ تم سن رہے ہو نا۔“
 کرس کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کی حالت ایک بارے ہوئے
 جواری کی سی ہو رہی تھی۔ اس نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔
 ”ہاں سن رہا ہوں لیکن تم بھی میری ایک بات سن لو۔
 میں تمہیں اسی کار کے بارے میں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔“
 ”ایک سیکنڈ۔ ابھی میری بات ختم نہیں ہوئی ہے۔ میں
 تمہارے بارے میں اکثر سوچتا رہتا ہوں اور جانتا ہوں کہ تم
 دونوں میاں بیوی کو زندگی گزارنے کے لیے بہت جدوجہد
 کرتی پڑ رہی ہے۔ میں بھی تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکا لیکن
 اب میرے حالات بہت بہتر ہو گئے ہیں۔ اس لیے چاہتا
 ہوں کہ درست ہونے کے ناتے اپنا فرض نبھائوں۔“
 ”ایک آن تھا اور میری ان دونوں کی باتیں سن رہی
 تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ڈیوی کا اٹکا جملہ کیا ہوگا۔ اس خیال کے
 آتے ہی وہ بے چین ہوئی اور اس کے ساتھ دھیرے دھیرے
 کاپٹے لگے۔ اس نے مضبوطی سے جگ بکڑ لیے۔
 ڈیوی کی آواز دوبارہ سنائی دی۔ ”میں چاہتا ہوں کہ تم
 یہ رقم اپنے پاس ہی رکھو۔ یہ تیس ہزار پاؤنڈز تمہارے ہیں۔
 میری بھتیجی ہے کہ میں ہمیشہ تمہیں استعمال کرتا رہا ہوں۔ سمجھ لو
 کہ یہ اسی کا معاوضہ ہے یا پھر اسے ایک سچے دوست کی طرف
 سے تحفہ سمجھ کر قبول کر لو۔“
 کرس حیرت سے یہ سب کچھ سن رہا تھا۔ اس کی نظر
 میری رہی۔ اس نے لرزے رہتے ہاتھوں سے وہ دونوں جگ میز
 پر رکھنے کی کوشش کی لیکن ریشے پر قابو نہ رکھ کر پھر اچانک ہی
 وہ جگ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر بائیں کے فرش پر گر کر پکنا
 چور ہو گئے۔
 ڈیوی کی آواز ایک بار پھر سنائی دی۔ ”انہیں یوں لگا
 جیسے وہ دنیا کے دوسرے کونے سے یوں رہا ہوں۔“
 ”کرس! تم میری بات سمجھ گئے نا۔ اس کار کو بیچ کر
 پیسے اپنے پاس رکھ لو۔ مجھے یقین ہے کہ اس میں تمہیں کوئی
 مسئلہ نہیں ہوگا۔“



حضرت ادریسؑ

رضوانہ ساجد

تاریخ گواہ ہے کہ ابلیس نے ہر دور میں اپنا قول نبھاتے ہوئے اولادِ آدم
 کو صراطِ مستقیم سے اتنا دور کر دیا کہ وہ گمراہ کن تاریکی میں
 ڈوب کر رہ گئے۔ مگر ایسے میں نور کا اجالا کہیں نہ کہیں سے
 اندھیرے کا پردہ چاک کرتے ہوئے نمودار ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ بھی
 بت پرستی میں مبتلا ہو کر اصل معبود کی جستجو کھو بیٹھے تھے۔
 ایسے میں حضرت ادریسؑ تشریف لائے اور اپنے رب کا پیغام ان تک
 پہنچایا لیکن منافقین اور منکرین نے آپ کو ہجرت پر مجبور کر دیا۔
 آپ نے اپنی قوم کو بے شمار علوم سے آشنا کیا۔ حضرت ادریسؑ
 پہلی بستی ہیں جنہوں نے علم و حکمت اور علم نجوم کی ابتدا کی
 اللہ تعالیٰ نے آپ کو افلاک کی ترکیب اور کواکب کے رموز و اسرار
 سے آگاہی دی۔ آپ نے لوگوں کو مدنی سیاست کے اصول و قواعد
 سکھائے۔ ایسے میں ابلیس ملعون کے منصوبہ دہرے کے دھرے رہ گئے۔

ایک نبی کے عہد کی جو صورت وادیں اور رہنمائی کا اجمال

فرزندِ آدم علیہ السلام جناب شیخ علیہ السلام اپنے ماننے والوں میں نہایت مقبول اور کامیاب تھے۔ یہاں تک کہ لوگ
 آپ کے انتقال کے بعد بھی آپ ہی کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے رہے۔ نو سو سال سے اوپر کی عمر کو پہنچ کر جب آپ کا

انتقال ہوا تو ان کے بیٹے اور بیٹیاں ہر طرف پھیلے ہوئے تھے اور سب بت پرستی سے دور، صراطِ مستقیم پر گامزن تھے۔ نصیحتوں کے اثاثر سے پیٹ بھر رہے تھے اور غباروں، میدانوں، پہاڑوں کی چوٹیوں پر رہ رہے تھے۔ دنیا بس وہیں تک تھی جہاں تک ان چند ہزار نفوس کے قدموں کی رسائی تھی۔

جب سلسلہ اولاد جھٹ پڑتے بڑھتے کسی پشت میں ایک صاحبِ جمال بزرگ محل اہل تک پہنچا اور ان کی وفات ہوئی تو لوگ آٹے کے دین سے پھر گئے۔ کہتے ہیں محل اہل حسن و جمال میں لاٹانی تھے۔ ان کی قوم ان سے بے حد پیار کرتی تھی۔ یہ ماہ تاب آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ لوگوں کی آنکھیں تاریک ہو گئیں۔ دل رونے لگے۔ ہر طرف محل اہل کو ڈھونڈتے مگر نہیں نہ پاتے تھے۔ ماتم سا بیجا ہوا تھا۔ ایسے میں شیطان کا داؤ چل گیا۔

رات کا وقت تھا۔ چند لوگ الاؤ روشن کیے اس کے گرد بیٹھے تھے کہ ایک بزرگ صورت آدمی ان کے درمیان آکر بیٹھ گیا۔ وہ صورت ان لوگوں کے لیے بالکل اجنبی تھی۔ ہر آنکھ نے اس کا بغور جائزہ لیا پھر ان میں سے ایک نے ڈرتے ڈرتے اسے مخاطب کیا۔

”کیا تم ہماری زبان سربانی سمجھ سکتے ہو؟“

”ہاں کیوں نہیں۔ میں تمہی میں سے ہوں۔“

”اگر تم ہم ہی میں سے ہو تو ہم نے آج سے پہلے تمہیں دیکھا کیوں نہیں؟“

”دیکھتے کہاں سے۔ عرصہ ہوا میں یہاں سے چلا گیا تھا۔ اب لوٹ کر آیا ہوں۔“

”تم چلے کیوں گئے تھے؟“

”اتھتے تھتوں اور کسی بڑے دریا کی تلاش میں۔“

”تمہیں وہ کھیت مل گئے؟“

”یہاں سے بہت اچھی جگہ ہے جہاں میں رہتا ہوں۔ وہاں اور بہت سے لوگ بھی ہیں۔ تم لوگ چاہو تو تم بھی وہاں رہ سکتے ہو۔“

”ہم یہاں سے کیوں جائیں۔ ہمارے باپ دادا نے ہمیں وقت گزارا ہے۔“

”نہ جاؤ مگر میں دیکھ رہا ہوں تم لوگ یہاں خوش نہیں ہو۔ تمہاری عورتیں تین کر رہی ہیں تمہارے چہرے آدھے ہیں۔“

”کیا تمہیں اتنا بھی نہیں معلوم کہ ہمارا بادشاہ محل اہل ہمارے درمیان سے اٹھ گیا ہے؟“

”یہ تو مجھے معلوم ہے۔“

”بس یہی ہمارا دکھ ہے۔ اسے دیکھتے بغیر ہمیں کیسے آئے۔“

”میں اسے زندہ تو نہیں کر سکتا لیکن اس کی صورت تمہیں ضرور دکھا سکتا ہوں۔“ شیطان نے کہا۔

”صورت ہی دکھا دو۔ ہم کچھ دیر کے لیے خوش ہو جائیں گے۔“

”کچھ دیر کے لیے نہیں۔ وہ صورت مستقل تمہارے پاس رہے گی۔“

”تو پھر دیر کیوں کرتے ہو۔ جلدی دکھاؤ وہ صورت۔“

”ابھی نہیں۔ کل تم لوگ مجھے یہیں ملنا۔ میں وہ صورت تمہیں دکھا دوں گا لیکن خبردار ابھی یہ بات ان لوگوں کو مت بتانا جو یہاں نہیں ہیں۔“

شیطان یہ کہہ کر ان کے درمیان سے اٹھ گیا اور کسی طرف چلتا ہوا ایک نظر لوں سے غائب ہو گیا۔ الاؤ کے گرد بیٹھے ہوئے لوگ دیر تک اس کی باتیں کرتے رہے اور پھر کسی انجانی مسرت سے سرشار، اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف چلے گئے۔ راکھ پر رکھے ہوئے انگارے کچھ دیر اندھیرے میں جگنو بنے رہے پھر ہر طرف گھپ اندھیرا چھیل گیا۔

اگلی رات آئی تو یہ لوگ پھر اسی جگہ جمع ہوئے اور اس اجنبی کا انتظار کرنے لگے۔ اس شخص نے زیادہ انتظار نہیں کرنے دیا۔ سب لوگوں نے ایک ساتھ دیکھا کہ کوئی ان کی طرف آ رہا ہے۔ اس کے سوا کوئی ہو سکتا ہے۔ وہ قریب آیا تو وہی تھا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی چیز بھی جو دور سے نظر نہیں آ سکتی تھی۔ آگ کی روشنی نے دکھایا تو نظر آیا۔ یہ نکلوی کا بتا ہوا ایک بت تھا۔ اس نے نکلوی کی اس نکلوے کو سب کے سامنے رکھ دیا۔ یہ اتنی صفائی سے بنایا گیا تھا کہ جیسے محل اہل خود چل کر ان کے پاس آ گیا ہے۔ اس

بت پر نظر پڑی تو سب آپس میں جھگڑنے لگے۔ ہر ایک اس کی ملکیت کا دعویدار بننا چاہتا تھا۔ سب کام شیطان کی فتناء کے مطابق ہو رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا اور یہاں فساد شروع ہو گیا تھا۔ جو لوگ کسی بات پر نہیں لڑے تھے ایک بت کے لیے لڑ رہے تھے۔ شیطان نے دل اندازی کی۔

”میں تمہیں ایک ایسی بات نہ بتاؤں کہ یہ بت تم سب کی ملکیت بن جائے۔“

”ہاں بتاؤ۔ تم بہت عقل مند ہو، کوئی نہ کوئی ترکیب نکال لو گے۔“

”تم لوگ اس بت کو کسی مرکز کی مقام پر رکھ دو۔ کسی پر کوئی پابندی نہ ہو۔ جس کا جی چاہے اسے جا کر دیکھ لے۔“

سب نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور ایک چار دیواری کھینچ کر اس بت کو وہاں نصب کر دیا۔ یہ پہلا بت خانہ تھا جو تعمیر ہو گیا۔

وقت گزرتا رہا۔ ایسے ایسے کئی بت خانے تعمیر ہوتے گئے۔ پھر ایسے لوگ پیدا ہو گئے جو اس بت کی طرح دوسرے بت تیار کرنے پر قادر تھے۔ انہوں نے محل اہل کے بت بھی بنائے اور کچھ خیالی شکلیں بھی کھڑکیں۔ ان کے مختلف نام بھی رکھ لیے۔ رفتہ رفتہ یہ بت صرف سجاوٹ تک محدود نہیں رہے بلکہ ان کی پرستش بھی ہونے لگی اور لوگ حضرت شیث علیہ السلام کی تعلیمات سے دور ہوتے چلے گئے۔ تمام اولاد آدم میں بت پرستی سرایت کر گئی۔

وقت کی گردش نے ان اندھروں کو مزید گہرا کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت دیرینہ کے مطابق بت پرستوں کی اصلاح کے لیے انہی میں سے ایک پیغمبر پیدا کیا جسے قرآن عزیز نے حضرت ادریس علیہ السلام کے نام سے یاد کیا ہے۔

”اور ادریس اور ادریس اور ذوالنفل ان میں سے ہر ایک تمہا صبر کرنے والا۔“ (سورہ ابراہیم)

”اور یاد رکھو قرآن میں ادریس کو۔ بلاشبہ وہ تھے سچے نبی اور بلند کیا ہم نے ان کے مقام کو۔“ (سورہ مریم)

بائبل کے مطابق جب حضرت شیث علیہ السلام ایک سو پانچ برس کے تھے تو ان سے انوش پیدا ہوئے۔ انوش کی پیدائش کے بعد حضرت شیث علیہ السلام آٹھ سو برس جیتے رہے اور ان سے بیٹے اور بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ انوش نوے برس کے تھے جب ان سے قینان پیدا ہوئے۔ قینان کی پیدائش کے بعد انوش آٹھ سو چارہ برس جیتے رہے اور ان سے بیٹے اور بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ قینان ستر برس کے تھے جب محل اہل پیدا ہوئے۔ محل اہل کی پیدائش کے بعد قینان آٹھ سو چالیس برس زندہ رہے اور ان سے مزید بیٹے اور بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ محل اہل تین سو برس کے تھے جب یارد پیدا ہوئے اور یارد کی پیدائش کے بعد محل اہل آٹھ سو تیس برس زندہ رہے اور ان سے بیٹے اور بیٹیاں پیدا ہوئیں اور یارد ایک سو بائیس برس کے تھے جب ان سے حنوک پیدا ہوئے۔

ان کے نام اور وطن کے بارے میں خاصے اختلافات ہیں۔ ایک جماعت کا خیال ہے کہ ان کا نام ہرمس البرامسہ ہے اور مصر کے قریب مصف میں پیدا ہوئے۔ یونانی ہرمس کو ارمیس کہتے ہیں اور ارمیس کے معنی عطار دے ہیں۔

دوسری جماعت کا خیال ہے کہ ان کا نام یونانی میں طرمیس، عبرانی میں خنوخ اور عربی میں اخنوخ ہے اور قرآن عزیز میں اللہ تعالیٰ نے انہیں ادریس کہا ہے۔ یہ جماعت یہ بھی کہتی ہے کہ ہرمس نے مصر سے نکل کر اقطاع عالم کی سیر کی اور تمام دنیا کو چھان ڈالا اور جب مصر واپس ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی جانب اٹھالیا۔

ایک تیسری جماعت یہ کہتی ہے کہ حضرت ادریس بائبل میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ اسی خیال پر اکثر کا اتفاق ہے کہ ان کا تعلق دجلہ اور فرات کے دو آب سے تھا۔ موجودہ کوفہ ان کا وطن تھا۔

نسب بیان کرنے والوں نے ان کا نسب نامہ اس طرح بیان کیا ہے۔ ”خنوخ یا خنوخ (ادریس) بن یارد بن محل اہل بن قینان بن انوش بن شیث بن آدم علیہ السلام۔“

مورخین کے مطابق آٹ 3284 ق م میں پیدا ہوئے۔ بعض مفسرین نے آپ کا زمانہ ولادت 3880 اور بعض نے 4500 ق م لکھا ہے لیکن اکثر انکشافات کے مطابق آپ کا زمانہ ولادت 3500 ق م ہے۔

رسول کریم ﷺ کے فرمان کے مطابق آپ سربانی پیغمبر تھے اور آپ پر تمسیح بھی نازل ہوئے۔ یہ صحیفہ عبرانی زبان میں تھے۔ ان صحیفوں میں اسرار اور ایسی نامی صحیفہ سلاویک زبان میں لکھا ہوا ملا ہے۔ اس کے علاوہ صحیفہ ادریس بھی ایتھوپیا میں موجود ہے۔

ابن حبان کے مطابق آپ نے سب سے پہلے قلم کا استعمال کیا۔ کپڑا سینا ایجاد کیا۔ ٹاپ تول کا فن اور اسلحہ سازی کا فن بھی آپ کی ایجاد ہے۔ علم ربی بھی آپ سے منسوب ہے۔
 حضور اکرم ﷺ سے دل کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا: ”بے شک ایک پیغمبر تھے جنہوں نے یہ لکھا لہذا جس شخص کا خط ان کے موافق پڑ جائے تو اس کے حق میں اچھا ہوتا ہے۔“
 علامہ تفسیر میں سے اکثر کا کہنا ہے کہ پہلے شخص جنہوں نے دین کے بارے میں وعظ و خطب کا سلسلہ ڈالا وہ یہی حضرت ادریس علیہ السلام ہیں۔

☆☆☆

حضرت آدم علیہ السلام کی نسل کو پھیلے ہوئے ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا لیکن ہر اس علاقے میں ان کی اولادیں موجود تھیں جہاں کھیتی باڑی کی سہولیات پائی جاتی تھیں لیکن شیطان اپنا کام دکھا چکا تھا۔ ہر طرف گمراہی اور بت پرستی کا بازار گرم تھا۔ ایسے میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ادریس علیہ السلام کو عہد نبوت پر سر فراز کیا اور حکم دیا کہ وہ اولاد آدم کی رہنمائی فرمائیں۔
 بابل کے بازاروں میں اس روز عجیب سی سراسیمگی پھیلی ہوئی تھی۔ ہر شخص ایک شخص کا تذکرہ کر رہا تھا۔ اس کا رنگ گندی ہے۔ دراز قد ہے۔ مٹی ڈاڑھی ہے، چمک دار آنکھیں ہیں۔ ہم میں سے ہے لیکن ہم سب سے زیادہ خوب رو ہے۔ چند دنوں سے دجلہ کے کنارے دکھائی دیتا ہے اور انکی باتیں کرتا ہے جو اس سے پہلے کسی نے نہ سنی ہوں گی۔ وہاں چلنا چاہیے۔ دیکھیں تو کہتا کیا ہے۔ دجلہ کے کنارے لوگ جمع تھے۔ حضرت ادریس علیہ السلام چند پتھر اوپر پیچھے رکھ کر اس کے اوپر کھڑے ہو گئے تھے اور لوگوں سے خطاب فرما رہے تھے۔

”اے لوگو! میں تم میں سے ہی ہوں لیکن تم سے مختلف ہوں۔ اس لیے کہ تم اپنے باپ دادا کے دین کو چھوڑ کر بت پرستی میں مبتلا ہو گئے ہو جبکہ میں اپنے رب سے اس فعل بد کی پناہ مانگتا ہوں اور تمہیں تلقین کرتا ہوں کہ بتوں کی پرستش سے باز آ جاؤ۔ پرستش کے لیے صرف وہی ایک ذات ہے جس نے تم پر اپنا پانی بنا کر بھیجا ہے۔ تم سے میں وہی کہتا ہوں جو اس نے مجھے بتایا ہے۔ لوگو! اللہ کی توحید پر ایمان لے آؤ۔ اس کا کوئی شریک نہیں اور تم نے اس کے شریک بنا لیے ہیں۔ یاد رکھو ایک دن تم سے تمہارا حساب لیا جائے گا۔ آخرت کے عذاب سے تمہیں صرف ایک چیز بچائے گی اور وہ یہ تمہارے اچھے اعمال۔ عدل و انصاف کو پیش نظر رکھو۔ میں تمہیں عدل و انصاف کے اور عبادت الہی کے طریقے بتاؤں گا۔ تم اس پر عمل کرو، دیکھیں بھی خوش حال رہو گے اور آخرت کے عذاب سے بھی نجات پاؤ گے۔“

ابھی آپ کا خطاب جاری تھا کہ دو مفند اور شریر لوگ جو بازار میں ان کی شہرت سن کر یہاں پہنچ گئے تھے، شور و غوغا بلند کرنے لگے۔

”تم کون ہوتے ہو ہمارے معاملات میں دخل اندازی کرنے والے۔ یہ ہمارے بت ہی تو ہیں جو ہمارے روزگار میں برکت دیتے ہیں۔ ہمارے لیے بارش برساتے ہیں۔ ایسی اچھی زمین کے میسر ہوگی جو ہماری دسترس میں ہے۔ تم چاہتے ہو ہم سے یہ سب کچھ چھین جائے اور ہم تمہارے رحم و کرم پر رہ جائیں۔“

ایک شخص نے آگے بڑھ کر اس پتھر پر قبضہ کر لیا جس پر حضرت ادریس علیہ السلام موجود تھے اور خطاب کر رہے تھے۔ حضرت ادریس علیہ السلام بہ حال دیکھ کر وہاں سے اتر گئے۔

آپ گھر پہنچے تو آپ کی زوجہ محترمہ جن کا نام بدآنہ بنت بادیل بن مویل تھا آپ کی پریشانی دیکھ کر گھبرا گئیں۔ آپ جب بھی گھر تشریف لاتے تھے خوش و خرم ہوتے تھے لیکن اس روز آپ کے چہرے پر بے پشتی نہیں تھی بلکہ غصہ ظاہر ہو رہا تھا۔
 ”خبر تو کدڑی آج آپ پریشان دکھائی دے رہی ہے۔“

”میری قوم گمراہی میں ہے۔ میں اسے اس اندھیرے سے نکالنا چاہتا ہوں لیکن یہ نادان میری بات سننے کو تیار ہی نہیں ہوتے بلکہ اپنی تو بزدلی پر اتر آتے ہیں۔“

”صبر کیجیے اور متحین فرماتے رہیے۔ آخر تک ان کے کان بند رہیں گے۔“
 ”خدا نہیں اس کا اجر دے۔“ حضرت ادریس علیہ السلام نے اپنی زوجہ سے فرمایا۔ ”عام طور پر عورتیں ایسے جھگڑوں سے گھبرا جاتی ہیں لیکن تمہاری استقامت نے مجھے حوصلہ دیا ہے۔ اب میں اور زیادہ تمہاری سے خدا کا پیغام لوگوں تک پہنچاتا رہوں گا۔“ آپ نے فرمایا اور اللہ کا شکر ادا کرنے کے لیے عبادت میں مشغول ہو گئے۔

دوسرے دن آپ باہر نکلنے کے لیے تیار ہوئے۔ اپنی انگوٹھی انگلی میں ڈالی جس پر تحریر تھا: ”اللہ پر ایمان کے ساتھ ساتھ صبر، صحت مندی کا باعث ہے۔“
 کمر سے پٹکا باندھا جس پر لکھا تھا۔

”حق تعالیٰ عیدیں اللہ کے فرائض میں پوشیدہ ہیں اور دین کمال شریعت سے وابستہ ہے اور موت میں کمال دین کی تکمیل ہے۔“
 اس دن آپ کے کمر سے نکلنے ہی کچھ لوگ آپ کے ساتھ ہو لیے۔ آپ خوش ہوئے کہ یہ لوگ میری باتیں سننے کے مشتاق ہیں۔ یہ شوق اسی طرح برقرار رہا تو یہ باتیں ایک دن ان پر اثر انداز بھی ہونے لگیں گی۔ راستے میں اور لوگ بھی شامل ہوتے گئے یہاں تک کہ آپ اس مقام تک پہنچ گئے جہاں آپ قوم سے خطاب فرمایا کرتے تھے۔ دیکھا کہ ایک شخص پہلے ہی سے آپ کی جگہ کھڑا ہے اور لوگوں سے خطاب کر رہا ہے۔ جو لوگ اس کے سامنے کھڑے ہیں اس کی باتوں کو بڑی توجہ سے سن رہے ہیں۔ سچ سچ میں خوشی سے چیختے بھی جا رہے ہیں۔ یہ شخص آپ کی مخالفت میں تقریر کر رہا تھا۔ سننے والوں کو آپ کے خلاف جھڑکار رہا تھا۔
 ”ادریس نہیں چاہتا کہ ہم ترقی کریں۔ یہ ہمارا خیر خواہ نہیں ہے۔ یہ ہمیں ہمارے بتوں سے برگشتہ کرنا چاہتا ہے۔ اس کی باتوں میں ہرگز نہ آنا۔ اگر ہمارے بت ہم سے ناراض ہو گئے تو ہم سے ہماری خوش حالی چھین جائے گی۔“
 جب یہ شخص تقریر کر کے چل دیا تو وہ لوگ بھی اس کے پیچھے پیچھے ہو لیے جو اس کی باتیں سن رہے تھے۔ صرف وہ لوگ وہاں رہ گئے۔ جو حضرت ادریس علیہ السلام کے ساتھ ساتھ چلے ہوئے یہاں تک آئے تھے۔ آپ اس پتھر پر کھڑے ہو گئے اور وعظ و تلقین کرنے لگے۔

”یہ جو ابھی یہاں سے اٹھ کر چلے گئے ہیں اللہ کی رحمت سے دور ہونے والے ہیں۔ تم بھی سن لو اور ان لوگوں کو بھی بتا دینا کہ اگر تم نے اپنی روش نہیں بدلی تو اللہ کی طرف سے ایک عذاب بہت جلد آنے والا ہے۔ یہ آفت، زمین کو آگ اور پانی سے ڈھانپ دے گی۔“

یہ لوگ کچھ دیر تک آپ کی باتیں سنتے رہے پھر اکتا کر ادھر ادھر ہو گئے۔ محض دو چار لوگ ہی تھے جو آپ کے قریب کھڑے رہ گئے۔ آپ نے اپنا خطاب مکمل کیا۔ ان لوگوں کے حق میں دعائے خیر کی اور پتھر سے اتر آئے۔

کئی سال گزر گئے۔ آپ نے یہی طریقہ اپنایا ہوا تھا۔ وقت مقررہ پر دجلہ کے کنارے پہنچ جاتے اور خطاب شروع کر دیتے۔ ان کا مخالف بھی بڑی پابندی سے ان کا پیچھا کر رہا تھا۔ سارے کی طرح آپ کے ساتھ لگا رہتا تھا۔ آپ کی مخالفت میں تقریریں کرتا رہتا تھا۔ اس کی تقریروں میں درویشی تھا لیکن چونکہ وہ بتوں کے حق کی تقریریں کر رہا تھا اور پوری قوم بتوں کی پرستش میں مبتلا تھی اس لیے اس کی باتیں لوگوں کے دلوں میں اتر رہی تھیں۔ حضرت ادریس علیہ السلام کے ساتھ محض دو چار ہی لوگ تھے جن کا شمار ان کے ماننے والوں میں کیا جاسکتا تھا۔

حضرت ادریس علیہ السلام نہایت ثابت قدمی سے کار نبوت انجام دے رہے تھے۔ اب انہوں نے اپنی تبلیغ کا دائرہ بھی بڑھا دیا تھا۔ دجلہ کے کنارے تک محدود نہیں رہے تھے بلکہ شام ہوتے ہی بازار میں نکل آتے اور لوگوں کو تلقین کرتے کہ وہ خدا کی ہستی اور اس کی توحید پر ایمان لے آئیں۔ ہر ماہ قمری تاریخ کی چودہ، پندرہ اور سولہ کے روزے رکھیں، زکوٰۃ ادا کرتے رہیں۔ دکانداروں کو نصیحت کرتے کہ ناپ تول میں ایمانداری سے کام لیں۔

ابھی تک ان کی تبلیغ کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا تھا۔ اس لیے قوم کے سربراہ دروہ لوگوں کو ان کی طرف سے کوئی خاص فکرا لاحق نہیں ہوتی تھی لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ ان کے ماننے والوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے تو ان کے کان کھڑے ہوئے۔

کچھ دنوں نے حضرت ادریس علیہ السلام کا گھر تبلیغ و ہدایت کا مرکز بنا ہوا تھا۔ جو لوگ آپ پر ایمان لے آئے تھے، یہاں ان کی تربیت ہو رہی تھی لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ مخالفین کو معلوم نہ ہونے پائے۔ اس احتیاط کو اتنا اندھا دھن ہی سمجھ لیتے دے سکتا تھا۔ رات ہوتے ہی دروازے پر دستک ہوتی، آپ آنے والے کا نام پوچھتے۔ دروازہ کھٹکا اور پتھر بند ہو جاتا۔
 ”کسی نے دیکھا تو نہیں؟“ سرگوشی ابھرتی۔
 ”نہیں۔ باہر اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔“

ایک ایک کر کے جب سب جمع ہو جاتے تو آپ اپنے ماننے والوں کو اپنی شریعت سے آگاہ فرماتے۔ قربانی اور نذرانے کے طریقوں سے آشنا کرتے۔ عبادت الہی کے طریقے سمجھاتے۔ یہ سب وہ چیزیں تھیں جو بذریعہ وحی آپ تک پہنچ رہی تھیں۔ اجتماعی عبادت بھی سب مل کر آپ کے گھر پر ہی ادا کرتے۔

نے ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ آپ راتوں کو گریہ و زاری کرتے تھے۔

”اے اللہ! یہ تھوڑے سے بندے جو تجھ پر ایمان لے آئے تھے۔ ان کی حفاظت فرما۔ اگر یہ بدل ہو کر واپس لوٹ گئے تو تیرا نام لیا کوئی نہیں رہے گا، مگر ابوں کو ہدایت دے۔ ان کے دلوں کو ہماری طرف سے نرم کر دے۔“

دن بدن گزرتے جا رہے تھے لیکن یہ معلوم ہوتا تھا جیسے آسمان کے دروازے بند ہو گئے ہیں۔ شاید امتحان کے کچھ دن اور باقی تھے۔ حضرت اور یس علیہ السلام کو ماننے والے اب اسنے جاڑ آگئے تھے کہ لگتا تھا کسی بھی وقت آپ کا ساتھ چھوڑ جائیں گے۔

وہ رات ستاروں سے عاری اندھیری اور خاموش تھی۔ وہ تمام لوگ جو اسلام قبول کر چکے تھے، حضرت اور یس علیہ السلام کے گھر میں جمع تھے۔ آپ کو بڑا رعب و وحی پہنچا رہی تھی اور اب وہ اس پیغام کو اپنے ماننے والوں تک پہنچانا چاہتے تھے۔

جب سب لوگ جمع ہو چکے تو آپ نے انہیں مخاطب کیا۔

”اے لوگو! تم پر اللہ کی رحمت ہو۔ مجھ سے تمہاری حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ میں رب العزت کی بارگاہ میں تمہارے لیے دعا گو تھا۔ میں خطر تھا کہ مجھے کوئی حکم دیا جائے اور میں حکم کروں۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اپنے ماننے والوں کو ساتھ لے کر بائیں سے نکل جاؤں پھر جہاں اللہ کا حکم ہو وہاں قیام کروں۔ اب بناؤ تمہیں میرا ساتھ دینا منظور ہے یا نہیں؟“

سکوت اور گہرا ہوا گیا۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دیا جائے۔ یہ کیا فیصلہ ہے۔ جہاں ہمارے باپ دادا رہتے چلے آئے ہیں وہاں سے ہجرت کیسے کر جائیں۔ مشکلیں بھی ہم نے اٹھائیں اور وطن بھی ہمیں چھوڑنا پڑ رہا ہے۔ جو لوگ حضرت اور یس علیہ السلام کی مخالفت کرتے رہے وہ تو مزے میں رہے۔ ٹھوکریں ہمیں کھائی پڑیں گی۔ حضرت اور یس علیہ السلام نے انہیں خاموش دیکھا تو ایک مرتبہ پھر اصرار کیا۔

”تم لوگ خاموش کیوں ہو۔ بولتے کیوں نہیں۔ کیا تمہیں اس فیصلے سے اختلاف ہے؟“

”یہ کیا فیصلہ ہوا۔ ہم کیا غلطی کرتے ہو ہمیں وطن چھوڑنا پڑ رہا ہے۔ ہمیں ستانے والے تو یہاں رہیں اور ہم صحرائوں میں بھٹکتے پھر رہیں۔“

”تمہیں وطن عزیز پر ہے یا اللہ تعالیٰ کی خوشنودی؟“

”آپ ہم سے ایسا سوال کیوں پوچھتے ہیں جس کا جواب آپ کو معلوم ہے۔ اگر ہمیں خدا کی خوشنودی حاصل نہ ہوتی تو اس کی راہ میں اتنی تکلیفیں کیوں اٹھاتے۔ ہم نے تو آپ کا ساتھ دینے کے لیے اپنے دوستوں اور عزیزوں تک کو چھوڑ دیا۔“

”تم نے انہیں نہیں چھوڑا بلکہ انہوں نے تمہیں چھوڑا ہے۔ اس لیے کہ تم حق پر تھے۔ بائیں کو یہ کیسے پسند آ سکتا ہے کہ حق اس کے ساتھ رہے۔ اب تمہیں یہ سوچنا ہوگا کہ بائیں کے ساتھ رہنا ہے یا بائیں سے الگ ہو جانا ہے۔“

”ہم خود بائیں کے ساتھ رہنا نہیں چاہتے لیکن یہ بھی تو حقیقت ہے کہ یہ ہمارا وطن ہے۔ اسے کیسے چھوڑ دیں۔“

”وطن کے لوگوں کا سلوک دیکھ رہے ہو۔ ایسے ہوتے ہیں اباب وطن؟“

اس کا کوئی جواب ان لوگوں کے پاس نہیں تھا لیکن ان کا دل بائیں میں اٹکا ہوا تھا۔ وہ اسے چھوڑنے پر تیار نہیں ہوتے تھے۔ حضرت اور یس علیہ السلام نے انہیں تذبذب میں دیکھا تو سب کو جانے دیا کہ اپنے اپنے گھروں کو جا کر خوب اچھی طرح غور کر لیں اور کل پھر اسی جگہ جمع ہوں۔

بائیں کی وجہ دوسرے دن بھی اسی طرح چٹکیاں تھیں۔ لوگوں کا رویہ اسی طرح ناز بنا رہا تھا۔ پھر وہاں اور یس علیہ السلام خاص طور پر گھروں سے نکلے کہ شاید اہل وطن کے رویوں میں کوئی تبدیلی نظر آجائے لیکن وہ جدھر سے گزرے طرے کے تیروں کی بوچھاڑی دیکھی۔ جس سے بات کرنے کی کوشش کی وہ منہ پھیر کر دوسری طرف چل دیا۔

رات کے وقت جب یہ جماعت حضرت اور یس علیہ السلام کے مکان پر جمع ہوئی تو ان میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے تجربات بیان کیے۔ امید کی کوئی صورت نہیں تھی۔ پھر سب نے کوئی چشمہ نہیں ملا تھا لیکن سب کے دلوں میں یہ کھٹکنا بھی تھا کہ حضرت اور یس علیہ السلام نہ جانے کہاں لے جائیں۔ بائیں جیسا سرسبز و شاداب علاقہ پھر ملے یا نہ ملے۔ اس کا اظہار بعض لوگوں کی زبان پر آ بھی گیا۔

”ہمیں بائیں جیسا علاقہ کہیں اور نصیب نہیں ہوگا۔ وجہ وفرات سے اچھی نہیں کہاں ہوں گی۔“

”کیا تمہیں یقین نہیں کہ ہجرت کا جو فیصلہ میں نے کیا ہے وہ میرا نہیں خدا کا فیصلہ ہے۔“

”ہمیں معلوم ہے۔ اسی لیے تو ہم آپ سے کہہ رہے ہیں کہ اپنے اللہ سے کہیے وہ یہ فیصلہ بدل دے۔ کوئی تدبیر ایسی کر

دے کہ ہم اپنے وطن ہی میں رہیں۔“

”اللہ کے فیصلے اکل ہوتے ہیں لیکن یہ تو بتاؤ تمہیں یہ فیصلہ تسلیم کرنے میں اتنی قیاحت کیوں ہے؟“

”ہم پہلے کہتے ہیں کہ یہ شادابی ہمیں کہیں اور نہیں ملے گی۔“

”یہ شادابی جس پر تم اتنا اترا رہے ہو، کیا تمہاری پیدائش کی ہوئی ہے؟“

”ہرگز نہیں۔ اس کا خالق تو اللہ تعالیٰ ہے۔“

”بس تو پھر تمہارا ایمان یہ ہونا چاہیے کہ اس کے کارخانہ قدرت میں کوئی کمی نہیں۔ جتنا حسن اس نے بائیں کو دیا ہے اس سے کہیں زیادہ اس خلقت زمین کو بھی دے سکتا ہے جہاں وہ تمہیں لے جانا چاہتا ہے۔ جو اس پر بھروسہ کرتے ہیں وہ انہیں بھی مایوس نہیں کرتا۔ تم اس پر بھروسہ کرو، وہ تمہیں ضرور اس کا نعم البدل دے گا۔ اس کی رحمت سے مایوس ہونا فخر ہے۔

اس کے حکم کے آگے سر تسلیم خم کر دو پھر دیکھو وہ تمہارے لیے کیسی کبھی نعمتیں عطا کرتا ہے۔ وہ ایسی نعمتیں ہوں گی کہ تم بائیں کو بھول جاؤ گے اگر اس کی حکم عدولی کر کے تم نے وطن نہ چھوڑا تو وہ جو ہر کام پر قادر ہے، تمہاری نہروں کو خشک بھی کر سکتا ہے۔ پھر تم ہو گے اور یہ ظالم اباب وطن۔ اس کے بعد اگر تم نے ملک چھوڑا تو کیا چھوڑا۔ اس کے نافرمان بننے سے کہیں بہتر ہے کہ اس کے فرمان بردار بن جاؤ۔ وہ جو ہر شے پر قادر ہے تم سے خوش ہوا تو تمہیں مالامال کر دے گا۔ ایک دن آنے لگے کہ یہی

اباب وطن حسرت سے کہیں گے کاش! ہم بھی تمہارے ساتھ ہجرت کر گئے ہوتے۔“

آپ کی تقریر ایسی موثر تھی کہ سب کے سب ہجرت پر آمادہ ہو گئے اور یہ عہد باندھا کہ وہ اپنے پیغمبر کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑیں گے۔ آپ نے ان سب کو حکم دیا کہ چلنے کی تیاری کریں۔

کچھ دن سے خاموشی تھی۔ حضرت اور یس علیہ السلام کی تیاری میں لگے ہوئے تھے جیسے وہ کہیں جانے کے لیے کمر کسر رہے ہوں۔ بہت سی لوگ اس تیاری کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ بڑی جتو کے بعد یہ معلوم ہوئی گیا کہ حضرت اور یس علیہ السلام اور ان کے ساتھی بائیں چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ کہاں، یہ کسی کو معلوم نہیں تھا بلکہ یہ تو انہیں بھی معلوم نہیں تھا جو ہجرت کر رہے تھے۔

تصدیق ہوتے ہی کھرام مچ گیا۔ وہی لوگ جنہوں نے زندگی اخیر کر رکھی تھی، اب افسردہ تھے۔ آپس میں رشتہ دار یاں تھیں اور اب یہ رشتے ٹوٹ رہے تھے۔ ان لوگوں کو اس لیے تک کیا جارہا تھا کہ خبرا کر حضرت اور یس علیہ السلام کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ یہ یہی قصد تھوڑی تھا کہ بائیں سے چلے جائیں۔ کسی کا بائیں چھوڑنے جارہا تھا۔ کسی کا بیٹا جارہا تھا تو باپ ہمیں رہ گیا تھا۔ پاؤں کی زنجیریں شور مچا رہی تھیں۔ جانے والوں کے لیے یہ ایک اور امتحان تھا اور یہ ایسا جذبہ بانی امتحان تھا کہ بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگا جائیں۔

ہر گھر میں طرح طرح کے سوالات کیے جا رہے تھے۔ جواب مل رہے تھے مگر کسی کی تشفی نہیں ہو رہی تھی۔ بس ایک ہی جواب سامنے تھا کہ ان کے پیارے ان سے جدا ہو رہے ہیں۔

قوم کے چند بڑے لوگوں نے انہیں اپنے پاس بلوایا اور پوچھا۔ ”تم لوگ کہاں جانے کی تیاریاں کر رہے ہو؟“

”یہ تو ہمیں بھی معلوم نہیں۔ بس اتنا معلوم ہے کہ بائیں چھوڑ کر جا رہے ہیں۔“

”سوال تو یہی ہے کہ تم لوگ کیوں جا رہے ہو، یہاں تم لوگوں کو کس چیز کی کمی ہے؟“

”یہ سوال آپ کو ان لوگوں سے کرتا چاہیے جنہوں نے ہم پر عمر بھر تک نگہ کر دیا تھا۔ پھر ہم یہاں رہ کر کیا کرتے؟“

”دیکھو، تم ہمارے اپنے ہو۔ ہمیں تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ تم نے ہمارے بتوں کو برا کہا شروع کیا جس کے نتیجے میں تنازعہ کھڑا ہوا۔ تم اگر آج حضرت اور یس علیہ السلام کا ساتھ چھوڑ دو تو ہم تمہیں گلے لگائے کو تیار ہیں۔“

”یہ سودا ہمیں منظور نہیں بلکہ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ آپ سب بھی حضرت اور یس علیہ السلام کی تعلیمات پر عمل پیرا ہو جائیں۔“

”تم ہمیں ایسے خدا کی پرستش کے لیے کہہ رہے ہو جیسے ہم نے دیکھا تک نہیں۔ اور یس اپنے طریقے ایجاد کرنا چاہتے ہیں جو ہمیں ہرگز قابل قبول نہیں۔“

”ہم نے تو یہ تک کہا کہ زبردستی نہیں ہے۔ تم اپنے بتوں کی پرستش کرتے رہو، ہمیں خدا کی عبادت کرنے دو لیکن یہاں کے لوگوں نے تو ہم سے لین دین ہی بند کر دیا۔ ہمیں بالکل ہی تنہا کر دیا پھر ہم یہاں رہ کر کیا کریں۔“

”ہم تم سے پھر کہتے ہیں۔ آپس کی دشمنیاں ختم کر دو۔ اور یس سے کہو وہ جہاں جانا چاہتا ہے چلا جائے۔ تم لوگ یہیں رہ جاؤ۔“

”یہ تو ہرگز نہیں ہو سکتا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں یہی ہدایت کی ہے کہ وہ اسکی نہیں ہمیں اپنے ساتھ لے کر جائیں گے۔“

”وہ ہمیں بے وقوف بنارہے ہیں۔“

”وہ اللہ کے نبی ہیں۔ جو کچھ کرتے ہیں اللہ کے حکم سے کرتے ہیں۔“

”یہ نبی کیا ہوتا ہے؟“

”جس طرح ہمارے اور تمہارے باپ آدم نبی تھے۔“

”تم بھی کیا تہیں لے کر بیٹھ گئے۔ کہاں صحراؤں میں بھٹکتے پھرو گے۔ جانے کا ارادہ اب بھی ترک کر دو۔“

”ہم اپنے نبی سے وعدہ کر چکے ہیں۔ ہمارا عہد ٹوٹنے کے لیے نہیں تھا۔“

ان کی طرف سے پاپوس ہونے کے بعد ان لوگوں نے حضرت ادریس علیہ السلام کو اپنے پاس بلایا۔ ”یہ آپ کسی نادانی کر رہے ہیں۔ ان لوگوں کو کہاں لے کر جا رہے ہیں؟“

”میرے رب نے مجھے صرف یہ حکم دیا ہے کہ میں اپنی جماعت کے ساتھ بابل سے ہجرت کر جاؤں۔ میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں کہ میں انہیں کہاں لے جا رہا ہوں۔“

”اچھے رہبر ہو کہ منزل کو پتا نہیں اور جا رہے ہو۔“

”میری رہنمائی کے لیے میرا خدا ہے۔ میں چٹار ہوں گا، جہاں اس کا حکم ہو گا کر جاؤں گا۔“

”کیا ہم تمہیں رککنے کے لیے نہیں کہہ سکتے؟“

”میرے خدا نے جو مجھے ہجرت کا حکم دیا ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سیدھا راستہ تمہاری قسمت میں نہیں ہے۔ اسی لیے ہم سے کہا جا رہا ہے کہ ہم تمہیں چھوڑ جائیں۔ تمہیں اگر کوئی توفیق ملی ہوگی تو ہم یہاں سے جاتے ہی کیوں۔“

”یہ بات نہیں۔“ ان سرداروں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”ہمارے بتوں کو یہ منظور نہیں کہ ان کا مذاق اڑانے والے یہاں رہیں۔ اسی لیے انہوں نے تمہارے دل میں یہ بات ڈالی ہے کہ تم یہاں سے چلے جاؤ اور وہ سب لوگ بھی جو تمہارے ساتھ ہیں۔ کچھ ہی دن میں یہ پیش تم سے چھین جائے گا اور تم صحراؤں میں بھٹکتے پھرو گے۔ یہی تمہاری سزا ہے۔“

ان بڑے لوگوں نے لوگوں میں بھی مشہور کر دیا کہ ادریس اور ان کے ساتھیوں کو بتوں کی توفیق کرنے کی سزا ملی ہے۔ ہمارے بتوں نے ان لوگوں کو ناراض ہو کر بابل سے نکال دیا۔ یہی وجہ تھی کہ جب حضرت ادریس علیہ السلام بابل سے نکلے تو بابل کے لوگوں نے بڑی دھوم دھام سے جشن منایا اور کئی دن تک بتوں کو خوش کرنے کے لیے چڑھاوے اور نذرانے چڑھائے جاتے رہے۔

حضرت ادریس علیہ السلام کا یہ چھوٹا سا قافلہ لائق وق و حرا میں کسی نامعلوم منزل کی طرف رواں دواں تھا۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ انہیں کہاں جانا ہے۔ منزل کا تعین ہو تو سفر آسان ہو جاتا ہے۔ یہاں تو معلوم ہی نہیں تھا کہ کہاں جا رہے ہیں۔ ان لوگوں کا حال تو یہ تھا جیسے راستہ بھٹک گئے ہوں۔ حضرت ادریس علیہ السلام کے سوا سب ہی پریشان تھے۔ سختیاں جیسے جیسے بڑھتی جا رہی تھیں وطن کی یاد ستاتی جا رہی تھی۔ وہ دبے لفظوں میں کہتے گئے تھے کہ ہم نے بابل سے نکل کر غلطی کی۔ بابل ہمیں سرزمین اب ہمیں میسر نہیں آسکتی۔ اب تک ریت اور پیاز یوں کے سوا ہمیں کچھ نہیں ملا ہے۔ حضرت ادریس علیہ السلام انہیں برابر موصلا دیے جا رہے تھے اور دعا فرما رہے تھے۔ ”اے اللہ! میرے ساتھیوں کے ایمانوں میں ضعف پیدا نہ کر۔ انہیں ثابت قدم رکھ اور انہیں بابل کا نعم البدل اچھا عطا کر۔“

کئی دن کے سفر کے بعد ان لوگوں کے پاس پانی کم ہو گیا۔ قطرہ قطرہ کر کے پاس بھجا رہے تھے۔ اب ان میں سے بہت سوں کو یقین ہو گیا کہ وہ ایسے ہی کھلی صحرا میں مر جائیں گے۔ زور و زور تک کوئی پرندہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا جس سے اندازہ ہوتا کہ کتنی قریب ہی پانی ہے۔

ریت کا ایک بڑا ٹیلا سامنے تھا اور کچھ نہیں معلوم تھا کہ یہ ٹیلا عبور کرنے کے بعد کیا منظر سامنے آتا ہے۔ ان لوگوں نے بے دلی سے اس ٹیلے پر چڑھنا شروع کر دیا۔ جب سب اوپر پہنچ گئے اور اس بلندی سے دیکھا تو کوئی چیز آئینے کی طرح چمکی ہوئی نظر آئی۔ سب اس طرف دوڑ پڑے۔ وہ جتنا چلتے جاتے تھے آئینے کی یہ چادر دور ہوئی جاتی تھی۔ ابھی وہ اس تماشے کو نظر کا دھوکا سمجھ رہے تھے کہ ان کی آنکھوں نے ایک بڑے دریا کو ٹھٹھا مارتے ہوئے دیکھا۔ وہ تب سمجھا دڑنے لگے۔ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ تھا۔ یہ دریا وہی تھا جسے آج دریائے نیل کہا جاتا ہے۔

حضرت ادریس علیہ السلام کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ وہ عالم بیجان میں تاج رہے تھے، شور مچا رہے تھے، ایک دوسرے پر پانی اچھال رہے تھے۔

حضرت ادریس علیہ السلام نے دریا کی روانی اور زمین کی شادابی دیکھی تو آپ نے بے ساختہ فرمایا۔ ”بابلیون“ (تمہارے بابل کی طرح شاداب مقام) حضرت ادریس کے اس لفظ ”بابلیون“ نے ایسی شہرت پائی کہ اس جگہ کا نام ہی بابلیون پڑ گیا۔ قدیم اقوام اس مقام کو اسی نام سے پکارتی رہیں۔ طوفان نوح علیہ السلام کے بعد جب دنیا دوبارہ آباد ہوئی تو حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے حام نے اپنے بیٹے مکرودریائے نیل کے کنارے آباد ہونے کا حکم دیا اور یہ مقام مصر بن حام کی وجہ سے مصر کہلایا۔

بہر حال موجودہ مصر اور قدیم بابلیون میں ایک بہترین جگہ منتخب کر کے دریائے نیل کے کنارے یہ لوگ آباد ہو گئے۔ ان کی عورتیں اور بچے بھی ان کے ساتھ تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ان لوگوں نے بابل کو بالکل ہی چھوڑ دیا ہے اور اب انہیں اسی ”بابلیون“ میں رہنا تھا جو خدا نے انہیں بابل کے نعم البدل کے طور پر عطا کیا تھا۔

خدا نے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا تھا۔ بابل سے انچی زمین عطا کی تھی۔ ان کے پیغمبر نے جو بشارت دی تھی وہ پوری ہوئی تھی۔ ان لوگوں کے ایمان مزید پختہ ہو گئے اور ہر وقت اپنے نبی کے ساتھ رہنے لگے۔ ان کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کے لیے کوشاں ہو گئے۔

یہ ایسی شاداب سرزمین تھی کہ یہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بہت سے قابل آباد تھے جو سب کے سب گمراہی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ یہ اندھیرے کی اچالے کی تلاش میں تھے اور اچالا بہت قریب آ گیا تھا۔ حضرت ادریس علیہ السلام کی ایک مخصوص قوم کے نبی نہیں تھے بلکہ انہیں خلافت ارضی عطا ہوئی تھی۔ روئے زمین پر جو بھی آباد ہے، اس تک اپنی تعلیمات پہنچانا آپ کے فرائض منصبی میں شامل تھا۔ آپ نے اپنے چند بااعتماد ساتھیوں کے ہمراہ ان قابل کار خ کیا اور پیغام الہی پھیلاتا شروع کر دیا۔

کہتے ہیں اس وقت مصر میں بہتر زمینیں بولی جاتی تھیں۔ آپ کے پیروکار یہ دیکھ کر حیران تھے کہ آپ کو ان تمام زبانوں پر عبور حاصل ہے جو جماعت آتی ہے آپ اس سے ہمیں کی زبان میں باتیں کرتے ہیں۔ خدا نے تعالیٰ کی عطا بخشش سے آپ اس وقت کی تمام زبانوں کے زبان دان تھے۔

آپ کے ماننے والوں کے لیے کچھ دنوں سے ایک اور بات دلچسپی اور تجسس کا باعث بنی ہوئی تھی۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ حضرت ادریس علیہ السلام ایک ایک دو درودن کے لیے غائب ہو جاتے ہیں اور پھر ملوث کر آ جاتے ہیں اور جب واپس آتے ہیں شریعت کا ایک نیا نکتہ بیان فرماتے ہیں۔ لوگوں میں یہ مشہور ہو گیا تھا کہ ایک فرشتہ ہے جو آپ کا دوست ہے۔ وہ جب بھی آتا ہے حضرت ادریس علیہ السلام اسے لے کر جنگل میں چلے جاتے ہیں۔ وہ آپ کو کئی نیا باتیں بتاتا ہے۔ ان سب زبانوں کا علم بھی اسی نے دیا ہوگا۔ اس کا یقین اس طرح بھی آتا تھا کہ آپ بھی کبھی کوٹری میں بند ہو جاتے تھے۔ اندر کوئی نہیں ہوتا تھا لیکن یہ معلوم ہوتا تھا جیسے آپ کسی سے باتیں کر رہے ہیں۔ بعض لوگ تو یہ دعویٰ بھی کرتے تھے کہ ایک شخص ہے جس کو اکثر آپ کے ساتھ دیکھا گیا ہے۔ یہی وہ فرشتہ ہے۔ لوگوں نے اس بارے میں آپ سے کئی مرتبہ سوالات کیے اور اس فرشتے کی حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کی لیکن آپ نے کسی کو کھل کر کچھ نہیں بتایا۔

ایک دن پھر آپ کے قریب رہنے والوں نے دیکھا کہ آپ تنہائی میں کسی سے باتیں کر رہے ہیں۔ یقیناً وہ فرشتہ پھر آیا تھا۔ اس سے آپ کو کچھ باتیں سنیں تھیں اور پھر قوم کو بتانی تھیں۔

پوری قوم انتظار میں تھی یا آخر درودن کے انتظار کے بعد حضرت ادریس علیہ السلام نے قوم سے خطاب کیا۔ ”لوگو! مجھے تاکید کی گئی ہے کہ میں تمہیں بتاؤں اور تم اس پر عمل کرو۔ خدا کی ہستی اور اس کی وحید پر ایمان لاؤ۔ صرف خالق ہستی کی پرستش کرو۔ آخرت کے عذاب سے رستگاری کے لیے اعمال صالح کو ڈھال بناتے رہو۔ ایسے اعمال کرو جو تمہیں آخرت کے عذاب سے بچائیں۔ مقررہ طریقے پر عبادت کرتے رہو اور کسی کے ساتھ نا انصافی مت کرو۔ پاک صاف رہا کرو۔ نشہ آور چیزوں کے قریب بھی مت جاؤ۔ کتے اور سور سے خاص طور پر اجتناب کرو۔“

آپ کے ماننے والے آپ کی ہر بات کو ایمان کا درجہ دیتے تھے۔ مختلف قبائل کے جو لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے تھے، آپ اور آپ کی جماعت کے لوگ انہیں ان تعلیمات سے آگاہ کرتے رہے۔ آپ کی یہ تعلیمات دور دور تک پہنچتی رہیں اور ان پر عمل بھی ہوتا رہا۔

آخری پینترا

ایک قدیم چینی کہادت ہے کہ لڑائی کے 370 پینترے داناؤں نے گنوائے ہیں ان میں جو پینترے سب سے کارآمد بتایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ بھاگ لو! اس کی تصدیق ہندو دیو مالا سے بھی ہوئی ہے۔ راون کے دس سر اور بیس ہاتھ تھے پھر بھی مارا گیا۔ اس کی وجہ ہماری سمجھ میں تو یہی آتی ہے کہ بھاگنے کے لیے صرف دو ٹانگیں تھیں۔

مشافق احمد یوسفی کی "آبِ گم" سے اقتباس
محمد یحیٰ ابن کھوڑہ، تحصیل کبٹ، سندھ

جانے لگی۔

"تم اس طرح نہیں جا سکتی ہو۔" ڈیرک اس کے راستے میں آگیا۔

"تم بھی جہنم میں جاؤ۔" عورت نے کہا اور اچانک اس کے پیٹ میں ٹھٹھا مارا۔ وہ خاصی طاقت ور تھی کیونکہ ضرب کی شدت نے ایک لمحے کے لیے ڈیرک کو مغلوب کر دیا تھا اور وہ اس کا فائدہ اٹھا کر تیزی سے باہر نکل گئی تھی۔ جب تک ڈیرک خود پر قابو نہ آیا تو وہ کارائشٹارٹ کر کے وہاں سے جا چکی تھی۔ ریسٹوران کا مالک اس کے پاس آیا۔

"مستمر ٹھیک ہوتا؟"

ڈیرک نے سیدھا ہوتے ہوئے گہری سانس لی اور بولا۔ "میں ٹھیک ہوں۔۔۔۔۔ اس عورت نے میری کار کو عقب سے ٹکرا مارا ہے۔ اس کی بریک لائن ٹوڑ دی ہے۔"

"تم پولیس کو رپورٹ کرو۔" ریسٹوران کے مالک نے مشورہ دیا۔ "اور آگے سفر میں تم کو بہت مشکل ہو سکتی ہے۔" لیکن وہ پولیس کو رپورٹ نہیں کر سکتا تھا۔ اسے رہ رہ کر عورت پر غصہ آ رہا تھا جس کی وجہ سے وہ مشکل میں پڑ گیا تھا۔ اسے معلوم تھا راستے میں جہاں بھی ٹریفک پولیس نے اس کی کار دیکھی وہ اسے روک کر پوچھ پچھا ضرور کریں گے۔ اگر کوئی اور مسئلہ نہ بھی ہوتا تب بھی وہ تاخیر کا شکار ضرور ہو جائے گا۔ جب کہ بارش نے پہلے ہی اس کے سڑک کو مشکل کر دیا تھا۔ اس نے ریسٹوران کے مالک کو ٹال دیا۔

"میں دیکھوں گا شاید کہیں ورکشاپ مل جائے اور میں لائن ٹھیک کرالوں۔"

اس نے کافی کی قیمت میز پر رکھی اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اسے خوف تھا کہ اس تصادم نے کار کے نظام کو نقصان نہ کیا ہو کہیں وہ اشارت ہونے سے انکار نہ کر دے لیکن کار

کیا وہ بات کرنے کے موڈ میں تھا۔ "بہت سال بعد میں اس قسم کی بارش دیکھ رہا ہوں۔"

"ہوں۔" ڈیرک نے ہنکارا بھرا۔
"تم اس موسم میں کہاں جا رہے ہو؟"

اس بار ڈیرک نے سخت نظروں سے اسے دیکھا اور بولا۔ "کیا ضروری ہے میں تمہارے ہر سوال کا جواب دوں۔" لہجے سے زیادہ ڈیرک کی نظروں نے ریسٹوران کے مالک کو سہا دیا تھا۔ اس نے جلدی سے کہا۔ "نہیں۔۔۔ میں تو سوچ رہا تھا کہ شاید تم بات کرنے کے موڈ میں ہو۔"

"میرا ایسا کوئی موڈ نہیں ہے۔" ڈیرک نے رکھاٹی سے کہا اور شیشے کے باہر دیکھنے لگا۔ مالک کا ڈنٹر کی طرف چلا گیا۔ ہائی وے کی طرف تاریکی کا راج تھا۔ اچانک ہی اس تاریکی سے ایک روشنی نمودار ہوئی اور ایک کار آ کر تیزی سے ڈیرک کی کار کے پاس رکی۔ دیکھتے دیکھتے بھی اس نے عقب سے ڈیرک کی کار کو ٹکرا مارا دی تھی۔ شیشہ بھرنے کی آواز اندر تک آئی تھی۔ ڈیرک بے ساختہ بولا۔ "لعنت ہو۔"

وہ باہر کی طرف بھاگا۔ آنے والی کار عقب سے اس کی کار سے ٹکرائی تھی جس نے ایک طرف کی بریک لائن توڑ دی تھی۔ ٹکرائے والی کار سے ایک عورت اتر کر اندر کی طرف لپٹی۔ ڈیرک اسے صبح سے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اپنے نقصان کا معائنہ کر کے وہ بھینسا ہوا اندر آیا تو عورت کا ڈنٹر پر ریسٹوران کے مالک سے ٹکرائی تھی۔

"پلیز کسی طرح رابطے کی صورت نکالو۔۔۔۔۔ یہ ایمر جنسی ہے۔"

ریسٹوران کے مالک نے نفی میں سر ہلایا۔ "فون خراب ہے اور اس موسم میں موبائل کام کہاں کرتا ہے۔"

ڈیرک غصے میں عورت کے پاس پہنچا اور اسے اس کا بازو پکڑ کر ایک جھٹکے سے اپنی طرف کھینچا۔ "تم نے میری کار کا کیا شٹر کیا ہے۔"

عورت تقریباً تیس برس کی تھی۔ دلکش نقوش اور موزوں حجامت کے ساتھ وہ کسی مرد کو متاثر کرنے کی پوری صلاحیت رکھتی تھی لیکن پریشانی نے اس کی دلکشی کو ماند کر دیا تھا۔ پھر ڈیرک کے انداز نے اسے غصہ دلا دیا۔ اس نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑایا۔ "دور رہو مجھ سے۔"

"میری کار۔۔۔" ڈیرک نے کہا چاہا۔

"جہنم میں گئی تمہاری کار۔۔۔" عورت کہہ کر وہاں سے

گیا کہ اس وقت سامنے سے کوئی دوسری گاڑی آگئی تو حادثے کا بہت زیادہ امکان ہوگا۔ لہذا اس نے بے بسی سے رفتار کم کر دی۔

کار مشکل سے تیس میل فی گھنٹے کی رفتار سے چل رہی تھی اور اسی رفتار سے وہ کسی صورت کل صبح دس بجے تک منزل پر نہیں پہنچ سکتا تھا۔ یہ موقع اس کے ہاتھ سے نکلنا چاہتا تھا۔ ڈیرک کو اس شخص کا خیال آیا جس پر اسے اپنا چاقو آزمایا تھا۔ شاید اس کی قسمت میں نہیں تھا۔ اس نے حسرت سے اپنے بیک کی طرف دیکھا۔ اسی لمحے سامنے سے ایک گاڑی نمودار ہوئی اور زن سے اس کے پاس سے گزری۔ وہ تصادم سے بال بال بچا تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اب اپنی ساری قوجہ ڈرائیونگ پر رکھے گا۔

رات گیارہ بجے وہ کوئی بڑھ سو میل کا فاصلہ طے کر چکا تھا۔ بارش کی شدت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ پانچ گھنٹے کی مسلسل اور اعصاب شکن ڈرائیونگ نے اسے تھکا دیا تھا اور اب اس نے کچھ دیر آرام کا فیصلہ کیا۔ اسے راستے میں آنے والے کسی ریسٹوران یا کیفے کی تلاش بھی جہاں رک کر وہ ایک کپ کافی لینا اور کچھ دیر سنا لیں۔ لیکن ریسٹوران اسے بارہ بجے ملا۔ یہ ایک چھوٹا سا ریسٹوران تھا جس کے ساتھ تیس اسٹیشن اور ایک چھوٹا سا مسٹور بھی تھا۔ اس نے کار پارکنگ میں روکی اور اپنے اوپر کوٹ کا کار اوپر کرتے ہوئے کار سے نکل کر تیزی سے اندر گھس گیا لیکن کوشش کے باوجود وہ اچھا خاصا جھجک گیا تھا۔ اندر آ کر اس نے پانی چھاڑا اور کاؤنٹر کی طرف بڑھ گیا۔ ریسٹوران میں مالک کے علاوہ صرف دو افراد اور تھے۔ ایک کرسی پر بیٹھا خزانے لے رہا تھا اور دوسرا سیئر کی بوتل سامنے رکھے اونگھ رہا تھا۔ مالک اسے دیکھ کر مستعد ہو گیا۔

"میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟"

"ایک کپ کافی گرم اور سیاہ۔" وہ اسٹول پر بیٹھ گیا۔ مالک نے غریبوں کی طرف اشارہ کیا۔ "بہتر ہوگا تم وہاں کہیں بیٹھ جاؤ۔۔۔۔۔ تم جھکے ہوئے لگ رہے ہو۔"

ڈیرک نے اس کی بات مان لی اور دروازے کے پاس ایک میز منتخب کی۔ کچھ دیر بعد ریسٹوران کے مالک نے اس کے سامنے کافی لا کر رکھی۔ "آج بہت طوفانی بارش ہو رہی ہے۔"

ڈیرک نے سر ہلایا اور کافی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ لیکن ریسٹوران کے مالک نے اس کی خاموشی کا کوئی اثر قبول نہیں

ڈیرک تیار ہو کر باہر نکل آیا۔ کار میں روانہ ہونے کے ساتھ ہی اس نے ریڈیو آن کر لیا اور مقامی خبروں کے لیے کوئی موزوں چینل تلاش کرنے لگا۔ ایک چینل سے خبریں نشر ہو رہی تھیں اس نے یہی چینل لگا دیا۔ کچھ دیر بعد اس کے مطلب کی خبر آگئی۔ یہ موسم کا احوال تھا اور بین کروہ کسی قدر تشویش زدہ ہو گیا کہ اس کے راستے میں شدید طوفانی بارش کا امکان تھا۔ موسم کے تیز تو ابھی سے خراب تھے۔ وہ ہائی وے پر آیا تو موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ جس میں سامنے کا منظر دھندلا رہا تھا اور اسے کار کی ہیڈ لائٹس تیز کرنے کے باوجود تیس چالیس گز سے آگے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ رفتار کم کرنے پر مجبور ہو گیا۔ شام کے چھ بج رہے تھے اور جب ایک گھنٹے بعد اندھیرا چھا جاتا تو صورت حال اور بھی خراب ہو جاتی۔ اس وقت بھی وہ چالیس سے زیادہ کی رفتار سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔

ڈیرک جھپٹتا لگا تھا۔ اس کا صبح تک منزل پر پہنچنا لازمی تھا۔ اگر وہ وقت پر نہیں پہنچ پاتا تو اس کا سفر بے کار جاتا۔ اس کا ارادہ تھا کہ رات کے نصف پہر کے بعد وہ کسی موٹل میں رک جائے گا۔ جب اس کی منزل سو میل سے کم فاصلے پر رہ جائے گی اور اگلی صبح وہ تازہ دم ہو کر وہاں پہنچ جائے گا۔ مگر بارش کو دیکھتے ہوئے اس کا کوئی امکان نظر نہیں آ رہا تھا کہ وہ رات آرام کرنے کے لیے کہیں رک سکے گا۔ اس رفتار سے سفر کرتے ہوئے اسے وہاں پہنچنے میں کم سے کم بارہ سے پندرہ گھنٹے لگ جاتے۔ آرام کیے بغیر وہ تھک جاتا تو اپنا کام کس طرح کرتا۔ تم سے کم صبح طریقے سے انجام نہیں دے سکتا تھا اور اسے معلوم تھا کہ یہ موقع پھر سے نہیں ملے گا۔ جو اس نے بڑی مشکل سے حاصل کیا تھا اور وہ اسے کھوتا نہیں چاہتا تھا۔

بارش کی وجہ سے ہائی وے پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا اس لیے ڈیرک نے تیز ڈرائیونگ کا خطرہ مول لے لیا۔ پھر بھی اس کی رفتار پچاس میل فی گھنٹے سے اوپر نہیں جا رہی تھی۔ ایک گھنٹے بعد مکمل طور پر تاریکی چھا چکی تھی اور اس میں ڈرائیونگ کرنا اور بھی دشوار ہو گیا تھا۔ اوپر سے بارش کی تیزی بڑھ رہی تھی۔ ونڈ اسکرین پر پانی چیسے دھار کی طرح گر رہا تھا اور کار کے دھیرے مسلسل چلنے کے باوجود اسے صاف کرنے میں ناکام ہو رہے تھے۔ جب وائپر نیچے جاتے تو ایک لمحے کو اسکرین بالکل دھندلی ہو جاتی تھی اور ڈیرک کو سامنے کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ اس نے محسوس

فوراً اشارت ہو گئی اور وہ آگے بڑھ گیا۔ بارش کی شدت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ ڈیرک کو خیال آیا کہ بارش اس لحاظ سے اچھی ہے کہ کوئی ٹریفک پولیس والا اس کی کاری خراب بریک لائٹ چیک نہیں کر سکے گا۔ رفتار کی حد میں سے زیادہ نہیں تھی۔ بلکہ ڈیرک کو یہ رفتار بھی خطرناک لگ رہی تھی مگر اسے سفر تو کرنا ہی تھا۔

اسے عورت کا خیال آیا۔ اس کا غصہ سرد ہو چکا تھا اور اسے پہلی بار عورت کی دل کشی یاد آئی۔ ممکن ہے وہ عام حالات میں اس سے ملا ہوتا تو اسے پسند کر بیٹھتا۔ پھر اسے اپنے نقوش یاد آئے۔ ان کرخت نقوش کے ساتھ کوئی عورت اسے پسند نہیں کر سکتی تھی۔ بلکہ آج تک کسی عورت نے اس میں دلچسپی نہیں لی تھی۔ وہ اکیلا تھا اور امکان یہی تھا کہ مرتے دم تک اکیلا ہی رہے گا۔

ڈیرک نے محسوس کیا کہ جیسے جیسے وہ آگے جا رہا تھا بارش میں تبدیلی آنے کے ساتھ طوفانی ہواؤں کا زور بھی بڑھنے لگا تھا۔ اس طرح سفر کرنا دشوار ہوتا جا رہا تھا۔ ہواؤں کی وجہ سے چیزیں بھی اڑ رہی تھیں۔ ایک خاصی بڑی شاخ آ کر وہ اسکرین سے ٹکرائی تو وہ ایک لمحے کو بھٹکا گیا۔ اسے خیال آیا کہ کار کسی چیز سے ٹکرائی ہے اور کار بری طرح لہرائی گئی تھی۔ اگر اس وقت ہائی وے پر کوئی اور گاڑی بھی ہوئی تو حادثہ بھی ہوسکتا تھا۔ لیکن ایسا ہوا نہیں تھا۔ کار قابو کرنے کے بعد اس نے سوچا کہ اسے کہیں رک جانا چاہیے ورنہ اس موسم میں سفر کرنے کا مطلب کسی حادثے کا شکار ہونا بھی ہوسکتا تھا۔

وہ ہائی وے کے کناروں پر روک بیٹھنے لگا۔ رات کا ایک بج رہا تھا اور فی الحال اسے کہیں کوئی روشنی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اس ہائی وے کے اطراف میں آبادی تھی۔ شاید طوفان کی وجہ سے کبھی بند کر دی گئی تھی۔ اس لیے ڈیرک کو کہیں روشنی نظر نہیں آ رہی تھی۔ پھر طوفان نے ہی اس کی مدد کی ایک بار بجلی چمکی تو اسے دائیں طرف ہائی وے سے ذرا فاصلے پر ایک دو منزلہ مکان نظر آ گیا۔ وہ تار بجی میں ڈوبا ہوا تھا اور اگر بجلی نہ چمکتی تو اسے پتا بھی نہ چلتا کہ یہاں کوئی مکان بھی ہے۔ اس نے کار فوراً ہی طور پر اس طرف بٹھادی۔ اسے راستے کا بالکل پتا نہیں تھا اور کار بچنے میں اترا جاتی تو پھنس بھی سکتی تھی۔ اس لیے وہ بہت محتاط انداز میں اسے مکان کی طرف لے جا رہا تھا۔ کسی نہ کسی طرح وہ اسے مکان کے سامنے لے جانے میں کامیاب رہا۔ مکان کے سامنے ایک گاڑی کھڑی تھی۔ ڈیرک کو امید ہوئی کہ مکان خالی نہیں ہے اور اسے یہاں پناہ مل جائے گی۔

کار کا برآمدے سے فاصلہ دس قدم بھی نہیں تھا لیکن

یہاں تک آتے آتے وہ بھیگ گیا تھا۔ برآمدے میں بھی پانی کی بو چھڑا آ رہی تھی۔ ہواؤں کا شور بالوں کی گرج کے ساتھ مل کر کان کے پردے پھاڑ رہا تھا۔ اس نے سامنے والا دروازہ زور سے بجایا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ ورنہ وہ بلا تکلف اندر کھس جاتا۔ چند لمحوں تک کوئی جواب نہیں ملا تو اس نے پھر دروازہ بجایا اور ساتھ چلایا۔ ”کوئی ہے مجھے پناہ چاہیے.... دروازہ کھولو۔“

اس بار بھی کوئی جواب نہیں ملا تھا۔ اس نے مشتعل ہو کر دروازے کو توڑنے کے انداز میں بجایا ڈالا۔ نتیجہ حسب سابق رہا تھا۔ اندر موجود افراد نے اگر دروازہ بجانے کی آواز سنی تھی تو ان کے کان پر جوں نہیں رسکتی تھی۔ ڈیرک کو پھر غصہ آنے لگا تھا۔ بدقسمتی سے مکان کا یہ رخ براہ راست ہواؤں کی زد میں تھا اور ہوا میں پانی کی بو چھاڑی اندر لا رہی تھیں۔ وہ مشتعل بارش کی زد میں تھا اور مکمل طور پر بھیگ گیا تھا۔

ڈیرک بارش کی پروا کیے بغیر نیچے اترا اور اس نے کار کی ڈی کھولی۔ اندر سے جبکہ لیور نکالا۔ یہ دو فٹ لمبا اور کوئی چار کلو گرام وزنی لیور تھا۔ وہ لیور لے کر واپس آیا۔ اس گھر کے لوگوں نے اپنی بدتمیزی سے خود کو اس قابل ثابت کیا تھا۔ اس نے سوچا اور دروازے پر پہلی ضرب لگائی۔ وزنی لیور نے پہلی ہی ضرب میں دروازے کو ہلا دیا تھا۔ ڈیرک نے پھر ضرب لگائی۔ دروازہ مزید ہلا گیا لیکن اس کی کنڈی والا حصہ توڑنا اس کے انداز سے زیادہ دشوار ثابت ہوا تھا۔ مگر اس نے کسی نہ کسی طرح پٹ کا یہ حصہ توڑ ڈالا اور اندر ہاتھ ڈال کر کنڈی کھولی۔

تیز ہوانے اسے خود اندر دھکیلا اور وہ زمین پر جا گرا۔ اندر گھپ اندھیرا تھا۔ اس نے جلدی سے اٹھ کر دروازہ بند کیا مگر اس کام میں اسے پوری طاقت لگانی پڑی تھی۔ ہوا چٹکھائی ہوئی اس کی کوشش ناکام بن رہی تھی۔ یہ مشکل اس نے دروازہ بند کیا اور اس پر زنجیر لگائی۔ اس کے پٹ کے ٹوٹے حصے سے ہوا اندر آ رہی تھی لیکن اس کا زیادہ زور نہیں تھا۔ ڈیرک نے اپنی چپب میں موجود پینل مارچ نکال کر روشن کی۔ یہ راہداری تھی جہاں وہ موجود تھا۔ اس نے زور سے کہا۔

”کوئی ہے یہاں؟“
جواب نہیں ملا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی موجود نہیں ہے لیکن ڈیرک کی چمکی حس بتا رہی تھی کہ مکان خالی نہیں ہے اور یہاں کچھ لوگ موجود ہیں مگر وہ سامنے کیوں نہیں آ رہے اور نہ انہوں نے اس کی طرف سے دروازہ توڑے

جائے کی مزاحمت کی۔ ڈیرک کو غمند ہوا۔ اس مکان میں تین اسیے چار اسرار لگ رہے تھے۔ ورنہ اپنے مکان میں دخل اندازی سے کوئی اس طرح غافل نہیں ہوتا۔ لیور اس کے پاس تھا۔ وہ اس نے ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔ مارچ کی روشنی میں وہ آگے بڑھنے لگا۔ راہداری کے آغاز پر سڑکیاں اوپر کی طرف جارہی تھیں اور دوسری طرف ان کے نیچے سے ایک دروازہ کسی نہ خانے میں جا رہا تھا۔ ڈیرک نے اسے کھولنے کی کوشش کی تو اسے منتقل پایا۔ راہداری کے دونوں طرف کئی کمرے تھے مگر یہ سب محلے ہوئے اور خالی تھے۔ وہ باری باری ان میں جھانک رہا۔ اپنی حفاظت کے بارے میں وہ پوری طرح محتاط تھا۔ جب کسی کمرے میں داخل ہوتا تو اس طرح چوکنہ ہو جاتا جیسے ابھی کہیں سے نکل کر کوئی اس پر حملہ کر دے گا مگر نیچے فلور کے سارے کمرے چکن سمیت خالی تھے۔ چکن آخر میں تھا اور اس کی میز پر دو خالی مگر گندی پیٹشیں موجود تھیں۔ اس نے

اسی لگا کر دیکھا۔ لٹا چلا چند حصے پہلے ہی لٹا گیا تھا۔ اس کی یقین مزید پختہ ہو گیا کہ مکان میں کچھ افراد موجود ہیں کسی وجہ سے اس کے سامنے نہیں آ رہے۔
نچلے حصے کا پوری طرح جائزہ لینے کے بعد وہ اوپری منزل کی طرف بڑھا۔ اوپر کا نقشہ بالکل ویسا ہی تھا جیسا نیچلی منزل کا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ مزید اوپر سڑکیاں جانے کے بجائے ایک چھوٹی سی سڑی تھی جو دو پچھتی تک جاری تھی۔ یہاں آ کر ڈیرک مزید محتاط ہو گیا۔ کیونکہ اسے یقین تھا کہ جو بھی ہے وہ اسی منزل میں ہے وہ ایک کے بعد ایک کمرہ کھولتا رہا۔ کمرے سارے کھلے تھے اور حیرت کی بات تھی کہ ان میں بھی کوئی نہیں تھا۔ نیچے جہاں بچن اور ڈانگ روم تھا اس کے اوپر ایک بڑا سا لاونج تھا اور اس پوری منزل میں چھینے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ ڈیرک نے الماریوں اور بستروں کے نیچے تک جھانک لیا تھا۔
اوپری منزل کو بھی خالی پا کر وہ ایک لمحے کو چکر کر رہ

سیرے نسوانی حسن کارلار

بلوسم بریسٹ ڈولپنگ ایڈٹائیٹنگ کریم (ہرٹل)

چھوٹی بریسٹ میں اضافہ کر کے بریسٹ کی نشوونما مکمل کرتی ہے

بریسٹ کی مری کو دور کرنے کی نئی لاتی ہے۔ بریسٹ کو مکمل اور خوبصورت بناتی ہے۔

Rs.250/=

چہرے کے فاضل بالوں کو ہمیشہ کیلئے ختم کرتی ہے۔

گلیسی یونانی کریم

قیثتی جڑی بوٹیوں کے اجزاء اور صحتیات سے تیار کردہ۔ یہ قدرتی صحتیوں و مہیا سوں کو طبی صاف کر کے رنگ کو را کرتی ہے۔

0321-2022028 **042-7666264**

Cell: 0333-5203553, Website: www.devapk.com

پاکیزہ

ماہنامہ

ستمبر 2010ء عید نبوی کی ایک تحفہ

انجم انصار اور عالیہ بخاری کے سلسلے وار ناول

مادی دنیا کی ضرورتوں سے قطع نظر ایک آواز ہماری صداقت و چائی کو ہمارے سامنے بے نقاب کرتی ہے۔ کچھ اسی تناظر میں قیصرہ حیات کا ناول

ماضی کے آئینے میں جھلکاتے عکس کو وقت کی دیر نہیں بھی منعکس ہونے سے نہیں روک سکتیں..... زندگی کے نشیب و فراز میں اپنی منزل کو ڈھونڈتی لڑکی کی کہانی **ذکیہ بلگرامی** کا دلچسپ ناول

زندگی اک ہیرے کے مانند ہے جسے خود تراشنا پڑتا ہے۔ **اقبال بانو** کے کچھ ایسے ہی کرداروں کی تلاش ڈھونڈو

محبت انسان کی زندگی میں لمحہ بہ لمحہ تبدیلیاں لاتی ہے۔ انہی تبدیلیوں کے ساتھ **غزالہ فرح** کا دلچسپ ناول

عید کی خوشیاں اور رنگارنگی شائستہ زبیر کا دلچسپ ناول

شیریں حیدر، صائمہ اکرم، عائشہ خان، نزہت جبین ضیا، ناہیدہ فاطمہ حسنین، آصفہ شفیق، عقیلہ حق، سائرہ رضا

اور عالیہ حرا کی یادگار تحریروں

آپ کی آواز کا رشتہ سے مستقل سلسلے

کیا آپ نے اس ماہ کا پاکیزہ پڑھا؟ نہیں! اکمال ہے!

رہی تھیں۔

”کبھی... کوئی نہیں... ہائے۔“ ”نو جوان بلبل گیا تھا۔ ڈیرک نے اس کا پیٹ سوجن والی جگہ سے دبایا تھا۔“ پلیز میری مدد کرو... ورنہ میں مر جاؤں گا۔“

ڈیرک نو جوان کی بات سے متفق تھا۔ وہ موت کے قریب تھا۔ ڈیرک سیدھا ہو گیا۔ اس نے نو جوان سے کہا۔ ”انتظار کرو میں ابھی آتا ہوں۔“

وہ اوپر آیا اور اس نے راہداری میں ایک طرف لنگی برساتی پہن لی۔ اسے باہر جانا تھا۔ برساتی کا ہڈ اچھی طرح

سر پر کر کے اس نے جیسے ہی دروازہ کھولا باہر سے تند ہوا کے ساتھ پانی کی بوجھاڑ بھی آئی تھی۔ وہ ہوا سے لڑتا ہوا اپنی کار

تک آیا۔ اس کا چریک بیک فرنٹ سیٹ پر رکھا تھا۔ اسے نکال کر ڈیرک واپس آنے لگا۔ دوسری گاڑی کے پاس سے گزرتے ہوئے کبھی چنگی تو اسے گاڑی کا دائیں بونٹ کسی

حادثے کے نتیجے میں پچکا ہوا نظر آیا تھا۔ وہ رک گیا پھر اس نے ٹارچ نکال کر اس کی روشنی میں بونٹ کا معائنہ کیا اور اس کا ٹک

کالک یقین میں بدل گیا تھا۔ یہ وہی گاڑی تھی جس نے اس کی کار کو بچنے سے نکر ماری تھی۔ یہ اسی لڑکی کا گھر تھا۔ وہ چری

بیک لے کر اندر آیا۔ اتنی دیر میں ہواؤں نے راہداری میں تباہی مچادی تھی۔ بڑی مشکل سے اس نے دروازہ اندر سے

بند کیا اور خانے کی سیڑھیاں اتر کر کھینچے آیا۔ جہاں نو جوان کبھی کی سی کیفیت میں تھا۔

اس نے فور سے نو جوان کو دیکھا اور اب اسے معلوم ہو گیا کہ وہ اسے جانتا ہے۔ پچھلے دنوں لگ رہا تھا۔ وہ یقیناً اس

عورت کا بھائی تھا۔ کیونکہ اس کے خدوخال میں اس سے مشابہت آ رہی تھی۔ عورت نے ایک تو اس کی کار کو نگر ماری تھی

اور پھر اس کو بھی ضرب لگا کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اس کی ضرب کا سوچ کر ڈیرک کو پھر غصہ آنے لگا تھا۔

اس نے بیک سیٹ پر رکھا اور اسے کھول کر اس میں سے اپنا آزمودہ چاقو نکال لیا۔ نو جوان کی آنکھوں میں چاقو دیکھ کر خوف اتر آیا تھا اور جب وہ اس کی طرف بڑھا تو وہ بے ساختہ

☆☆☆

وہ دو چھٹی میں دبکی ہوئی خوف سے کانپ رہی تھی۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ خوف ناک شخص اس کا چچا کرتا

ہو یا یہاں تک آجائے گا۔ آج کا دن اس کے لیے بہت برا ثابت ہوا تھا۔ لاریل کی طبیعت دو پہر سے خراب تھی لیکن اس نے اس پر اتنی توجہ نہیں دی تھی۔ اس کا شبہ تھا کہ اسے میسر

سردی نہیں لگ رہی تھی۔ کافی پی کر وہ راہداری میں آیا۔ میٹر جیوں کے نیچے سے خانے کے دروازے کے پاس سے گزرتے ہوئے اسے اندر سے کوئی آواز آئی تو وہ ٹھٹک گیا۔ وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ جو آواز آئی تھی وہ چچ کوئی آواز تھی یا اس کا وہم تھا۔ وہ کچھ دیر تک دروازے کے پاس کان لگائے کھڑا رہا تھا اور جب آواز نہیں آئی تو وہاں سے جانے لگا کہ اسی لمحے آواز دوبارہ آئی۔ اس بار اس نے واضح طور پر سنا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی انسان شدید درد سے کرا رہا ہو۔ ڈیرک نے دروازہ کھولا۔

”اندرون ہے؟“

جواب میں پھر کراہ سنا دی تھی۔ وہ جو بھی تھا یقیناً کسی بڑی تکلیف میں تھا۔ دروازہ اندر سے بند نہیں تھا بلکہ

یہ چابی سے لاک ہونے والا دروازہ تھا۔ ڈیرک نے دو تین بار آواز دی۔ پھر اس نے لیور سے کام لیا۔ یہ خانے کا

دروازہ کمزور سا تھا جو چند ضربوں میں جواب دے گیا۔ ڈیرک کا اندازہ درست نکلا۔ دروازہ لاک تھا اس میں

صرف پینٹل تھا اندر باہر کوئی کنڈی نہیں تھی۔ دروازہ کھل جانے کے بعد وہ میڑھیاں اتر کر نیچے آیا۔ ذرا نیچے آنے پر

اسے وہاں ہلکی سی روشنی محسوس ہوئی تھی۔ اس نے ٹارچ بند کر دی۔

”کوئی ہے؟“ اس نے آہستہ سے آواز دی۔ ”پلیز میری مدد کرو۔“ ایک مردانہ آواز نے کہا۔

ڈیرک میڑھیاں اتر کر نیچے آ گیا۔ یہ ایک چھوٹا سا خانہ تھا جہاں ایک طرف صوفے پر ایک نو جوان ٹھٹھا سا پڑا

تھا۔ صوفے کے آس پاس کا پورا فرش الٹیوں سے بھرا ہوا تھا اور نو جوان سرد موسم میں بھی پیسے میں شرابو رہا تھا۔ وہاں دیوار

پر ایک امیر جیسی لائٹ لگی تھی۔ ڈیرک الٹیوں سے جوتا بچاتا نو جوان کے پاس آیا۔ اس نے نو جوان کو دیکھا تو اسے عجب

سا احساس ہوا جیسے اس نے نو جوان کو پہلے بھی دیکھا ہو لیکن کہاں..... یہ اسے یاد نہیں آ رہا تھا۔ وہ مشکل سے چھپیں برس کا تھا۔

”کون ہو تم کیا ہوا ہے تمہیں؟“

”میرے..... پیٹ میں..... درد ہے۔“ ”نو جوان نے رک رک کر کہا۔

ڈیرک نے اس کی شرٹ اوپر کی اور اس نے فوراً ہی نو جوان کا پیچے سے پھولا پیٹ دیکھ لیا تھا۔ ”یہاں اور کون ہے

اوپر کی دونوں منزلیں خالی پڑی ہیں؟“ اس نے نو جوان سے پوچھا اس دوران میں اس کی انگلیاں نو جوان کا پیٹ ٹول

گیا تھا۔ جب دونوں منزلوں میں کوئی نہیں تھا تو پھر اس گھر کے افراد کہاں گئے تھے۔ کسادہ جرائم پیشہ تھے اور اس کی اس طرح آمد سے پریشان ہو کر کہیں چھپ گئے تھے اور شاید ان کے عزائم بھی اس کے بارے میں اچھے نہیں تھے۔ ایک لمحے کو اسے خیال آیا کہ وہ اس جگہ سے نکل جائے مگر جب اسے طوفان اور بارش یاد آئی تو اس نے خیال جھٹک دیا۔ اس موسم میں باہر جانا مناسب نہیں تھا۔ اب ایک جگہ بانی تھی جہاں کوئی ہوسکتا تھا اور وہ بھی دو چھٹی۔

خلائی کے دوران میں اس نے جہاں تک مکان اور اس کی چیزیں دیکھی تھیں۔ اسے یہ عام سا گھر لگا تھا۔ یہاں نہ تو اسلحہ

تھا اور نہ ہی کوئی اور ایسی جگہوں کو دیکھا جہاں اسلحہ ہوسکتا تھا لیکن وہاں چچ اسلحہ نہیں تھا۔ آخر اس نے دو چھٹی پر جانے

کا فیصلہ کر لیا۔ وہ ایک ہاتھ میں لیور اور دوسرے میں ٹارچ تھا مگر میڑھیاں چڑھنے لگی۔ میڑھیاں زیادہ مشکل نہیں تھیں اور وہ بٹا کسی آہٹ کے دو چھٹی کے فرش کھلنے والے

دروازے تک پہنچ گیا۔ اس نے آہستہ سے ہاتھ رکھ کر دباؤ ڈالا تو تختہ اندر

سے بند نکلا۔ اندر کوئی تھا اور اس نے تختے کی کنڈی لگا رکھی تھی۔ گویا اس گھر میں جو بھی تھا وہ اسی دو چھٹی میں تھا۔ ڈیرک

کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کی آمد پر اس طرح دو چھٹی میں جا چھپے کا کیا جواز ہوسکتا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اوپر کتنے

لوگ تھے اور وہ مسلح تھے یا نہیں تھے۔ وہ ان کو چھپنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اس لیے اس نے واپس جانے کا فیصلہ

کیا اور دو چھٹی کے تختے کے نیچے لگی کنڈی کو بند کر دیا۔ گویا اب اوپر سے کوئی نیچے نہیں آسکتا تھا۔ وہ اسی طرح دبے

قدموں نیچے اتر آیا اور پھر چلی منزل پر آ گیا۔ اسے پاس لگ رہی تھی۔ ملاقات کی لائٹ بند تھی لیکن جن میں رکھے فرنگ میں

سوجو پانی کی بوتل سرد تھی۔ پانی کی نالی اس نے ٹارچ کی روشنی میں چن کر معائنہ کیا۔ وہاں کھانے پینے کے لیے بہت کچھ تھا

لیکن اس کا کچھ کھانے کا مواد نہیں ہو رہا تھا۔ وہ یہاں بس اتنی دیر رکنا چاہتا تھا کہ بارش ہلکی ہو جائے۔

باہر بارش کا شور ویسے ہی جاری تھا۔ پانی پانی کر اس نے اپنا کوٹ اتار دیا۔ اس کے کپڑے کسی قدر خشک ہو چکے

تھے۔ اس نے چوبے پر کانی کے لیے پانی رکھ دیا اور پھر کانی تلاش کی۔ وہ اسے سامنے ایک کینٹ میں مل گئی، ساتھ میں

شکر اور کریم بھی تھی۔ مگر اس نے صرف کانی لی۔ گرم کانی نے اسے گرم کر دیا تھا اور اب اسے ہیکے کپڑوں کے باوجود اتنی

خاصی دیر بعد وہ چنگی اور اس کی چھٹی سس نے بتایا کہ وہ شخص اب یہاں نہیں ہے۔ شاید وہ نیچے جا چکا تھا۔ لیکن وہ اسے چھوڑ کر نیچے کیوں گیا تھا۔ رینا نے بہت آہستگی سے تختے کی کنڈی کھسکائی اور بہت ہی آہستہ سے تختہ اٹھانے کی کوشش کی تو انکشاف ہوا کہ اس شخص نے تختے کی باہر والی کنڈی لگا دی تھی۔ اس لیے اسے لاریل کا خیال آیا اور وہ تڑپ اٹھی۔ کرخت صورت والا اسے یہاں بند کر کے پہلے لاریل سے غصے کیا تھا۔ اس کے بعد اگر وہ آرام سے اس کے ساتھ جو جاے کر سکتا تھا۔ اس ویران جگہ پر ان کی فریاد سننے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ ان کا قریب ترین پرہی بھی کوئی نصف میل کے فاصلے پر ہوتا تھا۔

رینا نے تارچ جلائی اور دو چھتی میں کوئی ایسی چیز تلاش کرنے لگی جس سے تختے کے باہر لگی کنڈی کھولی یا توڑی جاسکے۔ لیکن دو چھتی کے کھاڑ خانے میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔ دھات کی چند چیزیں بھی تھیں لیکن وہ ہلکی اور ساخت میں ایسی تھیں کہ ان سے تختے پر ضرب نہیں لگائی جا سکتی تھی۔

اچانک اسے خیال آیا کہ تختہ اور نیچے لگی کنڈی معمولی سی تھی اور وہ اس پر چڑھ کر اچھٹی تو اس کا امکان تھا کہ تختہ یا کنڈی ٹوٹ جائے۔ اس نے تختے پر چڑھ کر اس کا تجربہ کیا۔ اس کے وزن سے تختہ دبے اور چرچا لگا۔ وہ اچھٹی تو تختہ اس طرح دبا کہ وہ ڈر کر اتر گئی۔ اگر تختہ ٹوٹ جاتا تو وہ نیچے جا گرتی۔ وہ ایک طرف کھڑی ہو کر تختے پر پاؤں مارنے لگی مگر اس طرح تختہ ہلا بھی نہیں تھا۔ اسے توڑنے کے لیے بوجھ لازمی تھا۔ مجبوراً وہ تختے پر کھڑے ہو کر اچھٹے لگی۔ یہ کوشش جلد رنگ لائی اور تختہ کنڈی سے ڈھیلا ہو کر جھولنے لگا۔ جب وہ ٹوٹنے کے قریب ہو گیا تو رینا ایک طرف ہو کر اسے پاؤں سے مار کر کھولنے کی کوشش کرنے لگی۔ ایک بار اس نے زیادہ ہی زور سے پاؤں مارا تو تختہ یک دم کھل گیا۔ اس کے حلق سے چیخ نکلی اور اگر اس نے لکڑی کی بنی کا سہارا نہ لے رکھا ہوتا تو وہ نیچے جا گرتی۔

سنبھل کر وہ نیچے آئی۔ اس نے تارچ اٹھالی لیکن اسے روشن نہیں کیا تھا۔ یہ اس کا گھر تھا اور اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ کون سی چیز کہاں ہے۔ وہ تاریکی میں نیچے آئی۔ کچھ دیر سن گئی رہی۔ نیچے آنے کے بعد اس کا دل بری طرح دھڑکنے لگا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ شخص یہیں نہیں چھپا ہے اور ابھی تاریکی سے نکل اسے دیوچ لگے گا۔ لیکن کچھ دیر تک اوپر والی منزل پر پھرنے کے بعد اسے یقین ہو گیا کہ وہ

یہاں نہیں ہے۔

رینا دبے قدموں نیچے آئی۔ یہاں بھی سنا تھا۔ پھر بجلی چمکی تو اس نے نہ خانے کا کھلا دروازہ دیکھ لیا۔ اس کا دل ایک لمحے کو رک گیا۔ اس شخص نے اس کے بھائی کو تلاش کر لیا تھا اور نہ جانے اس کے ساتھ کیا سلوک کرنے والا تھا۔ رینا نے کچن میں جا کر پہلے ہتھیار کے طور پر ایک تیز چاقو اٹھا لیکن جب اس نے سوچا کہ کیا وہ یہ چاقو کسی انسان کے جسم میں اتار سکے گی تو یہ سوچ کر اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے۔ اس نے چاقو رکھ دیا اور اسٹیل کا ایک وزنی کٹگیر اٹھا لیا۔

وہ نہ خانے تک آئی تو اسے نیچے روشنی کا احساس ہوا۔ اسے یاد آیا کہ نیچے ایک ایمر جی لائٹ تھی اور یہ ایسی کی روشنی تھی۔ وہ پیرھیوں سے سنبھل کر اترنے لگی۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ وہ شخص نہ خانے میں موجود ہے اور وہ کوئی آہٹ پیدا کر کے اسے چونکا نہیں چاہتی تھی۔ وہ بہت آہستہ سے نیچے آئی۔ کٹگیر اس نے حملے کے انداز میں اٹھا رکھی تھی۔ جب نہ خانہ اس کی نظروں میں آیا تو اس نے لاریل کو کوسونے پر آنکھیں بند کیے ساکت پڑے دیکھا اور اس کے پیٹ والے حصے پر خون ہی خون پھیلا ہوا تھا۔ اس کی شرٹ اور پتلون پر بھی خون لگ گیا تھا اور صوف بھی کسی قدر خون آلودہ ہو رہا تھا۔ رینا نے بڑی مشکل سے اپنی چیخ ضبط کی تھی۔

پھر اس نے کرخت صورت والے کو دیکھا جو ایک طرف ایک چھوٹا سا چاقو صاف کر رہا تھا اور اس پر خون لگا ہوا تھا۔ بات صاف تھی اس درندے نے اس کے بھائی کو چاقو سے قتل کر دیا تھا۔ حالانکہ لاریل نے اس کا کچھ نہیں لگا ڈا تھا۔ رینا پاگل ہونے لگی۔ اس دنیا میں اس کا ایک ہی تورشتہ دار تھا اور اس ظالم نے اسے بھی چھین لیا تھا۔ جوش انتقام میں وہ کرخت صورت والے کی طرف چھٹی اور اس سے پہلے کہ وہ ہوشیار ہوتا رینا نے کٹگیر گھا کر اس کے سر پر دے مارا۔ اس ضرب میں اس نے ساری قوت سودی تھی۔ اس لیے ڈیرک سر پر ضرب لگنے ہی بے ہوش ہو کر نیچے گر پڑا تھا۔ رینا نے اسے جھک کر دیکھا اور بے ہوش پا کر نفرت سے اس کے منہ پر تھوک دیا۔

”ذلیل شخص۔“

اس وار نے رینا کے دل کی آگ بدم تو کر دی تھی لیکن بھائی نہیں تھی۔ اس شخص نے اس کے بھائی کو مارا تھا۔ اس لیے انصاف کا تقاضا تھا کہ وہ بھی اسے مار دے۔ اس نے کٹگیر بلند کی اور اس بار وہ کھڑا ہوا وار کرنے جا رہی تھی

لیکن اس سے پہلے کہ وہ وار کرتی اسے لاریل کی ٹھٹھی سی آواز آئی۔

”رینا رک جاؤ۔۔۔ تم نے یہ کیا کیا؟“

☆☆☆

سر پر گتے والی ضرب نے ڈیرک کے چاروں طبق روشن کر دیے تھے۔ وہ فوراً ہی بے ہوش ہو گیا تھا۔ اسے یہ جاننے کا موقع بھی نہیں ملا کہ یہ بلائے ناگہانی اس پر کہاں سے نازل ہوئی تھی۔ وہ شاید تین چار گھنٹے بے ہوش رہا تھا۔ کیونکہ جب اس کی آنکھ کھلی تو بارش کا شور بدستور جاری تھا اور ابھی رات ہو رہی تھی۔ البتہ یہ تھا کہ وہ ایک صاف سترے بستر پر لیٹا ہوا تھا اور اس کے سر پر پٹی بندھی تھی۔ سر میں درد بھی کم تھا۔ وہ کراہ رہا تھا۔ اس کمرے میں وہ اکیلا ہی تھا اور شاید اسے یہاں بند کر دیا گیا تھا لیکن جب اس نے دروازہ چیک کیا تو اسے کھلا پایا۔ وہ قید نہیں تھا۔

وہ باہر جانے کا سوچ رہا تھا کہ دروازہ کھلا اور رینا اندر آگئی۔ اسے دروازے کے سامنے دیکھ کر وہ کسی قدر یوگلا گئی تھی۔ اس کے خیال میں وہ ابھی تک بے ہوش تھا۔ رینا نے بڑی بے رحمی سے اس کے سر پر وار کیا تھا اور گر لاریل اسے نہ روکتا تو وہ اسے ماری دیتی۔ اب وہ شرمندہ تھی۔ اس نے عداوت سے کہا۔

”سواری میں نے تمہارے ساتھ بہت غلط کیا۔“

”او تو تو یہ تم میں۔“ ڈیرک نے گہری سانس لی۔ ”میں بھی سوچ رہا تھا کہ یہ آفت اچانک کہاں سے نازل ہوئی۔“

رینا اسے نشست گاہ میں لے آئی اور پھر اس کے لیے کافی بنا کر لائی۔ ”اب تمہارا سر کا درد کیسا ہے؟۔۔۔ میں نے زیادہ ہی زور سے وار کر دیا تھا۔“

”ہاں وار تو تخت تھا لیکن درد اتنا نہیں ہے۔“

کافی نے رسی کی تکلیف بھی کم کر دی تھی اور اب وہ محسوس بھی نہیں کر رہا تھا۔ جب تک وہ کافی لیٹا رہا، رینا نے اسے بتایا کہ اسے کیا غلط بھی ہوئی تھی۔ وہ ہنسا۔ ”تم سمجھ رہی تھیں کہ میں نے تمہارے بھائی کو قتل کر دیا ہے؟“

رینا نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”اس وقت میں یہی سمجھی تھی کہ تم نے لاریل کو میرے انتقام میں قتل کر دیا ہے۔“

حالانکہ میں نے تو اس کی جان بچائی تھی۔ یقین کرو اگر میں ایک دو منٹ اور اس کا آپریشن نہ کرتا تو اس کا اپنڈکس پھٹ جاتا اور اب تک وہ مر چکا ہوتا۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ رینا نے سر ہلایا۔ ”جب لاریل نے مجھے روکا جب اس نے بتایا تھا کہ تم نے اس کے ساتھ کیا

کیا ہے۔“

”تمہارے بھائی کی خوش قسمتی ہے کہ میں سرجن ہوں اور اتفاق سے یہاں آگیا۔“

رینا نے اسے تعجب سے دیکھا۔ ”تو تم میرا تعاقب کرتے ہوئے نہیں آئے تھے؟“

”نہیں مجھے تمہارا تعاقب کرنے کی کیا ضرورت تھی اور میں تو طوفان سے پناہ لینے کے لیے یہاں آیا تھا۔“

رینا پھر شرمندہ ہو گئی۔ ”میں بھی کہ تم مجھ سے انتقام لینے کے لیے یہاں آئے ہو اور اسی وجہ سے میں نے لاریل کو نہ خانے میں چھپا دیا اور خود دو چھتی میں چھپ گئی تھی۔“

”ایسا نیچے کی وجہ؟“

رینا نے ہچکچا کر جواب دیا۔ ”وہ تم شکل سے بالکل بھی کوئی ڈاکٹر سرجن نظر نہیں آتے ہو۔“

ڈیرک نے گہری سانس لی۔ ”میں اپنی اس صورت کا کیا کروں اس کی وجہ سے مجھے لوگ ہمیشہ غلط سمجھتے ہیں۔ خیر چھوڑو اس بات کو لاریل کیسا ہے؟“

”ٹھیک ہے۔۔۔ میں نے تمہارے بیک سے نیند کا انجکشن نکال کر اسے لگا دیا تھا۔“

”وہ ٹھیک ہو جائے گا۔۔۔ لیکن کل اسے اسپتال لے جا کر اس کے زخم کی صفائی ضرور کرنی ہے۔“

”تو کیا تم طے جاؤ گے؟“

”ہاں صبح مجھے ایک اہم آپریشن میں حصہ لینا ہے۔“ ڈیرک نے اسے بتایا۔ ”یہاں سے کوئی دوسری دور ایک شہر میں۔“

”اس موسم میں تم اتنی جلدی وہاں نہیں جا سکتے ہو۔“

رینا بولی۔ ”ویسے بھی صبح ہونے والی ہے۔“

پھر صبح رہے تھے اور آپریشن کا آغاز دس بجے ہوتا تھا۔ وہ واقعی اتنی جلدی نہیں جا سکتا تھا۔ رینا اسے فوراً دیکھ رہی تھی۔ اس نے التجا آمیز لہجے میں کہا۔ ”پلیز رک جاؤ ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“

ڈیرک نے سوچا کہ واقعی ان لوگوں کو اس کی مدد کی زیادہ ضرورت ہے آپریشن تو اس کے بغیر بھی ہو سکتا تھا۔ پھر یہاں رینا جیسی حسین عورت بھی تھی اس نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور اس اثبات میں ہلادیا۔

”او کے میں رک رہا ہوں۔“

اس کی بات سن کر رینا کے چہرے پر جو روشنی آئی تھی اس نے ڈیرک کی سونی زندگی میں دینی اجالا کر دیا تھا۔





روشنی

ڈاکٹر ساجد امجد

تہ درتہ شخصیت کا حامل انسان..... بعض اوقات خود کو بھی سمجھ نہیں پاتا کہ وہ آخر چاہتا کیا ہے..... اور پھر حیوان ناطق ہونے کے باعث مٹی کا یہ پتلا زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر بس اچانک ہی حیوانیت کا مظاہرہ بھی کر ڈالتا ہے۔ جس کے بعد تمام عمر اپنے اس روپ پر پردے ڈالنے کی کوشش میں بے شمار خوبصورت لمحات کو..... اندیشوں کی آگ میں جلا دیتا ہے..... وہ بھی بڑے ستھرے انداز میں زندگی کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے تھا مگر پھر..... اچانک ایک طوفانی لہر نے اس کی زندگی کو تہہ بالا کر ڈالا، اور اب وہ زندگی کے اس مقام پر تنہا کھڑا تھا جہاں کئی تاریک لمحات بیتے دنوں کے نوحے سننا رہے تھے..... جہاں محبت وحشتوں کے درمیان لہولہان ہانپ رہی تھی اور..... ایسا تو ایک دن ہونا ہی تھا کہ قدرت نے کب اپنے باغیوں کو معاف کیا ہے۔

تیرگی کی جانب محسوس روشنی کی چراگاہ دینے والی تحریکیں روزگار

وہ اگر اس اسٹیشن پر غور نہ کرتی ہوتی تو اسے یقین ہی نہ آتا کہ ٹرین یہاں رک بھی سکتی ہے اور انہیں اتار کر آگے جا بھی سکتی ہے۔ چاروں طرف پہاڑ کھڑے تھے۔ پلیٹ فارم پر کلوی کی دو پچیس پڑی تھیں۔ دور ایک بوڑھا آدمی جالی ہوئی ٹرین کو ہری جھنڈی دکھا رہا تھا اور ٹرین اس کے دیکھتے ہی دیکھتے ایک پہاڑی سرنگ میں غائب ہو گئی تھی۔

”تم تو کہہ رہے تھے وہ بڑا پر فضا مقام ہے جہاں تم مجھے لے جا رہے ہو۔“ اس عورت نے اپنے شوہر سے کہا۔
”ابھی تو تم اسٹیشن پر اتری ہو۔ قصبے میں جا کر دیکھو گی تو خود کہو گی، کیا پر فضا جگہ ہے۔“

”یہاں انسان بستے ہیں یا ہم پہلے ہیں جو یہاں آئے ہیں؟“

”کیسی باتیں کرتی ہو، لاکھ بڑھلا لاکھ آبادی کا شہر ہے۔“
”میں تو یہ سوچ رہی ہوں، اتنی بڑی ٹرین کیا صرف ہمیں اتارنے یہاں تک آئی تھی اور اگر بھی جاتا پڑا تو لینے بھی آئے گی یا نہیں۔“

”مذاق چھوڑو، تم سامان کے پاس بیٹھو، میں کسی آدمی کو دیکھتا ہوں جو ہمیں ہستی تک پہنچا دے یا کوئی سواری مل جائے۔ فراز کا خیال رکھنا۔ یہ ادھر ادھر نہ ہو جائے۔“

”ماں یہاں بہت بیٹھ رہے تھے تو مجھ کو ہوائے گا۔ ریل کی پٹری پر پھیل رہا ہے، آپ ہی آجائے گا۔ آپ جائیں اور کسی سواری کا بندوبست کریں، مجھے تو یہاں ہول اٹھ رہے ہیں۔“
”اسے ریل کی پٹری سے بلاؤ، کوئی ٹرین آئی تو؟ پچھ ہی تو ہے۔“

”بلا لوں گی ایازہ، تم تو جاؤ، کس مصیبت میں پھنس گئی۔“

ایازہ کی عمر تیس بیس سال ہو گی، وہ یہاں سے پینتالیس سال پہلے دور ایک شہر کیلاش پور میں اسکول ماسٹر تھا، مگر بڑی آمدنی تھی اور اسے آمدنی بڑھانے کی فکر ہر وقت لگی رہتی تھی۔ شہر میں قابل استادوں کی کمی تھی لہذا اسے ٹیوشن بھی زیادہ نہیں ملتی تھی۔ انہی دنوں اسے معلوم ہوا کہ ”قصبہ پہاڑی“ میں حکومت نے ایک شاندار ہائی اسکول قائم کیا ہے۔ پرکشش تنخواہیں دے کر اساتذہ کو اس اسکول میں پڑھانے پر آمادہ کیا جا رہا ہے۔ رہائش مفت ہے۔ وہ خوش ہو گیا۔ اس نے سوچا، مکان کا کرایہ دینے سے بھی بچ جائے گا جو اس چھوٹی تنخواہ میں اسے دینا پڑ رہا تھا۔ تنخواہ بھی تقریباً دو گنی ہو جائے گی۔ چھوٹا سا قصبہ ہے وہاں اخراجات بھی کم ہوں گے۔ پوری تنخواہ صاف بچ جائے گی۔ اس نے پہلی فرصت

میں مجھے کو در خواست دے دی کہ وہ قصبہ پہاڑی جانے کے لیے خود کو پیش کرنے کا خواہش مند ہے۔ ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا کہ اس کی درخواست قبول ہو گئی۔

اس کی بیوی عمرانہ کو اب تک کچھ معلوم نہیں تھا۔ ایازہ ہر کی باتیں گھر میں بتانے کا قائل بھی نہیں تھا لیکن اب تو بتانا لازمی تھا۔ اس نے نہ صرف یہ خبر سنا لی بلکہ شہر سے سنا۔ اس نے بیوی کا مطالبہ پورا کر دیا تھا۔ وہ ہمیشہ سستی رہتی تھی کہ یہاں پڑے رہو گے تو بھی ترقی نہیں کرو گے۔ دنیا بہت بڑی ہے۔ یہاں سے نکلو، ہاتھ پاؤں مارو۔ مکان تک تو اپنا ہے نہیں۔ کم از کم مکان ہی اپنا کرو۔ عمرانہ نے بھی اس خبر کو بڑے اشتیاق سے سنا لیکن فوراً ہی اداس بھی ہو گئی۔ ایک تو اس لیے کہ اس کا شوہر اسے جہاں لے جا رہا تھا، وہ کوئی بڑا شہر نہیں تھا۔ ”قصبہ پہاڑی“ کا وہ نام ہی پہلی مرتبہ سن رہی تھی اور دوسرے اس لیے کہ اس کے بچے کے جو دو چار گھر تھے وہ چھوٹے رہے تھے۔ ماں باپ تو دنیا میں تھے ہی نہیں جو دو چار رشتہ دار تھے۔ ان سے بھی دور جانا پڑ رہا تھا۔ اس کی اداسی اپنی جگہ لیکن اس کا شوہر اسے جہاں لے جا رہا تھا اسے جانا تو تھا۔ ایازہ نے اسے راضی کرنے کے لیے اس قصبے کی تصویر کشی اس طرح کی کہ اس کی اداسی خوشی میں بدل گئی۔

”چھوٹی سی جگہ ہے لیکن ایسا حسین جیسے جنت کا کھڑا زمین پر اتار آیا ہو۔ شام کے وقت صاف ستری سڑکیں پر لوگ تفریح کے لیے اس طرح نکلتے ہیں جیسے پھولوں نے اپنا چمکنا شروع کر دیا ہو۔ مل کھائی سڑکیں اپنے سفریوں کو پہاڑوں پر لے کر جاتی ہیں اور پھر چکر کاٹ کر پیچھے اتر آتی ہیں۔ سڑکوں کی دونوں جانب سرد کے درخت ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے کھڑے رہتے ہیں۔ رات آتی ہے تو پورے قصبے پر کچھو کچھو کر دیتے ہیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے آسمان آتش بازی کے انبار چھوڑ رہا ہو۔ وہاں بسنے پھول ہیں کہ کتنی خوشبو ہر وقت پھیلی رہتی ہے۔ تم نے بھی پہاڑ پر چڑھنے کی کوشش کی ہے؟“

”میں نے تو پہاڑ بس فلموں میں دیکھے ہیں۔ چڑھتی کہاں سے۔“

”وہاں میں تمہیں پہاڑ کے اوپر لے کر جاؤں گا۔ اوپر سے دیکھنا پوری دنیا نظر آئے گی اور ہمارا بیٹا پہاڑی لڑکیوں کے ساتھ کھیلے گا۔“

”آپ نے تو ایسا نقشہ کھینچ دیا ہے کہ جی چاہتا ہے کل ہی چلی جاؤں۔“

”کل ہی سمجھو چار دن بعد تو چلے ہی جاتا ہے۔ میں نے مالک مکان سے کہہ دیا ہے۔ بھاری سامان سب بچ رہا

ہوں وہاں جا کر نیا خرید لیں گے۔ بس تم کپڑے اور تھوڑے سے برتن وغیرہ سمیٹ لو۔ میری کمائیاں ہیں وہ بھی ساتھ جائیں گی۔“

”فراز کبھی ریل میں نہیں بیٹھا۔ وہ بھی خوش ہو جائے گا۔“ عمرانہ نے کہا۔

عمرانہ ایسے ہی کئی رنگوں کے خواب لے کر یہاں آئی تھی اور اب سنا سن پلٹ فارم پر اس طرح سامان کے پاس بیٹھی تھی جیسے مالک مکان نے سامان باہر پھینک کر دروازہ بند کر لیا ہو۔ اس کا بیٹا فراز ابھی تک ٹرین کی پٹری پر کھڑا پتھر اچھال رہا تھا۔

عمرانہ نے دیکھا کہ وہی بوڑھا آدمی جو کچھ دیر پہلے ٹرین کو ہری جھنڈی دکھا رہا تھا، اس کی طرف آرہا ہے۔ وہ سمجھتی تھی کہ یہ آدمی ریلوے کا ملازم ہے اور پھر بوڑھا بھی ہے۔ اس کے باپ کی جگہ ہے لیکن پھر بھی وہ خوف زدہ ہو گئی اور گھبرا کر فراز کو آواز دینے لگی۔

”بیٹی، کیا بات ہے۔ اکیلی آئی ہو تمہارے ساتھ کوئی مر نہیں ہے؟“

”ہے۔ ہے کیوں نہیں۔ میں اپنے شوہر کے ساتھ آئی ہوں۔ وہ سواری کا بندوبست کرنے گئے ہیں۔“

”اور یہ کچھ؟“
”میرا بیٹا ہے۔ دروازہ اٹکی ہے، اس وقت بھی دیکھیے پتھر اچھال رہا ہے۔“ اس نے کہا اور فراز کو ایک مرتبہ پھر آواز دینے لگی۔

”اسے واپس بلا لیجئے اور اپنے پاس بٹھائیے۔ میں اسی کو دیکھ کر آیا ہوں۔ ابھی ٹرین آنے والی ہے۔“

”کوئی اور ٹرین بھی آئی ہے یہاں؟“

”چوبیس گھنٹوں میں دو ٹرینیں آتی ہیں۔ ایک وہ جو آپ کو چھوڑ کر گئی ہے دوسری وہ جو یہاں کے مسافروں کو لے کر جائے گی۔“

”یہاں تو کوئی مسافر ہے ہی نہیں۔“

”مسافر ہونہ ہو ٹرین کو تو آتا ہے۔ ایک منٹ کے لیے ٹھہرے گی پھر آگے بڑھ جائے گی کیلاش پور جانے کے لیے۔ آپ نے اپنے بچے کو نہیں بلایا مگر میں آنے والی ہے۔“

”وہ میرے کہنے سے نہیں آئے گا۔ ذرا آپ اسے ڈانٹ کر میرے پاس بھیج دیں۔“ عمرانہ نے کہا لیکن اس کی نوبت نہیں آئی، اسے ایازہ اتار کھائی دیا۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا جو یقیناً سامان اٹھانے اس کے ساتھ آیا تھا۔

فراز نے بھی باپ کو آتے ہوئے دیکھ لیا تھا لہذا وہ بھی دوڑتا

ہوا آ گیا۔

مزدور نے سامان اٹھایا اور آگے بڑھ گیا۔ ایازہ اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ عمرانہ اور فراز چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے پیچھے چلے رہے تھے۔ یہ بہت چھوٹا پلیٹ فارم تھا۔ چند قدم چل کر ہی اسٹیشن سے باہر نکلے گا دروازہ آگیا تھا جہاں ایک آدمی دروازے سے باہر جانے والوں سے ٹکٹ طلب کر رہا تھا۔ اسٹیشن سے نکلتے ہی تاکہ تیار کھڑا تھا۔ مزدور نے سامان تاکنے پر رکھ دیا۔ اس سامان کے درمیان جگہ بنا کر عمرانہ کو بٹھا دیا گیا۔ ایازہ اور فراز آگے تاکنے والے کے پاس بیٹھ گئے۔ تاکہ کچھ دیر کھلی سڑک پر چلتا رہا پھر دو پہاڑوں کے درمیان ایک دروازہ سا بنا ہوا تھا، تاکہ اس دروازے میں داخل ہوا۔ یہ گویا شہر میں داخل ہونے کا دروازہ تھا کیونکہ اب تاکہ ایک بازار سے گزر رہا تھا۔ یہ دیا بازار نہیں تھا جیسا وہ کیلاش پور میں دیکھ چکی تھی۔ کچھ کمین نما دکائیں تھیں، بہت سے ٹھیلے والے کھڑے تھے جن پر تازہ سبزیاں، پھلیاں اور مختلف قسم کا سامان فروخت ہو رہا تھا۔ چلتے پھرتے گاؤں کے لباس اور وضع قطع اس سے مختلف تھی جو وہ کیلاش پور میں دیکھتی رہی تھی۔ اسے سب اچھا تو لگ رہا تھا کیونکہ ایک نئی دنیا کا احساس ہو رہا تھا لیکن سوچ رہی تھی کہ ایازہ نے جو نقشہ کھینچا تھا یہ شہر دیکھنا تو نہیں ہے۔ چاروں طرف پہاڑ تو نظر آرہے ہیں لیکن کوئی سڑک پہاڑوں کی طرف جاتی تو نظر نہیں آ رہی ہے۔ پھولوں کی منہک بھی نہیں ہے۔ پھر اس نے سوچا ممکن ہے یہ سب شام کے وقت ہوتا ہو، رات آئے گی تو میں بکنوں کی بیخار بھی دیکھوں گی۔ آسمان کس طرح آتش بازی کے انبار چھوڑتا ہے۔

تاکہ ایک بڑی سی عمارت کے سامنے پہنچ کر رک گیا تھا۔ عمرانہ نے اس پھیلی ہوئی عمارت کو دیکھا اور خوش ہو گئی۔ اللہ نے آخر میری سہیلی۔ ایازہ کو کتنا بڑا گھر ملا ہے۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ تاکنے سے اتر بھی چکی ہوتی لیکن اس وقت تو وہ سامان میں پھنسی بیٹھی تھی۔ سامان اترتا تو وہ اترتی، اتنی دیر میں ایازہ آگے سے کوڑ کچھ اچکا تھا۔

”سامان تو اترو، میں اتروں کیسے؟“

”ابھی تمہیں نہیں اترتا ہے، بیٹھی رہو، میں اندر سے ہو کر آتا ہوں۔ فراز آگے بیٹھنا ہے خیال رکھنا۔“

عمرانہ سے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ یہ کون سا طریقہ ہے۔ نئے گھر میں سب سے پہلے مجھے لے کر جانا چاہیے تھا۔ اماں کبھی مجھ عورت کے قدموں میں برکت ہوتی ہے۔

وہ ایک تکلیف دہ انتظار کر رہی تھی اور تصور ہی تصور

میں اتنی بڑی عمارت کے کمرے گن رہی تھی۔ ہم اچھے کمرے کا کیا کریں گے۔ سامان بھی بہت چاہیے ہوگا۔ میں فکر کیوں کروں ایاز خود انتظام کریں گے۔ میرا کام تو بس یہ ہوگا کہ اچھے بڑے گراؤڈ میں یہ جو چیز پودے لگے ہوئے ہیں ان کی دیکھ بھال کرتی رہوں۔ نہ بابا اتنے بڑے باغیچے کی دیکھ بھال مجھ سے نہیں ہو سکتی۔ میں تو ایاز سے کہوں گی، اس کے لیے کوئی مالی رکھ لے جیسے کیلاش پور میں بڑی کوئی والی نے مالی رکھا ہوا تھا۔ جب ادھر سے گزر دوہتی تھی سے پودے تراش رہا تھا۔ اب میں بھی کوئی والی ہوں۔ ایک چھوڑ دو دو مالی رکھوں گی۔ فراز کو سائیکل دلا دوں گی کیلاش پور میں تو اس لیے نہیں دلائی تھی کہ سڑک پر لے کر نکل جائے گا۔ یہاں تو جگہ ہی جگہ ہے۔ بڑا چھانک بند کرو، پھر نہ کوئی اندر جا سکتا ہے نہ کوئی باہر آ سکتا ہے۔

اس کی نظریں مستقل اس عمارت پر جمی ہوئی تھیں۔ اسے دور سے ایاز آتا دکھائی دیا۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا جو سائیکل لیے پیدل چل رہا تھا۔ ایاز کو ملازمت کی طرف سے نوکر بھی تو ملا ہوگا۔ یہ شاید وہی ہے مگر یہ سائیکل پر کیوں ہے۔ ادبہ مجھے کیا۔ جب آئے گا تو خود ہی پتا چل جائے گا۔

ایاز آیا، اس نے تانگے والے سے کچھ کہا اور تانگا چل پڑا۔ عمران کو کچھ کہنے کا موقع ہی نہ ملا۔ سائیکل والا آدمی اپنی سائیکل پر آگے آگے چل رہا تھا۔ عمران کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ ہوا کیا اور اب ایاز اسے کہاں لے جا رہا ہے۔ ایاز تو بس ایسے ہی ہیں۔ کہہ دیا ہوگا کہ اتنا بڑا گھر لے کر ہم کیا کریں گے۔ میں ہی تو آدمی ہیں۔ شاید اب دوسرا گھر دیکھنے جا رہے ہیں۔ پتا نہیں دوسرا گھر اتنا بڑا ہو کہ نہ ہو۔ چلو میں دو نہیں تو ایک مالی رکھ لوں گی۔

تانگا اب اسی بازار سے گزر رہا تھا جہاں سے وہ ہو کر آئی تھی۔ پھر اس نے دیکھا بازار ختم ہو گیا ہے اور گھروں کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ یہ گھر اسے بڑے اچھے لگے۔ چھوٹے تھے لیکن سب دو منزلہ تھے۔ ہر گھر کے آگے چھوٹا سا گارڈن بھی تھا۔

ان کا تانگا ایک ایسے ہی مکان کے سامنے جا کر رک گیا۔ اس نے دیکھا وہ آدمی جو سائیکل پر تانگے کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا، آدھے قدم سے جھکا ہوا تانے میں چابی لگا رہا ہے۔ تو یہ ہے وہ مکان جہاں ہمیں رہنا ہوگا۔ وہ مکان اچھا خاصا تھا ایاز نے بے کار چھوڑ دیا۔ پوچھوں گی تو ضرور۔

”ہینڈ ماسٹر صاحب نے مجھے بتا دیا تھا کہ آپ آئے

والے ہیں لہذا میں نے کل ہی صفائی وغیرہ کرادی تھی۔ آپ کو کچھ کرنا نہیں پڑے گا۔“ سائیکل والے آدمی نے کہا جو یقیناً اسکول کا چچا ہی تھا۔

”عبدالرحمن مجھے دو چار دن تمہاری ضرورت پڑے گی۔ کیونکہ میں اس قصبے میں بالکل نیا ہوں۔“ ایاز نے ایک نوٹ اس کی منجھی میں رکھتے ہوئے کہا۔

”اس کی کیا ضرورت تھی صاحب۔ میں کل صبح آ جاؤں گا۔ پورا قصبہ گھملاؤں گا۔“

”ہاں کل آ جاؤ۔ کل میری چھٹی ہے، مجھے تو اسکول پر سوں سے جوائن کرنا ہے۔“

تانگے والے نے سامان اٹھا کر اندر پہنچا دیا۔ عمران اور فراز پہلے ہی اندر چلے گئے تھے۔ عمران گھر کا جائزہ لے رہی تھی۔ یہ ایک چھوٹا سا گراؤڈ تھا جس میں دو کمرے بیچھے تھے اور ایک کمرہ اوپر کی منزل پر بنا ہوا تھا۔ عمران کا دل بھگ گیا۔ یہ مکان تقریباً اتنی ہی بڑا تھا جتنا وہ کیلاش پور میں چھوڑ کر آئی تھی البتہ یہ دیکھ کر اس کا دل خوش ہو گیا کہ مکان بالکل نیا ہے اور کمروں میں ضروری فرنیچر بھی موجود ہے۔

ایاز تانگے والے کو گوارا کرنے کے بعد گھر میں آیا تو عمران اس کے سامنے تن کر کھڑی ہوئی۔ ”اتنا بڑا مکان چھوڑ کر یہ چھوٹا سا مکان لے لیا۔“ اس نے تم نے کوئی عقل مندی کی بات کی ہے۔“

”کون سا بڑا مکان۔ کس مکان کی بات کر رہی ہو۔“

”وہی جہاں پہلے تانگا رکھا تھا۔“

”وہ مکان نہیں تھا۔ وہ تو اسکول تھا جہاں مجھے پڑھانا ہے۔“ ایاز نے ہنستے ہوئے کہا۔

”یہی تو میں سوچ رہی تھی۔ تم معمولی سے اسکول منچر جو نہیں اتنا بڑا مکان کیسے لیا۔“

”اللہ کا شکر ادا کرو۔ مکان چھوٹا ہے لیکن یہ دیکھو ہے کتنا شاندار۔ اوپر کا کمرہ میں اپنے لکھنے پڑھنے کے لیے بنا لوں گا۔ ہماری ضرورت کے لیے کافی ہے۔“ اس نے بیوی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے فراز سے پوچھا۔

”ہاں بیٹا، تمہیں یہ گھر کیسا لگا؟“

”ابو بہت اچھا گھر ہے۔ کیلاش پور میں تو اوپر کمرہ بھی نہیں بنا ہوا تھا۔ اس میں کمرہ بھی ہے۔ چھت سے نیچے جھانک تو برابر والوں کا گھر بھی نظر آتا ہے۔ وہاں ایک بڑی پیاری سی بچی ہے۔ اتنی کیوت کہ بس کیا بتاؤں۔ جب ہمیں یہاں رہنے ہوئے بہت دن ہو جائیں گے اور ان لوگوں سے ہماری دوستی ہو جائے گی تو میں اس کے ساتھ کھلیا کروں گا۔“

”بڑی بات، چھت سے کسی کے گھر میں نہیں جھا سکتے۔“ ایاز نے کہا۔ ”دیکھ رہی ہوا ہے صاحب زادے کو۔ ابھی یہ مشکل آٹھ سال کے ہوئے ہیں اور پڑوس میں تا کہ جھانکی شروع کر دی۔“

”بٹاس کا ہے۔“

”تمہارا ہے اور کس کا ہے۔“

”میں سمجھا اس کا ہے جو پڑوس میں تاک جھاٹک کرتا ہے۔“

”تم نے یہ گھر لیا ہی اس لیے ہے کہ اس کی چھت سے پڑوس نظر آتا ہے۔“

”تمہاری قسم، مجھے تو معلوم بھی نہیں تھا۔“

”اسی لیے کہہ رہے تھے کہ اوپر کا کمرہ میں پڑھنے لکھنے کے لیے بتا لوں گا۔“

”ارے، ارے، تم تو ہاتھ دھو کے پیچھے پڑ گئیں، جس کی بیوی خود اتنی خوبصورت ہو وہ کیوں پڑوس میں جھانکے گا۔“

”باہر کی تو وال بھی سرخ تھی ہے۔“

”ارے ہاں، دال پر یاد آیا۔ ہم کھانا کیا کھا میں گئے۔ ابھی تو گھر میں کچھ ہوگا بھی نہیں۔ کل عبدالرحمن آئے گا تو اس کے ساتھ جا کر سودا سٹف لے آؤں گا۔ ابھی بازار سے کچھ پکایا لے آتا ہوں۔“

ایاز نے بیٹے کو ساتھ لیا اور بازار چلا گیا۔ عمران یہ دیکھنے اوپر چلی گی کہ ہماری چھت سے برابر والوں کا گھر کتنا نظر آتا ہے۔ اس نے دیکھا گھر تو نظر نہیں آتا ہاں چھت کی ہوئی ہے، کوئی چھت پر آئے تو دوسری چھت سے نظر آ سکتا ہے۔ فراز کو وہ پچی چھت پر نظر آئی ہوگی۔ اس نے چھت پر سے ہوئے کمرے کو ایک نظر دیکھا اور مطمئن ہو کر نیچے چلی آئی۔ کسی دن جاؤں گی، دیکھوں تو کسی برابر میں کیسے لوگ رہتے ہیں۔ اگر ابھی عورت ہوئی تو بات چیت میں دل لگا رہا کرے گا ورنہ تو اس ابھی شہر میں یورپیت ہی یورپیت ہے۔

ایاز کھانے کے لیے کئی ہوئی چھٹی لے کر آ گیا تھا۔

”یہاں کی پکلی بڑی مزے دار ہوئی ہے وہی لے آیا ہوں۔“

”شام کو کھائے چلیں گے تو وہاں میں جو ہوگی وہ خرید لیں گے۔“

”شام ہوئی تو عمران خوش ہوئی۔ اب ہم باہر نکلیں گے اور پھولوں کو چلتے ہوئے دیکھیں گے۔ ایاز نے بیٹی کہا تھا کہ وہاں لوگ اس طرح تفریح کے لیے نکلتے ہیں جیسے پھولوں نے اچانک چلنا شروع کر دیا ہو۔ اس نے دوپہر کو شام کے لیے کپڑے نکال کر رکھ لیے تھے۔ خوب اچھی طرح تیار ہوئی۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر دیر تک خود سے ہاتھیں

کیں اور فراز کی انگلی تمام کر باہر نکلی آئی۔ باہر وہی منظر تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ جب وہ آئی تھی تو ہر طرف دھوپ نکلی ہوئی تھی اور اب دھوپ نے ستر پلٹ لیا تھا۔ وہی اونچی نیچی ناہموار زمین تھی وہی سائیکلوں پر جاتے ہوئے مفلوک الحال لوگ تھے۔ اس نے سوچا وہ کوئی خاص سڑک ہوگی جو بقول ایاز ناچتی چلی کھاتی اپنے مسافروں کو چوٹی پر لے کر جاتی ہے اور پھر کاٹ کر نیچے لے آتی ہے۔ اس نے فراز سے بھی کہہ دیا تھا کہ ہم تفریح کے لیے ایک ایسی سڑک پر جا رہے ہیں۔ وہ بار بار پوچھ رہا تھا کہ وہ سڑک کب آئے گی۔

وہ ٹکڑوں سے باہر نکلی آئی تھی۔ ایک پکلی سی سڑک اس کے سامنے تھی جس پر بھی کبھی کوئی تانگا گزر جاتا تھا یا کوئی سائیکل سوار۔ جو لوگ چل پھر رہے تھے ان کے لباس پہلے تھے اور غربت کا غارہ چہروں پر تھا۔ ہمیں سے بھی یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ پھول اچانک چلنے لگے ہیں۔ کسی طرف سے بھی جھینگی جھینگی مہک نہیں آ رہی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف سرد کے درخت ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے نہیں کھڑے تھے۔ اس کے برعکس چند خواتین والے تھے جو کہیں کہیں بیٹھے ہوئے تھے۔

عمران اتنے غصے میں تھی کہ وہ ایاز سے کہہ بھی نہیں سکتی کہ چلتے ہوئے پھول کہاں گئے۔ فراز تھک گیا تھا۔ اس کے مطلب کی یہاں کوئی چیز بھی نہیں تھی جو وہ بہل جاتا۔ وہ بار بار واپس جانے کی ضد کر رہا تھا۔ پھر اس نے فراز کو یہ کہہ کر بھلانے کی کوشش کی کہ وہاں میں کہیں بیٹھ کر کھانا کھا میں گے۔

”کیا کہہ رہی ہو عمران، یہاں اس کا قصور بھی نہ کرنا۔“

یہ پہاڑی لوگ ہیں۔ عورت کا باہر کھانا بہت معیوب سمجھا جاتا ہے یہاں۔ کوئی ایسا ہونے نہیں ہوگا جہاں ہم بیٹھ سکیں۔ ہاں کچھ لے لیں گے اور باہر جا کر کھا میں گے۔“

”لو اس سے بھی گئے۔“ عمران منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔ اس کی آواز شاید ایاز کے کانوں تک نہیں پہنچ سکتی۔

ایک جگہ ایک آدمی آگس کریم بنانے کی مشین لیے کھڑا تھا۔ ایاز نے عمران سے پوچھا، اس نے منع کر دیا فراز نے آگس کریم لے لی اور کچھ دیر کے لیے بہل گیا۔

”اندر حیرا ہونے لگا ہے۔ اب بازار کی طرف چلتے ہیں، کچھ کھانے کے لیے لے لیا جائے۔“

عمران نے تو سوچ لیا تھا اب وہ کچھ بولے گی ہی نہیں۔ ایاز ایک طرف مڑا تو وہ بھی منجھتی انداز میں اس کے ساتھ ہی مڑی۔ ایاز نے عمران اور فراز کو ایک طرف کھڑا کیا اور خود ہولن میں چلا گیا۔ کچھ روٹیاں اور ساں خرید، صبح ناشتے کے لیے اٹھے خریدے اور واپس آ گیا۔

”کیا سالن بناتے ہیں یہ لوگ، کھاؤ گی تو انگلیاں جانتی رہ جاؤ گی۔ دوپہر میں دیکھا میں شاندار چمکی تھی۔“ اس نے کہا اور داؤد طلب نظروں سے عمرانہ کی طرف دیکھا۔ ”تم کچھ بولی کیوں نہیں؟“

”کیا بولوں۔ اب کسی ایسے رستے پر چلیے جو گھر کی طرف جاتا ہو۔“

”اوہو، تھک گئی ہوگی، چلو کوئی بات نہیں آدھا قصبہ کل محکم لیں گے۔“

گھر تک پہنچتے پہنچتے رات آگئی تھی۔ اس نے سوچا کچھ ہوا ہو یا نہ ہوا جگنو یلغار ضرور کریں گے۔ آسمان سے آتش بازی کے انار ضرور پھوٹیں گے لیکن اس کی یہ آرزو بھی پوری نہیں ہوئی بلکہ یہ ہوا کہ گھر کے قریب پہنچ کر راستے کو اندھیرے نے نکل لیا۔ یہاں روشنی بالکل نہیں تھی، یہاں بجلی کے پول ہی نہیں تھے تو روشنی کہاں سے ہوتی۔ بڑی مشکل سے تالے میں چابی لگا لی اور وہ اندر آ گئے۔

وہ سونے کے لیے لیٹی تو ایاز سے ناراض تھی۔ ایاز سمجھ رہا تھا کہ وہ کیوں خاموش ہے لیکن پوچھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ دونوں طرف خاموشی تھی۔ باہر بھی جان لیوا آواز نہ تھا۔ کمرے میں لگی گھڑی کی ٹک ٹک عجیب ڈراؤنا منظر پیش کر رہی تھی، اس خاموشی کو خرابیاز نے توڑا۔

”عمرانہ!“

”ہوں۔“

”کوئی بات کرو، آج اس گھر میں ہماری پہلی رات ہے۔“

”ایک ہستی ہے قصبہ پہاڑی۔ چھوٹی سی جگہ مگر ایسی حسین جیسے جنت کا ٹکڑا زمین پر اتر آئی ہو، شام کے وقت صاف ستھری سڑکوں پر لوگ تفریح کے لیے اس طرح نکلے ہیں جیسے اچانک پھولوں نے چلنا شروع کر دیا ہو۔“ اس نے وہ تمام الفاظ دہرا دیے جو یہاں آنے سے پہلے ایاز کی زبان سے ادا ہوئے تھے۔

ایاز پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ عمرانہ کس بات پر ناراض ہے۔ اسے خود احساس تھا کہ اس نے جو غلط بیانی کی تھی عمرانہ کا دل اسی غلط بیانی پر خون کے آنسو رو رہا ہے۔ وہ تو یوں چپ تھا کہ اگر وہ بھی چپ رہی تو دن گزرتے جاؤں گے لیکن عمرانہ نے اپنا کرب لفظوں کے حوالے کیا تو وہ تڑپ اٹھا۔

”عمرانہ مجھے معاف کر دو کہ میں نے تم سے جھوٹ بولا۔ تم نے جو تقاضا بنا دیا تھا میں نے پوری نہیں کی لیکن یہ میری مجبوری تھی۔ میں تمہیں یہاں اپنے ساتھ لانا چاہتا تھا۔ اسے جنت کا ٹکڑا کہتا تھا تو اس جہنم میں تم آئیں کیسے؟“

”میں تو تمہاری داسی ہوں ایاز۔ جہاں کہو گے چلی جاؤں گی مگر مجھ سے یہ جھوٹ تو نہ بولا ہوتا۔ اگر جھوٹ بولنے کی عادت ہو گئی تو ہر معاملے میں بھلو گے۔“

”بس ایک جھوٹ اور ہے وہ بھی سن لو تاکہ اسٹاک ختم ہو جائے۔ پھر کوئی جھوٹ نہ ہوگا نہ بولوں گا۔“

”وہ بھی بول دو۔ اب تو میں بھی عادی ہوتی جا رہی ہوں جھوٹ سننے کی۔“

”ایک لڑکی ہے عمرانہ۔ وہ مجھے بالکل اچھی نہیں لگتی۔“

”یہ تو خبر جھوٹ نہیں ہے۔“ عمرانہ نے اس کی طرف

کروٹ بدلی اور بے اختیار ہنسنے لگی۔

☆☆☆

”امی دیکھیں کون آیا ہے۔“ فراز نے اس بچی کی طرف توجہ دلائی جو اس کے ساتھ تھی۔

”کون ہے بیٹا؟“

”لو آپ کو کونسی ع۔ یہ روشنی ہے، میں نے آپ سے کہا تو تھا، برابر والوں کے گھر میں ایک بچی ہے، یہ وہی ہے، روشنی۔ ابھی ہے نا۔ اس کی آنکھیں دیکھیں گرین ہیں، اس کے سنہرے بال اچھے ہیں نا۔“

”وہ تو اچھے ہیں مگر تم اسے یہاں کیوں لے آئے۔“

اس کی امی دھوڑ رہی ہوں گی۔

”جی نہیں۔ میں ان سے پوچھ کر لایا ہوں۔ میں ان کے گھر گیا تھا۔ آئی بھی بہت اچھی ہیں، میں نے ان سے کہا

روشنی کو اپنے گھر لے جاؤں، انہوں نے کہا لے جاؤ۔“

عمرانہ نے روشنی کو اپنے پاس بلایا۔ پانچ چھ سال کی یہ بچی بے پناہ خوبصورت تھی۔ اس میں بھی اتنی پیاری کردہی تھی کہ عمرانہ کو بے اختیار پیار آ گیا۔ اس نے اسے گود میں اٹھالیا۔

”جھوڑیے نا۔ مجھے فراز کے ساتھ کھیلنا ہے۔“

”فراز نہیں، فراز بھائی کہتے ہیں۔ وہ آپ سے بڑے ہیں نا۔“

”جی نہیں، فراز میرے برابر کا ہے اور میں اسے فراز ہی کہوں گی۔“

”اچھا جاؤ کھیلو فراز کے ساتھ۔“

فراز اسے لے کر چھت پر چلا گیا۔ ایاز اپنے چہرے پر عبد الرحمن کے ساتھ سودا سلف لانے کا ارگیا ہوا تھا۔ عمرانہ کے پاس اب فرصت ہی فرصت تھی۔ گھر کیوں کے پردے نکال لیے تھے، وہ ان پر استری کرنے کھڑی ہو گئی۔ کوئی دروازہ زور زور سے بجا رہا تھا۔ شاید ایاز آ گئے۔ وہ

دروازے پر مچی۔ ایک عورت دروازے پر کھڑی تھی۔ عمرانہ اسے دیکھتے ہی سمجھ گئی کہ وہ روشنی کی ماں ہے، وہی گرین آنکھیں ویسے ہی سنہری بال۔

”بہن معاف کیجیے گا۔ میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا۔ میں آپ کے پردوں میں رہتی ہوں۔ راجلہ میرا نام ہے۔“

”جی جی، میں سمجھ گئی، آئیے اندر آئیے۔“

”نہیں اس وقت نہیں، میں پھر بھی فرصت سے آؤں گی۔ اس وقت تو میں روشنی کا پوچھنے آئی تھی۔ آپ کے بیٹے کے ساتھ کھیلنے آئی تھی۔“

”کیا سمجھوں اسے۔“

”نہیں کھیلنے دیں، میں تو بس پوچھنے آئی تھی کہ بچہ ہی تو ہیں کہیں اور تو نہیں نکل گئے۔ گھر میں ہیں تو نکلے ہیں۔“

”راجلہ، بہن، معاف کرنا، ہم کل ہی تو آئے ہیں۔ کل سے اب تک فرصت ہی نہیں ملی جو آپ سے ملنے آئی، آؤں گی ضرور۔“

”مہم سے پہلے بچوں نے دوستی کر لی۔“

”ہاں یہ تو ہے، میرا فراز تو بچوں کا دیوانہ ہے۔“

”ایک ہی بیٹا ہے آپ کا؟“

”جی ہاں۔ اس کے بعد اللہ نے کوئی اولاد دی ہی نہیں۔ آٹھ سال کا ہو گیا ہے ماشاء اللہ۔“

”اچھا بہن چلوں گی۔“

”فراز کے پاس بازار آگئے ہوئے ہیں وہ آجائیں تو میں آپ کی طرف ضرور آؤں گی۔“

عمرانہ اتار تیں کرنے اور سیلاب رکھنے کی شوقین تھی۔ یہاں آکر وہ ایک ہی دن میں گھٹ کر رہ گئی تھی۔ غضب خدا کا چوتیس گھنٹے سے بھی زیادہ مدت میں راجلہ پہلی عورت تھی جس سے اس نے چند باتیں کی تھیں۔ ان باتوں نے تو اس کی

پیاس اور بھی بڑھادی تھی۔ وہ جلد سے جلد جاننا چاہتی تھی کہ راجلہ کون ہے، کہاں سے آئی ہے، اس کا میاں کیا کرتا ہے، میاں سے خوش بھی ہے یا نہیں۔ اس نے جلدی جلدی پردوں پر استری کی اور لیٹ کر رکھ دیے۔ پہلے میں راجلہ سے مل کر آؤں گی، اس کے بعد پردے لٹکاؤں گی مگر کیا خاک جاؤں گی۔ ایاز تو آنے کا نام ہی نہیں لے رہے ہیں۔ وہ اوپر چلی گئی کہ دیکھوں دونوں بچے کیا کر رہے ہیں۔ وہ دونوں کھیلنے میں مگن تھے، اس طرف سے مطمئن ہو کر وہ نیچے اتر آئی۔

اتنی دیر میں ایاز مینے بھر کر راشن لے کر آچکا تھا۔ عبد الرحمن نے سامان گھر میں رکھوا دیا اور اجازت لے کر چلا گیا۔ ایاز نے گھر میں کسی چیز کی کمی محسوس کی۔ اسے خیال آیا

فراز نہیں ہے۔

”فراز نظر نہیں آ رہا ہے۔ کہاں ہے؟“

”وہ ایک بلی پکڑ لایا ہے اس کے ساتھ کھیل رہا ہے چھت پر۔“

”بلی پکڑ لایا ہے؟ بلی کہاں سے مل گئی اسے؟“

”برابر والوں کی چھت پر تھی۔“

”بلاؤ اسے۔ اب وہ بلیوں سے کھیلے گا؟ کل میں اپنے ساتھ اسے اسکول لے کر جاؤں گا۔ داخل کراؤں گا اسے ورنہ اسے تو اب چھت مل گئی ہے دن دن بھر چھت پر بڑنگا رہے گا، بلاؤ اسے۔“

”ناراض کیوں ہوتے ہو، کوئی بلی ولی نہیں لایا ہے، برابر والوں کی بچی ہے روشنی۔ اس کے ساتھ کھیل رہا ہے۔“

”بلیاں ہوں یا لڑکیاں۔ دونوں ایک ہی ہوتی ہیں۔ ناخن دونوں کے بڑے تیز ہوتے ہیں۔“

”ایاز، ایسی خوبصورت بچی ہے کہ بے اختیار چومنے کو جی چاہتا ہے۔ ماشاء اللہ بہت ہی حسین ہے، جوان ہو کر غضب کی نکلے گی، اگر فراز کے جوان ہونے تک ہم یہاں رہے تو فراز کی دہن بنا کر اسے اپنے گھر لے آؤں گی۔“

”خوبصورت لڑکیوں کے ساتھ تو بالکل نہیں کھیلنا چاہیے۔ بلاؤ فراز کو۔“

”اچھا بابا بلاتی ہوں۔“

وہ اوپر مچی اور دونوں کو نیچے لے آئی۔ ایاز نے بچی کو دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ ”واضحی عمرانہ، بہت پیاری بچی ہے۔ مجھے تو اشتیاق ہو گیا کہ اس کی ماں کو دیکھوں۔“

”آگئے اپنی ذلالت پر۔ آپ گھر میں بیٹھیں میں برابر والوں کے ہو کے آئی ہوں۔ وہ بے جا رہی آئی بھی تھیں تو جلدی میں تھیں، دروازے سے ہو کر چلی گئیں۔“

ایاز کچھ نہیں سن رہا تھا۔ اس نے بچی کو گود میں اٹھا لیا تھا۔ بچی بھی ایسی بے تکلف تھی کہ پھر بائیں کیے جا رہی تھی۔

”آپ فراز کے پاس ہیں۔“

”ہاں بیٹا، فراز کے پاس ہیں۔“

”پھر تو آپ میرے پاس بھی ہوئے۔“

”کیوں آپ کے پاس کیوں ہوئے۔“

”کیونکہ آپ مجھے اچھے لگے ہو۔ میں آپ کو پایا کہا کروں گی۔“

”ٹھیک ہے، تم آج سے میری بیٹی ہو۔“

”پھر مجھے ٹھانے لے کر چلو۔ وہ جو پایا ہوتے ہیں ناں، وہ اپنے بچوں کو ٹھانے لے کر جاتے ہیں۔“

”اچھا کسی دن لے کر چلیں گے۔ ابھی تو تم آنی کے ساتھ آئے گھر جاؤ۔ تمہاری امی انتظار کر رہی ہوں گی۔“
”میں امی سے بھی کہوں گی، آپ بہت اچھے ہیں۔“
”اچھا کہہ دینا۔“

عمرانہ اسے لے کر اس کے گھر چلی گئی۔ فراز بھی اس کے ساتھ تھا۔ ایاز جو سامان لے کر آیا تھا، اس فرصت کا فائدہ اٹھا کر باورچی خانے میں جھانسنے لگا۔
اس کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ کمرے میں آکر لیٹ گیا۔ اب کھانے کا وقت ہو گیا تھا۔ اسے فصر آرہا تھا کہ عمرانہ ابھی تک نہیں آئی۔ وہ ہوتی تو کچھ کھانے کا انتظام کرتی یا مجھ سے بتیجی میں بازار سے لے آتا۔ بھلا یہ کوئی وقت تھا کسی کے گھر جانے کا۔ اس نے سوچا وہ خود برابر والوں کے دروازے پر جائے اور عمرانہ کو بلا کر لے آئے۔ وہ سوچ ضرور رہا تھا لیکن ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ شاید ہمت ہو جی جانی لیکن اسی وقت عمرانہ آگئی۔

”او، تمہارے پڑوسیوں نے تمہارے لیے کھانا بھیجا ہے۔“
”کتنی غلط بات ہے عمرانہ۔ وہ لوگ کیا سوچیں گے، کیوں لے آئیں کھانا۔ میں بازار سے لے آتا۔“
”کوئی کچھ نہیں سوچتا۔ پڑوسیوں کے بڑے حقوق ہوتے ہیں، کسی دن میں کوئی چیز پکائوں گی تو میں دے آؤں گی۔“
وہ کھانے سے فارغ ہوئے تو عمرانہ نے پڑوسیوں کا

ذکر ایک مرتبہ پھر پھیر دیا۔
”مبارک ہو، آپ کے پڑوسی بھی آپ کی طرح کیلاش پور کے ہیں۔“
”کیلاش پور کے ہیں؟ یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ اپنے گھر کے ہیں اور اب پڑوسی بھی ہیں۔ کیا نام ہے اس عورت کے میاں کا اور یہاں قصبہ پہاڑی میں کیوں ہے۔ کیلاش پور سے کیوں چلا آیا۔“
”کسی نے کہہ دیا ہوگا بڑا پر فضا مقام ہے اور بے چارہ چلا آیا ہوگا۔“

”تم طنز کرنے سے باز مت آنا۔ تم اچھی طرح جانتی ہو، تمہاری فرمائشوں سے تنگ آکر اپنی تنخواہ بڑھانے کے لیے یہاں آیا ہوں۔ مجھے شوق نہیں تھا کیلاش پور چھوڑنے کا۔“
”اس کی بھی کوئی مجبوری ہوگی۔“ عمرانہ نے کہا پھر ایک دم سے اداس ہو گئی۔ ”ویسے بے چاری ہے بہت دھکی عورت۔“

”کیوں، دھکی کیوں ہے؟“
”آپ نے تو دیکھا نہیں ہے، بالکل جوان عورت

ہے، مجھ سے تو خیر بڑی ہوگی لیکن ہے جوان۔“
”تم سے تو خیر برعورت بڑی ہوتی ہے۔“
”اب مذاق مت کریں، آگے تو سنیں۔ وہ خود تو جوان ہے مگر میاں بڑی عمر کا ہے۔ بے بھی بالکل چوڑا سا۔ دہلا پٹکا۔“

”تم نے کہاں دیکھ لیا۔ کیا وہ گھر میں تھا؟“
”ارے نہیں، فوٹو رکھا ہوا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا، میں نے پوچھ لیا۔ یہ تمہارے والد کا فوٹو ہے۔ ہنسنے لگی۔ یہ تو میرے شوہر ہیں، میں جو کہنے والی کب تھی۔ میں نے کہہ دیا، یہ تو تم سے بہت بڑے ہیں۔ اس پر اس نے بتایا کہ یہ میرے دوسرے خاوند ہیں۔ پہلے خاوند کا انتقال ہو گیا تو اس سے شادی کر لی۔ یہ جو میں ہے، پہلے شوہر ہے۔ ابھی تین سال پہلے ہی تو اس بڑے سے شادی ہوئی ہے۔“
”یہ کیلاش پور سے یہاں کیسے آگئی۔“
”اس کا میاں پولیس میں ہے۔ ٹرانسفر ہو کر یہاں آیا ہے۔“

”کیلاش پور کا ہے تو شاید میں اسے جانتا ہوں۔ نام کیا بتایا۔“
”عاجد نام لے رہی تھی۔“

”اللہ بچائے تم عورتوں سے بھی گھٹنا کھڑی نہیں اور سارا کچھ چھٹا نکال کر لے آئیں۔ ویسے بے چاری ہمدردی کے لائق ہے۔“

”اب زیادہ ہمدردی جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں بھی کم ہی کم جایا کروں گی۔ عورت مجھے تیز لگتی ہے۔“
دوسرے دن کی صبح اس گھر میں عجیب طرح سے طلوع ہوئی۔ ایاز کو آج پہلے دن اسکول جانا تھا لہذا وہ علی الصبح اٹھ گیا۔ عمرانہ بھی اس کے ساتھ ہی اٹھ بیٹھی تھی۔ عمرانہ نے تو خیال بھی نہیں کیا تھا، ایاز کی نظر پڑی کہ فراز اسے بستر پر نہیں ہے۔ اسے فراز کا خیال اسی لیے آ گیا تھا کہ فراز کو اسکول میں داخلے کے لیے ساتھ لے جانا تھا۔ ورنہ وہ غور بھی نہ کرتا۔

”فراز صبح کہاں چلا گیا؟“ ایاز نے کہا۔
”جائے گا کہاں۔ اس گھر میں میں ہی چھت فی ہے۔ شوق چڑھا ہوا ہے، چھت پر گیا ہوگا، آپ تیار ہوں میں اسے لے کر آتی ہوں۔“

عمرانہ نے پہلے تو نیچے سے آوازیں دیں لیکن جب کوئی جواب نہ آیا تو وہ اوپر چلی گئی۔ چھت پر فراز تو کیا اس کی خوشبو بھی نہیں تھی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ یا اللہ فراز کہاں چلا گیا۔ پھر اس کی نظر کھڑکی کے ایک تختے پر پڑی جس کا ایک سر اس کی چھت پر تھا دوسرا پڑوسیوں کی چھت کی

منہ پر۔ اس نے دل تمام لیا۔ ضرور کوئی چور آیا ہے جو اس تختے کے ذریعے یا تو پڑوس کی چھت سے ادھر آیا ہے یا ادھر سے پڑوسیوں کی چھت پر گیا ہے۔ وہ خوفزدہ ہو کر ایاز کو آواز دینے والی بھی کفران کی آواز آئی۔
”امی۔“

”ارے تم وہاں کیا کر رہے ہو، کیسے پہنچے وہاں۔“
”اس تختے کے ذریعے۔“
عمرانہ نے ذرا اچک کر دیکھا تو روشنی بھی وہاں تھی۔ اب عمرانہ کی سمجھ میں آیا کہ فراز اس تختے کے ذریعے چھت پر پہنچا اور روشنی اپنی سرچھٹوں سے اوپر آگئی ہوگی۔ اف میرے خدا! ایسی بھی کیا دیوانی۔ تجھ ذرا بھی کھسک گیا ہوتا تو؟
”چلو گھر آؤ۔ اپنے دیکھ لیا تو مارتے ہوئے لائیں گے۔“
”ابھی آتا ہوں امی۔“ فراز نے کہا اور تختے پر بیٹھ گیا۔
”ادھر سے مت آؤ۔ آنی سے کہنا وہ دروازہ کھول دیں گی۔ دروازے سے آؤ۔“

وہ جتنی رہی وہ گئی اور فراز اپنی چھت پر آ گیا۔ اس کی اس حرکت پر عمرانہ کا خون کھول اٹھا تھا لیکن اگر وہ اس وقت فراز کو سزا سنائی تو ایاز کو خبر ہو جاتی اور وہ نہیں جانتی بھی کہ وہ فراز کے اس جرم سے واقف ہو۔ اس نے بے کام کسی اور وقت پر اٹھا رکھا۔ صرف اتنا کیا کہ فراز کا کان ہلنے سے موڑ دیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر نیچے چلی آئی۔

”اوپر چھت پر تھا، نہ جانے کس وقت اٹھ کر چلا گیا۔ کہہ رہا تھا چھت پر چڑیاں بول رہی تھیں انہیں دیکھنے آیا تھا۔“
”یہ ہے نا میرا بیٹا۔ قصبہ پہاڑی کا کج لطف تو یہ اٹھا رہا ہے۔ ایک کم ہو کہ پڑی سوئی رہتی ہو۔ پہاڑی بچہوں پر سورج نکلنے کا منظر ہی تو دلچسپ ہوتا ہے۔“

”اچھا اب کر چکے قصبے کی تحریف۔ میں فراز کو تیار کیے دیتی ہوں۔ اسے لے کر اسکول جاؤ۔ گھر پر رہے گا تو ہر وقت کھیل کود ہی میں گزارے گا۔“

ایاز، فراز کو لے کر اسکول چلا گیا۔ اب عمرانہ سوچ رہی تھی خالی گھر میں کیا کرے۔ اسے کچھ دیر بعد ہی تنہائی کا شدید احساس ہونے لگا تھا۔ اب کیلاش پور یاد آرہا تھا۔ وہاں تنہائی کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔ گھر سے باہر کا شور اٹاتا تھا کہ گھر بھر رہا تھا۔ یہاں تو باہر اتنا سا تھا کہ گھر میں بھی نہیں ہوگا۔ اس نے پورے گھر کی صفائی شروع کر دی حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ اسے آئے ہوئے ابھی دو ہی دن تو ہوئے تھے۔

گھر کی جھاڑ پونچھ بھی کر لی۔ گھڑی کی سوئی جہاں

کھڑی تھی وہیں کھڑی تھی۔ یا اللہ اب میں کیا کروں۔ اسے یاد آیا کھڑکیوں کے پردے استری کیے رکھے ہیں۔ وہ پردے ناسٹے کھڑی ہو گئی۔

دروازے پر کوئی دستک دے رہا تھا۔ وہ خوش ہو گئی، شاید ایاز آگئے۔ بیڈ ماسٹر نے جلدی چھٹی دیدی ہوگی کہ چنا شہر ہے، تمہاری بیوی اکیلے گھر میں پریشان ہو رہی ہوگی۔ تم گھر چلے جاؤ، وہ بھانسی ہوئی دروازے پر آئی اور پوچھے بغیر ہی دروازہ کھول دیا۔ دروازے پر ایاز نہیں اس کی پڑوسن راحیلہ کھڑی تھی۔

”تمہارے میاں گھر پر تو نہیں ہیں؟“
”نہیں، وہ تو اسکول گئے۔ آ جاؤ اندر آ جاؤ۔“

راحیلہ کے آنے سے وہ خوش ہو گئی تھی کہ چلو باتوں میں وقت کٹ جائے گا لیکن ایک خیال نے اسے خوف زدہ کر دیا۔ شاید راحیلہ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ فراز ان کی چھت پر آیا تھا۔ اس کی شکایت لے کر آئی ہوں گی لیکن دوسرے ہی لمحے اس کا خوف دور ہو گیا جب انہوں نے بتایا، میرے میاں ڈیوٹی پر چلے گئے۔ روشنی بھی اسکول میں ہے۔ میں گھر پر اکیلی تھی سوچا عمرانہ سے کب شب کر آؤں۔ ہم دونوں صبح کے وقت اکیلے ہوتے ہیں، تم ہو تو میں آ جا یا کروں۔“

اسی ملاقات میں اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ روشنی بھی اسکول جاتی ہے۔ وہ بھی اسی اسکول میں جاتی ہوگی جہاں ایاز پڑھاتے ہیں لیکن جب اس کے پوچھنے پر یہ معلوم ہوا کہ اس قصبے میں ایک ہی اسکول نہیں ہے تو اسے اطمینان ہو گیا کہ فراز اور روشنی اپنی دروٹو الگ رہیں گے۔ اگر ایک ہی اسکول ہوتا تو فراز اس کی جان وہاں بھی نہیں چھوڑتا۔

راحیلہ بھی کم باتوں کی نہیں تھی۔ دونوں عورتیں اس وقت تک دنیا و مافیہا سے بے خبر بائیں کرتی رہیں جب تک روشنی کے اسکول سے آنے کا وقت نہیں ہو گیا۔

”مجھے روشنی کو اسکول سے لانا بھی ہوگا۔ میں چلتی ہوں۔“ راحیلہ نے کہا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

”یہ بھی آتے ہی ہوں گے۔ میں ہنڈیا تو چڑھا دوں۔“
عمرانہ پھر اکیلی رہی تھی لیکن اب ایاز کے آنے میں بہت کم وقت رہ گیا تھا اور پھر کھانا پکانے کی مصروفیت بھی تھی۔ وہ بچن میں مشغول ہو گئی۔

ایاز اور فراز گھر آ گئے تھے۔ فراز کا داخلہ اسکول میں ہو گیا تھا۔ کیلاش پور میں وہ چوٹی جماعت میں تھا، یہاں اسے پانچویں کلاس میں داخل کر دیا گیا۔

”داخلہ تو خیر ویسے بھی ہو جاتا۔“ ایاز نے کہا۔ ”لیکن

میں نے سوچا ہیڈ ماسٹر صاحب کو حیرت میں ڈال ہی دوں۔
میں نے کتاب کا ایک صفحہ فراز کے سامنے رکھ دیا۔ اس نے وہ
صفحہ دو دفعہ پڑھا اور پھر تم جانتی ہو وہی ہوا جو فراز کی
خصوصیت ہے۔ اس نے وہ صفحہ زبانی سنا دیا۔ ہیڈ ماسٹر
صاحب کو یقین ہی نہیں آیا۔ کہنے لگے یا ز صاحب، اپنے بیٹے
پر کٹ لگا دو۔
”آپ کسی دن میرے فراز کو نظر لگوائیں گے۔ میں تو
کہیں یہ مظاہرے نہیں کرتی پھرئی۔“
”بھئی یہاں ضروری تھا۔ ذرا عیب ڈالنا تھا۔“
”اب یہ بات اسکول میں پھیل جائے گی اور پھر ہر
نیچر استاد لپٹا پھرے گا۔“
”ہاں یہ تو ہے، خیر دیکھا جائے گا۔“
فراز کی یہ عجیب و غریب صلاحیت تھی۔ دنیا میں ایسے
لوگ اور بھی گزرے ہیں اور اب بھی ہوں گے کہ جن کی قوت
حافظہ اتنی تیز ہوتی ہے کہ کوئی تحریر ایک مرتبہ یا دوسرے پڑھنے
سے انہیں زبانی یاد ہو جاتی ہے۔ فراز کا شمار ایسے ہی لوگوں
میں ہوتا تھا۔ وہ جس منظر، جس چہرے، جس راستے کو ایک
مرتبہ دیکھ لیتا، کبھی نہیں بھولتا تھا، یہ کوئی جادو نہیں تھا جس
حافظے کی قوت کا کمال تھا۔
شام ہوئی تو ایاز کو روشنی کا خیال آیا۔
”عمرانہ، ذرا برابر سے جا کر روشنی کو تو بلا دیا فراز
سے کہہ دو جا کر بلا لے گا۔“
”خیر تو ہے، چھوٹے میاں تو چھوٹے میاں بڑے
میاں سبحان اللہ۔ باپ بیٹے دونوں روشنی کے عاشق ہو گئے۔“
”بڑی پیاری بچی ہے۔ بے اختیار پیارا آتا ہے اسے
دیکھ کر۔“
”وہ تو ہے مگر اس وقت کیوں ہمارے ہیں؟“
”میں ذرا بار بار جاتا ہوں سوچا ہے کبھی سیر کر لاؤں۔“
”یا اللہ! میں کیا کیا مجھ سے دیکھ رہی ہوں۔ آپ کو تو
لڑکیاں پسند ہی نہیں ہیں۔ پھر اب کیا ہو گیا۔“
”بعض بچے خود بخود ادا ہوتا لیتے ہیں۔ پتا ہے کیا کہہ
رہی تھی۔ کہہ رہی تھی آپ میرے باپ ہیں کیونکہ آپ مجھے
اچھے لگتے ہیں۔ جب مجھ سے کہلو الیہ کہ میں اس کا پاپا ہوں تو
کہنے لگی پاپا تو وہ ہوتے ہیں جو سیر کے لیے لے کر جاتے ہیں،
تم غریب کہہ رہی تھیں، اگر ہم روشنی کے جوان ہونے تک
یہاں رہتے تو اسے اپنی بہو بنائیں گے۔ جس گھر میں جائے گی
روشنی کر دے گی۔“
فراز قریب ہی کھڑا یہ باتیں سن رہا تھا۔ کسی کو معلوم بھی

نہ ہوا وہ کب گیا اور کب روشنی کو لے کر آیا۔ اس کے پکڑوں
سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کی ماں نے اسے تیار کر کے بھیجا ہے۔
”جاؤ، روشنی کی امی سے کہنا، ہم اسے اپنے ساتھ باہر
لے کر جا رہے ہیں۔“
”میں نے پہلے ہی پوچھ لیا ہے۔ وہ کہہ رہی ہیں لے
جاؤ۔“ فراز نے کہا۔
عمرانہ کو باہر جانے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ باہر تھا بھی
کیا۔ میں نے پہلے پہاڑی لوگوں کو دیکھنے وہ کیا باہر جانی۔ ایاز،
روشنی اور فراز کو لے کر چلا گیا۔
وہ واپس آیا تو روشنی کے ایک ہاتھ میں چالی سے چلنے
والا بھالو اور دوسرے ہاتھ میں سونے جاگنے والی گڑیا تھی۔
ایاز کے ہاتھ میں ایک پیکٹ دیا ہوا تھا۔
”اسے کھول کر دیکھو۔ روشنی کے لیے دو کپڑے لایا ہوں۔“
”پرائی اولاد کے لیے آپ نے کتنے پیسے خرچ کر
دیے۔ آپ جب جائیں گے اس کو یہ سب دلائیں گے۔“
”اتنے پیارے کہہ رہی تھی، پاپا مجھے یہ چاہیے۔ میں
دلانا چلا گیا۔“
”ہمیں کچھ پتانا بھی ہے۔ ہم اتنی دور جنگل میں اس
لے نہیں پڑے ہوئے ہیں کہ جو کچھ میں وہ لٹا رہے ہیں۔“
”عمرانہ، اس بچی میں کوئی بات ضرور ہے، بے اختیار
دل اس کی طرف کھینچتا ہے، مجھے واقعی لڑکیاں پسند نہیں لیکن یہ
لڑکی نہیں روشنی ہے۔“
”اس کی ماں یہ سب چیزیں دیکھے گی تو دیکھنا وہ بھی
پسند نہیں کرے گی۔“
”کہنا ایاز نے اسے بچی بتالیا ہے۔“
روشنی تو ایسی خوش تھی کہ پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے
تھے۔ وہ بے چین تھی کہ جلدی سے یہ چیزیں لے جائے اور
ماں کو جا کر دکھائے۔ عمرانہ اس کی بے چینی دیکھ رہی تھی۔ اس
نے سب چیزیں اٹھائیں اور روشنی کے ساتھ اس کی ماں کے
پاس چلی گئی۔
وہی ہوا جب وہ واپس آئی تو ایاز سے اچھے گی۔ ”میں
کہہ رہی تھی نا۔ روشنی کی ماں برا مانے گی۔ کہہ رہی تھی اگر
آپ اسی طرح چیزیں دلائے رہے تو وہ روشنی کو آپ کے
ساتھ آئندہ نہیں بھیجے گی۔“
”بھئی، بچے تو سب کے بچے ہوتے ہیں، عجیب
عورت ہے کیوں برا مان رہی ہے۔“
”کہہ رہی تھی، اس طرح بچوں کو غیر لوگوں سے
چیزیں لینے کی عادت پڑ جاتی ہے۔“

”اچھا بھائی، آئندہ کوئی چیز نہیں دلاؤں گا۔ یہ بچی گھما
کر لے آیا کروں گا۔“
”ضرورت تو اس کی بھی نہیں۔ کسی کی اولاد کو اتنا سر
چڑھانا۔“ عمرانہ نے کہا اور بچن میں چلی گئی۔ ایاز اسکول سے
بچوں کی کچھ کپیاں لے کر آیا تھا، انہیں دیکھنے بیٹھے گیا۔
جب گھر میں خاموشی ہو گئی اور فراز نے دیکھ لیا کہ
باپ اپنے کام میں مصروف ہو گئے ہیں تو وہ عمرانہ کے پاس
آیا۔ اس کے چہرے سے شرافت عیاں تھی۔
”آنٹی نے تو پکچہ نہیں کہا تھا۔ آپ نے اپنی طرف
سے باتیں کی ہیں ناں۔“
”کون سی باتیں۔“ عمرانہ نے تو بے پروئی ڈالتے
ہوئے کہا۔
”میں کی روشنی کو چیزیں مت دلا یا کرو۔“
”میں اپنی طرف سے کیوں کہنے لگی تھی۔“
”اس لیے کہ ابو کے پیسے نہ خرچ ہوں۔“
”پاکل ہو گیا ہے۔ روشنی کی ماں نے مجھ سے کہا تھا۔
ضروری ہے کہ ہر بات تمہارے سامنے کی جائے، تم اس
وقت وہاں نہیں تھے جب وہ کہہ رہی تھیں۔“
”میں وہیں تھا۔“ فراز نے کہا اور ہنستا ہوا ہلکا گیا۔
☆☆☆☆
عمرانہ کو قہر پہاڑی میں رہتے ہوئے چھ مہینے ہو گئے
تھے۔ یہاں کوئی تفریق نہیں تھی لیکن اب اس کا یہاں دل لگ
گیا تھا۔ پڑوس اچھا لگ گیا تھا اس لیے بھی دل لگ ہوا تھا۔
راحیلہ بہت اچھی عادت کی عورت تھی۔ دوسرے تیسرے دن
ملنے بھی آجاتی تھی۔ روشنی تو زیادہ وقت عمرانہ کے ساتھ ہی
گزارتی تھی۔ فراز اس سے بہت مانوس ہو گیا تھا۔ اسکول
سے آنے کے بعد یہ مشکل دوپہر گزارتے تھے۔ پھر جو کھیل
میں لگتے تھے تو رات کی خبر لاتے تھے۔ ایاز اپنی کیفیت سمجھ
نہیں پا رہا تھا۔ وہ جب بھی روشنی کی طرف دیکھتا تھا بے اختیار
اس کا دل روشنی کی طرف کھینچ لگتا تھا۔ وہ اسے لے کر بازار
کی طرف نکل جاتا یا پھر اس کے پاس بیٹھ کر کھٹوٹوں اس سے
باتیں کرتا رہتا۔
ایک روز راحیلہ صبح ہی صبح عمرانہ سے ملنے اس کے گھر
آئی اور نہ جانے کیوں سے عجیب سا مطالبہ کر دیا۔ ”عمرانہ
تمہاری شادی کی اہم بھی تو ہوگی۔ ہماری دوستی کو اتنے دن
گزر گئے۔ تم نے وہ اہم دکھائی ہی نہیں۔“
”تم نے کبھی کہا بھی تو نہیں۔ اوپر ہی رکھی ہے ابھی
لا کر دکھائی ہوں۔“

عمرانہ اٹھ کر گئی اور اہم اٹھا کر لے آئی۔ راحیلہ نے
بڑے اشتیاق سے اہم ہاتھ میں لی اور پہلا صفحہ لٹتے ہی عجیب
بے شکا سا سوال کر ڈالا جو ظاہر ہے غیر ارادی طور پر اس کی
زبان سے ادا ہوا ہوگا۔
”یہ ہیں تمہارے میاں؟“
”میرے برابر بیٹھے ہیں۔ سہرا بھی بندھا ہوا ہے۔
ظاہر ہے یہی ہوں گے۔“
”ارے ہیں۔ میں بھی کیسی کوڑھ مغز ہوں۔ تمہاری
شادی کی تصویریں دیکھ رہی ہوں اور پوچھ رہی ہوں، یہ ہے
تمہارا شوہر۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا اور ایک ایک کر کے
تصویریں دیکھنے لگی۔
جب وہ اہم دیکھ چکی تو عمرانہ نے اس سے کہا۔ ”بھئی
میں تمہارے گھر آؤں تو مجھے اپنی اہم بھی دکھانا بلکہ اہم جا کر
لے آؤ۔“
”بھئی آؤ گی تو دکھاؤں گی۔“
”راحیلہ ایک بات پوچھوں۔ تمہاری پہلی شادی کی
بھی تو اہم ہوگی۔ مجھے تمہارے پہلے شوہر کی تصویریں دیکھنے کا
بہت شوق ہے۔“
”میرے ہوئے کی تصویریں کیا رکھتی۔ میں نے سب
جلا دیں۔“
”مرنے والوں کی تصویریں ہی تو یادگار ہوتی ہیں۔“
”بات یہ ہے عمرانہ کہ مرنے والے سے میری یوں بھی
نہیں بنتی تھی۔ جب وہ مری گیا تو میں نے تصویریں بھی جلا
دیں۔ اب تو مجھے وہ بھی یاد نہیں کہ کون تھا کہاں چلا گیا۔“
”میں چائے بناتی ہوں۔ بیٹھ کر چائے پیئیں گے۔“
”میں نے تمہیں اداس کر دیا۔“
”تم کیا اداس کر دے گی۔ میری قسمت اداس کیسے رہتی
ہے۔ تمہارا شوہر مگر چائے تو گھر جا کر پیوں گی۔“
”کہنا ناراض ہوئی ہو۔“
”نا دانتکی میں تمہارے پہلے بہت احسان میں نے
لے لیے ہیں۔ اب چائے کی تکلف کیا دوں۔“
عمرانہ اسے روشنی رہ گئی لیکن وہ اٹھ کر چلی گئی تھی۔
عمرانہ نے اہم اٹھا کر رکھی اور گھر کے کام کاج میں مشغول
ہو گئی۔ ایاز اور فراز اسکول سے آنے والے تھے۔
☆☆☆☆
تین چار دن گزر گئے تھے۔ نہ تو راحیلہ آئی تھی نہ اس
نے روشنی کو بیٹھا تھا۔ عمرانہ نے سوچا جا کر معلوم تو کیا جائے۔
کیا خبر اس کی طبیعت خراب ہو۔ راحیلہ نے بڑی بے ولی سے

”اس وقت میرے میاں گھر پر ہیں تم بعد میں آنا۔“
 ”تمہارے میاں مجھ سے عمر میں بہت بڑے ہیں۔
 ویسے بھی میں پرہیز نہیں کرتی۔ میں تو تمہاری خبریت معلوم
 کرنے آئی تھی۔“

”میں خبریت سے ہوں۔“ راحیلہ نے کہا۔ ”ویسے
 معاف کرنا دودھ پیچے بچے تو تمہارے میاں بھی نہیں ہیں جو
 میرے میاں کو بڑا اکبر دے رہی ہو۔“
 ”تم نے روشنی کو بھی نہیں بھیجا۔“

”اس کی پڑھائی کا حرج بہت ہوتا ہے۔ اچھا
 خدا حافظ۔“ راحیلہ نے اپنی زور سے دروازہ بند کیا کہ عمران
 گھر آکر دو قدم پیچھے ہٹ گئی اور پھر خود ہی مسکرا دی۔ میاں
 سے لڑکچھی ہوئی۔ غصہ اتر جانے لگا تو خود ہی آئے کی۔
 ایاز گھر آیا تو وہ یہ ذکر چھیڑے بغیر نہ رہ سکی۔ ”عجیب
 ہے یہ عورت۔“

”کون عورت۔“
 ”میری ہماری پڑوسن۔ روشنی کی ماں۔“
 ”کیا ہو گیا؟“

”حسد اور جین بہت ہے اس عورت میں۔ اس روز
 اچھی خاصی آئی ہے میرے پاس۔ میں نے شادی کا الم
 دکھایا۔ اب بھلا تاؤ، تیرا شوہر بوڑھا اور بد شکل ہے تو اس
 میں میرا کیا تصور۔ اسی وقت منہ پھول گیا۔ اٹھ کر چلی گئی۔
 میں نے کہا چل گئی ہوگی۔ پھر آپ ہی آپ آنا چھوڑ دیا۔ میں
 بے غیرت بن کر گئی بھی تو دروازے ہی پر گھڑے ہو کر باتیں
 کر لیں اور وہ بھی چلی گئی، اس معصوم روشنی پر بھی پابندی لگا دی
 ہے۔ نہیں آتی ہے تو نہ آئے، ہم کیا اس کے بغیر مرے
 جا رہے ہیں۔“

”اسی لیے روشنی کی دن سے نظر نہیں آئی۔ بچوں سے
 کیا دشمنی نکلتی۔ بہر حال اگر وہ نہیں آتی ہے تو تمہیں بھی
 جانے کی ضرورت نہیں ہے۔“
 ”میری جانے جوتی۔ کبھی آئی تو میں بھی منہ نہیں
 لگاؤں گی۔“

”اس کا شوہر بھی بد اخلاق سا ہے۔ مجھے ایک دن ملا تھا۔“
 ”دیکھا آپ نے۔ آپ تو اس کے مقابلے میں بالکل
 لڑکے ہیں، یہی طعن ہے راحیلہ کو۔“
 ”کیا کہا؟ راحیلہ نام ہے اس کا؟“
 ”آپ کو یہی نہیں معلوم؟“
 ”مجھے کیا معلوم۔“

دونوں گھر ایک دوسرے سے دور آباد ہو گئے تھے۔ آنا
 جانا بالکل بند ہو گیا تھا۔ بچوں پر کوئی روک ٹوک نہ بھی کی
 جائے تو بھی بڑوں کا موڈ دیکھ کر لائحہ عمل اختیار کرتے ہیں۔
 فراز سے کسی نے نہیں کہا تھا کہ وہ راحیلہ کے گھر نہ جانے لیکن
 وہ اتنا مجھد اور ضرور تھا کہ اس نے اس سرد جنگ کو محسوس کر لیا
 تھا۔ اس دن کے بعد سے اس نے بھی روشنی کا ذکر نہیں کیا
 تھا۔ بچہ تھا، اسے کسی نہ کسی کے ساتھ کھلنا پڑا تھا۔ اب وہ باہر
 نکل کر دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلنے لگا تھا۔ کبھی کبھی روشنی بھی
 اگر باہر آ جاتی تو فراز سب بچوں کو چھوڑ کر اس کے پاس چلا
 آتا تھا۔ ایک دن بہت کر کے فراز اسے گھر لے بھی آیا تو
 عمران نے اسے پانچ منٹ بعد ہی بھگا دیا۔

”جاؤ روشنی، تمہاری اماں ڈھونڈ رہی ہو گی جھپیں۔“
 یہاں مت آیا کرو۔ فراز کے ساتھ باہر بھی کھیل لیا کرو۔“
 ”اچھا آئی۔“ اس معصوم نے جواب دیا۔ ”آؤ فراز
 ہم باہر کھیلنے ہیں۔“

یہ سلسلہ چل ہی رہا تھا کہ ایک روز صبح میں شوہر چلا۔
 راحیلہ کی آواز اس شوہر میں صاف سنائی دے رہی تھی۔ کبھی
 بھی روشنی کا نام بھی سنائی دے رہا تھا۔ عمران دروازے پر
 گئی۔ معلوم ہوا روشنی بہت دیر سے غائب ہے۔ راحیلہ اسے
 دیکھ کر کہیں سے جھپٹی۔ ”روشنی کو تو نے نہیں چھپا دیا ہے۔“
 عمران وہاں جمع صورتوں کے پاس پہنچ گئی۔ ”میں کیوں
 چھپاؤں گی اس معصوم کو۔“

راحیلہ منٹے کے ہر گھر میں دیکھ چکی تھی۔ روشنی کہیں بھی
 نہیں تھی۔

ایاز اس وقت گھر ہی میں تھا۔ آواز سن کر وہ بھی
 باہر نکل آیا۔ یہاں چھ ماہ میں پہلی مرتبہ ہوا تھا کہ وہ راحیلہ کو
 دیکھ رہا تھا۔ اس کی سانس جہاں بھی وہیں رگ گئی۔ تو یہ ہے
 روشنی کی ماں راحیلہ۔ ہاں یہی تو ہے۔ راحیلہ اس کی آمد سے
 بے خبر، عورتوں سے باتیں کر رہی تھی۔ ایاز کا عجیب حال تھا۔
 اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہاں سے نہیں بھاگ جائے یا
 گھر میں جا کر نہیں چھپ جائے۔ اس سے پہلے کہ راحیلہ کی
 نظر اس پر پڑتی، وہ گھر میں آ گیا۔ اس کے وجود میں تنہا
 آندھیاں چل رہی تھیں۔ پھر اس نے اپنے آپ کو مستحیال
 لیا۔ اسے روشنی کا خیال آیا۔ روشنی کہاں چلی گئی۔ بے چاری
 راحیلہ کتنی پریشان ہے۔ وہ کبھی میرے سامنے نہیں آئی
 حالانکہ ہزار دفعہ آ سکتی تھی۔ اس پریشانی میں اسے یہ بھی خیال
 نہیں رہا کہ میں گھر پر ہوں، کبھی وقت باہر بھی آ سکتا ہوں۔
 اولاً وہ بھی کیا چیز ہوتی ہے۔ اس خیال کے ساتھ ہی اسے فراز کا

خیال آیا۔ فراز بھی تو نہیں ہے۔ کہیں فراز ہی تو روشنی کو لے کر
 کہیں نہیں چلا گیا۔ شاید۔ وہ ایک مرتبہ پھر باہر آیا۔ یہی وہ
 وقت تھا جب تمام عورتیں ایک ساتھی جھپیں۔ ”لٹی لٹی۔“
 وہ دیکھو روشنی وہ آ رہی ہے۔ عمران کا بیٹا فراز بھی اس کے
 ساتھ ہے۔“

ایاز نے دیکھا فراز اور روشنی بازدار کی طرف سے چلے
 آ رہے ہیں۔ روشنی کے ہاتھ میں ابھی تک اس کمریم دینی
 ہوئی تھی جو اس نے بازار سے خریدی تھی۔

ایاز مجھ رہا تھا کہ اب سارا الزام فراز پر ہی آ گیا کہ
 وہی اسے لے کر گیا تھا۔ اب عمران جانے اور راحیلہ۔ وہ اندر
 آ گیا کہ چلو معاملہ ختم ہو گیا۔

کچھ دیر بعد عمران اندر آئی۔ فراز اس کے ساتھ تھا۔
 اندر آتے ہی اس نے فراز کو بری طرح پھینکا شروع کر دیا۔
 ”کم بخت، اس کا باپ پولیس والا ہے۔ تیری کھال
 ادھیڑ کر رکھ دے گا۔“

”ابھی تو تم اس کی کھال ادھیڑ رہی ہو۔ اب چھوڑ بھی
 دوا۔“

”آپ تو آرام سے گھر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ کو
 کیا معلوم باہر کیا ہو گیا۔ یہ روشنی کو لے کر کہیں چلا گیا تھا۔ اس
 کی ماں سے معذرت رہی تھی۔“
 ”دونوں بچے ہیں، کسی کو کیا کہا جائے۔ یہ بات روشنی
 کی ماں کو بھی سوجھنی چاہیے۔“

”اب یہ اتنا بچہ بھی نہیں ہے۔ اسے معلوم ہونا چاہیے
 تھا کہ روشنی کی ماں اسے ڈھونڈ لے گی۔“

ایاز کے بچاتے بچاتے فراز کی اچھی خاصی پٹائی
 ہوئی۔ اس کی ناک سے خون بہنے لگا تھا۔ خون دیکھتے ہی
 عمران کا ہاتھ رک گیا۔

”اپنے چہیتے کو سمجھا لو کہ یہ روشنی کے ساتھ نہ کھیلے ورنہ
 میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔“ عمران نے فراز کو چھوڑا اور
 کمرے میں گھر کر اندر سے کمر بند کر لیا۔

فراز باپ سے لپٹ گیا۔ ابھی تک وہ خاموشی سے پٹ
 رہا تھا لیکن ایاز سے پٹنے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ انکی
 دہائیں مار رہا تھا کہ ایاز کے لیے چپ کرنا مشکل ہو گیا۔ ایاز
 نے اس کا خون صاف کیا۔ دودھ گرم کر کے پلا یا اور بڑی دیر
 تک اسے سمجھا تا رہا۔ فراز بے سدا ہو کر لپٹ گیا۔

ایاز گھر سے نکل کر گئی میں آ گیا۔ اس کی نظر میں راحیلہ
 کے مکان پر جمی ہوئی تھیں۔ کتنی موشی نہیں تھا۔ اگر کوئی ہوتا
 تو یہی سمجھتا کہ کوئی چور ہے جو مکان کا جائزہ لے رہا ہے۔ یہ

عورت اب تک میرے سامنے نہیں آئی تھی۔ سامنے نہ ہی آئی
 ہوتی تو اچھا تھا۔ وہ کھلتا ہوا گی کے موڈ تک گیا۔ اس نے ایک
 سگریٹ خریدی اور سلکا کر ہونٹوں سے لگائی۔ وہ زندگی میں
 پہلی مرتبہ سگریٹ پی رہا تھا۔ اب اس کی سمجھ میں آ رہا
 تھا، لوگ شراب کیوں پیتے ہیں۔ وہ کھلتا ہوا پھر گئی میں آ گیا۔

اس کے قدموں نے پھر اسے راحیلہ کے مکان کے سامنے
 چھوڑ دیا۔ عمران کا خیال درست تھا۔ اتنی خوبصورت عورت کو
 بوڑھا اور بد شکل شوہر مل جائے تو وہ الم دیکھ کر بے گئی نہیں تو

اور کیا کرے گی۔ اس کا پہلا شوہر کیا واقعی مر چکا ہے۔ اس
 نے جھوٹ بولا ہے تو یہ بھی اس کی مجبوری ہوگی۔ اسی وقت کئی
 کے اندر صرے میں کوئی داخل ہوا اور ایاز کھلتا ہوا آگے بڑھ

گیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ کتنی میں آئے والا، راحیلہ کے گھر
 کے سامنے آ کر رک گیا تھا۔ پھر دروازہ کھلا اور وہ جو کوئی بھی
 تھا اندر چلا گیا۔ دروازہ بند ہو گیا۔ اوہ تو یہ راحیلہ کا شوہر تھا۔

اب حسد کی آگ میں جلنے کی باری اس کی تھی۔ وہ راحیلہ کے
 شوہر پر حسد کر رہا تھا۔ گھر کے اندر اور گھر کے باہر بہت فرق
 ہوتا ہے۔ یہ فرق اس پر آج ظاہر ہو رہا تھا۔ پھر وہ آہستہ

آہستہ چلتا ہوا آیا اور اپنے گھر کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ پھر اس
 نے یہ فرق منادیا۔ وہ گھر کے اندر چلا آیا۔ اس کی بیوی نے
 گھر کے کا دروازہ اندر سے کھول دیا تھا اور اس نے فراز کو بھی

اٹھا کر اس کے بستر پر لٹا دیا تھا۔ ایاز اپنے بیٹے کے بستر کے
 قریب گیا۔ فراز سوتے ہوئے کسی فرشتے سے کم نہیں لگ رہا
 تھا۔ اس نے فراز کی چیشائی پر بوسہ دیا۔ میرے بچے! یہ کھیل
 کسی کو بھی راس نہیں آیا جو کھیل رہا ہے۔

”آپ کہاں چلے گئے تھے۔“ اس کی بیوی نے نیند
 میں ڈوبی آواز میں کہا۔

”باہر گئی میں تھا۔ ان گھروں کو دیکھ رہا تھا جو باہر سے
 بڑے پرسکون دکھائی دیتے ہیں۔“

اس کے بعد اس کی بیوی نے اس سے کچھ نہیں پوچھا۔
 شاید وہ یہی پوچھنے کے لیے جا چکی تھی۔ جواب مل گیا اور وہ سو
 گئی آج اسے بوسوںے والا خوش نصیب لگ رہا تھا۔ کیونکہ خود
 اس کی نیند اڑ گئی تھی اور یوں لگتا تھا جیسے اب وہ جب تک قصبہ
 پہاڑی میں ہے سونے کی حسرت میں جاگتا رہے گا۔ اس نے
 باری باری فراز اور عمران کی طرف دیکھا اور ان جیسا بننے کے
 لیے آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ سوچ رہا
 تھا آج اسے یہ بے چینی کیوں ہے۔ اس لیے کہ اس نے فراز
 کو چھپے ہوئے دیکھا ہے؟ اس لیے کہ روشنی کے وقتی طور پر کم
 ہو جانے پر عمران کو بہت باتیں سننے کو ملی ہیں؟ اس لیے کہ آج

اسے کیلاش پور بہت یاد آیا ہے یا اس لیے کہ اس کی نظر آج راحیلہ پر پڑی ہے؟ یہی بات ٹھیک معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس کے بعد سے ہی دل میں ایک چور آکر بیٹھ گیا ہے۔ شاید یہی بات ٹھیک ہے لیکن مجھے خود پر قابو پانا چاہیے۔ اگر عمرانہ نے میری کیفیت کو بھانپ لیا اور عورت ہونے کے ناتے اس بے چینی کے سبب کی گہرائی تک پہنچ گئی تو میرے اعتماد کا کیا ہوگا۔ یہی تو وہ شے ہے جو رشتوں کو بنائے رکھتی ہے۔

اسے یوں لگا جیسے دیواروں کی آنکھیں نکل آئی ہیں۔ وہ تمام آنکھیں اندھیرے میں اسے تلاش کر رہی ہیں۔ وہ اگر پکڑا گیا تو ان آنکھوں پر میرا ہر راز عیاں ہو جائے گا۔ چروہ راز جو ابھی تک میں نے خود پر بھی ظاہر نہیں کیا ہے۔ وہ گھبرا کر اٹھ گیا۔ مٹی کے قدموں کی طرح آواز کیے بغیر چلتا ہوا کمرے سے باہر آ گیا۔ اس کا حلق پیاس کی شدت سے چلنے رہا تھا جیسے میلوں کی مسافت طے کر کے آیا ہو۔ وہ صحن میں رکھے پانی کے ٹکے کے قریب گیا اور اوپر نیچے دو گلاس خشک حلق کے حوالے کر دیے۔ بڑی دیر تک اس دیوار کی طرف دیکھتا رہا جس کے دوسری جانب وہ عورت بھی بنے اس نے شام کے وقت گلی میں دیکھا تھا جو روشنی کی ماں تھی جس کا نام راحیلہ تھا۔ اس عورت سے میرا کیا رشتہ ہے۔ میں اس کے لیے کیوں جاگ رہا ہوں۔ وہ خود کو ملامت کرنے لگا۔ کوئی اگر عمرانہ کے لیے اس طرح جاگے اور مجھے معلوم ہو جائے تو میں اس کے بارے میں کیا سوچوں گا۔ میں عمرانہ کی امانت ہوں۔ اس طرح کسی اور کے لیے جاگنا اس امانت میں خیانت ہے۔ وہ پھر کمرے میں چلا آیا۔ وہ پھر بستر پر تھا اور خیالوں کی پورس تھی۔ انہی خیالوں سے لڑتا ہوا وہ کسی وقت سو گیا۔

صبح اس کی بیوی نے اسے اسکول جانے کے لیے اٹھایا تو اس کا بدن بخار سے جھل رہا تھا۔ اس کی بیوی نے گھبرا کر اس کی کلائی چھوڑ دی۔

”ارے آپ کو تو بہت تیز بخار ہے۔ رات بہت تیز ہوا چل رہی تھی اور آپ گلی میں نکل گئے تھے۔ یہ بخار اسی وجہ سے ہوا ہے۔ آپ لیٹے رہیے اسکول جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ذرا دن نکل آئے تو ڈاکٹر سے دوا لے آئیے گا۔ میں بھی آپ کے ساتھ چلی چلوں گی۔“

”نہیں عمرانہ میں اسکول ضرور جاؤں گا۔ فraz کو بھی تیار کر دو۔“

”ایک دن چھٹی کر لو گے تو اسکول بند نہیں ہو جائے گا۔“

”میں اسکول جا کر ڈاکٹر کو دکھا آؤں گا۔“

”کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بس لیٹے رہیے، عمرانہ نے اٹھتے ہوئے ایاز کو دوبارہ بلانے لیا۔

”میں گھر میں نہیں رہ سکتا۔ مجھے اسکول جانا ہے۔“ وہ اتنی زور سے چلا کہ کمرہ گونج گیا۔ فraz بھی گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

”اب میرے ہوتے ہوئے بھی آپ کو گھر اچھا نہیں لگتا۔ کیے دیتی ہوں فraz کو تیار۔ طے جائیے اسکول۔“ ایاز کو واقعی وحشت ہو رہی تھی۔ اسے اتنی جلدی تھی کہ جی چاہتا تھا تیار ہوئے بغیر ہی اسکول چلا جائے۔ دل میں ایک خوف سا بیٹھ گیا تھا کہ اگر وہ گھر میں رہا اور راحیلہ آئی تو پھر اس کا آتما سنا ہوا جائے گا۔

فraz تیار ہو چکا تھا۔ ایاز نے چپکے سے دروازہ کھولا اور گردن باہر نکال کر گلی کا جائزہ لیا۔ راحیلہ کا دروازہ اچھی طرح دیکھا۔ جب اطمینان ہو گیا کہ راحیلہ کا دروازہ بند ہے تو وہ باہر نکل آیا۔ فraz اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا لیکن آج ایاز کی رفتار اتنی تیز تھی کہ اسے باپ کا ساتھ دینا مشکل ہو رہا تھا۔

وہ اسکول سے واپس آیا تو فraz کو اس طرح اپنے پاس لے کر لپٹ گیا جیسے مرغی اپنے چوزوں کو چیل سے بجاتی ہے۔ شام ہوئی تو فraz کو لے کر باہر نکل گیا۔ اسے ڈر تھا کہ اگر فraz گھر پر رہا تو پھر روشنی کے گھر چلا جائے گا اور اب وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ روشنی کے ساتھ کھیلے۔

وہ گھر واپس آئے تو شام نے ابتدائی رات کا لباس پہن لیا تھا۔ اب اسے کوئی ڈر نہیں تھا کہ راحیلہ یا روشنی آئے گی لیکن پھر بھی احتیاط ضروری تھی۔ وہ فraz کو پڑھانے بیٹھ گیا۔ دراصل وہ چاہتا تھا کہ اسے اتنا مصروف کر دیا جائے کہ روشنی کے ساتھ کھیلنے کا وقت ہی اس کے پاس نہ رہے۔

کتابیں بند ہونے اور دست خوان لپٹ جانے کے بعد صرف اتنا ہی وقت رہ گیا تھا کہ کچھ دیر گلی میں ٹہلنے کے بعد بستر پر دراز ہو جایا جائے۔

”آؤ یا، ذرا گلی میں ٹہل کر کھانا ہضم کرتے ہیں۔“ اس نے فraz سے کہا۔

وہ فraz کو لے کر گلی میں آ گیا تھا۔ گلی میں روز کی طرح گھب اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ وہ ٹہلتا ہوا گلی کے آخری کنارے تک آ گیا۔ جب واپس ہونے لگا تو فraz نے خاموشی توڑی۔

”ابو، ایک بات کہوں۔“

”کہو بیٹا، ہو۔“

”کیا ہم کیلاش پور واپس نہیں جاسکتے۔“

”کیوں نہیں جاسکتے۔“

”تو پھر واپس نہیں، یہاں رہنے کا کیا فائدہ جب میں

روشنی کے ساتھ کھیل بھی نہیں سکتا۔“

”جہنمیں معلوم ہے روشنی کی ماں نے تمہاری امی کی کتنی بے عزتی کی ہے۔“

”اس میں روشنی کا کیا قصور۔ وہ کتنا رورہی ہوگی میرے ساتھ کھیلنے کے لیے۔“

ایاز کے پاس اس کی باتوں کا کوئی جواب نہیں تھا اور اب گھر بھی نزدیک آ گیا تھا۔ اس نے فraz کو موقع نہیں دیا تھا کہ وہ کوئی اور بات کرتا۔

گھر میں آیا تو عمرانہ کی زبان پر بھی یہی شکایت تھی کہ ایک پڑوس تھا، کچھ دل بہل جاتا تھا اب میں اس سے بھی گئی۔

آپ نے بھی منع کر دیا ہے کہ میں راحیلہ سے ربط منقطع نہ رکھوں ورنہ میں خود جا کر معافی طلب کر لیتی۔ ایاز بڑی رتی ہوں۔ اس سے تو ابھی میں کیلاش پور میں تھی۔ دل گھبراتا تھا تو کم از کم مارکیٹ ہی کا ایک چکر لگا آیا کرتی تھی۔ یہاں تو عورتیں بازار میں نکل بھی نہیں سکتیں۔ وہ سونے کے لیے بستر پر لیٹا تو کئی بڑے بڑے سوال اس کے سامنے تھے۔ ان میں سے ایک کا بھی جواب اس کے پاس نہیں تھا۔

وہ صبح سو کر اٹھا تو عمرانہ ابھی جاگ نہیں تھی حالانکہ وہ اس کے اٹھنے سے پہلے ہی بیدار ہو جاتی تھی۔ ناشتا وغیرہ بنانے کے بعد اسے بیدار کرتی تھی۔ ایاز نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ وہ وقت سے بہت پہلے اٹھ گیا تھا۔ وہ کمرے سے باہر نکلا اور بے اختیار سیز حیاں طے کر کے چھت پر پہنچ گیا جیسے کسی نے اسے بلایا ہو۔ ارد گرد کے پہاڑوں پر نظر پڑی۔ پہاڑوں پر کبھی چادر پڑی ہوئی تھی۔ ابھی سورج نے ان پہاڑوں کی اوٹ سے جھانکنا شروع نہیں کیا تھا۔ اسے انسوس ہو رہا تھا کہ وہ ایسا منظر دیکھنے اس سے پہلے چھت پر کیوں نہیں آیا۔

پہاڑوں سے نظر پڑی تو وہ راحیلہ کی چھت کی طرف دیکھنے لگا۔ اس وقت راحیلہ نہ جانے کیا کر رہی ہوگی۔ سو کر اٹھی بھی ہے یا نہیں۔ اٹھ تو گئی ہوگی۔ روشنی کو بھی تو اسکول جانا ہوتا ہے۔

اگر وہ میرے اسکول میں پڑھتی ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ میں اسے روز دیکھ لیا کرتا۔ شاید کسی کام سے راحیلہ چھت پر آجائے۔ میں اسے دیکھ لوں اس کی نظر مجھ پر نہ پڑے۔ وہ کتنی ہی دیر چھت پر ٹہلتا رہا۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ اس دیوار کی طرف چلا گیا جہاں جھانکنے سے گلی نظر آتی ہے۔ کچھ پتے گھروں میں سے اسکول جانے کے لیے نکل رہے تھے۔ وہ ان پتھروں کو دیکھتا رہا۔ شاید روشنی بھی اپنی ماں کے ساتھ گھر سے نکلے۔

اس نے گردن پر تھپی کی اور اپنی آنکھیں راحیلہ کے دروازے پر رکھ دیں۔

وہ تھک ہار کر وہاں سے بیٹے ہی والا تھا کہ راحیلہ کا دروازہ کھلا اور راحیلہ کا شوہر باہر نکلا۔ اس کے پیچھے راحیلہ بھی باہر آئی تھی۔ راحیلہ کو یہ معلوم ہی نہیں ہو سکتا تھا کہ کوئی اسے اوپر سے دیکھ رہا ہے۔ راحیلہ کا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ اپنے شوہر کو رخصت کر رہی تھی۔ ایاز کی آنکھیں نہ جانے کیوں خود بخود جھپک گئیں۔ اگر کچھ دیر اور میں یہاں کھڑا رہوں تو روشنی کو بھی دیکھ سکتا ہوں۔ وہ بھی تو اسکول کے لیے نکلتی گی۔

”ابو، چلتے ناشتا کر لیں۔ اسکول کو دیر ہو رہی ہے۔“ فraz کی آواز اس کے کانوں میں آ گئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ فraz اسے بلانے چھت پر آ گیا تھا۔ اب وہ اسے کیا بتاتا کہ کسے دیکھنے وہ یہاں کھڑا ہے۔ وہ اس کے ساتھ چھت سے نیچے اتر آیا۔

وہ ناشتا کرنے کے بعد فraz کے ساتھ باہر نکلا تو آج پہلی مرتبہ اس کا جی چاہا کہ عمرانہ اسے رخصت کرنے کے لیے دروازے پر آئے۔ وہ ٹھوڑی دیر دروازے پر رک بھی رہا لیکن عمرانہ کا یہ معمول تھا ہی نہیں۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور دروازہ بند کر کے باہر نکل گیا۔

دوسرے دن وہ جان بوجھ کر اسکول کے وقت سے بہت پہلے اٹھ گیا۔ چرووں کی طرح سے نکلا اور چھت پر پہنچ گیا۔ آج کبر اٹھا تھا کہ ہاتھ بھر آکے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ کبر کے اس پار راحیلہ کی چھت پر کوئی آیا تھا۔ ایاز کا خون اس کی رگوں میں جھنکے لگا۔ شاید راحیلہ بھی مجھے دیکھنے کی مشتاق ہے۔ اسے معلوم ہو گیا ہوگا کہ میں چھت پر آتا ہوں۔ وہ مجھے دیکھنے آئی ہوگی۔ برا ہوا اس کبر کا کچھ نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔

دھوپ میں چلتا ہوا یہ سانس چھت کے ایک خاص حصے تک آیا۔ شاید اس دیوار تک جہاں کھڑے ہو کر دوسری چھت کو دیکھا جاسکتا تھا۔ پھر وہ سایہ اسی دھوپ سے لڑتا ہوا واپس ہو گیا اور نیچے اترنے والے نینکے چلا گیا۔

کچھ نظر نہیں آ رہا تھا اور سورج نکلنے کے انتظار میں اسکول کا وقت گزر جاتا۔ اس نے گلی میں جھانک کر دیکھا۔ کبر کی چادر یہاں بھی بچھی ہوئی تھی۔ وہ مایوس ہو کر چھت سے نیچے آ گیا۔ عمرانہ گلی میں اور بچن میں ناشتا تیار کر رہی تھی۔ ایاز بے دلی سے تیار ہونے لگا۔

وہ اسی کبر میں گھر سے نکلا اور اسکول کے لیے روانہ ہو گیا۔ اسکول تک پہنچتے پہنچتے کبر کم ہو گئی تھی لیکن اب وہ لوٹ کر نہیں آ سکتا تھا۔

اچھے دن اسکول کی چھٹی تھی۔ اس نے ایک دن پہلے

وہ تھک ہار کر وہاں سے بیٹے ہی والا تھا کہ راحیلہ کا دروازہ کھلا اور راحیلہ کا شوہر باہر نکلا۔ اس کے پیچھے راحیلہ بھی باہر آئی تھی۔ راحیلہ کو یہ معلوم ہی نہیں ہو سکتا تھا کہ کوئی اسے اوپر سے دیکھ رہا ہے۔ راحیلہ کا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ اپنے شوہر کو رخصت کر رہی تھی۔ ایاز کی آنکھیں نہ جانے کیوں خود بخود جھپک گئیں۔ اگر کچھ دیر اور میں یہاں کھڑا رہوں تو روشنی کو بھی دیکھ سکتا ہوں۔ وہ بھی تو اسکول کے لیے نکلتی گی۔

”ابو، چلتے ناشتا کر لیں۔ اسکول کو دیر ہو رہی ہے۔“ فraz کی آواز اس کے کانوں میں آ گئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ فraz اسے بلانے چھت پر آ گیا تھا۔ اب وہ اسے کیا بتاتا کہ کسے دیکھنے وہ یہاں کھڑا ہے۔ وہ اس کے ساتھ چھت سے نیچے اتر آیا۔

وہ ناشتا کرنے کے بعد فraz کے ساتھ باہر نکلا تو آج پہلی مرتبہ اس کا جی چاہا کہ عمرانہ اسے رخصت کرنے کے لیے دروازے پر آئے۔ وہ ٹھوڑی دیر دروازے پر رک بھی رہا لیکن عمرانہ کا یہ معمول تھا ہی نہیں۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور دروازہ بند کر کے باہر نکل گیا۔

دوسرے دن وہ جان بوجھ کر اسکول کے وقت سے بہت پہلے اٹھ گیا۔ چرووں کی طرح سے نکلا اور چھت پر پہنچ گیا۔ آج کبر اٹھا تھا کہ ہاتھ بھر آکے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ کبر کے اس پار راحیلہ کی چھت پر کوئی آیا تھا۔ ایاز کا خون اس کی رگوں میں جھنکے لگا۔ شاید راحیلہ بھی مجھے دیکھنے کی مشتاق ہے۔ اسے معلوم ہو گیا ہوگا کہ میں چھت پر آتا ہوں۔ وہ مجھے دیکھنے آئی ہوگی۔ برا ہوا اس کبر کا کچھ نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔

دھوپ میں چلتا ہوا یہ سانس چھت کے ایک خاص حصے تک آیا۔ شاید اس دیوار تک جہاں کھڑے ہو کر دوسری چھت کو دیکھا جاسکتا تھا۔ پھر وہ سایہ اسی دھوپ سے لڑتا ہوا واپس ہو گیا اور نیچے اترنے والے نینکے چلا گیا۔

کچھ نظر نہیں آ رہا تھا اور سورج نکلنے کے انتظار میں اسکول کا وقت گزر جاتا۔ اس نے گلی میں جھانک کر دیکھا۔ کبر کی چادر یہاں بھی بچھی ہوئی تھی۔ وہ مایوس ہو کر چھت سے نیچے آ گیا۔ عمرانہ گلی میں اور بچن میں ناشتا تیار کر رہی تھی۔ ایاز بے دلی سے تیار ہونے لگا۔

وہ اسی کبر میں گھر سے نکلا اور اسکول کے لیے روانہ ہو گیا۔ اسکول تک پہنچتے پہنچتے کبر کم ہو گئی تھی لیکن اب وہ لوٹ کر نہیں آ سکتا تھا۔

اچھے دن اسکول کی چھٹی تھی۔ اس نے ایک دن پہلے

وہ تھک ہار کر وہاں سے بیٹے ہی والا تھا کہ راحیلہ کا دروازہ کھلا اور راحیلہ کا شوہر باہر نکلا۔ اس کے پیچھے راحیلہ بھی باہر آئی تھی۔ راحیلہ کو یہ معلوم ہی نہیں ہو سکتا تھا کہ کوئی اسے اوپر سے دیکھ رہا ہے۔ راحیلہ کا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ اپنے شوہر کو رخصت کر رہی تھی۔ ایاز کی آنکھیں نہ جانے کیوں خود بخود جھپک گئیں۔ اگر کچھ دیر اور میں یہاں کھڑا رہوں تو روشنی کو بھی دیکھ سکتا ہوں۔ وہ بھی تو اسکول کے لیے نکلتی گی۔

”ابو، چلتے ناشتا کر لیں۔ اسکول کو دیر ہو رہی ہے۔“ فraz کی آواز اس کے کانوں میں آ گئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ فraz اسے بلانے چھت پر آ گیا تھا۔ اب وہ اسے کیا بتاتا کہ کسے دیکھنے وہ یہاں کھڑا ہے۔ وہ اس کے ساتھ چھت سے نیچے اتر آیا۔

وہ ناشتا کرنے کے بعد فraz کے ساتھ باہر نکلا تو آج پہلی مرتبہ اس کا جی چاہا کہ عمرانہ اسے رخصت کرنے کے لیے دروازے پر آئے۔ وہ ٹھوڑی دیر دروازے پر رک بھی رہا لیکن عمرانہ کا یہ معمول تھا ہی نہیں۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور دروازہ بند کر کے باہر نکل گیا۔

دوسرے دن وہ جان بوجھ کر اسکول کے وقت سے بہت پہلے اٹھ گیا۔ چرووں کی طرح سے نکلا اور چھت پر پہنچ گیا۔ آج کبر اٹھا تھا کہ ہاتھ بھر آکے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ کبر کے اس پار راحیلہ کی چھت پر کوئی آیا تھا۔ ایاز کا خون اس کی رگوں میں جھنکے لگا۔ شاید راحیلہ بھی مجھے دیکھنے کی مشتاق ہے۔ اسے معلوم ہو گیا ہوگا کہ میں چھت پر آتا ہوں۔ وہ مجھے دیکھنے آئی ہوگی۔ برا ہوا اس کبر کا کچھ نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔

دھوپ میں چلتا ہوا یہ سانس چھت کے ایک خاص حصے تک آیا۔ شاید اس دیوار تک جہاں کھڑے ہو کر دوسری چھت کو دیکھا جاسکتا تھا۔ پھر وہ سایہ اسی دھوپ سے لڑتا ہوا واپس ہو گیا اور نیچے اترنے والے نینکے چلا گیا۔

کچھ نظر نہیں آ رہا تھا اور سورج نکلنے کے انتظار میں اسکول کا وقت گزر جاتا۔ اس نے گلی میں جھانک کر دیکھا۔ کبر کی چادر یہاں بھی بچھی ہوئی تھی۔ وہ مایوس ہو کر چھت سے نیچے آ گیا۔ عمرانہ گلی میں اور بچن میں ناشتا تیار کر رہی تھی۔ ایاز بے دلی سے تیار ہونے لگا۔

وہ اسی کبر میں گھر سے نکلا اور اسکول کے لیے روانہ ہو گیا۔ اسکول تک پہنچتے پہنچتے کبر کم ہو گئی تھی لیکن اب وہ لوٹ کر نہیں آ سکتا تھا۔

اچھے دن اسکول کی چھٹی تھی۔ اس نے ایک دن پہلے

وہ تھک ہار کر وہاں سے بیٹے ہی والا تھا کہ راحیلہ کا دروازہ کھلا اور راحیلہ کا شوہر باہر نکلا۔ اس کے پیچھے راحیلہ بھی باہر آئی تھی۔ راحیلہ کو یہ معلوم ہی نہیں ہو سکتا تھا کہ کوئی اسے اوپر سے دیکھ رہا ہے۔ راحیلہ کا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ اپنے شوہر کو رخصت کر رہی تھی۔ ایاز کی آنکھیں نہ جانے کیوں خود بخود جھپک گئیں۔ اگر کچھ دیر اور میں یہاں کھڑا رہوں تو روشنی کو بھی دیکھ سکتا ہوں۔ وہ بھی تو اسکول کے لیے نکلتی گی۔

”ابو، چلتے ناشتا کر لیں۔ اسکول کو دیر ہو رہی ہے۔“ فraz کی آواز اس کے کانوں میں آ گئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ فraz اسے بلانے چھت پر آ گیا تھا۔ اب وہ اسے کیا بتاتا کہ کسے دیکھنے وہ یہاں کھڑا ہے۔ وہ اس کے ساتھ چھت سے نیچے اتر آیا۔

وہ ناشتا کرنے کے بعد فraz کے ساتھ باہر نکلا تو آج پہلی مرتبہ اس کا جی چاہا کہ عمرانہ اسے رخصت کرنے کے لیے دروازے پر آئے۔ وہ ٹھوڑی دیر دروازے پر رک بھی رہا لیکن عمرانہ کا یہ معمول تھا ہی نہیں۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور دروازہ بند کر کے باہر نکل گیا۔

دوسرے دن وہ جان بوجھ کر اسکول کے وقت سے بہت پہلے اٹھ گیا۔ چرووں کی طرح سے نکلا اور چھت پر پہنچ گیا۔ آج کبر اٹھا تھا کہ ہاتھ بھر آکے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ کبر کے اس پار راحیلہ کی چھت پر کوئی آیا تھا۔ ایاز کا خون اس کی رگوں میں جھنکے لگا۔ شاید راحیلہ بھی مجھے دیکھنے کی مشتاق ہے۔ اسے معلوم ہو گیا ہوگا کہ میں چھت پر آتا ہوں۔ وہ مجھے دیکھنے آئی ہوگی۔ برا ہوا اس کبر کا کچھ نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔

دھوپ میں چلتا ہوا یہ سانس چھت کے ایک خاص حصے تک آیا۔ شاید اس دیوار تک جہاں کھڑے ہو کر دوسری چھت کو دیکھا جاسکتا تھا۔ پھر وہ سایہ اسی دھوپ سے لڑتا ہوا واپس ہو گیا اور نیچے اترنے والے نینکے چلا گیا۔

کچھ نظر نہیں آ رہا تھا اور سورج نکلنے کے انتظار میں اسکول کا وقت گزر جاتا۔ اس نے گلی میں جھانک کر دیکھا۔ کبر کی چادر یہاں بھی بچھی ہوئی تھی۔ وہ مایوس ہو کر چھت سے نیچے آ گیا۔ عمرانہ گلی میں اور بچن میں ناشتا تیار کر رہی تھی۔ ایاز بے دلی سے تیار ہونے لگا۔

وہ اسی کبر میں گھر سے نکلا اور اسکول کے لیے روانہ ہو گیا۔ اسکول تک پہنچتے پہنچتے کبر کم ہو گئی تھی لیکن اب وہ لوٹ کر نہیں آ سکتا تھا۔

اچھے دن اسکول کی چھٹی تھی۔ اس نے ایک دن پہلے

وہ تھک ہار کر وہاں سے بیٹے ہی والا تھا کہ راحیلہ کا دروازہ کھلا اور راحیلہ کا شوہر باہر نکلا۔ اس کے پیچھے راحیلہ بھی باہر آئی تھی۔ راحیلہ کو یہ معلوم ہی نہیں ہو سکتا تھا کہ کوئی اسے اوپر سے دیکھ رہا ہے۔ راحیلہ کا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ اپنے شوہر کو رخصت کر رہی تھی۔ ایاز کی آنکھیں نہ جانے کیوں خود بخود جھپک گئیں۔ اگر کچھ دیر اور میں یہاں کھڑا رہوں تو روشنی کو بھی دیکھ سکتا ہوں۔ وہ بھی تو اسکول کے لیے نکلتی گی۔

”ابو، چلتے ناشتا کر لیں۔ اسکول کو دیر ہو رہی ہے۔“ فraz کی آواز اس کے کانوں میں آ گئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ فraz اسے بلانے چھت پر آ گیا تھا۔ اب وہ اسے کیا بتاتا کہ کسے دیکھنے وہ یہاں کھڑا ہے۔ وہ اس کے ساتھ چھت سے نیچے اتر آیا۔

وہ ناشتا کرنے کے بعد فraz کے ساتھ باہر نکلا تو آج پہلی مرتبہ اس کا جی چاہا کہ عمرانہ اسے رخصت کرنے کے لیے دروازے پر آئے۔ وہ ٹھوڑی دیر دروازے پر رک بھی رہا لیکن عمرانہ کا یہ معمول تھا ہی نہیں۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور دروازہ بند کر کے باہر نکل گیا۔

دوسرے دن وہ جان بوجھ کر اسکول کے وقت سے بہت پہلے اٹھ گیا۔ چرووں کی طرح سے نکلا اور چھت پر پہنچ گیا۔ آج کبر اٹھا تھا کہ ہاتھ بھر آکے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ کبر کے اس پار راحیلہ کی چھت پر کوئی آیا تھا۔ ایاز کا خون اس کی رگوں میں جھنکے لگا۔ شاید راحیلہ بھی مجھے دیکھنے کی مشتاق ہے۔ اسے معلوم ہو گیا ہوگا کہ میں چھت پر آتا ہوں۔ وہ مجھے دیکھنے آئی ہوگی۔ برا ہوا اس کبر کا کچھ نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔

دھوپ میں چلتا ہوا یہ سانس چھت کے ایک خاص حصے تک آیا۔ شاید اس دیوار تک جہاں کھڑے ہو کر دوسری چھت کو دیکھا جاسکتا تھا۔ پھر وہ سایہ اسی دھوپ سے لڑتا ہوا واپس ہو گیا اور نیچے اترنے والے نینکے چلا گیا۔

کچھ نظر نہیں آ رہا تھا اور سورج نکلنے کے انتظار میں اسکول کا وقت گزر جاتا۔ اس نے گلی میں جھانک کر دیکھا۔ کبر کی چادر یہاں بھی بچھی ہوئی تھی۔ وہ مایوس ہو کر چھت سے نیچے آ گیا۔ عمرانہ گلی میں اور بچن میں ناشتا تیار کر رہی تھی۔ ایاز بے دلی سے تیار ہونے لگا۔

وہ اسی کبر میں گھر سے نکلا اور اسکول کے لیے روانہ ہو گیا۔ اسکول تک پہنچتے پہنچتے کبر کم ہو گئی تھی لیکن اب وہ لوٹ کر نہیں آ سکتا تھا۔

اچھے دن اسکول کی چھٹی تھی۔ اس نے ایک دن پہلے

وہ تھک ہار کر وہاں سے بیٹے ہی والا تھا کہ راحیلہ کا دروازہ کھلا اور راحیلہ کا شوہر باہر نکلا۔ اس کے پیچھے راحیلہ بھی باہر آئی تھی۔ راحیلہ کو یہ معلوم ہی نہیں ہو سکتا تھا کہ کوئی اسے اوپر سے دیکھ رہا ہے۔ راحیلہ کا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ اپنے شوہر کو رخصت کر رہی تھی۔ ایاز کی آنکھیں نہ جانے کیوں خود بخود جھپک گئیں۔ اگر کچھ دیر اور میں یہاں کھڑا رہوں تو روشنی کو بھی دیکھ سکتا ہوں۔ وہ بھی تو اسکول کے لیے نکلتی گی۔

”ابو، چلتے ناشتا کر لیں۔ اسکول کو دیر ہو رہی ہے۔“ فraz کی آواز اس کے کانوں میں آ گئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ فraz اسے بلانے چھت پر آ گیا تھا۔ اب وہ اسے کیا بتاتا کہ کسے دیکھنے وہ یہاں کھڑا ہے۔ وہ اس کے ساتھ چھت سے نیچے اتر آیا۔

وہ ناشتا کرنے کے بعد فraz کے ساتھ باہر نکلا تو آج پہلی مرتبہ اس کا جی چاہا کہ عمرانہ اسے رخصت کرنے کے لیے دروازے پر آئے۔ وہ ٹھوڑی دیر دروازے پر رک بھی رہا لیکن عمرانہ کا یہ معمول تھا ہی نہیں۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور دروازہ بند کر کے باہر نکل گیا۔

دوسرے دن وہ جان بوجھ کر اسکول کے وقت سے بہت پہلے اٹھ گیا۔ چرووں کی طرح سے نکلا اور چھت پر پہنچ گیا۔ آج کبر اٹھا تھا کہ ہاتھ بھر آکے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ کبر کے اس پار راحیلہ کی چھت پر کوئی آیا تھا۔ ایاز کا خون اس کی رگوں میں جھنکے لگا۔ شاید راحیلہ بھی مجھے دیکھنے کی مشتاق ہے۔ اسے معلوم ہو گیا ہوگا کہ میں چھت پر آتا ہوں۔ وہ مجھے دیکھنے آئی ہوگی۔ برا ہوا اس کبر کا کچھ نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔

دھوپ میں چلتا ہوا یہ سانس چھت کے ایک خاص حصے تک آیا۔ شاید اس دیوار تک جہاں کھڑے ہو کر دوسری چھت کو دیکھا جاسکتا تھا۔ پھر وہ سایہ اسی دھوپ سے لڑتا ہوا واپس ہو گیا اور نیچے اترنے والے نینکے چلا گیا۔

کچھ نظر نہیں آ رہا تھا اور سورج نکلنے کے انتظار میں اسکول کا وقت گزر جاتا۔ اس نے گلی میں جھانک کر دیکھا۔ کبر کی چادر یہاں بھی بچھی ہوئی تھی۔ وہ مایوس ہو کر چھت سے نیچے آ گیا۔ عمرانہ گلی میں اور بچن میں ناشتا تیار کر رہی تھی۔ ایاز بے دلی سے تیار ہونے لگا۔

وہ اسی کبر میں گھر سے نکلا اور اسکول کے لیے روانہ ہو گیا۔ اسکول تک پہنچتے پہنچتے کبر کم ہو گئی تھی لیکن اب وہ لوٹ کر نہیں آ سکتا تھا۔

اچھے دن اسکول کی چھٹی تھی۔ اس نے ایک دن پہلے

وہ تھک ہار کر وہاں سے بیٹے ہی والا تھا کہ راحیلہ کا دروازہ کھلا اور راحیلہ کا شوہر باہر نکلا۔ اس کے پیچھے راحیلہ بھی باہر آئی تھی۔ راحیلہ کو یہ معلوم ہی نہیں ہو سکتا تھا کہ کوئی اسے اوپر سے دیکھ رہا ہے۔ راحیلہ کا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ اپنے شوہر کو رخصت کر رہی تھی۔ ایاز کی آنکھیں نہ جانے کیوں خود بخود جھپک گئیں۔ اگر کچھ دیر اور میں یہاں کھڑا رہوں تو روشنی کو بھی دیکھ سکتا ہوں۔ وہ بھی تو اسکول کے لیے نکلتی گی۔

”ابو، چلتے ناشتا کر لیں۔ اسکول کو دیر ہو رہی ہے۔“ فraz کی آواز اس کے کانوں میں آ گئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ فraz اسے بلانے چھت پر آ گیا تھا۔ اب وہ اسے کیا بتاتا کہ کسے دیکھنے وہ یہاں کھڑا ہے۔ وہ اس کے ساتھ چھت سے نیچے اتر آیا۔

وہ ناشتا کرنے کے بعد فraz کے ساتھ باہر نکلا تو آج پہلی مرتبہ اس کا جی چاہا کہ عمرانہ اسے رخصت کرنے کے لیے دروازے پر آئے۔ وہ ٹھوڑی دیر دروازے پر رک بھی رہا لیکن عمرانہ کا یہ معمول تھا ہی نہیں۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور دروازہ بند کر کے باہر نکل گیا۔

دوسرے دن وہ جان بوجھ کر اسکول کے وقت سے بہت پہلے اٹھ گیا۔ چرووں کی طرح سے نکلا اور چھت پر پہنچ گیا۔ آج کبر اٹھا تھا کہ ہاتھ بھر آکے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ کبر کے اس پار راحیلہ کی چھت پر کوئی آیا تھا۔ ایاز کا خون اس کی رگوں میں جھنکے لگا۔ شاید راحیلہ بھی مجھے دیکھنے کی مشتاق ہے۔ اسے معلوم ہو گیا ہوگا کہ میں چھت پر آتا ہوں۔ وہ مجھے دیکھنے آئی ہوگی۔ برا ہوا اس کبر کا کچھ نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔

دھوپ میں چلتا ہوا یہ سانس چھت کے ایک خاص حصے تک آیا۔ شاید اس دیوار تک جہاں کھڑے ہو کر دوسری چھت کو دیکھا جاسکتا تھا۔ پھر وہ سایہ اسی دھوپ سے لڑتا ہوا واپس ہو گیا اور نیچے اترنے والے نینکے چلا گیا۔

کچھ نظر نہیں آ رہا تھا اور سورج نکلنے کے انتظار میں اسکول کا وقت گزر جاتا۔ اس نے گلی میں جھانک کر دیکھا۔ کبر کی چادر یہاں بھی بچھی ہوئی تھی۔ وہ مایوس ہو کر چھت سے نیچے آ گیا۔ عمرانہ گلی میں اور بچن میں ناشتا تیار کر رہی تھی۔ ایاز بے دلی سے تیار ہونے لگا۔

وہ اسی کبر میں گھر سے نکلا اور اسکول کے لیے روانہ ہو گیا۔ اسکول تک پہنچتے پہنچتے کبر کم ہو گئی تھی لیکن اب وہ لوٹ کر نہیں آ سکتا تھا۔

اچھے دن اسکول کی چھٹی تھی۔ اس نے ایک دن پہلے

وہ تھک ہار کر وہاں سے بیٹے ہی والا تھا کہ راحیلہ کا دروازہ کھلا اور راحیلہ کا شوہر باہر نکلا۔ اس کے پیچھے راحیلہ بھی باہر آئی تھی۔ راحیلہ کو یہ معلوم ہی نہیں ہو سکتا تھا کہ کوئی اسے اوپر سے دیکھ رہا ہے۔ راحیلہ کا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ اپنے شوہر کو رخصت کر رہی تھی۔ ایاز کی آنکھیں نہ جانے کیوں خود بخود جھپک گئیں۔ اگر کچھ دیر اور میں یہاں کھڑا رہوں تو روشنی کو بھی دیکھ سکتا ہوں۔ وہ بھی تو اسکول کے لیے نکلتی گی۔

”ابو، چلتے ناشتا کر لیں۔ اسکول کو دیر ہو رہی ہے۔“ فraz کی آواز اس کے کانوں میں آ گئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ فraz اسے بلانے چھت پر آ گیا تھا۔ اب وہ اسے کیا بتاتا کہ کسے دیکھنے وہ یہاں کھڑا ہے۔ وہ اس کے ساتھ چھت سے نیچے اتر آیا۔

وہ ناشتا کرنے کے بعد فraz کے ساتھ باہر نکلا تو آج پہلی مرتبہ اس کا جی چاہا کہ عمرانہ اسے رخصت کرنے کے لیے دروازے پر آئے۔ وہ ٹھوڑی دیر دروازے پر رک بھی رہا لیکن عمرانہ کا یہ معمول تھا ہی نہیں۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور دروازہ بند کر کے باہر نکل گیا۔

دوسرے دن وہ جان بوجھ کر اسکول کے وقت سے بہت پہلے اٹھ گیا۔ چرووں کی طرح سے نکلا اور چھت پر پہنچ گیا۔ آج کبر اٹھا تھا کہ ہاتھ بھر آکے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ کبر کے اس پار راحیلہ کی چھت پر کوئی آیا تھا۔ ایاز کا خون اس کی رگوں میں جھنکے لگا۔ شاید راحیلہ بھی مجھے دیکھنے کی مشتاق ہے۔ اسے معلوم ہو گیا ہوگا کہ میں چھت پر آتا ہوں۔ وہ مجھے دیکھنے آئی ہوگی۔ برا ہوا اس کبر کا کچھ نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔

دھوپ میں چلتا ہوا یہ سانس چھت کے ایک خاص حصے تک آیا۔ شاید اس دیوار تک جہاں کھڑے ہو کر دوسری چھت کو دیکھا جاسکتا تھا۔ پھر وہ سایہ اسی دھوپ سے لڑتا ہوا واپس ہو گیا اور نیچے اترنے والے نین

ہی پروگرام بنایا تھا کہ وہ فراز اور عمران کو لے کر قصبے سے دو میل دور واقع جمیل پر جائے گا۔ دن بھر وہاں گزار کر شام کو گھر آئے گا۔

اسے گھر سے وحشت ہونے لگی تھی۔ عجیب سی نفسیات ہو گئی تھی۔ وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ راحیلہ اسے نظر آنی رہے اور یہ بھی چاہتا تھا کہ راحیلہ کو نہ معلوم ہو کہ وہ اسے دیکھ رہا تھا۔ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ فراز، روشنی کے ساتھ کھیلے۔ اسی لیے وہ فراز کو اپنے ساتھ لگے رکھتا تھا۔

چھٹی کا دن تھا۔ اسے معلوم تھا راحیلہ دیر سے سوکر اٹھے گی۔ اس کا شوہر بھی شاید نہ جائے۔ وہ دروازے پر بھی نہیں آئے گی۔ اس لیے وہ چھت پر بھی نہیں گیا۔ دن چڑھنے سے پہلے وہ پوری بیویوں کو لے کر گھر سے نکل گیا۔ جمیل تک جانے کے لیے ٹیکسیا چلی گئی تھیں۔ اس نے بھی ٹیکسیا کر لی۔

عمران نے خبر گیری کی کہ وہ کس سے مل گیا۔ یہاں آیا ہے۔ وہ تو بس یہ سمجھ رہی تھی کہ ایاز کو اس کا کتنا خیال ہے۔ اسے نفرت کے لیے جمیل پر لے آئے حالانکہ وہ چھٹی کے دن آرام بھی کر سکتا تھا۔ وہ جمیل بھی ایک جگہ کہ وہ خوش ہو گئی۔ پتا بھی نہیں چلا کہ دن کب گزر گیا۔

ایاز کی بے یقینی روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ اب وہ صبح اسکول جانے سے پہلے باقاعدگی سے چھت پر جا رہا تھا۔ اسکول سے آنے کے بعد بھی دوپہر سے شام تک صدا چکر لگا لیتا تھا۔ کئی مرتبہ اسے کامیابی بھی ہوئی۔ اسے راحیلہ کی ایک جھلک نظر آ گئی۔ پھر اس نے اوپر کے کمرے میں ایک میز اور ایک کرسی ڈال لی کہ یہاں بیٹھ کر کچھ بڑھ لکھ لیا کریں گا۔

عمران اس کی ان بے تابوں کو یہ غور دیکھ رہی تھی۔ وہ منہ پھٹ عورت تھی آخر ایک روز پوچھ ہی لیا کہ وہ ہر وقت چھت پر رہنے کی کوشش کیوں کرتا ہے۔ اس کے پوچھنے کا مقصد یہ تھا کہ مجھ سے اتنے بے زاریوں ہو گئے ہو۔ ایاز نے محسوس کیا کہ بس اب راز کھلنے کا وقت قریب آ گیا ہے۔ عمران کسی دن راحیلہ کے پاس بھی پہنچ جائے گی اور اس سے کہے گی، میرا میاں تمہاری وجہ سے چھت پر آتا ہے۔ وہ اپنی میز کرسی اٹھا کر نیچے لے آیا۔

اب اس نے چھت پر جانا چھوڑ دیا تھا لیکن بہانے بہانے سے دن میں کئی مرتبہ کئی جگہ تک آتا تھا کہ کسی طرح راحیلہ کو دیکھ لے یا روشنی نظر آجائے لیکن راحیلہ نے روشنی کو نہ جانے کس غلاف میں چھپا لیا تھا کہ اس کی آواز تک سنائی نہیں دیتی تھی۔ راحیلہ کو تو اس نے ایک مرتبہ بڑی خریدتے ہوئے دیکھ بھی لیا تھا لیکن روشنی اسے پھر بھی نظر نہ

آئی۔ وہ اسکول کب جاتی ہے واپس کب آتی ہے کچھ معلوم نہیں ہوتا تھا۔ راحیلہ نے اسے کسی رشتے دار کے پاس بھیج دیا ہے یا گھر میں ہی نہیں چھپا دیا ہے۔ ایک معا تھا، سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔

وہ تلاش کی اس دھوپ چھاؤں سے تنگ آ چکا تھا۔ عمران نے بھی اپنی پڑ پڑی ہوئی کھٹی کھٹی اس سے لڑتی ہی رہتی تھی۔ وہ سوچنے لگا اگر وہ قصبہ پہاڑی میں مزید کچھ دن رہا تو بالکل ہو جائے گا۔ بالکل نہیں بھی ہوا تو کسی نہ کسی دن یہ راز تو کھل کر رہے گا۔ اسے فراز کی فکر بھی تھی۔ وہ اسے روشنی سے بچا کر رکھنا چاہتا تھا۔ سال دو سال بعد فراز بڑا ہو جائے گا تو پھر اسے روشنی سے دور رکھنا مشکل ہو جائے گا۔ میں اگر کیکش پور واپس چلا جاؤں تو یہ سب مقاصد پورے ہو سکتے ہیں۔ یہاں رہوں گا تو راحیلہ کی کشش مجھے بھینچتی رہے گی۔ اسے متناہس یاد آ گیا۔ متناہس ایک خاص فاصلے سے لوے کو اپنی طرف کھینچتے ہیں لیکن اگر فاصلہ بڑھا دیا جائے تو اس کی کشش بے کار ہو جاتی ہے۔ میں بھی راحیلہ سے بہت قریب آ گیا ہوں مجھے دور ہو جانا چاہیے ورنہ وہ طوفان آسکتا ہے جو دو گھروں کی تباہی کا باعث ہو سکتا ہے۔

”عمران، میں بڑے شوق سے یہاں آیا تھا مگر اب میرا دل چاہا تو ہو گیا ہے۔“ ایک دن ایاز نے عمران سے کہا۔ ”میں تو شوق سے بھی نہیں آئی تھی۔ مجھ سے تو پوچھو مجھ پر کیا گزر رہی ہوگی۔“

”سوچتا ہوں ٹرانسفر کر کے واپس چلا جاؤں۔“ ”مجھے تو اس قصبے میں آسیب معلوم ہوتا ہے، آپ بھی بول گئے ہیں، وہ نہیں رہے جو وہاں پر تھے۔ تنہائی کی قید ہے جو ہم دونوں کاٹ رہے ہیں۔“

”مجھ پر حکومت کی طرف سے یہ پابندی ہے کہ ایک سال سے پہلے ٹرانسفر نہیں کر سکتا ورنہ کل ہی سامان اٹھاؤں۔“ ”ایک سال میں دو مہینے تو کم رہ گئے ہیں۔ کچھ دن اور کانٹوں پر سولوں کی۔ فراز کے امتحان بھی ہو جائیں گے۔“ ”تیار کرو۔ اب یہاں رہنا نہیں جاتا۔“

عمران تو جیسے خوشی سے پاگل ہو گئی۔ جو بات وہ کہتا چاہتی تھی، ایاز نے خود کہہ دی تھی۔ تیاری کیا کرنی تھی، بس وہ دن کتنے میں لگ گئی کہ کب دو مہینے پورے ہوں اور کب وہ یہاں سے جائے۔

دن تو کتنی میں بندریت کی طرح ہوتے ہیں۔ ریت آہستہ آہستہ کم ہوتی رہتی ہے، دن گزرتے رہتے ہیں، یہ دن بھی کب رکے والے تھے۔

ایاز نے ٹرانسفر کی درخواست دیدی تھی۔ اس سلسلے میں اسے ایک آدھ مرتبہ کیکش پور بھی جانا پڑا۔ یہاں سے ٹرانسفر ہوتا اتنا آسان نہیں تھا۔ ایاز نے یہ تک سوچ لیا تھا کہ اگر درخواست منظور نہیں ہوئی تو وہ اسے کھینچ لیا تو یہاں نہیں رہے گا۔ آخر تنہا جدوجہد کے بعد اس کا ٹرانسفر ہو گیا۔

”عمران کل تو ہم جا رہے ہیں۔ تم جا کر اپنی پڑوس سے مل آؤ۔ کیا خراب ملنا ہوتا بھی ہے یا نہیں۔“ ”اس عورت نے جو سلوک میرے ساتھ کیا ہے اس کے بعد ملنے کو مل نہیں چاہتا لیکن آپ کہتے ہیں تو چلی جاتی ہوں۔“ ”فراز کو بھی ملنی جاؤ۔“

ایاز یہ جانا چاہتا تھا کہ ہمارے یہاں سے جانے پر راحیلہ کے تاثرات کیا ہوتے ہیں۔ اسی لیے اس نے عمران کو اس سے ملنے کی اجازت دی تھی۔ اس کے جانے کے بعد وہ آخری مرتبہ چھت پر گیا تھا۔ اس لیے نہیں کہ اسے راحیلہ کے آنے کی امید تھی بلکہ اس لیے کہ وہ ماضی کی یادوں کے طور پر اس چھت کو اپنی آنکھوں کے خزانے میں بند کر لیتا چاہتا تھا۔ وہ بڑے دکھ سے ان دونوں چھتوں کو دیکھتا رہا۔ اب یہاں کیا آنا ہوگا۔ کبھی کبھی راحیلہ کو دیکھنے کا موقع مل جاتا تھا۔ اب شاید وہ بھی دیکھنے کو نہ ملے۔ روشنی کے لیے میں کچھ بھی نہ کر سکا۔ مجھے وقت اسے دیکھ لیں گا۔ کبھی میرے لیے بہت ہوگا۔ زردی انہی مجبور یوں کا نام ہے۔

عمران جب تک آئیں گی وہ چھت پر ہی رہا۔ عمران کے آنے کے بعد وہ نیچے آ رہا۔ وہ پوچھنا چاہتا تھا کہ راحیلہ کے تاثرات کیا تھے۔ لیکن آغا زخود عمران نے کر دیا۔ ”عجب پر اسرار عورت ہے، مجھے تو اس سے ڈر لگنے لگا ہے۔“ ”کیا ہو گیا۔“

”یا تو ایسی کتنی تھی کہ بالکل ہی ہمارا بایکاٹ کر دیا تھا یا مجھے گلے سے لگا کر ایسی روٹی کہ مجھے بھی ملا دیا۔“ ”ہاں پھر نے کا احساس ہوتا ہے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔“ ”کہہ رہی تھی بعض مجبوریاں ایسی تھیں کہ مجھے تم سے قطع تعلق کرنا پڑا۔ اس قطع تعلق میں میرا نہیں تمہارا فائدہ تھا۔ بھلا بتاؤ تو میرا کیا فائدہ ہو سکتا تھا۔“

”تم نے پوچھا نہیں وہ کیا مجبور تھی۔“ ”پوچھا تھا، سننے کی میرے محبوب شوہر سے میرا یہی وعدہ تھا۔ بھلا بتاؤ، یہ کوئی جواب ہوا البتہ ایک بات اس نے بڑی معقول کہی۔ کہنے لگی، آپ لوگ برابر میں تھے تو یہ احساس رہتا تھا کہ کوئی اپنا ہے۔ آپ لوگ چلے جائیں گے تو پھر وہی تنہائی کوئی نہ کوئی یہاں آ کر ضرور رہے گا مگر آپ کی

بات اور تھی۔“ ”روشنی کو لے آئیں۔ میں ایک نظر دیکھ تو لیتا۔“ ایاز نے کہا۔

”وہ سو رہی تھی۔“ ”بہانہ کیا ہوگا۔“ ”نہیں، میں خود دیکھ کر آئی تھی۔ وہ کمرے میں سو رہی تھی۔“ ”خیر، پرانی اولاد پر ہمارا کیا حق۔“

”آپ یہ کہہ رہے ہیں۔ میں نے جب کہا کہ ایاز، روشنی کو دیکھنا چاہتے ہیں تو اس نے کہا۔“ ”یہ ان کی بیٹی ہے، جیسے ہی سو کر اٹھے گی میں خود لے کر تمہارے پاس آؤں گی۔“ ”کچھ دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی شاید راحیلہ ہوگی۔ روشنی کو لے کر آئی ہوگی۔“

”اسے اندر مت بلانا۔“ ایاز نے کہا۔ ”صرف روشنی کو لے آنا۔“

”وہ اگر آتا چاہے گی تو میں کیا منع کر دوں گی۔“ ”پھر مجبور ہے۔“ ایاز نے کہا اور اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا کہ اگر راحیلہ اندر آ بھی جائے تو اس سے سامنا نہ ہو۔

راحیلہ نے اندر آنے کو نہیں کہا صرف روشنی کو چھوڑ کر چلی گئی اور یہ بھی کہہ گئی کہ تم خود اسے چھوڑ جانا، میں لینے نہیں آؤں گی۔ میری تمہاری ملاقات اب سچ ہی ہوگی۔

روشنی جیسے ہی اندر آئی ایاز نے اسے گود میں اٹھا لیا۔ بے اختیار اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ بڑی پیاری بچی ہے کل کے بعد اس سے ملاقات کہاں ہوگی۔ خدا اس کا مقدر اچھا کرے۔“

ایاز اور فراز دونوں مل کر اس کے ساتھ کھیلے رہے۔ رات کا کھانا بھی روشنی نے ان کے ساتھ کھایا۔ اسے تو شاید یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ لوگ کل چلے جائیں گے۔ وہ اپنی باتوں سے سب کو ہنساتی رلاتی رہی۔ پھر کہنے لگی مجھے نیند آرہی ہے مجھے میری امی کے پاس چھوڑ آؤ۔ عمران اسے اس کے گھر چھوڑ آئی۔

فراز اس دور ان بالکل چب رہا تھا۔ اس نے روشنی کے ساتھ کھیلے میں کھیلنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ بظاہر یہ لگتا تھا کہ وہ اس سے ناراض ہے۔ اس کے جانے ہی وہ بستر پر اونٹھ سے منہ کر پڑا اور سسکیاں بھر بھر کے رونے لگا۔ عمران اندر گئی تو اسے روتے ہوئے دیکھا۔ یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ کیوں رو رہا ہے۔ اس نے اس کا سراپا گود میں رکھ لیا۔

”جیہا، ہمیں یہاں ہمیشہ نہیں رہنا تھا۔ کبھی نہ کبھی تو یہاں سے جانا تھا۔ روٹی کو ہم ساتھ نہیں لے جاسکتے۔ اسے بھول جاؤ ہم کیلاش پور جا رہے ہیں۔ وہاں تمہارے پرانے دوست ملیں گے۔ ان کے ساتھ خوب کھیلنا۔“

”آپ لوگوں نے مجھے روشنی کے ساتھ نہیں کھیلنے دیا۔ اب دیکھنا میں کسی کے ساتھ نہیں کھیلوں گا۔ زندگی میں میرا کوئی دوست نہیں ہوگا۔“

”ایسا نہیں کہتے جیہا۔ ابھی تمہیں خوب پڑھنا ہے۔ پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بننا ہے۔“

وہ رات اسی طرح گزر گئی۔ ایاز یہاں سے جاتا بھی چاہتا تھا اور اب اسے بچہ پانچ دھکے بھی ہو رہا تھا بالکل اسی طرح جیسے کسی کے گھر چوری ہو کر چور توڑا مال لے جائیں بہت سارا چھوڑ جائیں۔ اس چوری کا انفسوس بھی ہوگا اور خوشی بھی کہ بہت سارا مال بچ بھی تو گیا۔ اس نے یہاں آکر بہت کچھ گنوا دیا تھا مگر بہت کچھ بچا بھی لے جا رہا تھا۔

صبح ہوئی تو وہ دو تانگے لے کر آگیا۔ سامان زیادہ ہو گیا تھا لہذا ایک تانگے پر سامان رکھا گیا دوسرے میں عمران، فراز اور وہ خود بیٹھا۔

جس وقت تانگے میں سامان رکھا جا رہا تھا، اس نے دیکھا راحیلہ کے دروازے سے دو آنکھیں باہر جھانک رہی تھیں۔ یہ یقیناً راحیلہ تھی جو آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے رخصت کر رہی تھی۔ روشنی اسکول گئی ہوئی تھی۔ وہ جب آئی ہوگی تو اسے معلوم ہوا ہوگا کہ پنجرہ خالی پڑا ہے، پتھی اڑ گیا۔ دونوں تانگے ایک ساتھ چلے۔ ایاز بڑی دیر تک آگے کا سفر پیچھے کی طرف دیکھتا رہا۔ تانگے اسی بازار سے گزر رہے تھے جہاں سے کیلاش پور سے آتے ہوئے گزر رہے تھے۔ عمران اب ان دکاؤں کو غور سے نہیں دیکھ رہی تھی۔ ان کی حقیقت اس پر کھل چکی تھی۔ اب اسے سرو کے درختوں، پھولوں کی مہک اور چمنوں کی یلغار کا انتظار نہیں تھا۔ اب وہ کیلاش پور میں آباد اپنے ان رشتے داروں کو یاد کر رہی تھی جن کے گھر اسے اس وقت تک ٹھہرنا تھا جب تک کرایے کا کوئی معقول گھر ایاز کو نہیں مل جاتا۔ انہی خیالوں میں وہ اسٹیشن تک پہنچ گئی۔ تانگے والوں نے وہ سامان پلیٹ فارم تک پہنچا دیا اور گاڑی کا انتظار کرنے لگے۔ ان سے یہی طے ہوا تھا کہ اس سامان کو گاڑی میں بھی رکھوا دیں گے۔

ایک سال میں کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ وہی پلیٹ فارم تھا، وہی اکیلا پن تھا، وہی بوڑھا ہری جھنڈی دکھانے والا

تھا۔ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد ریل کی شکل دکھائی دی۔ گاڑی رکتے ہی سامان چڑھا دیا گیا۔ یہ تینوں بھی سوار ہو گئے۔ گاڑی نے کیلاش پور کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔ کیلاش پور پہنچنے کے بعد یہ چھوٹا سا قلعہ عمران کے ماموں کے گھر قیام پذیر ہوا۔ ایاز نے کرایے کا مکان ڈھونڈنے کی کوشش شروع کر دی۔ وہ صبح اسکول چلا جاتا پھر اسٹینٹ ایجنسیوں کے چکر کاٹا رہتا اور پھر شام کو گھر چلا آتا۔ اس کی یہ کوششیں رنگ لائیں اور اتفاق سے وہی مکان مل گیا جسے چھوڑ کر وہ قصبہ پہاڑی گیا تھا۔ وہ قسمت کی اس قسم ظریفی پر حیران تھا۔ اسے نہ جانے کس طاقت نے ایک سال کے لیے کیلاش پور سے باہر بھیج دیا اور پھر واپس آ کر اسے وہی مکان مل گیا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کہیں گیا ہی نہیں تھا۔

”اس ایک سال کے عرصے میں کچھ بھی تو نہیں بدلا۔“

عمران نے کہا۔ ”وہی مکان بھی مل گیا۔“

”مگر غور کرو تو بہت کچھ بدل گیا ہے عمران۔ ہمارا فراز اب پہلے جیسا نہیں رہا۔ ہم ایک شوخ اور شرارتی بچے کو اپنے ساتھ لے کر گئے تھے اور ایک سنجیدہ اور ادا اس بچے ساتھ لائے ہیں۔ وہ بہت بدل گیا ہے عمران۔“

”وقت کے ساتھ وہ بھی پہلے جیسا ہو جائے گا۔ جن تبدیلیوں کا ہمیں سامنا کرنا پڑا، انے ان تبدیلیوں کا بہت اثر لیتے ہیں۔ وہ جن چیزوں سے مانوس ہو جاتے ہیں انہیں چھوڑتے ہوئے انہیں بہت دکھ ہوتا ہے۔ وہ کچھ دن گھبرایا گھبرایا رہے گا پھر اسکول جانے لگے گا، گھر سے باہر نکلے گا، پرانے دوستوں سے ملاقات ہوگی تو وہ پھر سے بدل جائے گا۔“

عمران نے ایاز کو مطمئن تو کر دیا تھا لیکن خود اندر سے ڈری ہوئی تھی۔ اس کے کانوں میں وہ الفاظ گونج رہے تھے جو قصبہ پہاڑی سے چلے وقت فراز نے اس سے کہے تھے۔ اس نے کہا تھا آپ لوگوں نے مجھے روشنی کے ساتھ نہیں کھیلنے دیا، اب دیکھنا میں کسی کے ساتھ نہیں کھیلوں گا۔ زندگی میں میرا کوئی دوست نہیں ہوگا۔“

وہ اپنے کے پرمل کر رہا تھا۔ منٹے کے پرانے دوست اسے ملا بلا کر ٹھک ٹھک گئے تھے مگر وہ کسی کے ساتھ کھیلنے پر تیار نہیں تھا۔ اگر اس کا یہ رویہ نہیں بدلا تو وہ زندگی کا منٹے کا لائق نہیں رہے گا اور اگر یہ منٹے کسی دن بغاوت کی صورت اختیار کر گیا تو نہ جانے کس کس طرح اپنے آپ کو بگاڑ بیٹھے گا۔

ایاز نے اسے اپنے اسکول میں داخل کرادیا تا کہ گھرانی میں رہے لیکن چند ہی روز میں اسے چھٹا داؤ بونے لگا۔ کہیں اور پڑھ رہا ہوتا تو کم از کم ایاز کو اس شرمندگی کا سامنا تو نہ کرنا

پڑتا جس کا سامنا اسے اب کرنا پڑ رہا تھا۔ اس کے اساتذہ کو اس سے یہ شکایت نہیں تھی کہ وہ شرارتی ہے یا کسی کو اس کی ذات سے نقصان پہنچ رہا ہے لیکن یہ شکایتیں روز آتی تھیں کہ زندہ لوگوں کی طرح ہے ہی نہیں۔ ایک چلتی پھرتی روح ہے جو کلاس میں آکر بیٹھ جاتی ہے اور اٹھ کر چلی جاتی ہے۔ ذہین ترین لڑکا نہایت ہی ثابت ہو رہا تھا۔ اس پر نہ کسی کی ڈانٹ کا اثر ہو رہا تھا نہ کسی کی مار کا۔ اس کا حافظہ اتنا زبردست تھا کہ سبق اگر ایک دفعہ بھی پڑھ لیتا تو زبانی یاد کر لیتا لیکن حافظہ بھی جب کام کرتا جب وہ کچھ پڑھتا۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے جان بوجھ کر سبق یاد ہی نہیں کر رہا ہے۔

امتحان کے دن آئے۔ عمران اور ایاز نے بہت سمجھا یا تو بے دلی سے کچھ پڑھ لیا۔ امتحان بھی پاس ہو گیا لیکن ایسے نمبر نہیں آئے جو اس کی ذہانت کے حامل لڑکے کا حق بننا تھا۔ وہ جس منظر، جس چہرے کو دیکھ لیتا تھا، اس کے حافظے میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جاتا تھا۔ اس نے کچھ دن روشنی کے ساتھ گزارے تھے، یہ بچی اس کے ذہن میں محفوظ ہو گئی تھی۔ وہ اسے بھلا نہیں پا رہا تھا۔ اس کے ذہن میں یہ بات بھی بیٹھ گئی تھی کہ اس کے ماں، باپ نے اسے روشنی سے دور کر دیا۔ پہلے تو اس کے ساتھ کھینچنے پر پابندی لگائی اور پھر اسے لے کر کیلاش پور آگئے۔ وہ دونوں کو کھنڈر وار بھرا ہوا تھا اور اپنی دانست میں دونوں سے بدلتے رہا تھا۔ جو کچھ میں نے چاہا انہوں نے نہیں دیا، اب جو کچھ میں چاہتا ہوں میں انہیں نہیں دوں گا۔ یہی سبب تھا کہ وہ بڑے پرتوجہ ہی نہیں دے رہا تھا۔ ایذا پسند ہو کر رہ گیا تھا۔ جو شخص ایذا پسند ہو جائے وہ خود کو اذیت پہنچا کر بھی خوش ہوتا ہے اور دوسروں کو اذیت میں مبتلا کر کے بھی خوش ہوتا ہے۔ فراز اپنے والدین کو اس اعزاز میں اذیت پہنچا رہا تھا کہ ان کی امیدوں پر پانی پھیرتا جا رہا تھا اور خود کو اس طرح اذیت پہنچا رہا تھا کہ اس عمر میں بھیل کود سے دور ہو گیا تھا۔ گھر پہنچتے ہی ایک کونے میں بیٹھ جاتا اور شاید خود کو قصبہ پہاڑی کے غم کو چوں میں لے جاتا۔

ایاز اسکول ماسٹر تھا۔ اگر دولت مند ہوتا تو کسی نفسیاتی ماہر ڈاکٹر سے فراز کا علاج کرایا جاسکتا تھا۔ یہ سیدھا سا نفسیاتی معاملہ تھا لیکن اس طرف کسی کا دھیان ہی نہیں گیا۔ گیا بھی ہوگا تو ان ڈاکٹروں کی فیس کون دیتا۔

عمران اپنے رشتے کے ایک بھائی کے گھر گئی ہوئی تھی۔ ان دنوں پریشانی تو تھی ہی وہاں فراز کا ذکر آیا تو ان باتوں کو چھپا نہ سکی جنہیں اب تک چھپائی رہی تھی۔ بھائی کے سامنے فراز کی حرکتوں کا ذکر آیا تو وہ سوچ میں پڑ گئے۔

”بہن، تم میاں بیوی اب تک ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہو اور بچے کی یہ حالت ہو گئی۔ اس کو تو کوئی اثر ہے۔ اگر نہ ہوتا تو کسی جھاڑ پھونک کرنے والے کو دکھا کر دیکھ لو۔ اگر میری بات جھوٹ لگتی تو اپنی ناک کٹوا لوں گا۔“

”بھائی، ہمارا کون ایسا دشمن ہے جو میرے بچے پر جادو کرے گا۔“

”صرف جادو ہی کچھ نہیں ہوتا۔ تم لوگ اس پہاڑی قصبے میں جا کر رہے تھے۔ وہ تو بھنگل ہے، کسی کی پلیٹ میں آگیا ہے بچہ۔“

”مگر وہاں تو اچھا خاصا تھا۔“

”ایک تو تم بحث بہت کرتی ہو۔ ایسی چیزوں کا اثر بہت بعد میں ہوتا ہے۔ جو بلا اس سے پہلی ہے وہ اب اپنا اثر دکھا رہی ہے۔“

”بھائی صاحب، آپ ہی کچھ کریں۔ میں تو ایسے کسی معالج کو جانتی نہیں ہوں اور ایاز تو سرے سے تعویذ گنڈوں کے قائل ہی نہیں۔ میں کس سے کہوں کس کے پاس جاؤں۔“

”میری نظر میں ہیں دو ایک جن اتارنے والے لیکن اس کے لیے ہمیں ایاز بھائی کو تیار کرنا پڑے گا۔ لے میں جاؤں گا لیکن ان کا ہونا ضروری ہے۔ کل کلاس کو کوئی بات ہو گئی تو بھائی پرانی اولاد کا معاملہ ہے۔“

”ہائے میں کیا کروں۔ میرا بچہ تو گیا ہاتھوں سے، میرا ایک ہی تو بچہ ہے۔“

”بہن، تم روٹی کیوں ہو۔ تمہارا بھائی ابھی زندہ ہے۔ تم ایاز بھائی کو سمجھاؤ، اگر وہ نہیں بھائی مانے تو میں تمہیں لے چلوں گا۔ علاج تو بہر حال کرانا ہے۔“

عمران روٹی دھوئی گھر آگئی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے ایاز کے کانوں میں بات ڈالی۔ وہ پہلے تو بہت بگڑا۔ ان علاج کرنے والوں کو برا بھلا بھی کہہ ڈالا لیکن وہ خود اتار پریشان ہو چکا تھا کہ بالآخر تیار ہو گیا مگر اس شرط پر کہ وہ خود نہیں جائے گا، عمران کو اجازت دیدے گا۔ عمران کے لیے اس کی اجازت ہی بہت تھی۔ اس نے اپنے بھائی سے کہا اور ان کے ساتھ فراز کو کسی بھائی سے وہاں لے گئی جہاں اس کے بھائی کے بقول روحانی علاج ہوتا تھا اور انہی کے بقول جو صاحب یہ کام کرتے ہیں۔ وہ بہت پیچھے ہوئے ہیں۔ ان کے قبضے میں بہت سے موکل ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

عمران کے بھائی کے ان جملی غیر صاحب سے بہت اچھے تعلقات تھے لہذا وہ ان سے اکیلے میں ملا اور انہیں بتایا کہ اس کی بہن اپنے بچے کی طرف سے بہت پریشان ہے۔

یہ لوگ قصب پہاڑی میں جا کر رہے تھے۔ وہیں سے کوئی بلا بچے کے پیچھے لگ گئی ہے۔ باقی باتیں آپ ان سے خود معلوم کر لیجئے گا۔

ضیعت الاعتقاد و عورتوں کا رش لگا ہوا تھا لیکن تعلقات کی بنا پر عمران کو پہلے بلا لیا گیا۔ فراز بھی حیران پریشان ان کے ساتھ تھا۔

”آؤ، آ جاؤ۔ مجھے معلوم تھا تم اپنے بچے کو لے کر یہاں ضرور آؤ گی۔ وقت پر آ گئیں ورنہ کھیل بگڑنے ہی والا تھا۔“ حیر صاحب نے عمران کو دیکھتے ہی کہا۔

عمران نے کچھ کہنے کو نہ کھولا ہی تھا کہ اس جعلی حیر نے ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کر دیا اور مزید ہی منہ میں کچھ پڑھنے لگا۔ عمران اس کے سامنے دم بخود بیٹھ گیا۔

”میرے موکل آ گئے ہیں، میں ان سے تمہارے بچے کے بارے میں پوچھتا ہوں۔ خبردار، راج میں مت بولنا۔“ حیر نے کہا اور پھر اپنے موکل سے مخاطب ہوا۔ ”دیکھو، یہ خاتون جو اس وقت میرے سامنے بیٹھی ہیں ان کے بچے کو دیکھو اور بتاؤ اس کے ساتھ کیا مسئلہ ہے۔“

حیر صاحب، اس طرح غور سے سننے لگے جیسے کوئی انہیں کچھ بتا رہا ہے۔ سچ میں ہوں ہاں بھی کرتے جا رہے تھے۔ جب یہ گفتگو جسے ان کے علاوہ کوئی نہیں سن رہا تھا ختم ہو گئی تو انہوں نے موکل کو چلے جانے کا حکم دیا اور عمران سے مخاطب ہوئے۔

”بچے پر سٹری کرایا عیا ہے۔ تم سال دو سال پہلے شہر سے باہر کی تھیں؟“

”جی ہاں حیر صاحب، میرے میاں کا ٹرانسفر ہو گیا تھا۔“

”قصب پہاڑی گئی تھیں۔“

”جی حیر صاحب، آپ پر تو سب روشن ہے۔“

”بچے پر سٹری وہیں کرایا گیا ہے اور بہت سخت ہے بچے کی جان بھی جاسکتی ہے۔“

”حیر صاحب، کون کراسکتا ہے۔ ہماری تو کسی سے دشمنی بھی نہیں۔“ عمران رونے لگی۔

”ہمیں نام بتانے کی اجازت نہیں صرف اشارہ دے دیتا ہوں، کرانے والی عورت ہے۔“

”میں اپنے لیے نہیں مانگ رہا ہوں، موکلوں میں تقسیم کرنے ہوتے ہیں۔“

”میں تو صرف دو ہزار لاکھ تھی۔“

”وہی نکالو، میں علاج تو شروع کروں۔ پندرہ دن کے تعویذ دے رہا ہوں۔ پندرہ دن بعد آؤ تو تین ہزار اور لے آتا۔“

حیر صاحب نے تعویذ لکھ کر دے دیے مگر صبح نہار منہ پانی میں گھول کر پلا دینا اور بچے کی کوئی پہنٹی نہیں گھر کے اندر کسی جگہ رکھ کر جلا دینا۔

عمران وہاں سے آئی تو غصے سے لال چلی ہو رہی تھی۔ اس کا شک را حیلہ پر تھا۔ اس نے آتے ہی را حیلہ کو گالیاں بھی شروع کر دیں۔ درمیان میں روشنی کا نام بھی آتی جاتا تھا۔

ایاز اسے سمجھا رہا تھا، ایسے جعلی حیر فراڈ ہوتے ہیں۔ ان کی باتوں پر اپنا خون مت جلاؤ لیکن وہ کہاں ماننے والی تھی۔

اس نے فراز کو باقاعدگی سے تعویذ پلانے شروع کر دیے تھے۔ اس کی بیس بھی جلا دی تھی لیکن اگلے بیٹے را حیلہ کو گالیاں بک رہی تھی۔

فراز یہ سب کچھ سن رہا تھا اور اندر ہی اندر کھول رہا تھا۔ وہ روشنی کو کھولا نہیں تھا۔ دل ہی دل میں اسے یاد کرتا رہتا تھا۔ روشنی کے حوالے سے را حیلہ بھی اسے عزیز تھی۔ اسے یہ گالیاں زہر لگ رہی تھیں۔ اسے یوں سے نفرت ہونے لگی جو اس کی عزیز بہتی کو برا بھلا کہہ رہی تھی۔ وہ ایک دن غصے سے پھٹ پڑا۔ اس نے ماں کو منع کیا اور جب وہ نہیں مانی تو بیوی اٹھا کر زمین پر پٹ دیا۔ بچن کے برتن توڑ ڈالے۔ ایاز جب تک اسے پکڑتا اس نے اچھا خاصا نقصان کر دیا۔

”دیکھا ہے سب سٹری کا اثر ہے۔ اس کا توڑ ہو رہا ہے تو جادو اپنا اثر دکھا رہا ہے۔“

”اس کے سامنے را حیلہ اور روشنی کو کیوں گالیاں بکتی ہو۔“

”میں تو بکوں گی۔ ابھی جاتی ہوں حیر صاحب کے پاس۔ کرتی ہوں بندوبست۔“

وہ اسی وقت گھر سے نکلی، اپنے بھائی کو ساتھ لیا اور حیر صاحب کے پاس پہنچ گئی۔ انہیں سارا احوال سنایا۔ انہوں نے پھر موکلوں کو بلایا۔ موکلوں سے گفتگو کی اور ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

”تم نے اگر اس دن پورے پیسے دے دیے ہوتے تو یہ دن دیکھنا نہ پڑتا۔ موکل ناراض ہو گئے ہیں۔“

بچے کے منہ اور سر پر اس پانی کے چھینٹے مارو، انشاء اللہ ٹھیک ہو جائے گا۔ اب جاؤ تین دن بعد آنا۔“

عمران کی غیر موجودگی میں ایاز نے فراز کو پیار سے سمجھا دیا اور اس سے یہ وعدہ لے لیا کہ آئندہ وہ یہ توڑ پھوڑ نہیں کرے گا۔ وہ سمجھ گیا لہذا عمران جب گھر آئی تو وہ پرسکون ہو چکا تھا۔ عمران نے حیر صاحب کے دیے ہوئے پانی کے چھینٹے اس کے منہ پر مارے اور پھر تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس قفل کو دہرائی دی۔ وہ اس توڑ پھوڑ کے بعد اتنا ٹھیک چکا تھا کہ پڑ کر سو گیا۔

”حیر صاحب نے یہی کہا تھا کہ پرسکون ہو کر سو جائے گا۔ یا اللہ میرے بچے کو چھپا کر دے۔“

”جب اللہ ہی سے مانگنا ہے تو اس جعلی حیر کے پتھر میں کیوں پڑی ہوئی ہو۔“

”تم ڈاکٹر کے پاس کیوں جاتے ہو بس اللہ سے شفا مانگ لیا کرو۔ کرتا تو اللہ ہی ہے مگر بندوں کے ہاتھ میں بھی شفا ہوتی ہے۔ دیکھو فائدہ ہوا یا نہیں۔ آہستہ آہستہ پورا توڑ کر دیں گے۔“

دو دن تک فراز بالکل ٹھیک رہا۔ وہ جان بوجھ کر اس کے سامنے را حیلہ کو برا بھلا کہتی رہی لیکن فراز نے کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔

”بھلا کون حیر صاحب کے پاس چلتا ہے۔ کل کے بعد میرا اہل بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔“

فراز نے خاموشی سے ماں کی بات سنی لیکن دل ہی دل میں وہ کچھ اور سوچ رہا تھا۔ وہ رات میں کسی وقت اٹھا۔ ماں کے بٹومے سے پیسے نکالے اور گھر سے نکل گیا۔ رات کافی ہو چکی تھی لیکن بڑا شہر تھا، سڑکوں پر ہلکا چمکنا ٹریفک اب بھی چل رہی تھی۔ وہ پیدل ہی ایک طرف چل دیا۔ اس کی کوئی منزل نہیں تھی لیکن یہ راستہ اسٹیشن کی طرف جاتا تھا۔ وہ اسٹیشن پہنچ گیا۔ یہاں پہنچ کر اس نے سوچا، قصب پہاڑی را حیلہ آگئی کے پاس چلا جائے۔ وہاں روشنی بھی ہوگی۔ روشنی کا خیال آتے ہی اس کے ارادوں کو پروا نہ رہی۔ وہ اٹھواری پر چلا گیا۔

معلوم ہوا قصب پہاڑی جانے والی ٹرین صبح نو بجے آئے گی۔ وہ وہیں ایک چٹخ پر پڑ کر سو گیا کچھ سوئے کچھ اٹھئے سوئے ہوئی۔ اس نے قصب پہاڑی کا ٹکٹ خریدا اور گاڑی آنے کا انتظار کرنے لگا۔ گاڑی آتے ہی پلیٹ فارم پر بھگدڑ مچ گئی۔ وہ بھی اس بھگدڑ میں شامل ہو گیا اور ایک ڈبے میں جگہ بنائی۔

وہ قصب پہاڑی کے اسٹیشن پر اترا تو اسے وہ دن یاد آ گیا جب وہ جہی مرتبہ یہاں آیا تھا۔ اس کی ماں سامان کی

کھواہی کر رہی تھی اور وہ ریل کی پٹری پر پتھر اچھال رہا تھا۔ وہ کچھ دیر ان دنوں کو یاد کرتا رہا اور پھر اسٹیشن سے باہر آ گیا۔ وہ بھی کوئی چیز بھول نہیں تھا۔ اسے روشنی کے گھر کا راستہ معلوم تھا۔ اس نے کوئی سواری کرنے کا تکلف نہیں کیا بلکہ پیدل ہی چل پڑا۔

وہ اس گھر کے سامنے کھڑا تھا جس میں کبھی اس نے ایک سال گزارا تھا۔ اس گھر کے برابر ہی روشنی کا گھر تھا۔ اسے یوں لگا جیسے روشنی ابھی بھاگتی ہوئی آئے گی اور کہے گی، فراز اتم آ گئے۔ میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔ اب تو وہ بھی بڑی ہو گئی ہوگی۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا اور دروازے پر دستک دیدی۔

”کیا بات ہے۔ بال آئی ہے یا پتنگ۔ کیا چاہیے تمہیں۔“ ایک عورت دروازے پر آئی اور اس نے اسے سوال ایک ساتھ کر دیے۔

”مجھے را حیلہ آگئی ہے ملنا ہے۔“

”کون را حیلہ آگئی۔“

”وہی جو شہر کی ماں ہیں۔ ان کے شوہر پولیس میں ہیں۔“

”اچھا وہ۔ تو اب یہاں نہیں رہتے۔“

”اب وہ کہاں رہتی ہیں؟“

”انہوں نے ہمیں یہ بتایا تھا کہ وہ لوگ کیلاش پور جا رہے ہیں۔“

”میں کیلاش پور ہی سے تو آیا ہوں۔“

”ہمیں اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں۔“ اس عورت نے کہا اور دروازہ بند کر دیا۔

اس نا کامی کے باوجود وہ خوش ہو گیا کہ روشنی، کیلاش پور میں ہے۔ کیلاش پور تو میرا اپنا شہر ہے۔ اسے وہاں کہیں نہ کہیں ڈھونڈ ہی لوں گا۔ وہ اگلے قدموں اسٹیشن کی طرف دوڑ پڑا۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ ایسی کی ٹرین ایک گھنٹے بعد آنے والی تھی اگر نکل گئی ہوتی تو اسے اس اجازت اسٹیشن پر رات کا ٹکٹ پڑتی۔ وہ اسٹیشن پر ایک میز پر بیٹھ گیا۔ یہ خیال ہی اس کے لیے خوش کن تھا کہ روشنی اس کے شہر میں ہے۔ اچانک اسے کیلاش پور اچھا لگنے لگا تھا۔ اس کا دل جا رہا تھا کہ کوئی جادو کا پرندہ آئے اور اسے اپنے پر پر بٹھا کر کیلاش پور پہنچا دے۔ جب جادو کا پرندہ ہوگا تو کیلاش پور تو کیا، وہ تو اسے اس گھر تک پہنچا دے گا جہاں روشنی رہتی ہے۔

اس پلیٹ فارم پر دو آدمی اور تھے اور تیسرا وہ تھا بہر حال ٹرین آنی اور دوسروں کے ساتھ وہ بھی سوار ہو گیا اور ٹرین کیلاش پور کی طرف دوڑنے لگی تھی۔

وہ کیلاش پور پہنچا تو اسے گھر کا خیال آیا۔ میں گھر چلا تو جاؤں لیکن اب تک تو میری ڈھونڈ بچ گئی ہوگی۔ میں کیا بتاؤں گا کہ میں کل سے کہاں تھا۔ پھر ایک خیال نے اس کی مشکل حل کر دی۔ بہانہ تو ایسا سوچا ہے کہ نہ صرف میرا قصور معاف ہو جائے گا بلکہ پہلے سے بڑھ کر محبت بھی کی جائے گی۔

وہ بے خوف ہو کر گھر پہنچ گیا۔ اس کا گھر رشتے داروں سے بھرا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی سب خوشی سے چیخنے لگے۔ عمراند کی نظر اس پر پڑی تو دوڑتی ہوئی آئی اور اسے گلے لگا کر اتار دلی کر چپ کرانا مشکل ہو گیا۔

”کہاں چلا گیا تھا میرے بچے۔ تیری ماں تیرے فراق میں اتار دلی کر رات بھر میں آدھی رہ گئی۔ دیکھ لے میرا کیا حال ہو گیا ہے۔ کہاں چلا گیا تھا تو۔“

”میں سب کے سامنے نہیں بتاؤں گا۔“ وہ اسے کرنے میں لے گیا۔ ”امی، میں گھر میں سو رہا تھا کہ ایک آدمی جس کے بڑے بڑے سینک تھے مجھے اٹھا کر قصبہ پہاڑی لے گیا۔“

”قصبہ پہاڑی؟“

”ہاں امی۔ راجیلہ آئی کی چھت پر۔ کہنے لگا تم رات بھر یہیں رہو، صبح راجیلہ آئی آئی کی۔“ میں رات بھر چھت پر رہا صبح راجیلہ آئی نہیں آئیں تو میں نیچے اتر۔ وہاں راجیلہ آئی تو نہیں میں کوئی اور عورت بھیجی جو مجھے اپنے گھر میں دیکھ کر مارنے کے لیے آئی۔ اسی وقت وہ سینکوں والا آدمی پھر آیا اور مجھے کیلاش پور لے آیا۔“

”یہ بات کسی کو بتانا مت۔“ عمراند نے کہا۔ ”بیر صاحب نے مجھے تسلی دیدی تھی کہ تمہارا بیٹا مل جائے گا۔ ان پر سب روشن ہے۔ میں ابھی جا کر انہیں بتاتی ہوں بلکہ تو بھی میرے ساتھ چل۔“

”نہیں۔ مجھے اس سینکوں والے نے منع کر دیا ہے۔“

”اچھا تو پھر میں ایکی ہو آتی ہوں۔ انہیں بتانا تو ضروری ہے۔“

عمراند بھی گھر سے چلی گئی، مہمان بھی ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے تو ایاز نے فراز کو اپنے پاس بلایا اور نہایت پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پیسرا۔

”جی جی بتاؤ تم کہاں گئے تھے۔“

”میں نے ابھی تو بتایا ہے کہ سینکوں والا آدمی مجھے اٹھا کر لے گیا تھا۔“

”تمہاری ماں اس پر یقین کر سکتی ہے، میں نہیں

کر سکتا۔ مجھے جی جی بتاؤ، میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔“

”آپ امی سے کہہ دیں گے۔“ فراز بکھلے لگے۔

”میں وعدہ کرتا ہوں تمہاری امی سے کچھ نہیں کہوں گا۔“

”امی مجھے بیر صاحب کے پاس لے جا رہی تھیں اس لیے میں گھر سے بھاگ گیا تھا۔“ ایاز پر جا کر سو گیا۔ امی کے پیسے چرائے تھے۔ دن بھر چیز کھاتا پھرا۔ پھر سوچا گھر نہیں گیا تو کیا کروں گا۔ میں گھر چلا آیا۔“

اسے یہ بتانے کی ہمت نہیں ہوئی کہ وہ قصبہ پہاڑی چلا گیا تھا۔ ایاز نے اسے جی بولنے پر شاباش دی اور اس سے کہا وہ تھک گیا ہوگا، جا کر سو جائے۔

عمراند بیر صاحب کے پاس سے آئی تو بڑی خوش تھی۔

”بیر صاحب نے سینکوں والے جن کو بلایا تھا۔ اسے بتا دیا ہے کہ اگر اب وہ فراز کو کہیں لے کر گیا تو وہ اسے جلا کر خاک کر دیں گے۔“

”پیسے کتنے لیے ان بیر صاحب نے؟“

”پانچ سو لے کر میرے بچے سے بڑھ کر تھوڑی ہیں۔“

جعلی بیر کا جھوٹا کل گیا تھا۔ ایاز نے سوچ لیا تھا کہ

اب وہ عمراند کو ان کے پاس نہیں جانے دے گا۔ فراز اپنی مرضی سے گیا تھا اور خود گیا تھا۔ بیر صاحب نے سینکوں والے جن کو بلا کر دھکی بھی دیدی۔

فراز کو معلوم ہو گیا تھا کہ روشنی کیلاش پور میں ہے۔ بس اب اسے ڈھونڈنے کا مسئلہ تھا۔ وہ دوسرے دن اسکول گیا ضرور لیکن انڈویل میں بھاگ گیا۔ کتابیں اس نے ایک جانتے والے دکاندار کے پاس رکھیں اور شام تک جتنا چل سکتا تھا چلا رہا کہ شاید راجیلہ یا روشنی اسے سہرا مل جائیں۔ اتفاق ایسے بھی تو ہوتے لیکن یہ اتفاق روز تو نہیں ہوتے۔ کسی

چہرے نے اسے آواز نہیں دی کہ میں راجیلہ ہوں یا میں روشنی ہوں۔ وہ تھک ہار کے گھر پہنچا تو اس کی تلاش ایک مرتبہ پھر شروع ہو چکی تھی۔

”کہاں گئے تھے؟“ ایاز نے پوچھا۔

”میں کسی کو تلاش کر رہا تھا۔“

”پانچ سو نہیں ہو گئے ہو۔ کسے تلاش کر رہے تھے۔“

”یہ نہیں بتا سکتا۔“

”اگر کل تم اسکول سے بھاگے تو میں تمہارا برا حشر کروں گا۔“

اس نے باپ کے اس چیلنج کو قبول کیا۔ وہ دوسرے دن اسکول گیا ہی نہیں۔ پیٹ کے درد کا بہانہ کر کے گھر میں پڑا رہا۔ پھر موقع دیکھ کر ماں کے بونے سے پیسے نکالے اور ایک

مرتبہ پھر گھر سے بھاگ گیا اور اس مرتبہ دوسرے دن واپس نہیں آیا بلکہ پورے ایک ہفتے غائب رہا۔ اس تمام عرصے میں اس نے ایک ایک دروازے کو دیکھا، ایک ایک دکان میں جھانکا لیکن روشنی یا راجیلہ اسے نہیں ملی۔ دن بھر پالگوں کی طرح انہیں ڈھونڈتا رہتا، رات کو کسی دکان کے آگے بڑ کر سو جاتا۔ جلد ہی اسے احساس ہو گیا کہ راستے بڑے شہر میں کسی بڑے نشان کے بغیر کسی کو ڈھونڈنا ممکن نہیں۔ اسے صرف اتنا معلوم تھا کہ روشنی کے پاپا پولیس والے ہیں لیکن ان کا نام تک اسے معلوم نہیں تھا۔ ورنہ جتنے قاتل تھے سب کو چھان چکا ہوتا۔ اب اس کے پاس گھر سے لائے ہوئے پیسے بھی ختم ہو چکے تھے۔ دو وقت ہو گئے تھے ایک کھیل اڈرمنٹ میں نہیں گئی تھی۔ اب اسے گھر کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ ایک مرتبہ پھر گھر پہنچ گیا۔ اس حالت میں کہ اس کے کپڑے دھول اور مٹی میں اٹے ہوئے تھے، بال بکھرے ہوئے تھے، پاؤں سوچ گئے تھے۔ نقاہت ایسی تھی کہ گھر میں داخل ہوتے ہی بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

دیکھاری ماں، بے بس باپ جتنے بھر سے اسے تلاش کرتے پھر رہے تھے، اسے اس حال میں دیکھا تو اسپتال لے کر بھاگے۔ ڈاکٹر نے دو تین کھٹے ٹیکٹک میں رکھا۔ ڈرپ لگا کر جب جاگے اس نے آنکھیں کھولیں۔

پھر اس حال میں گھر پہنچا ہو تو اس پر کیا غصہ کی جاسکتی ہے۔ اس سے تو یہ پوچھتے ہوئے بھی ڈر لگ رہا تھا کہ وہ کہاں چلا گیا تھا۔ اسے غروں کے بستر پر سلا یا۔ شفقت کا پکھا جھلا۔ جب اس نے کچھ جان پکڑی تو باپ سمجھا نہ گیا۔ فراز کو بھی اب اچھی غامی نصیحت ہو چکی تھی۔ اس نے باپ سے وعدہ کیا کہ اب وہ بھی گھر سے نہیں بھاگے گا۔

وہ روشنی کو بھولا نہیں تھا لیکن اس حقیقت سے بھی آشنا ہو چکا تھا کہ یوں گئی پھر نے سے وہ نہیں ملے گی خود ہی سمجھی میرے سامنے آ جائے تو آ جائے۔ اس نے شکست نہیں مانی طریقہ جنگ بدل دیا۔ میں زندگی میں شامل رہ کر اسے تلاش کرتا رہوں گا۔ وہ کہیں نہ کہیں مل ہی جائے گی۔

اس نے پھر اسکول جانا شروع کر دیا لیکن اب وہ روشنی کے ملنے تک زندگی سے خوش نہیں رہ سکتا تھا۔ یہ اس کی مجبوری تھی۔ اس کے ذہن میں روشنی کی وہ تصویر تھی جو اس نے قصبہ پہاڑی کے قیام کے دوران دیکھی تھی۔ اب وہ تصور ہی تصور میں اس تصویر کو بڑا کر کے دیکھ رہا تھا۔ اس کا جسم ایسا ہو گیا ہوگا، قد اتنا ہو گیا ہوگا، نقش و نگار میں یہ تبدیلی آئی ہوگی۔ اس کی آنکھوں پر پلوں کی جھل جھل تھی

ہوگی۔ ہفتے وقت اس کے دانت موتیوں کی طرح چمکنے لگے ہوں گے۔ اس کے سہرے بال اس کے کاندھوں پر جمونے لگے ہوں گے۔

یہ باتیں کوئی خطی ہی سوچ سکتا ہے۔ وہ واقعی ایک خطی کی زندگی گزار رہا تھا۔ چپ چاپ، خاموش، اکیلی زندگی۔ صبح کسی کے اٹھانے بغیر اٹھ جاتا۔ تیار ہو کر اسکول چلا جاتا۔ واپسی میں ایک ایک چہرے کو نکلتا ہوا واپس آ جاتا۔ کسی نے کوئی بات پوچھ لی تو جواب دے دیا ورنہ خاموش۔ نہ کسی سے کچھ طلب کرنا نہ کسی سے شکایت کرنا۔

کسی بھی ماں کے لیے اسے بچے کی یہ حالت تکلف وہ ہوتی ہے۔ عمراند بھی اسے دیکھ دیکھ کر غرضتی رہتی تھی لیکن یہ سوچ کر اُنسو پونچھ بھی لیتی تھی کہ اب اس کا غصہ اور اشتعال تو کم ہو گیا ہے۔ اسکول بھی باقاعدگی سے جا رہا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ حالت بھی جاتی رہے گی۔ بیرون، مزاروں کے چکر کاٹ کاٹ کر تھک چکی تھی مگر حوصلہ نہیں ہاری تھی۔ ایاز سمجھا سمجھا کر تھک چکا تھا۔ اب اس نے بھی سمجھنا چھوڑ دیا تھا۔ اس وقت کے انتظار میں تھا جب فراز اپنی اصلاح خود کر لے۔ کوئی مجبور ہو جائے کہ وہ عام لڑکوں کی طرح زندگی کو ہنس بول کر گزارے لگے۔

وقت کا پیرا امید و بیم کے راستے پر چلتا رہا۔ فراز نے ماں باپ کی لالچ کھ لی۔ اس نے میٹرک کر لیا اور وہ بھی فرسٹ ڈویژن میں۔ عمراند وقت سے پہلے بوڑھی ہو گئی تھی لیکن اس خوش خبری کو سن کر وہ خود کو جوان محسوس کرنے لگی تھی۔ جس بچے کی زندگی کی امید نہ رہی ہو اس نے میٹرک کر لیا۔ سب خوش تھے لیکن فراز کا چہرہ جذبات سے عاری تھا جیسے کوئی قرض تھا جو اس نے چکا دیا تھا۔ اس میں خوشی یا افسوس کی کیا بات ہے۔ ماں کا سرخرو سے بلند ہو گیا تھا مگر وہ گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا تھا۔

”ہاں بھی فراز، اب تو تم میٹرک پاس ہو گئے۔“

”جی۔“

”اب کیا کرنے کا خیال ہے۔ میری طرح بی۔ اے کرو۔ میجر زرنینگ کر لو اور ٹھٹ سے اسکول میں پڑھاؤ۔“

”ابھی میں نے کچھ سوچا نہیں۔“

”آرام سے سوچ لو۔ ابھی کالج کھلنے میں دو تین ماہ ہیں۔“

باپ کی نصیحتیں اپنی جگہ مگر فراز تو یہ سوچ رہا تھا، روشنی کو ڈھونڈنے کا مزہ تو اب آئے گا۔ فرصت ہی فرصت ہے۔ نہ اسکول جانے کی فکر نہ اسکول سے بھاگنے کی فکر۔ بے فکر ہی بے فکر ہے۔

شام ہوئی تو اس نے کپڑے بدلے، سلیپے سے بال جمائے کہ اگر روشنی نہیں ملے گی تو مجھے وحشت کا تو نظر آتا چاہیے۔ وہ ایک ایسے مکمل میں بیٹھ گیا جہاں وہ اس سے پہلے بھی نہیں آیا تھا۔ یونہی ایک لمبی میں داخل ہوا اور گھٹن گھٹن گھوم کر دوبارہ مرکزی سڑک پر نکل آیا۔ بے مقصد گھومتا رہا اور پھر گھر آ گیا۔

اب اس نے اپنا بیک دستور بنالیا تھا کسی بس میں لیڈیز پورشن سے لگ کر کھڑا ہو جاتا اور عورتوں کو اترتے چڑھتے دیکھتا رہتا کہ شاید کسی اسٹاپ سے روشنی سوار ہو۔ جہاں جی چاہتا اتر جاتا۔ کچھ دیر اس علاقے میں گھومتا پھر تاپھر واپسی کی بس میں بیٹھ جاتا۔ ایک روز وہ پولیس لائن پہنچ گیا۔ راجیلہ کا شوہر پولیس میں تھا اس لیے اس کا خیال تھا کہ بلا اسے یقین ہو گیا تھا کہ راجیلہ اور روشنی بھی وہیں رہ رہی ہوں گی۔ یہاں قلیٹ بنے ہوئے تھے۔ وہ اس علاقے میں دیر تک گھومتا رہا پھر ایک بڑھیا کو دیکھ کر اس کی ہمت ہوئی۔

”اماں، یہاں کوئی راجیلہ نام کی عورت رہتی ہے؟“
”تم جہاں کھڑے ہو سبکی تو اس قلیٹ ہے۔“ بڑھیا نے کہا اور پھر خود ہی راجیلہ کو آواز دے کر بلا لیا۔ ”راجیلہ تیرے گھر مہمان آئے ہیں۔“

ایک عورت گود میں بچہ اٹھائے باہر آئی اور فراز کو فور سے دیکھنے لگی۔ ”کیا ہے۔ کس کو پوچھ رہا ہے۔“
”مجھے راجیلہ آئی کا پوچھنا تھا جن کی بیٹی روشنی ہے۔“
”راجیلہ تو میں ہوں لیکن میری کوئی بیٹی نہیں ہے جسے چھپنے تو یہاں تک آیا ہے۔“
”میں کسی کو چھپنے نہیں آیا۔“

”ابھی پتا چل جاتا ہے۔ یہ پولیس والوں کا علاقہ ہے۔“ اس نے فراز کو دھمکی دی اور اپنے میاں کو بلا لیا۔ وہ شاید ابھی ابھی ڈیوٹی سے آیا تھا۔ وردی بھی نہیں اتاری تھی یا ڈیوٹی پر جانے کی تیاری کر رہا ہوگا۔ اس نے آتے ہی کسی پوچھ چھ کے بغیر فراز کو دو زوردار چھڑے دیے۔

”سالے لڑکیوں کے گھروں کے پتھر لگتا ہے اور وہ بھی پولیس لائن میں آکر۔“

وہ اپنی بے گناہی جتانے لگا تو اس نے ایک چھٹیر اور لگا دیا۔ شور سن کر اور پولیس والے بھی قلیٹوں سے نکل آئے۔ اب اس پولیس والے نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ لڑکا اس کی بیوی کو چھین رہا تھا۔ فراز ابھی تک اپنی بے گناہی ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آوازیں آنے لگیں کہ اسے تھانے لے جا کر بند کر دو۔ چھتر پڑیں گے تو سب اگل دے

گا کہ یہاں کس مقصد سے آیا تھا۔ ان میں دو چار شریف لوگ بھی تھے۔ انہوں نے فراز کی جان چھڑائی کہ لڑکا شریف معلوم ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے یہاں کسی کا پتا معلوم کرنے آیا ہو۔ مختصر یہ کہ بڑی مشکل سے ان کی جان چھوٹی اور اس نے عہد کر لیا کہ اب وہ کسی سے روشنی کے بارے میں نہیں پوچھے گا۔ وہ خود ہی مل گئی تو ٹھیک ورنہ پوری زندگی اس کو یاد کر کے گزار دے گا۔

☆☆☆

فراز ایک سنیا ہال پر لگے فلمی پوسٹر کے سامنے کھڑا تھا۔ اسے نو فلموں سے کوئی دلچسپی تھی نہ فلمی اداکاروں سے سروکار تھی کہ اس تصویر سے بھی کوئی سروکار نہیں تھا جس کے سامنے وہ پچھلے دس منٹ سے کھڑا تھا۔ یہ تصویر اسے ابھی بھی نہیں لگی تھی۔ یہ کسی بہت بڑے آرٹسٹ کا بنایا ہوا شاہکار بھی نہیں تھا۔ بس عجیب قسم کی ایک بھدی سی تصویر تھی جو اس قسم کے پوسٹروں میں نظر آتی ہیں۔ اسے تو یہ تک معلوم نہیں تھا کہ یہ کس اداکار کی تصویر ہے۔ سوال یہ ہے کہ پھر وہ اس تصویر کے سامنے کیوں کھڑا تھا؟ اس کا جواب وہ خود ہی دے رہا تھا۔ اگر میں تصویر بنانے کے فن سے واقف ہو جاؤں تو مجھے روشنی کو تلاش کرنے، دور نہ جانا پڑے۔ میں اپنے تصور کی روشنی کو کاغذ پر اتار کر اپنی دیواروں پر سجالوں، بڑے خرچے دنیا کو بتا سکوں کہ یہ ہے میری روشنی۔ میرے تصورات میں وہ ہر جگہ موجود ہے لیکن میں اسے سامنے بٹھا کر اس کی پرستش نہیں کر سکتا۔ کاش! اچھے مصوری آجائے۔ اس خیال کے آتے ہی وہ چلنے کے بجائے دوڑنے لگا تھا۔ اسے گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔

”آپ نے کہا تھا، میں سوچ کر جواب دوں کہ مجھے کیا کرتا ہے۔ میں نے سوچ لیا ہے، میں مصور بننا چاہتا ہوں بلکہ میں مصور ہوں۔ اپنے خیالوں میں تصویریں بنٹ کر ہوں۔ مجھے ایک ایسا شخص چاہیے جو ان تصویروں کو کاغذ پر منتقل کرنے کا ہنر مجھے سکھا دے۔“ اس نے گھر پہنچنے ہی اپنے ارادے اپنے باپ کے حوالے کر دیے۔

”کوئی بات ایسی نہ کرنا جس سے تمہارا باپ خوش ہو۔“ کہنا تو یہ چاہیے تھا کہ ابو، آپ اسکول ماسٹر ہیں میں پرو فیسر بنوں گا۔ اس کے برعکس یہ کہنے آئے ہو کہ رنگ اور برش لے کر دیواروں کو رنگین کرتے پھر دوں گے۔“

”مجھے وہی بننا چاہیے جو بننے کی مجھ میں صلاحیت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں ایک اچھا مصور بن سکتا ہوں۔“
”جب یقین ہے تو مجھ سے کیا پوچھتے آئے ہو۔“ جودل

میں آئے کرو کیونکہ اب تم بڑے ہو گئے ہو۔“
عمرانہ نے سنا تو اس نے بھی سمجھا یا کہ تصویریں بنانا گناہ ہوتا ہے وہ اس گناہ کو اختیار نہ کرے۔ وہ یہ تو نہیں چاہتی تھی کہ اس کا بیٹا اسکول ماسٹر بنے لیکن یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ مصور بن کر رہ جائے۔ وہ سمجھتی رہی لیکن فراز نے اس کی بات بھی نہیں مانی۔

اب اسے جو کرتا تھا خود کرتا تھا۔ اس نے ایک آرٹ اسکول میں داخلہ لے لیا۔ ایاز نے تو خیر اس کی یہ جہاد بھی برداشت کر لی اور یہ سوچ کر خوش ہو گیا کہ فراز کی قسمت میں اگر میچر بننا ہی لکھا ہے تو وہ آرٹ میچر بن جائے گا لیکن عمرانہ سے اس کی یہ بغاوت برداشت نہیں ہوئی۔ اس نے فراز کے لیے کیا کیا خواب دیکھے تھے، ایک بھی پورا نہیں ہوا۔ اس نے بڑے صدمے اٹھائے تھے لیکن اس صدمے نے اسے بستر پر ڈال دیا۔

☆☆☆

فراز کو رنگوں اور لکیروں سے کھینچتے ہوئے ایک سال ہو گیا تھا۔ ابھی وہ اپنے تصور کو کاغذ پر منتقل کرنے کے لائق نہیں ہوا تھا لیکن اس کے اساتذہ اس سے بہت پر امید تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ اس نے دو سال کا کام ایک سال میں مکمل کر لیا تھا۔ اس کی قدرتی صلاحیتیں پوری طرح بروئے کار آ رہی تھیں۔ ان صلاحیتوں کو ابھارنے میں اس کا وہ جنون بھی شامل تھا جو اس فن کو حاصل کرنے کے لیے اس کا معاون ہو رہا تھا۔ وہ دنیا کی طرف سے منہ پھیر کر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ دن دن بھر کاغذوں پر لکیریں کھینچتا رہتا تھا۔

اس نے دو سال مکمل کر لیے تھے۔ اب اس کا امتحان ہونے والا تھا۔ اس کے اساتذہ میں شرطیں لگ گئیں کہ وہ پورے اسکول میں فرسٹ آئے گا۔ کوئی دوسرا طالب علم اس کی ٹکر نہیں۔

امتمالی نمبر میں ایک ماڈل کی تصاویر تمام طالب علموں میں تقسیم کر دی گئیں۔ ایک ہی تصویر سب کو بنانی تھی۔ تین گھنٹے بعد جب تمام طالب علموں کی بنائی ہوئی تصویریں جمع کی گئیں تو اس نے ماڈل کے بجائے کوئی اور ہی تصویر بنا دی تھی۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے امتحان میں غالب کے بارے میں لکھنے کو کہا جائے اور کوئی اقبال کے بارے میں لکھ کر آجائے۔ اس نے اقبال پر کتنا ہی اچھا لکھا ہوا ہے نمبر نہیں دیے جاسکتے۔ فراز نے بھی یہی کیا تھا۔ یہ تصویر فی اعتبار سے اس پائے کی تھی کہ بڑے سے بڑے مصور کے فن پاروں کے ساتھ رکھی جاسکتی تھی لیکن اس پر نمبر نہیں دیے جاسکتے تھے۔

اس کے پرنسپل نے یہ تصویر دیکھی تو اٹش اٹش کر اٹھا۔ یہ لڑکا دنیا کے مصوری میں آفتاب بن کر نکلے گا۔ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ اسے پرنسپل کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ ”تمہیں تو کوئی اور ماڈل دیا گیا تھا۔ تم نے یہ تصویر کیوں بنادی؟“

”آپ کے دیے ہوئے ماڈل پر میرا تصور غالب آ گیا۔“
”میں جانتا ہوں ایک تخلیقی مصور کو اپنے خواب بہت عزیز ہوتے ہیں لیکن تم تو امتحان دے رہے تھے۔“

”امتحان میرے فن کا ہونا چاہیے۔ یہ دیکھنا چاہیے میرے خطوط، میرے دائرے، میری لکیریں کیسی ہیں؟“
”تمہاری بات سے اتفاق کرنے کے باوجود تمہیں نمبر نہیں دیے جاسکتے۔ تمہیں اس اسکول میں ایک سال اور گزارنا ہوگا یا میں یہ رعایت دے سکتا ہوں کہ تم ماڈل کی تصویر بنا کر پیش کر دو۔“
”میں کوشش کروں گا۔“

اسے کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ ماڈل کی تصویر اسے دے دی گئی۔ اس نے اچھا بنانا شروع کیا۔ جب تصویر مکمل ہوئی تو یہ ماڈل کی تصویر نہیں تھی۔ یہ تو وہی تصویر بن گئی جو وہ اس سے پہلے بنا چکا تھا۔

”تم نے تو پھر وہی تصویر بنادی۔“
”میں کیا کروں، میرے خزانے میں یہی ہے۔“
”تمہارے تصور میں یہ ایک بچی ہی کیوں ہے۔ ماڈل کی نہ کسی اور تصویر بنا دیتے۔ تم نے تو ایک مرتبہ پھر اسی بچی کی تصویر بنادی۔“

”اس بچی کے سوا دنیا میں اور کوئی ہے بھی تو نہیں۔“
”عجب پاگل پن کی باتیں ہیں تمہاری۔ کیا زندگی بھر ایک ہی تصویر بناتے رہو گے۔“

”نہیں، چہرہ یہی رہے گا مگر بڑھتی رہے گی۔ عمر کے ساتھ ساتھ چہرے کے خطوط بھی بدلتے رہیں گے۔ یہ تبدیلیاں ہی میرے آرٹ کی درآمدی ہوگی۔“
”لوگ آتا جائیں گے مسٹر فراز۔“
”آرٹ میں نے اپنی تسکین کے لیے سیکھا ہے دوسروں کو خوش کرنے کے لیے نہیں۔“
”تمہاری مقبولیت؟“

”مجھے اس کی بھی پروا نہیں۔ میں تو کسی کی تلاش میں نکلا ہوں۔ سفر کرنے والے کا تنوں کی پروا نہیں کرتے۔“
فراز نے کہا اور کوئی شگفتگی لے بغیر اسکول سے باہر آ گیا۔ ایک مرتبہ پھر وہ زمانے کی ٹھوکروں کی زد پر تھا۔ اس کا

باب اس سے خفا تھا کہ اس نے اپنے دو سال ضائع کر دیے۔ کوئی شقیہ تک حاصل نہ کر سکا کسی اسکول میں ڈرائنگ ماسٹر ہی لگ جاتا۔ وہ خود بھی اس حقیقت کو تسلیم کر رہا تھا۔ مگر اس کی مجبوری کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ اس نے ماڈل کی تصویر بنائی چاہی تھی لیکن روشنی کا بچپن اس کے ذہن میں محفوظ تھا۔ اس کے قلم نے روشنی کی تصویر بنادی اور وہ امتحان میں پاس نہ ہو سکا۔ اس نے گھر میں بیٹھ کر بھی کوشش کی لیکن ہمیشہ بے خبر سا ہو جاتا اور ہوش آتا تو روشنی کا بچپن کاغذ پر اتر آتا۔ بھی کھلے بالوں کے ساتھ کبھی دو چٹیاں بندھی ہوئی، کبھی فراک پہنے کبھی پینٹ فیس میں۔ اس نے قصبہ پہاڑی میں رہ کر روشنی کے جتنے روپ دیکھے تھے وہ سب اس کے ذہن میں محفوظ تھے۔ وہ ان سب کو رنگوں میں بناتا جاتا تھا لیکن اس کے پاس نہ رنگ تھے نہ برش نہ پتل بھی، نہ کاغذ۔ وہ خواب دیکھنے لگا تھا کہ اس کا اسٹوڈیو ہو، مصوری کا سامان وافر مقدار میں اس کے پاس ہوتا کہ وہ روشنی کا تعارف دنیا سے کرا سکے۔ دنیا کو بتا سکے کہ وہ روشنی کو تلاش نہیں کر سکا لیکن اسے امر تو کر سکتا ہے اور پھر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ میری بنائی ہوئی کوئی تصویر روشنی کے گھر میں پہنچ جائے اور وہ مجھ سے ملنے چلی آئے۔ اسے معلوم تو ہو کہ میں اس کے ساتھ صرف کھینچتا تھا، اس سے محبت بھی کرتا تھا۔

وہ پیسوں کے حصول کے لیے بیٹوں کے چکر کاٹا رہا کہ قرض مل جائے۔ دوکانوں پر گیا کہ مصوری کا سامان ادھار مل جائے۔ اپنے اسکول کے اساتذہ سے ملا کہ ان کے ذریعے کسی ایسے شخص سے تعارف ہو جائے جو آرٹ کا دلدادہ ہو اور اسے اسٹوڈیو کھول کر دے سکے۔ اس کی تمام کوششیں ہوا پر دو ہو گئیں۔ لوگ آرٹ کی قدر دانی کا دعویٰ تو کرتے تھے لیکن عمل میں کورے تھے۔ اس کی کوششوں سے بے خبر اس کے والدین اس کی تنگ و دو کو آوارہ گردی پر محمول کر رہے تھے۔ وہ دن کو لکھتا ہے، رات گئے گھر آتا ہے۔ نہ جانے کن آوارہ صحبتوں کا شکار ہو گیا ہے۔ نہ تیار ماں کا خیال ہے نہ باپ کے بڑھاپے کا۔ کہیں تو کہہ جاتا تو ہمارے بڑھاپے کا سہارا تو ہوتا۔

جب فراز ہر طرف سے مایوس ہو چکا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ اپنا اسٹوڈیو کھولنے کے بجائے کسی بڑے مصور کے ساتھ مل کر کھنواہ پر یا کشین پر کام کرنے لگے۔ ایسے مصور کے انتخاب میں اسے دیر نہیں لگی۔ وہ جب آرٹ اسکول میں تھا تو اس نے کئی مصوروں کے نام سنے تھے اور ان کا کام دیکھنے کا موقع بھی ملا تھا۔ انہی میں ایک مصور تھا جسے جن کے کام سے وہ بہت متاثر ہوا تھا۔ وہ ان کے اسٹوڈیو پہنچ گیا۔ یہ اسے وہاں جا کر معلوم ہوا کہ بہت بوڑھے ہو گئے ہیں لیکن کام کرتے ہیں۔ کسی کو شاگرد نہیں بناتے نہ انہوں نے اپنا کوئی معاون رکھا ہوا ہے۔

”تم امتحان کیوں پاس نہیں کر سکتے؟“

”میں جب ان کے دیے ہوئے ماڈل کی تصویر بنانے لگا تو میرے تصور میں آیا لڑکی میرے سامنے آگئی۔ میں نے اس کی تصویر بنا دی۔ میرا استدلال یہ تھا کہ محسن کو میرا فن دیکھنا چاہیے میں کوئی بھی تصویر بناؤں۔“

”ان اسکول والوں کو کسی کے فن کی پروا نہیں ہوتی بلکہ ان میں اتنی اہلیت ہی نہیں ہوتی کہ اسے جانچ سکیں۔ تم ایسا کرو کہ مجھے اپنے تصور میں آباد اس لڑکی کی تصویر بنا کر دکھاؤ، میرا اسٹوڈیو کھلا ہوا ہے جتنے دن میں چاہو مکمل کرو۔“

یہ اس کے لیے بہت بڑا اعزاز تھا کہ مصور یا اسے اپنے قلم چھونے کی اجازت دے رہے تھے۔ وہ اسی وقت بیٹھ گیا۔ وہ رات کو گھر بھی نہیں گیا۔ دوسرے روز تصویر مکمل کر کے ان کے سامنے رکھ دی۔ ایک بچی بیٹہ گلے میں ڈالے اسکول جانے کے لیے گھر سے نکل رہی تھی۔ مصور نے اس تصویر کو تنقیدی نظر سے دیکھا اور ایک طرف رکھ دیا۔ ”اب اسی بچی کی دوسری تصویر بناؤ۔“

”اس میں کوئی خامی رہی ہے۔“

”جو کہا جا رہا ہے وہ کرو۔“

کام کر سکتے ہو۔“

اس نے ان کے ساتھ کام کرنے کی ہامی بھری لیکن مصور کا جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ ان کی تصویروں کو بیگاڑ دے گا۔ اس کا قلم صرف روشنی کی تصویروں پر چلتا ہے۔ وہ کام کر رہا ہے لیکن بے دلی اس کی لکیروں سے ظاہر ہو رہی ہے۔ وہ چاہتے تو اس سے معذرت کر لیتے لیکن وہ اس کے اندر کے فنکار کو ماننا نہیں چاہتے تھے۔ سو نے کی قدر جو بری کو ہوتی ہے۔ انہوں نے سوچا اگر اس فنکار کو موقع دیا جائے تو ان کا مصور ثابت ہوگا۔ ایک ایسا مصور جس نے زندگی بھر ایک چہرے کو بنایا لیکن اس تنوع کے ساتھ کہ ہر تصویر میں ایک نئی بات نظر آتی ہے۔ انہوں نے اس سے کہا تم میرے کام کو چھوڑو اور اپنی تصویریں بناؤ، میں بہت جلد تمہاری نمائش کراؤں گا۔

فراز کو ایک سہارا مل گیا۔ اس نے قصبہ پہاڑی میں اپنی ایک سالہ رہائش کو کاغذ پر منتقل کرنا شروع کر دیا۔ قصبہ پہاڑی کے بازار، وہاں کی دکانیں، وہاں کے پہاڑی لوگ، پھر اپنا اسکول، اپنا گھر اور چھ سالہ روشنی کا بچپن اس نے ایک سال کی مدت میں ہی تصویریں مکمل کر لیں۔ مصور نے دیکھا تو پھر ک اٹھے۔

”میرے بیٹے! اور بیٹل کام ہے۔ ہمارے ملک کے ایک حصے کی ثقافت اس میں جلوہ گر ہے۔ ان تصویروں کی نمائش ہوئی تو بڑی پذیرائی ہوگی۔“

مصور باریک کوششوں سے اس کی تصویروں کی نمائش ہوئی۔ یہ اس کی پہلی نمائش تھی لیکن ان تصویروں نے دھوم مچا دی مگر اس مرحلے پر ایک اور مشکل آن کھڑی ہوئی۔ یہ اس کا بالکل پنا ہی کہا جاسکتا تھا کہ وہ روشنی کی کسی تصویر کو بچپن کے لیے تیار نہیں تھا۔ مصور یا اس کی ہر بات ماننے کو تیار تھے لیکن اس بات سے اتفاق نہیں تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اس طرح اس کا نام دور دور پہنچے گا اور وہ مختصر سے عرصے میں دولت مند بھی ہو جائے گا۔ وہ پھر بھی انکار کرتا رہا کہ اتنی دولت کا وہ کیا کرے گا۔ پھر مصور نے اس کی دھمکی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔

”یہ تصویریں جب دوسروں تک پہنچیں گی تو ممکن ہے تمہاری روشنی کی نظر سے بھی کوئی تصویر گزرے اور وہ تم سے ملنے چلی آئے۔“

یہ بات فراز کی سمجھ میں آگئی۔ تین روز کی نمائش میں اس کی تمام تصویریں بیک گئیں۔ وہ بہت دن بعد اپنے گھر گیا تو اس کی جیبیں نوٹوں سے بھری ہوئی تھیں۔ اپاز نے زندگی بھر اتنا نہیں کمایا تھا جتنا وہ لے آیا تھا۔ اس نے اپنی ماں کو

نہایت اچھے اسپتال میں داخل کرایا لیکن اب ان کی حالت اتنی بگڑ چکی تھی کہ کوشش کے باوجود وہ انہیں نہیں چکا سکا۔

وہ اپنی دوسری نمائش کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔ اس نے اپنے تصور کو حرکت دی۔ دس سال کی عمر میں وہ کبھی ہوئی ہوگی۔ وہ کئی دن غور کرتا رہا اور بالآخر اس نے ایک تصویر بنائی۔ یہ تصویر چھ سال کی بچی میں خوش گوار تبدیلی کی کہانی تھی۔ مختلف ضرور ہو گئی تھی لیکن دیکھنے میں روشنی ہی معلوم ہوتی تھی۔ ایسی بہت سی تصویریں اس نے بنائیں۔ ان تصویروں میں وہ ایسی بھی تھیں جن میں وہ فراز کی ماں یعنی عمراندہ کے ساتھ کھڑی ہے۔ اس عمر میں روشنی کیلاش پورا چکی تھی لہذا اس منظر میں کیلاش پوری کثافت نظر آرہی تھی۔

اس نمائش کو پہلے سے بھی زیادہ پذیرائی ملی۔ حکومت نے بھی اسے ایوارڈ اور انعامات سے نوازا۔ اب وہ رئیس ترین مصور بن گیا تھا۔ اس کی ایک ایک تصویر لاکھوں میں خریدی جا رہی تھی۔

اس نمائش کے بعد مصور کا انتقال ہو گیا۔ اب وہ اس اسٹوڈیو میں نہیں رہ سکتا تھا۔ مصور کے بیٹوں کا آرٹ سے کوئی شغف نہیں تھا۔ انہوں نے فراز سے یہ اسٹوڈیو خالی کر لیا۔ اب فراز کے پاس اتنی دولت تھی کہ وہ ایسے کئی اسٹوڈیو کھول سکتا تھا۔ اس نے ایک شاندار دو منزلہ عمارت خرید لی۔ اوپر کا حصہ باپ کو رہائش کے لیے دے دیا، نیچے اسٹوڈیو کھول لیا۔ اسی میں اپنا بسز لگالیا۔

☆☆☆

”مس روشنی، وزیر اعظم صاحب نے کل ساڑھے چار بجے ہوٹل کراؤن میں پریس کانفرنس رکھی ہے۔“

”جی ہاں، مجھے معلوم ہوا تھا۔“

”ہمارے اخبار کی طرف سے نمائندگی آپ کریں گی۔“

”میں۔۔۔ سر میں۔۔۔ میرا مطلب ہے مجھے تو ابھی ایک سال ہوا ہے، جو بڑے لوگ ہیں انہیں اعتراض ہوگا۔“

”وہ میں دیکھ لوں گا۔ آپ اچھی طرح اسٹیڈی کر لیں، کچھ سوال بنائیں اور کل چار بجے ہوٹل پہنچ جائیں۔ دفتر کی گاڑی چاہیں تو وہ بھی مل جائے گی۔“

”تھیں سر، میں پہنچ جاؤں گی۔“

”یہ ہوٹل میں داخلے کا کارڈ ہے۔“

وہ چیف ایڈیٹر کے کمرے سے نکلی تو گھبراہٹ اور خوشی سے اس کی عجیب کیفیت ہو رہی تھی۔ چھٹی کا وقت ہو گیا تھا لہذا گھر چلی گئی۔ دوسرے دن وقت مقررہ پر ہوٹل پہنچ گئی۔ وہ پریس کانفرنس کے بعد باہر آرہی تھی کہ اس نے

سینس ڈائجسٹ

287

ستمبر 2010

لالی میں ایک بچی کی تصویر لٹکی دیکھی۔ اس کے قدم خود بخود رک گئے۔ یہ تو میری تصویر ہے۔ میرے بچپن کی تصویر۔ ایسی ہی ایک تصویر تو میں نے گھر میں لگائی ہوئی ہے۔ یہ فرار بھی وہی ہے، جوتے بھی وہی ہیں جو میرے گھر میں لگی تصویر میں ہیں۔ میری تصویر یہاں کیسے آگئی۔ وہ اس تصویر کو مکمل دیکھے جارہی تھی۔ یہ بنائی کس نے ہے۔ وہ تصویر کے اور قریب ہوئی۔ مصور کا نام کتنا تھا۔ ”فرار“۔ اس مصور کا نام تو میں نے سن رکھا ہے لیکن اس کی کوئی پینٹنگ نظر سے نہیں گزری۔ ویسے یہ تصویر بنائی کمال کی ہے۔ اس سے تو ملنا چاہیے۔ معلوم تو ہو کہ میری تصویر اسے ملی کہاں سے جس سے یہ تصویر اس نے بنائی ہے۔ یہ تصویر اس نے ہماری قیمت پر فروخت کی ہوگی۔ میں تو اس پر مقدمہ کر سکتی ہوں کہ میری اجازت کے بغیر اس نے میری تصویر بنائی کیسے۔ یہ خیالی تصویر تو ہرگز نہیں ہے۔

دوسرے دن اس نے گھر میں رکھی ہوئی اپنے بچپن کی تصویر پر اس میں رکھی اور فرار کے اسٹوڈیو لٹکی۔
”مجھے فرار صاحب سے ملنا ہے۔“ اس نے فرار کے ملازم سے کہا۔

”کیا نام بتا دوں؟“
”ان سے کہیے روشنی آئی ہے۔ میں اخبار کی طرف سے آئی ہوں ان کا انٹرویو کرنا ہے۔“
وہ ملازم کے آنے کا انتظار کر رہی تھی مگر اس نے دیکھا کہ ایک چوبیس چوبیس سال کا لڑکا ہاتھ میں برش پڑے دوڑتا ہوا آ رہا ہے۔ اس نے سوچا، مصور فرار کا کوئی شاگرد ہوگا۔
”آپ ہیں مس روشنی؟“
”جی۔“

”آئیے۔“ اس نے کہا اور اسے لے کر ایک کمرے میں پہنچ گیا۔

”روشنی، تم نے مجھے پہچانا؟“
”میں فرار صاحب سے ملنے آئی ہوں۔“
”میں ہی ہوں فرار۔ مجھے پہچانو روشنی۔ میں کہاں کہاں تمہیں ڈھونڈتا رہا ہوں۔ تم کہاں چلی گئی تھیں اور آج اچانک کہاں سے آگئیں۔“ وہ مکمل بولے چلا جا رہا تھا۔
”آپ بولنا بند کریں تو میں کچھ بولوں۔ جناب، میں روشنی ضرور ہوں لیکن وہ نہیں جو آپ سمجھ رہے ہیں۔ میں تو یہ پوچھنے آئی ہوں کہ آپ نے میرے بچپن کی تصویر میری اجازت کے بغیر کیسے بنائی؟“
”میں نے تو آپ کی جوانی کی تصویر بھی بنائی ہے جبکہ

میں نے آپ کو صرف بچپن میں دیکھا تھا۔“
وہ دوڑتا ہوا گیا اور ایک تصویر اٹھا کر لے آیا۔ روشنی نے دیکھا تو حیران رہ گئی۔ یہ اسی کی تصویر تھی۔ بس فرق اتنا تھا کہ اس نے اپنے سنہری بال کٹوا لیے تھے اور تصویر میں اس کے شانوں پر جمبول رہے تھے۔ اس کا بدن تصویر میں ذرا بھاری تھا، وہ بہت دلی ہوئی تھی۔
”یہ ایک اور ثبوت ہے۔ میں آپ پر مقدمہ کروں گی۔ آپ میری اجازت کے بغیر میری تصویریں کیسے بنارہے ہیں۔“
”تم کہیں لی ہی نہیں میں روشنی تو میں اجازت کیسے لیتا۔“
”مجھے آپ کی ذہنی حالت پر شک ہو رہا ہے۔“
”روشنی، میں فرار ہوں تمہارا فرار۔ بچپن میں ہم ایک ساتھ کھیلے رہے ہیں۔“

”کھیلے ہوئے گئے۔ اب کی بات کرو۔“
”روشنی، کیا تمہیں قصبہ پہاڑی یاد ہے۔“
”مجھے تو یاد نہیں لیکن امی بتاتی ہیں، ہم وہاں بھی رہ چکے ہیں، میرے پاپا کا وہاں فرانسفر ہو گیا تھا۔“
”تمہیں فرار یاد نہیں جو تمہارے برابر والے گھر میں رہتا تھا۔ عمارت آئی کا بیٹا، ہم لوگ چھت پر کھیلے تھے۔ یاد ہے ایک مرتبہ میں تنہا کھڑے تھے کہ تمہاری چھت پر چلا گیا تھا۔ تم جتنی دیر بھی فرار کر جاؤ گے۔“
”بچپن کی بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جو ذہن پر نقش ہو جاتی ہیں۔ روشنی کو بھی یہ واقعہ کچھ یاد آئے گا۔ یہ یادیں اتنی غیر متوقع تھیں کہ اس کا سر پکڑانے لگا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

”اف میرے خدا! مجھے یہ واقعہ یاد آ گیا۔ مجھے عمارت آئی بھی یاد آ رہی ہیں۔ تمہارے پاپا ایک روز مجھے اپنے ساتھ بازار لے کر گئے تھے۔ تم فرار ہو۔ وہی فرار۔“
”ہاں روشنی، میں وہی فرار ہوں۔ تم تو بچپن کے ساتھ مجھے بھی بھول گئیں لیکن میں بدقسمت کچھ نہ بھول سکا۔ میں نے تمہیں یاد رکھا۔ میں تمہیں ڈھونڈنے گھر سے بھاگ کر قصبہ پہاڑی بھی گیا تھا مگر تم وہ گھر چھوڑ چکی تھیں۔ میں کیلاش پور کے ایک ایک گھر میں تمہیں ڈھونڈتا رہا۔ پھر میں نے تمہیں اپنے دل میں تلاش کر لیا۔ اپنے تصور میں آباد کر لیا۔ تم ہر وقت میرے سامنے رہتی تھیں۔ میں تمہیں اپنے ساتھ ساتھ بڑھتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ میں مصور بن گیا اور پھر تمہارے سوا کسی کی تصویر میں نے آج تک نہیں بنائی۔ ہر تصویر تمہاری اجازت کے بغیر بنائی۔ اب چاہو تو مجھ پر مقدمہ کرو۔“

”فرار، تم کتنے عظیم مصور ہو۔“ اس نے فرار کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔ ”میں امی کو جا کر بتاؤں گی کہ تم مجھے دوبارہ مل گئے ہو۔“
”میں بھی ابو سے کہوں گا کہ وہ راجیلہ آئی سے ملیں اور تمہیں میرے لیے مانگ لیں۔ امی تو اب اس دنیا میں نہیں ورنہ وہ تمہاری امی کے پاس جاتیں۔“
”میں کل پھر آؤں گی۔ اس وقت مجھے آفس کے لیے دیر ہو رہی ہے۔“

وہ اسٹوڈیو سے نکلی تو اس قابل نہیں تھی کہ آفس جاتی۔ اسے بہت سی وہ باتیں یاد آئی تھیں جو کچھ دیر پہلے تک اس کے ذہن سے محو تھیں۔ وہ جلد سے جلد ماں کو بتا دینا چاہتی تھی کہ میرے بچپن کا سا گھر فرار مجھے ملا تھا۔
اس نے گھر پہنچتے ہی ماں کو گود میں اٹھا لیا۔ وہ خوشی سے پاگل ہوئی جاری تھی۔ پھر اس نے ماں کو گود سے اتارا اور فرار سے ملاقات کا پورا احوال سنا دیا۔ وہ سمجھ رہی تھی اس کی ماں کو بھی اتنی ہی خوشی ہوگی لیکن ان کے چہرے سے فنی غائب ہوئی۔

”ایک مرتبہ تو مل لی ہے لیکن آئندہ ملی تو اپنی ماں کو زندہ نہیں دیکھ سکی گی۔“
”امی وہ بہت اچھا ہے۔ بچپن سے اب تک مجھے ڈھونڈتا رہا ہے۔“
”میں نے کہہ دیا تو ان لوگوں سے نہیں ملے گی۔“
”امی آخر اس کا تصور کیا ہے؟“
”یہ میں تجھے بعد میں بتاؤں گی۔ ابھی تو مجھ سے وعدہ کر کہ تو اس سے نہیں ملے گی۔“
”وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔“

”یہ شادی ہوئی تو آسمان زمین پر گر پڑے گا۔ میری بچی تو اپنی ماں کی مجبوری سمجھ۔ میں تجھے سب کچھ بتا دوں گی۔ بس تو وعدہ کر کہ تو فرار کے قریب نہیں جائے گی۔“
”امی مت روئیں۔ مجھ سے آپ کے اسٹوڈیو دیکھے جاتے۔ آپ کہتی ہیں تو میں اس سے نہیں ملوں گی لیکن آپ بھی وعدہ کریں کہ مجھ سے آئندہ شادی کے لیے نہیں کہیں گی۔“
”میری بچی۔“ ماں نے اسے لپٹا لیا اور دیر تک دونوں روتی رہیں۔

☆☆☆

”ابو، ایک بہت بڑی خوش خبری لے کر آپ کے پاس آیا ہوں۔“
”کیا بات ہے بہت خوش ہو۔ کوئی نمائش ہونے والی ہے؟“

”مجھے روشنی ملی تھی۔“

”کون روشنی؟“

”قصبہ پہاڑی میں آپ کو یاد ہے ہمارے پڑوس میں راجیلہ آئی رہتی تھیں۔ ان کی ایک بہت پیاری بیٹی تھی روشنی۔ وہ ملی تھی۔“

”وہ کہاں مل گئی تھی؟“

”بس مل گئی۔ مجھے پہچان بھی گئی۔ آپ کو اس کے گھر جانا ہے میرا رشتہ لے کر۔ آپ نے اور امی نے نہ جانے کیوں ہمیشہ اسے مجھ سے دور رکھا ہے لیکن اب آپ میری شادی اس سے کرائیں۔“

”اس وقت تمہارا بچپن تھا۔ تمہاری پڑھائی پڑاؤ پڑتا تھا اس لیے کھیلنے سے منع کرتے تھے۔ تم اس کا پتا دو میں اس کی ماں سے جا کر بات کرنا ہوں۔“

”میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔ آئی سے میں بھی تو ملوں۔“
”تمہیں بیٹا، پہلے میں ان سے مل لوں۔ کوئی بات بنی تو تم بھی چلنا یہی طریقہ ہوتا ہے۔“

”ٹھیک ہے تو میں ڈرائیور کو بتا سمجھا دوں گا، وہ آپ کو لے جائے گا۔“

ایاز نے اپنے اثاثات فرار پر نظر نہیں ہونے دیے تھے لیکن اسے معلوم تھا کیا بات کرتی ہے۔ وہ پوری رات جاگتا رہا تھا۔ صبح کچھ دیر کے لیے سویا اور پھر ڈرائیور کے ساتھ راجیلہ کے گھر چلا گیا۔ وہ بھی جیسے انتظار ہی میں تھی۔
”آئیے ایاز احمد۔ مجھے فاضلہ عورت سے آپ کو کیا کام پڑ گیا۔ میں اسی دن کے انتظار میں تھی۔“

”کام تم بھی جانتی ہو۔ میرا بیٹا، تمہاری بیٹی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔“
”تو رشتہ لے کر آئے ہو۔“

”نہیں۔ یہ سمجھانے آیا ہوں کہ کسی طرح یہ شادی نہ ہونے پائے۔“

”کیوں، اس میں حرج کیا ہے۔“
”یہ دونوں بہن بھائی ہیں۔ کیا تمہیں یہ نہیں معلوم۔“
”یہ تو میں آپ کے منہ سے سن رہی ہوں۔ آپ ہی نے کہا تھا، میرے پیٹ میں کسی اور کا خون بہا رہا ہے۔ روشنی آپ کی اولاد کب ہے۔“

”مجھے اب اور شرمندہ مت کرو۔ تم سے بہتر کون جانتا ہے روشنی کس کی بیٹی ہے۔“
”میں بات میں نے آپ سے برسوں پہلے بھی کہی

اب اس سے کہے گی کہ شاہ پور چلتے ہیں۔
ایاز سے جو اس نے اتنی باتیں کی تھیں وہ محض اپنے
دل کا غبار نکالنے کے لیے کی تھیں اور اس لیے بھی کہ جن
مشکلوں سے وہ گزری ہے، ایاز بھی تو ان کا مزہ چکھے۔ اس
کے بیٹے کو بھی تو معلوم ہو کہ اس کا باپ کیا تھا۔
ایاز گھر پہنچا تو فرماز اس کے انتظار میں تھا۔

”کیا ہوا ابو۔“

”وہ مان گئی ہے۔ کل چھوڑ کر پرسوں میں تمہیں ان
کے گھر لے کر چلوں گا۔“

”اوہ، آپ کتنے اچھے ہیں۔ آج امی ہوتیں تو کتنی
خوش ہوتیں۔“

”اب تم اپنا کام کرو، میں تھک گیا ہوں۔“

”ہاں آپ آرام کریں۔“

اس کے جانے کے بعد اس نے خود کو ان طوفانوں
کے سپرد کر دیا جو اس کے اندر شور مچا رہے تھے۔ ایاز احمد ڈرو
اس وقت سے جب روشنی کو بھوکے روپ میں دیکھو گے۔
اس پائل عورت سے کچھ بعید نہیں۔ وہ مجھ سے انتقام لے
رہی ہے وہ یہ شادی ہونے دے گی۔ میں فرماؤ کہ حقیقت بتا
دوں؟ ہرگز نہیں۔ میری پادشاهی کا خلاف تار تار ہو جائے
گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے وہ اسے جھوٹ سمجھے۔ یہ سمجھے کہ میں
اسے روشنی سے دور رکھنے کے لیے من گھڑت کہانی سنارہا
ہوں۔ وہ شادی پھر بھی کر لے گا اور میں اس کی نظر میں ہمیشہ
کے لیے جھوٹا بن جاؤں گا۔ میری عزت خاک میں مل جائے
گی۔ تو پھر میں؟ نہیں نہیں میرا ایک ہی تو بیٹا ہے۔ تو کیا میں
بھی؟ ہاں؟ ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔ راجیلہ، میں تیرے عزائم کو پورے
نہیں ہونے دوں گا۔ معاف کرنا میرے بچے۔ میں تجھ سے
کہتا تھا، روشنی کے ساتھ تم کھیل مگر تو نہیں مانا۔ اب اس
کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ روشنی کا فیصلہ اندھیرے میں ہوتا
ہے۔ شاید آج رات۔

دوسرے دن اخبارات اس خبر سے بھرے ہوئے تھے۔
”مشہور مصور فرماز احمد کے اسٹوڈیو میں پراسرار ارتعاش
زدگی۔ فرماز احمد اور اس کے والد کے علاوہ ہزاروں فن پارے
اور لاکھوں روپے کا سامان جل کر خاکستر۔ ہو سکتا ہے یہ آگ
شارت سرکٹ سے لگی ہو۔ تحقیقات جاری ہیں۔“

روشنی اپنی ماں سے پہلے یہ کہہ چکی تھی کہ میں اس شرط
پر فرماز سے ملنا چھوڑوں گی کہ آئندہ آپ مجھ سے شادی کے
لیے نہیں کہیں گی۔

تھی لیکن آپ نے مجھ سے پیچھا چھڑانے کے لیے مجھ پر
بہتان دھرا تھا۔ ایاز احمد آپ نے مجھے سبز باغ دکھائے۔ میں
آپ کے بھکاوے میں آئی۔ مجھ سے بھول ہو گئی اور جب
میں نے تمہیں بتایا کہ میں ماں بننے والی ہوں تو تم نے صاف
کہہ دیا، میں شادی شدہ ہوں۔ میں تمہاری دوسری بیوی
بننے کو بھی تیار تھی لیکن تم ایک بے بس لڑکی کو کھنڈر میں چھوڑ کر
چلے گئے۔ تم اسی شہر میں تھے لیکن ہم غریب لوگ تمہارا کچھ
بھی نہ بگاڑ سکے۔ تمہاری وجہ سے میری شادی ایک بوڑھے
بد شکل انسان سے ہوئی جو ظالم بھی تھا۔ میں سب سے یہی
کہتی رہی۔ میرا شوہر مر گیا ہے۔ اب وقت آگیا ہے اس
بدنامی کا حصہ تم بھی میو۔ اپنے بیٹے کو بتا دو کہ روشنی تمہاری
ناجانزبانی ہے ورنہ میں یہ شادی ہونے دوں گی۔ ایک گناہ
اور کئی۔“

”میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔“

”میں نے بھی ایک دن ہاتھ جوڑے تھے۔“

”تم روشنی کو کسی طرح سمجھا دو۔“

”تم فرماؤ کہ کیوں نہیں سمجھاتے۔ اسی لیے نا کہ وہ سب
پوچھے گا۔ ایاز احمد خدا کی لاشی بے آواز ہوئی ہے۔ تم کیلاش
پورا اسی لیے چھوڑ کر گئے تھے کہ تمہارا ضمیر تمہیں چھینوڑتا رہتا
تھا۔ تم مجھ سے دور بھاگنا چاہتے تھے مگر قدرت نے تمہیں
قصبہ پہاڑی پہنچا دیا تاکہ تم مسلسل اذیت کا شکار رہو۔ اب
روشنی کو بھوکے روپ میں دیکھ کر کیلاش لگے گا۔“

”یہ نکال نہیں ہوگا۔“

”تم نے مجھ سے کون سا نکاح کیا تھا۔ جیسا باپ ویسی
بیٹی۔ اب میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ اس سے پہلے
کہ روشنی آجائے اور اپنے باپ کے کرتوت سن لے۔ تم
جاسکتے ہو۔“

اس سے پہلے کہ ایاز کچھ اور کہتا، وہ کمرے سے اٹھ کر
چلی گئی۔ ایاز کچھ دیر بت بنا وہاں بیٹھا رہا پھر ایک جھٹکے سے
اٹھا اور باہر نکل گیا۔

راجیلہ خود سمجھتی تھی کہ یہ شادی نہیں ہو سکتی اسی لیے اس
نے روشنی کو کتنی سے منع کر دیا تھا کہ وہ فرماز سے نہ ملے۔ اس
سے آگے بھی اس نے سوچ رکھا تھا کہ وہ روشنی سے کہے گی یہ
شہر چھوڑ دے۔ وہ کیلاش پور آئی بھی اپنے شوہر کے انتقال
کے بعد تھی یعنی صرف دو سال پہلے۔ قصبہ پہاڑی سے اس
کے شوہر کا رانسفر ایک شہر شاہ پور میں ہوا تھا۔ رانسفر منٹ کے
بعد بھی وہ وہیں رہا۔ روشنی کی تعلیم بھی اسی شہر میں ہوئی۔ وہ
وہیں رہنا چاہتی تھی لیکن راجیلہ اسے کیلاش پور لے آئی۔ وہ

